تالیف
حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اِنسان

کیا ہے؟ لوگ کہتے ہیں، مٹی کا پُتلا ہے، اس میں جان ڈال دی گئی، وہ بولنے لگا۔ منطق پڑھنے والے کہتے ہیں، انسان ایسا جان دار ہے جس کو عقل عطا کی گئی جس سے وہ بُرے بھلے کو پہچانتا ہے اور سوچ سمجھ کر نتیجے اخذ کرتا ہے چیزیں ایجاد کرتا ہے۔ لیکن دنیا میں جاندار اور بھی ہیں، انسان کا درجہ ان سب سے اونچا کیوں ہے۔ کیا صرف عقل کی وجہ سے؟

اگر اس کی بڑائی صرف عقل کی وجہ سے ہے تو یہ جو تمام جانداروں پر قبضہ جماتا ہے، دنیا کی ہر ایک چیز کو اپنے تصرف میں لے آتا ہے، کسی کو کاٹتا ہے کسی کو توڑتا ہے، کسی چیز کو جلاتا ہے، کسی چیز کو پگھلاتا ہے، سمندروں میں تیرتا ہے، فضا میں اُڑتا ہے اور اب چاند تاروں پر بھی قبضہ جمانا چاہتا ہے۔ تو اُس کا یہ قبضہ اور تصرف کہاں تک درست ہے۔ کیا یہ جبر و قہر اور ظلم نہیں ہے؟ کیا یہ قبضہ غاصبانہ اور یہ تصرف ظالمانہ نہیں ہے؟ کیا اس کو عقل اس لئے دی گئی ہے کہ وہ ظلم اور جبر و قہر کر سکے۔ اس عقل کو ہم نعمت اور رحمت مانیں یا عذاب اور مصیبت سمجھیں کہ ساری مخلوق کو اپنے شکنجہ میں کس رہی ہے۔ منطق اس کا کوئی جواب نہیں دیتی۔

ہم نے قرآن شریف کا مطالعہ کیا، قرآن شریف میں اس کا جواب موجود ہے۔
قرآن حکیم بتاتا ہے کہ اس تمام مخلوق کا ایک پیدا کرنے والا ہے۔ اس نے اپنی مرضی سے اس تمام مخلوق کو پیدا کیا۔ زمین، آسمان، چاند، سورج، سب اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ جس کو جیسا چاہا بنا دیا اور اپنے کام پر لگا دیا۔ اسی خدا نے انسان کو پیدا کیا، اس کو عقل اور سمجھ دی۔ اُس کو علم دیا اور اسی نے انسان کو پوری کائنات میں اپنا نائب بنا دیا۔ (سورہ بقرہ ۲۶ آیت ۳۰) اسی نے اس کو ایسی صلاحیت اور ایسی طاقت بخش دی کہ زمین و آسمان کی کسی بھی چیز پر وہ قبضہ کر سکتا ہے۔ اور اس کو اپنے کام میں لا سکتا ہے۔ زمین و آسمان کی تمام چیزیں اسی کے لئے مسخر کر دیں (سورہ جاثیہ ۴۵ آیت ۱۳)

بس انسان کا یہ قبضہ غاصبانہ اور یہ تصرف جابرانہ نہیں ہے بلکہ یہ تصرف جائز اور یہ قبضہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کارندہ اپنے مالک کی طرف سے قبضہ کیا کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ انسان کی حقیقت قرآن شریف نے یہ بتائی ہے کہ وہ اللہ کا خلیفہ (نائب) ہے۔ اس کی بڑائی صرف عقل کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اس لئے ہے کہ اس کو نیابت کا منصب عطا ہوا ہے۔

یہ مٹی کا پُتلا کیا ھے؟

یہ ہمارا بدن جس کو ہم مٹی کا پُتلا کہتے ہیں، کیا یہی انسان ہے؟ ہر شخص جواب دے گا۔ یہ انسان نہیں ہے۔ یہ صرف قالب ہے، انسان کچھ اور ہے۔

یہ قالب گھٹتا ہے، بڑھتا ہے، پرانا پڑ جاتا ہے۔ کبھی اس کا کوئی حصہ کٹ جاتا ہے۔ مگر "زید" جس کا یہ قالب ہے، وہ نہیں بدلتا۔ زید بچپن میں بھی زید تھا، جوانی میں بھی زید ہی رہا۔ بوڑھا ہو گیا تب بھی زید ہی ہے۔ وہ بیمار پڑا تب بھی زید ہی تھا

اس کی بینائی جاتی رہی تب بھی زید رہا۔ آنکھیں بنوالیں اور چشمہ لگا کر دیکھنے لگا تب بھی زید ہی ہے۔ یہ زید انسان ہے۔ یہ جب بھی تھا جب یہ مٹی کا پتلا اُس کا قالب نہیں بنا تھا۔ اور جب بھی رہے گا جب یہ مٹی کا قالب اس سے الگ ہو جائیگا۔

زندگی کیا ہے؟ لوگ کہتے ہیں۔ بہت خفیف سا قطرہ یا کیڑا تھا۔ ماں کے پیٹ میں اُس نے بڑھنا شروع کیا۔ وہ بچہ بن گیا۔ پیدا ہوا۔ بڑھا۔ جوان ہوا۔ بوڑھا ہوا۔ یہ زندگی ہے۔ مگر یہ تو اس قالب کی سرگذشت ہے زید جس کو ہم انسان کہتے ہیں وہ تو کچھ اور ہے۔

جب یہ قالب ختم ہوا تو کیا زید بھی ختم ہو گیا۔ موت صرف قالب کی آئی۔ فنا صرف قالب ہوا۔ یا انسان بھی فنا ہو گیا؟

خود ہمارے دل کی آواز یہی ہے اور دنیا میں جو بھی مذہب ہے وہ یہی کہتا ہے کہ زید فنا نہیں ہوا۔ موت کا مطلب ہے کہ زید اپنے خاکی قالب سے جُدا ہو گیا۔ موت انتقال ہے۔ یعنی زید ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہو جاتا ہے۔ موت فنا نہیں ہے۔

مرنے کے بعد اچھا! اگر موت فنا نہیں ہے۔ زید مرنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے تو اس بقار کا نام کیا ہے؟

مرنے کے بعد باقی رہے گا تو کہاں رہے گا؟ کس طرح رہے گا۔ آرام سے رہے گا یا تکلیف سے؟ آرام ملے گا تو کس طرح؟ تکلیف ہوگی تو کیوں ہوگی۔ کیا ہوگی۔ کس طرح ہوگی؟

موجودہ زندگی کا تعلق اس سے کیا ہوگا؟

اس زندگی میں جو کچھ کیا ہے اس کا کوئی اثر موت کے بعد ہوگا؟

اگر اثر ہوگا تو کس عمل کا اثر کیا ہوگا؟

کون سے عمل کرنے چاہئیں جن کے اثر اچھے ہوں ۔ وہ عمل کس طرح کرنے چاہئیں کون سے عمل نہیں کرنے چاہئیں ؟

اگر ہماری عقل اور سمجھ کا تقاضا ہے کہ جہاں ہمیں پہنچنا ہے وہاں کی باتیں معلوم کرلیں اور رات کی اندھیری ختم ہونے کے بعد جو کل کا دن آنے والا ہے اس کا انتظام آج کرلیں تو ہمارے لئے لازم ہوجاتا ہے کہ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کریں اور سب سے پہلی فرصت میں اور فرصت نہ ہو تب بھی فرصت نکال کر ان سوالات کے جواب معلوم کرلیں ۔

کس سے معلوم کریں ؟

اگر کوئی شخص یورپ گیا ہو تو اس سے یورپ کی باتیں معلوم کی جاسکتی ہیں ۔ لیکن اگر یورپ کوئی نہ گیا ہو یا جو یورپ گیا ہو وہ کبھی واپس نہ آیا ہو تو کس سے معلوم کریں ؟

یورپ کی باتیں معلوم کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ۔ اگر ہمیں یورپ جانا نہ ہو ۔ لیکن جب ہمیں جانا ہے اور ضرور جانا ہے اور وہاں جاکر رہنا ہے اور اتنا رہنا ہے کہ اُس کی کوئی مُدت معین نہیں ، ساری عمر وہیں رہنا ہے تو ہم سے زیادہ کوئی نادان ، اور غافل نہ ہوگا اگر ہم یورپ کی باتیں معلوم نہ کریں اور تمام حالات کی پُوری پُوری تحقیق نہ کرلیں ۔

ہماری دانشمندی یہی ہوگی کہ ہم جہاں تک معلوم کرسکیں ہر چیز کی تحقیق کرلیں ۔ مگر یہ سوال پھر لوٹ آیا کہ کس سے معلوم کریں ۔

عقل کی رہنمائی

ہمیں عقل پر بہت ناز ہے ۔ اور اس میں شک نہیں کہ عقل ایسی نعمت ہے کہ اس پر ناز کرنا چاہیئے ۔ مگر سب باتیں عقل سے نہیں معلوم کی جاسکتیں ۔

اس شخص کو عقلمند نہیں بے وقوف کہا جائے گا جو یورپ کی باتیں عقل سے معلوم

کرنا چاہے اور قصرِ بکھنگھم کا نقشہ اپنی عقل سے کھینچنے لگے۔ عقل وہاں کام کرتی ہے جہاں مشاہدہ یا تجربہ ہوتا ہے۔ تجربہ بھی مشاہدہ ہی سے ہوتا ہے۔ جہاں مشاہدے کچھ بھی نہ ہوں وہاں عقل کام نہیں کر سکتی۔ ٹرین کی گڑگڑاہٹ یا سیٹی کی آوازیں یا انجن کا دھواں دیکھ لیں تب تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ٹرین گذر رہی ہے۔ ورنہ سیکڑوں ٹرینیں آتی جاتی رہتی ہیں آپ کو احساس بھی نہیں ہوتا۔ عقل بے چاری غافل رہتی ہے۔ پھر عجیب بات ہے کہ مشاہدہ کے بعد بھی جو فیصلہ عقل سے کرتے ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس میں غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ مثلاً:

(۱) ٹیبل فین جب چلتا ہے تو ہمارا مشاہدہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں کوئی پنکھڑی نہیں ہے، حالانکہ یہ مشاہدہ غلط ہے۔

(۲) ہماری آنکھوں کے سامنے مشاہدہ کی سب سے بڑی چیز آفتاب ہے۔ آفتاب نکلتا ہے، چڑھتا ہے، غروب ہوتا ہے، ہم روز بلاناغہ مشاہدہ کرتے ہیں مگر آفتاب گھوم رہا ہے یا زمین۔ ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ آفتاب گھوم رہا ہے۔ ہم چاند تاروں کو چھپتے نکلتے دیکھتے ہیں، مشاہدہ کرتے ہیں، دنیا کے بڑے بڑے عقلمند اسی مشاہدہ پر بھروسہ کرتے رہے۔ اسی مشاہدہ کی بنا پر انھوں نے ہیئت اور نجوم جیسے فنون ایجاد کیے۔ ہزاروں برس تک ان فنون کی دھاک بیٹھی رہی۔ بڑے بڑے ذہین اور سمجھ دار علماء نے اپنی ساری ساری عمریں ان فنون کے ایجاد کرنے پھر پڑھنے پڑھانے میں صرف کیں۔ ان فنون کی بنیاد پر اصطرلاب، زائچے اور رصدگاہیں تیار کی گئیں۔ بڑی بڑی حکومتوں نے ان فنون کی سرپرستی کی۔ بے شمار دولت ان فنون کی ترقی پر صرف کی گئی۔ لیکن اب تحقیق یہ ہے کہ یہ جو کچھ تھا۔ سب غلط تھا۔ جو مشاہدہ تھا وہ حقیقت نہیں تھا۔ فریبِ نظر تھا۔ کیونکہ آسمان کا تو وجود ہی نہیں ہے۔ اور گھومنے والا آفتاب نہیں ہے بلکہ زمین گھوم رہی ہے۔

(۳) ہماری عقل سب کچھ جانتی ہے مگر یہ نہیں جانتی کہ خود عقل کیا ہے اور ہماری جان کی حقیقت کیا ہے ؟

مطلب یہ ہے کہ سب سے قریب کی چیز جان ہے اور عالم مشاہدہ میں سب سے بڑا آفتاب ہے ۔ ہماری عقل دونوں کے بارے میں درماندہ اور عاجز ہے اور اتنی بڑی غلطی کھا چکی ہے کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے ۔

(۴) دنیا کے عقلمندوں کا فیصلہ تھا اور ہمارا مشاہدہ بھی یہی ہے کہ 'حرکت' کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا ۔ ہمارے الفاظ اور ہماری آواز بھی زبان اور گلے کے پٹھوں کی حرکت کا اثر ہے ۔ یہ بھی فوراً ختم ہو جاتے ہیں ۔ اُن کے باقی رہنے کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور اُس شخص کو بے وقوف اور بے عقل سمجھا جاتا تھا جو اُن کے باقی رہنے کی بات کہتا تھا ۔ مگر سائنس کی جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا کہ جس کو بے وقوفی سمجھا جاتا تھا وہ حماقت نہیں بلکہ حقیقت ہے ۔ ہمارے الفاظ باقی رہتے ہیں ۔ اُن کو ہم ریکارڈ کر سکتے ہیں ۔ ٹیلی ویژن نے ہماری حرکت کے لئے بھی بقار کا فیصلہ کر دیا ہے ۔

ہمارے ہر ایک عمل کا ایک اثر ہے ۔ ایک لفظ سے ہم کسی کو ناراض کر دیتے ہیں کسی کو خوش کر دیتے ہیں ۔ ہمارا ایک ہی لفظ کبھی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے اور اگر ایک ہی لفظ باغیانہ ہو تو ایک لفظ کی بنا پر پھانسی بھی دی جا سکتی ہے ۔

اب عقل کی رہنمائی ناکافی ، ہر ایک عمل کی تاثیر لازمی ۔ موت فنا نہیں ، موت صرف ایک پُل ہے جس پر سے انسان گذرتا ہے تو دوسرے عالم میں پہنچ جاتا ہے ۔ اس عالم میں پہنچ کر کیا ہوگا ۔ اس کا جواب کون دے ؟

فطرت مددگار ہے

بچہ پیدا ہوا۔ وہ صرف رونا جانتا ہے اور کسی بات کی اس کو خبر نہیں۔ وہ بے بس ہے۔ بہت کمزور ہے۔ خود کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کی زندگی غذا پر موقوف ہے مگر یہ نہ کھانا جانتا ہے، نہ کھا سکتا ہے اور اتنا کمزور ہے کہ بڑے آدمی کی غذا وہ برداشت بھی نہیں کر سکتا۔ روٹی کا ٹکڑا جو بڑے آدمی کی زندگی کا سہارا ہوتا ہے اُس کے لئے موت کا پیغام بن جاتا ہے۔

لیکن جس قدرت نے اُس کو قطرہ سے بڑھا کر بچہ بنایا وہ یہاں بھی اُس کی مدد کر رہی ہے۔

ماں کی مامتا بے چین ہوتی ہے کہ اس ننھے سے بچے کو چھاتی سے لگائے تو خاص اس جگہ جہاں اُس کا مونھ رہتا ہے۔ قدرت نے ایک فوارہ بنا دیا ہے۔ جیسے ہی یہ بچہ پیدا ہوا اس فوارہ میں بچہ کی غذا اکٹھی ہو گئی۔ جو نہایت ہلکی۔ اس کی طاقت اور اس کی صحت کے لئے سب سے زیادہ بہتر اور سب سے زیادہ مناسب ہے یہ بچہ کچھ نہیں جانتا۔ مگر یہ خوب جانتا ہے بلکہ اس کا ماہر ہے کہ وہ اس فوارہ کو کس طرح چوسے اور کس طرح اس لطیف غذا کو اپنے پیٹ تک پہنچائے۔

یہ اس کو کس نے سکھایا؟ یہ قدرت کی مدد ہے۔ اور اس کی فطری تعلیم۔ بچہ کو ہوا کی ضرورت ہے۔ سردیوں میں نگہداشت کی ضرورت ہے۔ دھوپ کی ضرورت ہے۔ یہ اپنی حفاظت خود نہیں کر سکتا۔ اس کو محافظ اور نگراں کی ضرورت ہے۔

قدرت نے ماں کی فطرت میں وہ محبت بھر دی کہ اس نے نہ صرف ایک خدمت گذار کی طرح بلکہ فداکار اور جاں نثار بن کر ہنسی خوشی اس کی ہر ایک خدمت انجام

دی۔ اپنا تمام چین اور آرام اس کی خدمت اور راحت پر قربان کر دیا۔
فطرت نے باپ کو شفقت اور محبت کا ایسا پُتلا بنا دیا کہ اُس نے بچّہ کی حفاظت، پرورش اس کی تعلیم و تربیت اور ترقی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا۔
بہنوں اور بھائیوں میں وہ امنگ پیدا کر دی کہ یہ بچّہ اُن کا محبوب مشغلہ اور بہت ہی پیارا کھلونا بن گیا۔ وہ ہر وقت اس میں مشغول رہتے ہیں اور اس کے رنج سے رنجیدہ اور خوشی سے خوش ہوتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کو خوش کرنے کے لئے اسی جیسے بچّے بن جاتے ہیں۔

فطرت رہنما اور معلم ہوتی ہے

یہ فطرت کی رہنمائی تھی کہ بچّہ کو دودھ چوسنا سکھایا قدرت کی فطری رہنمائی سے بچّہ نے غذا حاصل کی۔ بدن میں طاقت آئی تو یہ صرف قدرت کی مدد اور اس کی رہنمائی ہے کہ بچّہ میں شناخت کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ چلنا پھرنا تو درکنار بچّہ خود سے اُٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ زبان ابھی خاموش ہے۔ صرف حلق سے ہوں ہوں کر لیتا ہے۔ مگر آنکھوں اور کانوں کی طاقت میں ایسی پختگی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ ماں باپ کو دیکھتا ہے تو پہچان لیتا ہے۔ بہن بھائی جو اس سے محبت کرتے ہیں اُن کو بھی پہچانتا ہے خوشی خوشی اُن کی گود میں چلا جاتا ہے جن کو نہیں پہچانتا اُن سے وحشت کھاتا ہے۔ یہ بچّہ کی حفاظت کے لئے قدرت کی رہنمائی ہے۔
ہم اگر عربی یا انگریزی بولنا چاہتے ہیں تو اس زبان کی گرامر یاد کرتے ہیں، ریڈر پڑھتے ہیں تب کچھ بول سکتے ہیں۔ مگر قدرت کی یہ رہنمائی ہے کہ ماں باپ کی زبان بچّہ بغیر کسی گرامر کے سیکھ جاتا ہے۔
قدرت نے جب بچّہ کو پہچاننے کی طاقت بخشی تو ساتھ ساتھ ایک بات کا شوق بھی دلا دیا۔ یہ ہے نقل اُتارنے کا شوق۔

زبان ابھی قابو میں نہیں ہے۔ مگر بچہ چاہتا ہے کہ جو سُنے زبان سے اس کو ادا کرے۔ وہ پُورا لفظ ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتا کوئی ایک حرف ادا کر سکتا ہے تو اُسی کو ادا کرتا ہے۔ پھر اس کی مشق کرتا ہے۔ اُس کے ادھورے لفظ کو اُس کے ماں باپ سنتے ہیں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہنسنے لگتے ہیں۔ مگر بچہ ہمت نہیں ہارتا یہ برابر کوشش کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ کچھ عرصہ میں کامیاب ہو جاتا ہے اور جس طرح اُس کے ماں باپ اور مُربّی و سرپرست بولتے ہیں یہ بھی بولنے لگتا ہے۔

یہ مدد اور تعلیم کی دوسری قسم ہے۔ جو فطرت اور قدرت کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تعلیم کا فطری طریقہ یہ ہے کہ فطرت نمونہ پیش کر دیتی ہے اس نمونہ کی نقل اُتارنے کی مشق ہو جاتی ہے تو اس کو تعلّم اور سیکھنا کہتے ہیں۔

ترقّی پذیر شہری زندگی

اور

فطرت کی مدد اور رہنمائی

اونچے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھی انسان رہتے ہیں۔ مگر کس طرح رہتے ہیں، کیا کھاتے ہیں کیا پہنتے ہیں۔ آپ کو اگر کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر جانے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ آپ کے پالتو مویشی کی زندگی اور ان پہاڑی انسانوں کی زندگی میں فرق بہت ہی کم ہوتا ہے۔

یہ پہاڑی انسان پہاڑی کھوہ "جگی" یا چھوٹے سے چھپر میں رات گذارتے ہیں۔ جانوروں کی کھال جس پر بال موجود ہوتے ہیں یا ٹاٹ کی طرح اُون کے بُنے ہوئے کمبل اُن کی پوشاک ہوتی ہے۔ کُرتے یا پاجامے بھی کمبل ہی جیسے کپڑے

کے ہوتے ہیں۔ شکاری جانوروں کا گوشت۔ درختوں کے پھل۔ اُبلے ہوئے چاول ادھ کچری سی موٹی روٹی اُن کی خوراک ہوتی ہے۔ خالی نمک یا پیاز یا گڑ جیسی کوئی میٹھی چیز یا سِل پر رگڑی ہوئی لہسن پیاز کی چٹنی سالن کا کام دیتی ہے۔ کوئی مہمان آتا ہے تو اُس کے لئے سبزی کی بھاجی بنا لیتے ہیں۔ یہ اُن کا تکلف ہوتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان کی شروع زندگی ایسی ہی تھی بلکہ اس سے بھی پست تھی۔ روٹی سالن یا چٹنی تو کیا اُسے گیہوں چاول اور آگ کی بھی خبر نہیں تھی۔ کاتنا اور بُننا بھی وہ نہیں جانتا تھا۔ پہلے پہل تو اسے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ اگر کوئی مرجائے تو اُس کی لاش کو کس طرح سنگوانا چاہیئے۔

اس شروع کی زندگی کا اب صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے کہیں اس کا نمونہ دیکھا نہیں جا سکتا۔

بہر حال آپ اس سب سے پہلی زندگی کا تصور کیجئے پھر اپنے زمانے کی دیہاتی زندگی، قصباتی زندگی پھر شہری پھر ہندوستانی زندگی پھر کسی زیادہ ترقی یافتہ ملک کی شہری زندگی پر نظر ڈالئے۔ یہ بے شمار منزلیں کس طرح طے ہوئیں۔

جواب یہی ہوگا۔ انسانی دماغ کام کرتا رہا۔ ضرورتیں سامنے آتی رہیں، ایجادیں ہوتی رہیں اور دُنیا ترقی کرتے کرتے اس منزل پر پہنچ گئی۔

یہ جواب درست ہے۔ لیکن لفظ ایجاد تحقیق طلب ہے۔ ایجاد کیسے ہوتی ہے؟

آپ تحقیق فرمائیے۔ ایک اہم سوال ہے۔

ایجاد اور فطری الہام

(۱)

رات کی بے انتہا سردی کے بعد جب آفتاب کی کرنوں سے انسان کو تگھاس پہنچا۔ تو جیسے ہی گرمی اور سردی کا اس کو احساس ہوا اُسے یہ بھی شوق ہوا ہوگا کہ کوئی ایسی چیز اُسے مل جائے جو دھوپ کی طرح گرم ہو۔ بہت ممکن ہے۔ پھر ایسا ہوا ہو کہ کسی پتھر پر اُس نے زور سے پتھر مارا اور اس سے چنگاریاں نکلیں۔ یہ چنگاری اس کی ضرورت کی چیز تھی۔ اُس نے فوراً کھوج شروع کر دی کہ چنگاری کیسے پیدا کی جاسکتی ہے آخرکار اُس نے چقماق دریافت کر لیا۔ تگھاس اور گرماہٹ کی ضرورت ہر ایک کو تھی مگر پتھر پر پتھر مار کر آگ نکالنے کا خیال کسی ایک ہی شخص کو آیا۔ اس نے اس کا تجربہ کیا۔ پھر لوگوں کو بتایا۔ چونکہ لوگوں کی ضرورت کی چیز تھی سب نے اس کو فوراً قبول کر لیا۔ یہ آگ کی ایجاد ہے۔

(۲)

قدرت نے گھوڑے، خچر، اونٹ وغیرہ بہت سے جانور بنائے ہیں۔ ہزاروں سال پہلے سے انسان نے اُن کو اپنی سواری بنائے رکھا تھا اور انھیں کے ذریعہ وہ سامان بھی منتقل کیا کرتا تھا۔ لیکن انسانوں کی آبادی اتنی بڑھ چکی تھی کہ یہ سواریاں ناکافی ہو رہی تھیں۔

ضرورت تھی کہ جانوروں کے سوا کوئی چیز ہو جو حرکت کرے اور سواری کا کام دے سکے۔ ایک شخص نے دیکھا کہ جب بند مونھ کی ہنڈیا میں جوش زیادہ آیا تو وہ حرکت کرنے لگی۔ یہاں تک کہ چولھے کے اوپر سے گر گئی۔ اس کا ذہن فوراً منتقل ہوا اُس نے تجربہ شروع کیا یہاں تک کہ اسٹیم کا موجد بن گیا۔ دنیا کو ایسی طاقت

کی ضرورت تھی۔ لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ اس ایجاد کو لیا اور ترقی کے راستے پر چلنا شروع کر دیا جس کی آخری منزل کا اب تک کوئی پتہ نہیں۔

ہنڈیا کا جوش مارنا انوکھی بات نہیں تھی۔ اس کو ہر شخص جانتا اور دیکھتا تھا مگر بھاپ سے متحرک کرنے اور کسی چیز کو چلانے کا خیال ایک ہی شخص کو آیا، اُس نے تجربہ کر کے اُس کو ایجاد کا درجہ دیا۔

(۳)

یہ خیال کیا ہے؟ اس کے ذہن یا دماغ میں کیسے آیا؟ کس نے ڈالا؟ صرف عقل نے یہ خیال پیدا کیا تو عقل تو دوسرے انسانوں کے پاس بھی ہے۔ اور بے شمار انسان موجود ہیں جن کے پاس اس موجد سے کہیں زیادہ عقل کے خزانے فطری طور پر محفوظ ہیں۔

اچھا اگر اس کے ذہن میں یہ خیال عقل نے پیدا کیا تو اس طرح کی باتیں ان کو کس نے بتائیں جن میں عقل نہیں ہے؟

مکڑی کو جالا تننا۔ بھڑ کو چھتا بنانا اور چیونٹی کو بل بنانا کس نے سکھایا۔ شہد کی مکھی کو کس نے بتایا کہ وہ پھول سونگھے، ان سے عرق چوسے اور اپنے چھتے میں لاکر اس کو اس طرح اُگلے کہ شہد بن جائے۔ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ یہ قدرت کا فیض ہے۔ وہی قدرت جس نے کیڑے کو بتایا کہ وہ شہتوت کے پتوں سے ریشم کس طرح بنائے مولے کو بتایا کہ وہ اپنا حسین آشیانہ تنکوں سے کس طرح تعمیر کرے۔ اسی نے آگ اور اسٹیم کا نسخہ انسان کے ذہن میں ڈالا۔ اس طرح قدرت کی تعلیم کو "فطری الہام" کہا جاتا ہے۔

جانور عقل و علم سے محروم ہوتے ہیں تو یہ فطری الہام ان کی فطرت کا جز بن جاتا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے علم و عقل سے نوازا ہے۔ تو اس کے لئے یہ الہام ایک

روشنی، ایک کرن، ایک چمک بن جاتا ہے، جس سے اس کو راستہ کا ایک سرا معلوم ہو جاتا ہے۔

تشریعی الہام (وحی) اور نبوت و رسالت

(۱)

اچھا جس طرح تمدن اور سائنسی ایجادات کے سلسلہ میں ایسا ہوا کہ ضرورتیں سامنے آتی رہیں، مسائل پیدا ہوتے رہے، ماہرین کے ذہن ان کے حل کی طرف متوجہ ہوتے رہے۔ پھر کسی ماہر کے ذہن میں ایک بات آئی، اس نے اس سوال کو حل کر دیا۔ اور اس طرح ایک نئی ایجاد دنیا کے سامنے آگئی۔ کیا خود انسان اور انسانیت کے سلسلے میں بھی ایسا ہوا ہے کہ سمجھدار انسانوں نے غور کیا ہو کہ انسان کیا ہے؟ خالق ہے یا مخلوق؟ خود پیدا ہو گیا یا کسی نے پیدا کیا؟ کسی بھی مشین کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ یہ اپنے پورے کل پرزوں کے ساتھ خود بخود پیدا ہو گئی۔ تو ہم اس کو حماقت سمجھتے ہیں اور جس طرح دوپہر کے وقت ہمیں آفتاب کا یقین ہوتا ہے، اسی طرح اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اس مشین کا کوئی بنانے والا ضرور ہے۔ وہ صاحب علم و ارادہ اور صاحب قدرت ہے۔ تو یہ انسان جو ایسی مکمل مشین ہے کہ اس نے ہزاروں لاکھوں مشینیں بنا ڈالیں، کیا کوئی صاحب عقل و انصاف ایک لمحہ کے لئے بھی تصور کر سکتا ہے کہ یہ خود بخود پیدا ہو گیا، یا اس کو کسی ایسی ہستی نے پیدا کر دیا جو صاحب علم و ارادہ اور صاحب قدرت نہیں ہے۔

لیکن وہ بنانے والا کون ہے؟ اس نے انسان کو کیوں بنایا؟ اس نے عقل و ہوش کے ساز و سامان سے کیوں نوازا؟

انسان کا تعلق اس کے ساتھ کیا ہونا چاہیئے؟

انسان کو دنیا میں کس طرح رہنا چاہیئے ؟

تحقیق طلب بات یہ ہے کہ کیا ایسے ماہر پیدا ہوئے جنھوں نے اس طرح کے سوالات پر غور کیا ہو۔ اور اُن کے ذہن میں وہ روشنی پیدا ہوئی ہو جس نے ان سوالات کو حل کیا ہو۔

(۲)

ابتدا میں انسان کے صرف قریبی رشتہ دار تھے پھر نسلیں بڑھیں، رشتے دُور کے ہو گئے، پھر آبادیاں بھی الگ الگ ہو گئیں، پھر نسلوں میں امتیاز پیدا ہونے لگا۔ پھر رنگوں میں بھی فرق ہو گیا۔

یعنی پہلے انسان اور اُس کے قریبی رشتہ داروں کا مسئلہ تھا۔ اس سلسلہ میں ضرورتیں تھیں اور ایک طریقہ زندگی تھا۔ پھر رفتہ رفتہ رشتہ دار غیر رشتہ دار۔ اجنبی پڑوسی۔ شہری۔ غیر شہری۔ مُلکی۔ غیر ملکی۔ کالے۔ گورے وغیرہ کے سوالات سامنے آئے۔

(۳)

جس طرح انسانوں کی صورتیں مختلف ہیں، اُن کے مزاج، اُن کے ذہن بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے پیش آنے والے سوالات کے جواب بھی مختلف ہوتے ہیں۔ دلائل بھی مختلف ہوتے ہیں جن کی بنا پر بحث مباحثہ کی نوبت بھی آتی ہے جس کے نتیجے میں لڑائی جھگڑے بھی شروع ہو جاتے ہیں۔ مگر اس بحث مباحثہ میں یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ غور و فکر کی صلاحیت بڑھتی ہے، ذہنی استعداد ترقی کرتی ہے۔

(۴)

عقل انسانی اور ذہنی استعداد جیسے جیسے بڑھتی رہی اپنے متعلق بھی سوالات پیدا ہوتے رہے۔ ہم کیا ہیں؟ کیوں ہیں؟ زندگی اور موت کیا ہے۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ ہماری اس زندگی کا تعلق مابعد الموت سے کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اپنے پیدا کرنے والے کے متعلق کبھی سوالات پیدا ہوتے رہے۔ وہ ایک ہے یا کئی ہیں؟ وہ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ کب سے ہے؟ کب تک رہے گا؟ اُس کے بیوی بچے اور اولاد ہے یا نہیں؟ کیا اُس کے کچھ مددگار ہیں؟ مددگار کون ہیں؟ اُن کا تعلق خدا سے کیا ہے؟ ہمارا تعلق ان مددگاروں سے کیا ہونا چاہیئے؟

یہ روشن آفتاب اور چمکدار تارے کیا ہیں؟ یہ بڑے بڑے دریا اور اونچے اونچے پہاڑ کیا ہیں؟ دُنیا میں جو بڑے بڑے آدمی ہوتے ہیں اُن کی حیثیت کیا ہوتی ہے۔ مرنے کے بعد اُن کا مرتبہ کیا ہوتا ہے؟ ہم اُن کو یاد رکھیں تو کس طرح وغیرہ وغیرہ۔

سوال یہ ہے کہ جس طرح سائنس اور تمدّن کے سلسلے میں ترقی کے ہر ایک مرحلہ پر کسی ماہر کے ذہن میں کوئی خیال ڈالا گیا، جس نے گتھی سلجھادی اور ایک ایجاد دنیا کے سامنے پیش کر دی۔ کیا ان سوالات کے متعلق جن کو ہم مختصر الفاظ میں اخلاق اور رُوحانیت کے مسائل کہتے ہیں، ایسا ہوا ہے کہ جو اخلاق اور روحانیت میں کمال رکھتے تھے اور جن کو ان مسائل کی لگن تھی ان میں کچھ ایسے ماہر ہوئے کہ ترقی کے ہر ایک مرحلہ پر اُن کے ذہن روشن ہوئے اور انھوں نے وہ گتھیاں سُلجھا دیں جو اس وقت انسانی زندگی کے رشتہ ترقی میں پڑی ہوئی تھیں۔

عقل و قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ جو فطرت پُوری فیاضی کے ساتھ ابتدا سے انسان کی رہنما رہی جس نے اُس کو آغوشِ مادر میں دودھ پینا سکھایا۔ بولنا۔ چلنا سکھایا۔ زندگی گذارنے اور افزائش نسل کے راستے بتائے۔ جس نے ترقی تمدن کے ہر ایک مرحلہ پر اس کی رہنمائی کی، اُس نے یقیناً اس سلسلہ میں پُوری فیاضی سے کام لیا اور اخلاقی، روحانی اور خود انسانیت سے متعلق مسائل کی گتھیاں سلجھانے میں بھی اس کی ہدایت نشان راہ بنی۔

(۵)

اب یہ بات تو قطعاً بے معنی، حد درجہ غلط اور خلافِ فطرت ہے کہ اس رہنمائی کے لئے خود خالق مخلوق بن گیا اور کسی انسان کے روپ میں رُونما ہوگیا ۔ یہ تو وہی کہہ سکتا ہے جس کو خود خدا بننے کا شوق ہو ۔

شہد کی مکھی کو جب شہد بنانا اور انسان کے بچّہ کو جب بولنا سکھایا تو کیا خالق اور خدا اس وقت شہد کی مکھی یا انسان کا بچّہ بن گیا تھا ۔ ؟ ہرگز نہیں ۔ انسان فطری طور پر سیکھنے کا عادی ہے ۔ پس فطرت کے مطابق بات یہ ہے کہ اس خالق و قادر نے کچھ ایسے نمونے سامنے رکھے ۔ یعنی ایسے انسان پیدا کئے جن کو بچپن سے نیک بنایا ۔ خدا کی باتوں میں انکا دل لگتا تھا ۔ انھیں باتوں کی اُنکو لگن تھی ۔ اسی لگن میں وہ مگن رہے کسی اور طرف انکا دھیان بھی نہیں گیا گناہ کی کوئی بات اُن سے ہو ہی نہ سکی ۔ خدا نے اُن کو اس لئے پیدا کیا کہ رُوحانی اور اخلاقی مسائل پر غور کریں ۔ پھر جیسے کسی سائنس کے ماہر کو کوئی بات سمجھا دی ۔ اسی طرح خدا نے ان نیک بندوں کو ان سوالات کے جوابات سجھائے اور وہ روشنی بخشی جس نے روحانیت اور اخلاق سے متعلق مسائل کی گتھیوں کو سلجھایا ۔ پھر بحث و مباحثہ سے نہیں بلکہ اعلیٰ اخلاق اور بہترین کردار پیش کر کے اپنی سچائی کا ثبوت بھی دیا ۔ اور انسانوں کے لئے اخلاقی اور رُوحانی ترقی کا راستہ بھی کھولا ۔

(۶)

وہ روشنی جو ان پاک رہنماؤں کو عطا فرمائی الہام ہی ہے ۔ مگر یہ الہام فطری الہام سے بہت اونچا درجہ رکھتا ہے ۔ فطری الہام ایک دھیان یا خیال ہوتا ہے اور اس درجہ کا کہ یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ دھیان یا خیال خود پیدا ہوگیا ہے یا کسی نے دل میں ڈالا ہے ۔ بجلی سی کوندتی ہے اس کی جھلک سے ایک کنارہ سا نظر آجاتا ہے ۔ پوری بات ذہن نشین نہیں ہوتی پوری بات کے لئے کدوکاوش کرنی پڑتی ہے ۔ لیکن ان پاک

بندوں کو جو الہام ہوتا ہے وہ صرف جھلک نہیں ہوتا، وہ تڑکے کا نور ہوتا ہے۔ جو ذہن کے اُفق پر خود بخود پھیلتا اور چھاجاتا ہے۔ وہ ایک یقین ہوتا ہے۔ وہ کنارہ نہیں ہوتا بلکہ پُورا سبق ہوتا ہے۔ وہ راستہ کا پورا نقشہ اور زندگی کا ضابطہ ہوتا ہے۔ وہ شریعت یعنی قانون اور ضابطہ کی تعلیم دیتا ہے۔ اسی لئے اس کو "تشریعی الہام" کہا جاتا ہے۔

(۷)

مگر جس طرح کسی فن کے ماہر کو جو دھیان یا خیال عطا ہوتا ہے، وہ محض عطائی اور وہبی ہوتا ہے۔ ہزاروں ماہر عمریں لُٹا دیتے ہیں، مگر موجد نہیں بن سکتے۔ کوئی خوش نصیب ہوتا ہے جس کو ایجاد کی نعمت میسّر آجاتی ہے۔ اسی طرح اخلاق اور رُوحانیت کے ماہرین کو بھی جو روشنی عطا ہوتی ہے وہ محض عطائی اور وہبی ہوتی ہے۔ وہ خالق کی طرف سے انتخاب ہوتا ہے۔ ماہر رُوحانیت و اخلاق کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتا۔

(۸)

تمدن اور سائنسی ترقیات کے کسی ماہر کے ذہن میں جو خیال ڈالا جاتا ہے وہ اخلاقی یا رُوحانی مسئلہ نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق کسی فن یا آرٹ سے ہوتا ہے۔ لہٰذا اس فن کی مہارت اور اس کی ترقی کی لگن تو ضروری ہوتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ یہ ماہر رُوحانیت اور اخلاق میں بھی کمال رکھتا ہو۔ مگر وہ مسائل جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ان کا سارا تعلق اخلاق اور رُوحانیت سے ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ جس کو الہام کی روشنی عطا ہو۔ وہ رُوحانیت میں سب سے بلند، اخلاقی کمالات میں سب سے اونچا ہو۔ بچپن سے اس کو یہی لگن رہی ہو۔ سچائی۔ پاکبازی۔ امانداری جیسے اعلیٰ اخلاق کا بہترین نمونہ ہو۔ خالق ذوالجلال پر پُورا یقین اور بھروسہ رکھتا ہو۔ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا خدا پرست اور خدا ترس ہو۔

(۹)

ماہرین فن کی ایجاد چونکہ مشاہدہ ہوتی ہے۔ لہذا اس کو دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کی ایجاد خود دلیل بن جاتی ہے۔ لیکن ماہرین اخلاق و روحانیت جو پیش کرتے ہیں وہ ایک علمی اور روحانی سبق ہوتا ہے جس کے نتائج اس وقت نہیں بلکہ بعد میں اور عموماً دوسرے عالم میں ظاہر ہوتے ہیں۔ لہذا ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنی مہارت اور اپنی سچائی کی دلیل پیش کریں مگر ان کی سچائی اور امانت داری کی سب سے بڑی دلیل خود اُن کی پاک اور بے داغ زندگی ہوتی ہے۔

وہ ہمیشہ اللہ والے رہے ہر وقت اس کو یاد کرتے رہے اور اسی سے ڈرتے رہے۔ اُنھوں نے کبھی انسان کے حق میں کوئی جھوٹ نہیں بولا کسی سے بددیانتی نہیں کی۔ کسی سے فریب اور دھوکے کی بات نہیں کہی۔ کسی کی امانت میں کبھی کوئی خیانت نہیں کی۔ تو جو اپنے جیسے انسانوں کے حق میں، تمام عمر سچا دیانت دار اور پاک وصاف رہا ہو۔ کیا عقل باور کر سکتی ہے کہ وہ اس خدا کے حق میں جھوٹ بولیگا جس سے وہ ہمیشہ لَو لگائے رہا۔ اور بچپن سے اسی کے دھیان میں مگن رہا۔ اس کے غضب سے ڈرتا رہا اور اس کے قہر سے لرزتا رہا۔

مگر اس دلیل سے وہی متاثر ہو سکتے ہیں جو اس کو ہمیشہ سے جانتے رہے ہوں اور پرکھتے رہے ہوں۔ لہذا اس دلیل کے علاوہ وہ کوئی ایسی چیز بھی پیش کرتے ہیں جو اگرچہ مشاہدہ ہوتی ہے مگر انسانوں کی طاقت سے خارج ہوتی ہے۔ تمام انسان مل کر ایسی چیز پیش کرنا چاہیں تو پیش نہیں کر سکتے۔ خود ان پیش کرنے والوں کی طاقت سے بھی وہ خارج ہوتی ہے وہ صرف خالق کی بخشش ہوتی ہے، جو خالص اسی کی طرف سے ہوتی ہے۔ لہذا انسانوں کی طاقت سے خارج ہوتی ہے۔ ایسی چیز کو "معجزہ" کہا جاتا ہے۔

(۱۰)

انسانیت کاملہ۔ اعلیٰ اخلاق اور رُوحانیت کے یہ کامل اکمل ماہرین جن کو یہ روشنی عطا ہوئی نبی اور رسول کہلاتے ہیں۔ اونچے درجے کا الہام جو اُن کو ہوتا ہے۔ اس کو "وحی" کہا جاتا ہے۔ اور یہ رابطہ اور تعلق یا یہ منصب جو اُن کو عطا ہوتا ہے نبوت کہلاتا ہے اور جو کوئی حیرت انگیز نشان اُن کو دیا جاتا ہے جس کی مثال پیش کرنے سے دنیا عاجز رہتی ہے۔ اس کو "معجزہ" کہا جاتا ہے۔ الہام کی روشنی اُن کے لئے یقینی ہوتی ہے۔

یہ کامل اور برگزیدہ رہنما جیسے خدا کا یقین رکھتے ہیں، اس کے صفات کا یقین رکھتے ہیں اسی طرح اُن کو یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ اُن کو بتایا جارہا ہے وہ حق ہے سچ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی ہے جو ان کو یہ باتیں خود یا اپنے خاص فرشتے کے ذریعے بتا رہا ہے۔ کوئی شک و شبہ اُن کو اس تعلیم میں نہیں ہوتا۔ اسی لئے وہ اس پر اتنے پختہ ہوتے ہیں کہ اپنا سب کچھ اس پر قربان کردیتے ہیں۔ سخت سے سخت مصیبت اور کڑی سے کڑی آزمائش اُن کے قدم میں کوئی جنبش نہیں پیدا کرسکتی کیونکہ وہ اپنے یقین اور مکمل اعتماد و اطمینان کو نہیں بدل سکتے۔

نبیوں اور رسولوں کا سلسلہ

(۱)

انسان کا جب وجود ہوا۔ جیسے اس کو موجودہ مادی زندگی کے لئے رہنمائی کی ضرورت تھی ایسے ہی اس کو دُوسری (اُخروی) زندگی کے لئے بھی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ تو جیسے فطری الہام کا سلسلہ شروع ہوا ایسے ہی نبوت کا سلسلہ

بھی شروع ہوا۔ اور نبی آنے شروع ہوئے جو ہر پیدا ہونے والے سوال کا جواب دیتے رہے۔ اور ہر نئی گتھی کو سلجھاتے رہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوا کہ ایسے سوالات ابھر کر سامنے آئے جو آئندہ ترقی کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتے تھے جہاں سے ایک شاہراہ معین ہوتی تھی، جہاں یہ بتانا ہوتا تھا کہ اس تیراہے یا چوراہے میں سے کونسا راستہ سیدھا ہے۔

ایسے موقع پر خاص خاص سبق دیئے گئے، جن کی پوری کتاب بن گئی۔ اور نبی نے وہ کتاب دنیا کے سامنے پیش کردی۔ ایسے نبی جن کو کتاب دی گئی، اُن کو رسول کہا جاتا ہے۔

انسانوں کے یہ کامل رہنما ہر قوم میں آئے، ہر ملک میں آئے۔ اُن کی تعداد ہزاروں سے بھی زیادہ ہے۔ مشہور یہ ہے کہ تقریباً سوالاکھ نبی ہوئے۔

(۲)

مادی ترقیات اور سائنسی تحقیقات کا تعلق صرف موجودہ زندگی سے ہے۔ یہ پوری ہوں یا ادھوری۔ دوسری زندگی پر اُن کا اثر نہیں پڑتا بلکہ بہتر ہے کہ یہ ادھوری رہیں۔ تاکہ انسان کا دماغ بیکار نہ ہو۔ وہ ترقی کرتا رہے اور آگے بڑھتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنسی تحقیقات جو ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ اُن کو آخری نہیں کہا جاتا۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ کائنات کے کسی ایک کونہ کی بھی تحقیقات پوری نہیں ہوسکی۔

لیکن جن مسائل کا تمامتر تعلق دوسری زندگی سے ہے اگر ان کی تعلیم ادھوری رہتی ہے اور اس کی وجہ سے عمل ناقص، اخلاق نامکمل اور ضابطۂ حیات ناتمام رہتا ہے، تو ظاہر ہے یہ انسانیت اور نوع انسان کے لئے بہت بڑا نقصان ہے کیونکہ اس سے وہ زندگی ناقص رہتی ہے جو حقیقی زندگی ہے، جو دوسرے عالم میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گی۔

(۴)

وہ خدا جس نے نبوت کا سلسلہ قائم فرما کر دوسری زندگی سے متعلق مسائل میں رہنمائی فرمائی اور اس اُخروی زندگی میں سعادت اور کامیابی کا راستہ انسان کو بتایا۔ اس کی رحمت نے ضروری سمجھا کہ اس تعلیم کو مکمل کردے۔

لہذا جب تک انسان کے ذہن وفکر میں یہ صلاحیت نہیں پیدا ہوئی کہ وہ کورس کے آخری اور مکمل سبق سمجھ سکے۔ اس وقت تک اس کی ذہنی صلاحیت اور فکری استعداد کے بموجب درجہ بدرجہ تعلیم ہوتی رہی اور جب اس کے ذہن میں یہ صلاحیت پیدا ہوگئی تو اس کو ایک دو سبق ہی نہیں بلکہ مکمل کتاب دیدی گئی۔ اور عام اعلان کردیا گیا کہ یہ وہ کتاب ہے جس میں سراسر صداقت، سچائی اور یقین ہی یقین ہے شک وشبہ کا کوئی دھندلکا اس میں نہیں ہے۔

وہ پاکباز خدا ترس جو آگے قدم بڑھانا چاہتے تھے مگر ان کو راستہ نہیں مل رہا تھا! یہ کتاب ان کے لئے سراسر ہدایت اور رہنمائی ہے جو پاکباز فلاح اور کامیابی کی آخری منزل پر پہنچنا چاہتا ہے، اس سے روشنی حاصل کرے اور قدم بڑھائے۔

دین ایک ہے

(۱)

حقیقت ایک ہی ہوسکتی ہے

دنیا خود بخود ہوگئی۔ یا اس کو کسی نے پیدا کیا؟

پیدا کرنے والا ایک ہے یا کئی ہیں؟

پیدا کرنے والے کو مددگاروں کی ضرورت ہے یا نہیں؟

وہ ہم جیسا ہے یا ہم جیسا نہیں ہے ؟
اُس کے بیوی بچے اور اولاد ہے یا نہیں ہے ؟
ان میں سے ایک ہی بات حق ہو سکتی ہے
وہی ایک بات اوّل سے آخر تک تمام نبیوں اور تمام رسولوں نے پیش کی اسی کا نام دین ہے۔
ان سب نبیوں نے یہی بتایا کہ :
دنیا اور دنیا کی ہر ایک چیز جس میں انسان بھی ہے مخلوق ہے
صرف ایک ذات خالق ہے
وہ کامل و مکمل ازلی و ابدی ہے
وہ ہر ایک حاجت سے پاک ہے۔
وہ نرالا ہے، نہ اس کا کوئی ہم جنس ہے، نہ اُس کے کوئی مشابہ ہے۔ نہ اُس کے بیوی بچے ہیں، نہ اُس کا کوئی مددگار ہے نہ کسی مددگار کی اس کو ضرورت ہے،
انسانی زندگی کے دو حصے ہیں۔ ایک دنیاوی زندگی۔ دوسری وہ زندگی جو اس کے بعد آئے گی اصل زندگی وہی ہے۔
ہر ایک عمل کی پاداش ہے۔ اُس کا اچھا یا بُرا نتیجہ ہے۔ ہماری یہ زندگی کھیتی ہے ہم جیسا بوئیں گے ویسا کاٹیں گے۔ خدا کی مخلوق صرف وہی نہیں جو ہمارے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی مخلوق ہے جس کو ہم ان آنکھوں سے یا مادی آلات سے نہیں دیکھ سکتے۔ ایسی ہی ایک مخلوق ہے جس کو فرشتہ کہا جاتا ہے۔
تمام کائنات ختم ہونے والی ہے۔ صرف خدا کی ذات ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے
قیامت برحق ہے
جب موجودہ دنیا ختم ہو جائے گی۔ ایک دوسرا عالم سامنے آئے گا۔ اس میں

انسان کے اعمال کا حساب ہوگا، جو اچھے ثابت ہوں گے اُن کو جنّت ملے گی جو بُرے ثابت ہوں گے۔ ان کو دوزخ میں دھکیل دیا جائے گا۔

(۲)

یہ بنیادی حقیقتیں ہیں۔ تمام انبیاء (علیہم السّلام) نے انہیں کو بتایا۔ انہیں کو عقائد کہا جاتا ہے۔

انبیاء (علیہم السّلام) کو ماننے والے جو ان باتوں کو مانتے رہے اُن کو 'مُسلم' کہا گیا مگر بہت سے لوگوں نے اپنی عقل کو رہنما بنایا اور عقل ان حقیقتوں کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتی تھی، لہذا بھٹکتے رہے۔

اُنھوں نے کبھی خدا کی ذات وصفات میں، کبھی دُنیا یا انسان کے قدیم یا حادث ہونے میں، کبھی دوسری زندگی کے مسائل میں، کبھی انسان اور خدا کے درمیان تعلق میں عقلیں لڑائیں، طرح طرح کی باتیں نکالیں اور اُنھیں کو مذہب بنالیا۔

(۳)

کبھی ایسا ہوا کہ لوگوں نے اپنے ذاتی فائدے یا اپنے سماج کو رہنما بنالیا اور نبی کی تعلیم کو اس پر ڈھال کر مذہب کی صورت بدل دی حقیقت کو فراموش کردیا رسم ورواج یا اپنے مفاد کو مذہب بنالیا۔

کبھی خوش اعتقادی میں اپنے نبی یا دینی پیشواؤں کو اُن کی حیثیت سے بڑھایا وہ اُن کو خدا کا مددگار یا اس کی اولاد ماننے لگے۔

اللہ کے نبیوں اور رسولوں نے آکر اصلاح کی کوشش کی۔ کبھی لوگوں نے اُن کی بات مانی اور ایسا بھی ہوا کہ نبی عمر بھر کوشش کرتے رہے مگر قوم کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی۔ بہر حال لوگوں خصوصًا اُن کے سماجی رہنماؤں نے غلط راستے اختیار کرکے اپنے اپنے مذہبوں کی صورتیں بدل دیں۔ لیکن ان غلط کاریوں سے وہ حقیقت

نہیں بدل سکتی جس کی تعلیم انبیا علیہم السّلام دیتے رہے۔ لہذا دین ایک ہی رہا۔

(۴)

البتہ قدرتی اور سماجی صلاحیتوں اور انسان کی ذہنی استعداد کے بموجب عبادت کے طریقوں اور ان چیزوں میں اختلاف ہوتا رہا جن کو نظام حیات اور زندگی گذارنے کا دستور العمل یا شریعت کہا جاتا ہے۔ پس انبیاء علیہم السّلام کی شریعتیں مختلف ہوتی رہیں۔ اصل دین ایک ہی رہا۔ کیونکہ حقیقتیں بہرحال حقیقتیں رہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

(۵)

آخر میں ایک مکمّل کتاب دے دی گئی۔ وہ مکمل پیغام اور دین برحق کا مکمّل دستور ہے۔

یہ اعلان کر دیا گیا کہ یہ کتاب ہمیشہ ہمیشہ اسی طرح محفوظ رہے گی کبھی اس میں ایک نقطہ اور ایک شوشہ کا بھی فرق نہیں آئے گا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ لوگ کسی لفظ یا فقرہ کا مطلب غلط سمجھ جائیں مگر اس کے لفظوں میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی اور اسی بنیاد پر غلط سوچنے والوں کی غلطی کی اصلاح کی جاتی رہے گی۔ چونکہ یہ کتاب ہمیشہ ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ دینِ حق کا پیغامِ مکمّل لوگوں کے سامنے رہیگا لہذا کسی نبی یا کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اب نہ کوئی نبی پیدا ہوگا اور نہ وحی کے ذریعہ کوئی اور کتاب نازل ہوگی۔ علماء کا کام ہوگا کہ اس کتاب کو سمجھیں سمجھائیں اور اپنے اخلاق و کردار سے اپنی نیک نیتی کا ثبوت دیتے رہیں۔

نبی ہر ایک قوم میں آئے

وہ سوالات جو ابتدا ہی میں بیان کیے گئے تھے ہر ایک سمجھدار انسان کے

سامنے آئے اور ہر ایک قوم کو خواہ وہ کہیں رہتی ہو۔ اس کا رنگ اس کی نسل خواہ کچھ ہو۔ اُس کو ان سوالات کے جوابات کی ضرورت ہوئی۔ چنانچہ ہر ایک قوم میں نبی بھیجے گئے۔ یہی نبی انسانوں اور تمام دنیا میں پھیلی ہوئی اقوام کے سچے رہنما تھے، جنھوں نے دین کی باتیں بھی بتائیں اور دنیا کی بھی۔ رُوحانی مسائل میں بھی رہنمائی کی اور سماجی معاملات میں بھی۔ اُنھوں نے سیاسی سبق بھی دیئے اور اخلاقی اور مذہبی بھی۔ بس یہی حضرات صحیح رہنما اور سچّے ہادی تھے۔

لیکن دنیا کی قوموں نے جب اپنی زندگیاں خاص خاص نظریات پر ڈھالنا شروع کیں تو کچھ قومیں وہ ہوئیں جنھوں نے سرے سے نبوّت ہی کا انکار کردیا۔ اور نبیوں کے بجائے اوتار ماننے لگیں یا سائنس اور فلسفہ کو یعنی عقلیت کو مذہب کی حیثیت دیدی یا رسم و رواج کو دھرم اور دین بنالیا۔

قرآن پاک اور تذکرۂ انبیاء

قرآن پاک کا انداز یہ ہے کہ وہ مشاہدات سے یا تاریخ اور قومی روایات کے مسلّمہ شواہد سے استدلال کرتا ہے۔

اُس نے یہ تو کہا کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں "نذیر" (نبی) نہ گذرا ہو۔

یہ بھی فرمایا: ہر ایک قوم کے لئے نبی ہوئے۔ (سورۂ رعد)

لیکن اس نے ان نبیوں کا تذکرہ نہیں کیا جو ان قوموں میں بھیجے گئے تھے۔ جو نبوّت کی منکر، اوتار پرست یا رسم و رواج اور فلسفہ و سائنس یعنی عقلیت کی پجاری ہوگئیں اور نبیوں کو بالکل بھُلادیا۔

کیونکہ قرآن حکیم کا موضوع تاریخ نہیں ہے اُس کا موضوع ہدایت اور رہنمائی ہے پس تاریخ کی حیثیت سے توان فراموش کردہ نبیوں کا تذکرہ اس لئے نہیں کیا گیا کہ تاریخ قرآن حکیم کا موضوع نہیں ہے اور نبی کی حیثیت سے اُن کا تذکرہ اس لئے بے سود تھا کہ جن کے سامنے اُن کے کردار کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا تھا وہ ان کو قطعاً بھُلا چکی

ہے یا اگر جانتی ہے تو نبیوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ اوتار یا فلسفی کی حیثیت سے ۔
مثلاً کرشن جی یا رام چندر جی، ممکن ہے نبی ہوں مگر ان کو ماننے والے ان کو نبی کی حیثیت سے نہیں مانتے۔ لہٰذا کسی استدلال میں نبی کی حیثیت سے اُن کا نام لینا بے سود تھا۔ البتہ عیسائی اور یہودی اگرچہ راہِ اعتدال سے بہت کچھ ہٹ چکے تھے اور اصل تعلیم کو تقریباً مسخ کر چکے تھے لیکن وہ سلسلۂ نبوت کے قائل تھے۔ اور یہودی اگرچہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کو نہیں مانتے تھے مگر عیسائی ان سب کو مانتے تھے جن کا تذکرہ بائبل میں ہے۔ لہٰذا قرآن پاک میں انہیں انبیاء علیہم السّلام کی مثالیں پیش کی گئیں۔ اور انہیں کے تعلیم و کردار سے استدلال کیا جن کا تذکرہ توریت یا انجیل میں ہے ۔
ہم بھی اِنہیں انبیاء علیہم السّلام میں سے چند کے تذکرہ سے اس کتابچہ کو آراستہ کرتے ہیں ۔ (واللہ الموفق)

سب سے پہلا انسان سب سے پہلا نبی

وہ سب سے پہلا انسان جو دنیا میں آیا جس کو پُوری رُوئے زمین کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ بنایا۔ قرآن حکیم اور بائبل دونوں کا متفقہ بیان یہ ہے کہ وہ "آدم" تھے، جن کو نبوّت بھی عطا ہوئی تھی (علیہ السّلام)

آدم علیہ السّلام کو اللہ تعالیٰ نے چیزوں کے نام بتا دیئے تھے (قرآن شریف سورۃ آیت)

آدم نے سب مواشیوں اور آسمان کے پرندوں اور ہر ایک جنگلی جانور کا نام رکھا۔ (بائبل ب۲ فقرہ ۲۰)

آدم علیہ السّلام جانتے تھے کہ اُن کا اور تمام کائنات کا پیدا کرنے والا ایک خدا ہے تن تنہا۔ وہ اسی کے پرستار تھے۔

آدم علیہ السّلام کے بدن ہی کے حصّہ سے اس کا جوڑا خدا نے پیدا کیا

یہ سب سے پہلی عورت تھی۔ (قرآن حکیم سورہ نساء رکوع ۱ آیت ۱)

(بائبل پیدائش باب دوم۔ فقرہ نمبر ۲۱، ۲۲، ۲۳)

آدمؑ نے اپنی جورو کا نام حوا رکھا، اس لئے کہ وہ سب زندوں کی ماں ہے اور خداوند خدا نے آدمؑ اور اس کی جورو کے واسطے چمڑے کے کرتے بنا کر ان کو پہنائے۔ (بائبل پیدائش ۳ فقرہ ۲۰، ۲۱)

ان دونوں کے اولاد ہوئی بڑھی پھیلی آدم علیہ السّلام جانتے تھے کہ ان کا اور تمام کائنات کا پیدا کرنے والا خدا ہے۔ جو اکیلا اور تنہا ہے۔ اس کا کوئی شریک یا ساجھی یا مددگار نہیں ہے۔ وہ صرف خدائے واحد کے عبادت گذار اور پرستار رہے۔ آدم علیہ السلام نے کچھ اپنی عقل اور سمجھ سے اور کچھ خدا کے بتانے (الہام) سے خدا کی عبادت کرنے اور دنیا میں زندگی گذارنے کے طریقے سیکھے اور اپنی اولاد کو بتائے۔ آدم علیہ السّلام کی عمر ۹۳۰ برس ہوئی (بائبل پیدائش ۵ فقرہ ۵)

صحیح تعداد تو کسی کو بھی معلوم نہیں۔ البتہ تقاضا رقیاس یہ ہے کہ نو صدیوں کے طویل عرصہ میں آدم علیہ السلام کی اولاد ہزاروں[1] سے آگے بڑھ گئی ہوگی۔ اور باقاعدہ[2] مکانات بھی تعمیر ہونے لگے ہوں گے۔ اور بہت سی آبادیاں بھی ہوگئی ہوں گی۔

ناموراَفراد

اولادِ آدمؑ کی تعداد بڑھی آبادیاں قائم ہوئیں۔ لین دین اور کاروبار شروع ہوا۔ نئے نئے مسائل سامنے آتے رہے۔ بڑے بڑے لوگوں نے ان کو حل کیا۔ ان میں سے چند کے نام ہمیں مذہبی روایات کے ذریعہ معلوم ہوئے ہیں:۔ وَد ۔ سُواع ۔ یَغُوث ۔ یَعُوق ۔ نَسر۔

---

[1] اگر ہر لڑکے کے تین لڑکے مانے جائیں تو ایک آدمی کی اولاد بارھویں پشت میں پونے دو لاکھ ہو سکتی ہے۔ [2] جو تمدن بائبل کی تصریح کے بموجب چمڑے کے لباس سے شروع ہوا تھا وہ سوتی کپڑے تک یقیناً پہنچ گیا ہوگا۔

سب سے پہلی گمراہی یہ لوگ مرتے رہے تو ان کے کارناموں سے سبق لینے کے لئے لوگوں نے اُن کی برسیاں منانی شروع کیں ان کی تصویریں بھی بنالیں تاکہ اُن کا تصور قائم رہے اور اُن کی زندگیوں سے سبق لیا جاتا رہے۔ پھر جب تصویر کشی سے آگے بڑھ کر مورتی بنانے کا آرٹ شروع ہوا تو لوگوں نے اُن کی مورتیاں بنالیں۔ پھر اُن کی پُوجا بھی شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ انہیں کی پُوجا رہ گئی۔ آدم علیہ السّلام کے بتائے ہوئے طریقے ایک ایک کر کے سب ختم ہو گئے ذہنوں میں اُن کا ہلکا سا خاکہ بھی نہیں رہا۔[1]

حضرت نوح علیہ السّلام اس گمراہی کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السّلام کو نبوّت کے لئے منتخب فرمایا۔ حضرت نوح علیہ السّلام کی عمر ایک ہزار سال ہوئی۔ یہ غیر معمولی طویل عمر تبلیغ اور اصلاح کی جدّوجہد اور مصیبتیں اُٹھانے میں صرف ہوئی۔ مگر چند آدمیوں کے علاوہ ساری قوم ایک ہی ڈگر پر چلتی رہی۔

حضرت نوح علیہ السلام کی یہ طویل عمر دنیا کے مستثنیات میں سے ہے۔ اس زمانے میں بھی اتنی لمبی عمر نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے قدرتی بات ہے کہ کئی پشتیں حضرت نوح علیہ السّلام کے سامنے گذریں مگر انسانی ذہن کچھ اس طرح بگڑ گیا تھا کہ بات اُن کے دماغوں میں بیٹھ ہی نہیں سکی کہ ہم جیسے انسان خواہ کتنے ہی بڑے ہو جائیں پُوجا کے لائق نہیں ہو سکتے۔

پرستش کا مستحق صرف خدا رواحد ہے جس نے سارے عالم کو پیدا کیا۔

وہ حضرت نوح علیہ السّلام کی تردید ہی کرتے رہے اور جو اذیتیں پہنچا سکتے تھے برابر پہنچاتے رہے۔

---

[1] بخاری شریف ص ۷۳۲۔ تفسیر سورۂ نوح۔

حضرت نوح علیہ السلام کو جب کئی پشتوں کے بعد یہ یقین ہو گیا کہ وہ پودے جو اچھے پھلوں کے لئے لگائے گئے تھے، جھاڑ بن چکے ہیں، یہ اگر باقی رہے تو کانٹوں کا جنگل بڑھے گا۔ باغ انسانیت پھول اور پھل نہیں لا سکے گا تو انھوں نے مجبور اور بے چین ہو کر بد دعا کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طوفان[1] آیا۔ جس نے تمام قوم کو غرق کر دیا۔ صرف حضرت نوح علیہ السلام اور جو اُن کے ساتھ جہاز پر سوار تھے وہ باقی رہ گئے۔

اس طوفان میں زمین سے بھی پانی اُبلا اور بائبل کی روایت ہے کہ چالیس روز تک دن رات بارش برستی رہی۔ زمین ہی نہیں بلکہ پہاڑوں کی چوٹیاں بھی پانی میں ڈوب گئیں۔ (پیدائش باب ۷، ۸)

طوفان رُکا اور زمین خشک ہوئی تو جو جہاز میں پناہ لئے ہوئے تھے، وہ زمین پر اُترے۔ دوبارہ آبادی شروع ہوئی۔ مگر تمدن کی رفتار اس مرتبہ تیز رہی۔ کیونکہ آباد ہونے والے وہ تھے جو تمدن کی بہت سی منزلیں پہلے ہی طے کر چکے تھے۔

یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اتنا بڑا جہاز بنالیا تھا جس میں وہ اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ، جن میں انسانوں کے علاوہ اور جانداروں کے جوڑے اور اُن کے کھانے پینے کا سامان بھی تھا، کئی ماہ رہ سکے۔

---

[1] یہ زمانہ تاریخ سے بہت پہلے کا واقعہ ہے۔ بائبل سے اس کی کچھ تفصیل معلوم ہوتی ہے۔ قرآن حکیم نے مختصر طور پر اتنا ہی تذکرہ کیا ہے، جتنا تذکرہ نصیحت کرنے اور عبرت دلانے کے لئے ضروری تھا۔ بائبل اور قرآن کے علاوہ دوسری قوموں کی مذہبی روایات میں بھی کسی نہ کسی عنوان سے اس کا تذکرہ ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ انسانی آبادی اسوقت محدود تھی۔ کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام سے چند پشتوں کے بعد ہی یہ طوفان آگیا تھا۔

طوفان کے بعد زیادہ پشتیں حضرت نوح علیہ السّلام کے تین بیٹوں سے چلیں جن کے نام تھے: سام، حام، یافث

لیکن نئی آبادی ایک ہی صوبہ یا ایک ہی ملک میں بند ہو کر نہیں رہی۔ مختلف علاقوں میں پھیلی۔ مثلاً

سام کی اولاد زیادہ تر عرب (مشرق وسطیٰ) میں۔
حام کی اولاد زیادہ تر مصر اور افریقہ میں۔
یافث کی اولاد زیادہ تر الجزائر وغیرہ میں آباد ہوئی۔

یعنی انسانی دنیا جو پہلے ایک ملک میں تھی اب کئی ملکوں میں پھیل گئی۔ وسعت آبادی کے ساتھ ان کی ضرورتوں کا دائرہ بھی وسیع ہوا جس نے تبادلہ اور تجارت کا رواج ڈالا۔ نہریں نکالی گئیں، باغ لگائے گئے۔ پہاڑ کھود کر ان میں محل بنائے گئے۔ دیواروں میں مورتیاں اور طرح طرح کی تصویریں کھود دی گئیں تعلیم کا سلسلہ بھی جاری ہوا۔ اخلاق اور روحانیت کی روشنی بھی پھیلی۔ ملکی نظام بھی قائم ہوا۔ چھوٹی چھوٹی حکومتیں بھی بنیں۔ مگر تمدن کی ترقی کے ساتھ تمدنی امراض بھی پیدا ہوتے رہے۔ ان کی اصلاح کے لئے انبیاء علیہم السّلام آتے رہے۔ مگر کبھی کبھی ان امراض نے ایسی وبائی صورت اختیار کی کہ پوری قوم کو فنا کے گھاٹ اُتار دیا۔

یہ امراض ان تمام قوموں میں پھیلے جن میں تمدن نے ترقی کی۔ ان سب کے نام بتانے مشکل ہیں۔ مگر عربوں کو اپنی خاندانی اور ملکی روایات کے ذریعہ یہ معلوم تھا کہ عاد و ثمود جو بڑی طاقتور قومیں تھیں، کاروباری دھوکہ دینے کے امراض ان میں پیدا ہوئے اور اس طرح ان کی طبیعتوں میں رچ گئے کہ وہ اُن سے نفرت کرنے کے بجائے اُن کو اپنا فن اور اپنا کمال سمجھنے لگے۔

حضرت ھود علیہ السّلام
حضرت صالح علیہ السّلام

جیسے انبیاء علیہم السّلام آئے انھوں نے خداشناسی اور خدا پرستی کی دعوت دیتے ہوئے ان امراض کے ازالہ کی کوشش بھی کی۔ ان قوموں نے اگرچہ صدائے حق پر توجہ نہیں دی۔ جس کے نتیجہ میں وہ برباد ہوگئیں مگر صدائے حق ختم نہیں ہوئی بلکہ وہ انسان کا علمی اور اخلاقی سرمایہ بن گئی۔

عجائب پرستی اور خود فراموشی

تمدن آگے بڑھ رہا تھا، انسانی دماغ کے گوشے کھل رہے تھے۔ نئی نئی تحقیقات سامنے آرہی تھیں مگر خود اپنے بارے میں انسان کی ذہنیت پہلے سے بھی زیادہ پست[1] ہوگئی تھی۔

انسان خود اپنی حقیقت فراموش کرچکا تھا وہ کیا ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو سب سے زیادہ ذلیل اور ہر چیز کو اپنے سے زیادہ بلند اور لائق پرستش سمجھ لیا۔

آسمان کے تارے سب سے زیادہ عجیب تھے، اُس نے اپنے ذہن و فکر کی تمام پونجی انہیں کے سمجھنے اور پہچاننے میں صرف کردی۔ غور و فکر نے عجیب عجیب نتیجے اخذ کئے۔ کچھ اُن میں سے درست بھی ہوتے رہے، یہاں تک کہ بہت سی باتیں جو اٹکل سے سمجھی تھیں اُن کا عقیدہ اور یقین بن گئیں۔

ستاروں کے الگ الگ نام رکھے گئے۔ اُن کی تاثیریں معلوم کی گئیں اور یقین کرلیا گیا کہ حالات زمانہ کا اُتار چڑھاؤ، موسموں کی تبدیلی، قوموں کا عروج و زوال، قسمت کا بگاڑ سنوار۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ اُن کی تاثیروں ہی سے ہوتا ہے۔ یہ تاثیریں

---

[1] پہلے قوم نوح جن ناموروں کی پوجا کرتی تھی وہ انسان تھے اور اب جن عجیب چیزوں کو معبود بنایا گیا اُن کا درجہ انسان سے کم ہے۔

اُن کی اپنی ہیں۔ ان کی خوشی یا ناراضگی سے ان میں تبدیلی ہوسکتی ہے ۔ اُن کی رضامندی حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ خاص خاص موقعوں پر خاص خاص وقت میں اُن کی پوجا کی جائے۔

اس طرح ایک لمبا چوڑا مذہب بن گیا جو انسان کے دماغوں پر حکومت کرنے لگا۔

چاند جس پر بیسویں صدی عیسوی میں اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ تارے، جن تک موجود دنیا کے راکٹ پہنچ رہے ہیں۔ آفتاب جس کے متعلق نئی تحقیق یہ ہے کہ اس جیسے آفتاب اور اس جیسے نظام شمسی خدا جانے کائنات میں کتنے ہیں۔ انہیں چاند تاروں کو معبود اور قابل پرستش سمجھ لیا گیا تھا۔

آفتاب سب سے بڑا تھا اس کو سب سے بڑا دیوتا مانا گیا۔ اور تاروں کو اور درجے دیئے گئے۔ اُن تک پہنچنا مشکل تھا تو اُن کی تاثیر کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی مورتیاں بنائی گئیں۔ اُن کے نام کے شوالے تعمیر کئے گئے اور یہ مورتیاں ان شوالوں میں رکھ کر اُن کی پوجا شروع کردی گئی۔

منطق اور فلسفہ اس وقت بھی تھا۔ اور ہمارے زمانہ کے فلسفیوں سے زیادہ اُن کو اپنے فلسفہ پر ناز تھا۔

ہمارے زمانے میں تحقیقات کا قدم بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ مگر پھر بھی یقین کیا جاتا ہے کہ تحقیقات نامکمل ہے۔ اور خدا جانے کتنی منزلیں ہیں جہاں تک رسائی نہیں ہوئی۔ اور نہیں کہا جاسکتا کہ آخری منزل تک رسائی ہوسکے گی یا نہیں۔

لیکن اس زمانہ کے فلسفیوں کو اپنی تحقیق پر یہاں تک ناز اور غرور تھا کہ مخالفت برداشت نہیں کرسکتے تھے جو اُن کو حقیقت کی راہ بتاتا اس کو گردن زدنی مجرم سمجھتے تھے۔

مار ڈالنا، سولی پر چڑھا دینا، آگ کی بھٹی میں جھونک دینا، سب کچھ اس کے لئے روا تھا جو ان کی بات نہ مانتا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السَّلام

ایران و عرب کے بیچ میں مملکت عراق ہے جس کے ایک جانب خلیج فارس ہے اور دوسری جانب شام و فلسطین۔

یہاں زیادہ تر "حامی" نسل کے لوگ آباد تھے۔ جو "کوش" پسر حام پسر نوح علیہ السَّلام کی اولاد سے تھے۔ اسی خاندان کا بادشاہ بھی تھا، جس کا نام نمرود تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ پہلا بادشاہ تھا۔

کچھ آبادی ان کی بھی تھی جو سام پسر نوح علیہ السَّلام کی اولاد تھے۔

یہ ملک اس زمانہ میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اس کا دارالحکومت بابل تھا جو اس زمانہ کے علوم و فنون کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ بابل کے قریب ایک "اور" شہر تھا جہاں زہرہ، چاند اور سورج کے مندر تھے۔ جہاں صبح و شام پوجا کے لئے یاتری پہنچا کرتے تھے۔

یہیں ایک شخص "تارح" رہا کرتا تھا، جس کا تعلق اولاد سام سے تھا۔ مورتیاں بنانے اور گھڑنے کا کام اس کے یہاں ہوتا تھا اور اس میں اس کو کمال حاصل تھا۔ اسی وجہ سے اس کو آذر کہا جاتا تھا[1]

حضرت ابراہیم علیہ السَّلام اسی کے بیٹے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو عقل سلیم عطا فرمائی تھی۔ انھوں نے وہ بات سوچی جو اس دور میں بالکل اوپری بات تھی۔ اگرچہ آج

[1] تاج العروس و قاموس وغیرہ اور آذر بت کا نام بھی تھا۔ جس کا یہ پجاری تھا اور اس کے نام پر اپنا نام رکھ لیا تھا۔

جانی پہچانی حقیقت معلوم ہوتی ہے مگر اس زمانہ کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روشنی کی کرن کا نظر آجانا سب سے بڑے دیدہ ور اور صاحب بصیرت کا کام تھا۔

یہ چاند تارے جن کو دیوتا کہا جاتا ہے ان پر ہر دن زوال کیوں آتا رہتا ہے تھوڑی دیر کے لئے نکلتے ہیں پھر چھپ جاتے ہیں۔ آفتاب جس کو سب سے بڑا دیوتا کہا جاتا ہے اتنا پابند کیوں ہے۔ راستہ مقرر، گردش کا وقت مقرر۔ صدیاں گذر جاتی ہیں مگر جس مقام اور جس تاریخ پر اس کے طلوع وغروب ہونے کا جو وقت ہے، اس میں فرق نہیں آتا۔ اگر یہ دیوتا ہے تو ایسا جکڑ بند کیوں ہے اور اگر مجبور ہے تو دیوتا بننے کے قابل نہیں اس کی پوجا غلط ہے۔

یقیناً یہ خدا نہیں ہے۔ خدا کوئی اور ہے جس نے پوری کائنات کا یہ کارخانہ قائم کیا جس کا ایک پُرزہ یہ آفتاب ہے۔ مجھے اسی خدا کی عبادت کرنی چاہیئے۔ اپنی پوری ہستی۔ اپنا مرنا اور جینا اور اپنا تمام کام اسی کے لئے کردینا چاہیئے۔ صرف اسی کا ہوجانا چاہیئے اور صرف اسی کا بن کر رہنا چاہیئے"۔

یہ فطری الہام کا نور تھا۔ جو ذہنِ ابراہیم پر چمکا (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق فرمائی۔ اُن کو نبوت و رسالت کے منصب عظیم سے نوازا۔ ان کے مسلک کو دین حق اور آنے والے تمام مذہبوں کا اساس اور بنیادی نقطۂ نظر قرار دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تبلیغ شروع کی تو پوری قوم بھڑک اٹھی۔ خود اُن کا باپ اُن کا دشمن ہوگیا۔ بہت سے مناظرے اور مباحثے ہوئے۔ براہ راست بادشاہِ وقت سے مناظرہ ہوا۔ اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام پہاڑ سے بھی زیادہ ثابت قدم ثابت ہوئے تو طے کرلیا گیا کہ آگ کا جہنم بنا کر ان کو اس میں جھونک دیا جائے۔

سرکاری طور پر قومی حیثیت میں اس سزا کو جاری کرنے کا انتظام کیا گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو آگ کے دہکتے ہوئے جہنم میں جھونک دیا گیا مگر جس خدا نے ان کو عظیم الشان خدمت کے لئے پیدا کیا تھا اُس نے اپنی قدرت کا نمونہ دکھایا' نارِ نمرود کو گلزارِ ابراہیمؑ بنا دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام صحیح سالم اس جہنم سے نکل آئے۔ اُن کے کسی ایک بال پر بھی آنچ نہیں آئی۔ لیکن جو قوم خود اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لے تو اس کو کون کھول سکتا ہے۔

اس کھلے معجزے کے بعد بھی قوم کے انداز میں فرق نہیں آیا تو حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے وطن اور قوم کو خیر باد کہا۔ کہ کسی جگہ پہنچکر یادِ خدا کریں۔ ان کے ساتھ اُن کی بیوی "سارہ" تھیں۔ بھتیجا حضرت لوط علیہ السّلام اور اُن کی بیوی۔

یہ قافلہ منزلیں طے کرتا ہوا فلسطین پہنچ گیا اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ مصیبتیں اب بھی پیش آتی رہیں۔ ایک مرتبہ قحط سخت پڑا۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور ان کی اہلیہ مصر پہنچے، وہاں بھی اُن کی آزمائش ہوئی۔ مگر پھر بادشاہ ان سے متاثر ہوا۔ یہاں تک کہ اپنی لڑکی ہاجرہ کو اُن کی زوجیت میں دیدیا اور بہت کچھ ہدیئے، تحفے دیکر اُن کو رخصت کیا۔ ان دونوں بیویوں سے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے دو لڑکے ہوئے۔ اسمٰعیل (علیہ السّلام) حضرت ہاجرہ سے اور اسحاق (علیہ السلام) حضرت سارہ کے بطن سے۔

یہودیوں، عیسائیوں اور عربوں میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی شخصیت مسلم تھی حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو مورثِ اعلیٰ بھی مانتے تھے اور اپنے دین و مذہب کا بانی بھی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ہی کو مانتے تھے۔

آریائی نسل میں "برھما" یا "برھم" کی شخصیت مسلّم تھی لیکن یہ کون تھے اور آریا

کہاں سے آئے۔ یہ تحقیق طلب ہے۔

اگر ان کا نشو و نما ایران سے ہوا ہے تو حضرت ابراہیم کا وطن بھی ایران کے قریب عراق میں تھا۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام اور خانہ کعبہ

ستارہ پرستوں نے ستاروں کے نام پر شوالے اور مندر بنا رکھے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے ستاروں کے خالق اور تمام کائنات کے پروردگار خدا رواحد کے نام پر مسجدیں بنانی شروع کیں۔

پہلے اپنے فرزند ارجمند حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کو ساتھ لیا اور اس مقام پر خانہ خدا کی تعمیر کی جہاں سب سے پہلے انسان (حضرت آدم علیہ السّلام) نے خدا کا گھر بنایا تھا جس کو کعبہ کہا جاتا ہے۔

آدم علیہ السّلام کی بنائی ہوئی یہ مسجد اگرچہ خاص اس مقام پر تھی جس کا درجہ کائنات روحانیت میں بہت بلند مانا جاتا ہے، وہ تجلی گاہ ربّ العالمین ہے لیکن کئی صدی پہلے جب طوفانِ نوحؑ آیا تھا تو یہ مسجد منہدم ہو کر ایک سُرخ ٹیلے میں دب گئی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے ٹیلے کو کاٹ کر یہ بنیادیں برآمد کیں اور ان پر خانہ کعبہ تعمیر کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام جب یہ تعمیر کر رہے تھے تو ساتھ ساتھ اپنے رب اور مالک کی بارگاہ میں گڑگڑا کر یہ دعا بھی کر رہے تھے:

" اے ہمارے رب ہماری یہ خدمت قبول فرما۔ خداوندا تو دُعائیں سُنتا ہے تو سب باتوں کو جانتا ہے (سب کے دلوں کا حال تجھے معلوم ہے)
اے ہمارے رب ہمیں اپنا حکم بردار بنا اور ہماری اولاد میں بھی

ایک اُمّت پیدا کر جو تیری فرماں بردار ہو۔

اے ہمارے رب اے ہمارے پروردگار ہمیں عبادت کے طریقے بتائے اور ہماری جو کوتاہیاں ہیں اُن کو معاف فرما۔ بے شک تو ہی معاف کرنے والا مہربان ہے۔

اے ہمارے رب ہماری اولاد (نسل) میں ایسا رسول پیدا کر جو خود اُنہیں میں کا ہو (انہیں کے خاندان اور نسل کا ہو) جو اُن کے سامنے تیری آیتیں پڑھے اور اُن کو سکھائے کتاب اور حکمت (دانش اور بصیرت کی باتیں) اور ان کو سنوارے (دیندار، مہذّب اور با اخلاق بنائے) تو ہی ہے غالب اور زبردست حکمت والا۔"

(سورۂ بقرہ ۲ آیات ۱۲۶ - ۱۲۹)

حضرت ابراہیم علیہ السّلام، حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کو بچپن ہی میں یہاں لے آئے تھے۔ حضرت ہاجرہ ساتھ تھیں۔ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کو اسی جگہ آباد کر دیا تھا، جہاں بعد میں خانہ کعبہ بنایا اور اس وقت دعا کی تھی:

"اے ہمارے رب میں نے اپنی کچھ اولاد اس (بنجر) میدان میں جہاں کھیتی کا نام و نشان نہیں ہے تیرے واجب الاحترام گھر کے قریب آباد کر دی ہے، مقصد یہ ہے کہ وہ نماز قائم کریں۔

(سورۂ ابراہیم رکوع ۶)

یہیں سے مکہ کی آبادی شروع ہوئی اور اسی کے قریب "منیٰ" مقام پر وہ واقعہ پیش آیا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے الہامی خواب کی بنا پر اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کو اللہ کے نام پر قربان کرنے کا ارادہ کیا باپ اور بیٹے دونوں نے آنکھیں بند کر کے اُن کے اوپر پٹیاں کس لیں کہ فطری محبّت کی تڑپ ہچکچاہٹ نہ پیدا کرے۔

بیٹا بخوشی راہِ خدا میں قربان ہونے کے لئے لیٹ گیا اور باپ نے گلے پر چھری چلائی۔ مگر جب اپنی قربانی کو دیکھنے کے لئے آنکھوں سے پٹی کھولی تو قربان ہونے والا بیٹا الگ کھڑا تھا۔ سامنے ایک ذبح شدہ دُنبا تھا اور یہ بشارت سُنائی جا رہی تھی کہ

"یہ بہت بڑا امتحان تھا جس میں تم دونوں کامیاب ہوئے تم پر ہمیشہ ہمیشہ سلام ہو، جو نیکوکار ہوتے ہیں ہم اُن کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔" (سورۂ صافات)

حضرت اسحاق علیہ السّلام

حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے دوسرے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السّلام کو شام میں آباد کیا۔ یہاں بھی خانۂ خدا بنایا جس کو یروشلم کہا جاتا ہے۔

حضرت اسحاق علیہ السّلام کے مشہور فرزند حضرت یعقوب (علیہ السّلام) ہوئے جن کا نام اسرائیل بھی تھا۔ انہیں کی اولاد بنواسرائیل کہلائی۔ کئی ہزار برس تک بنواسرائیل وہ منتخب قوم رہی کہ جن میں نبیوں اور رسولوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ جو تبلیغ و اصلاح کے فرائض انجام دیتے رہے۔

حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت ایوب، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ (علیہم الصلوات والتسلیمات) انہیں میں سے ہوئے۔

بنواسرائیل مصر میں

حضرت یوسف علیہ السّلام کے گیارہ بھائی اور بھی تھے۔ مگر باپ (حضرت یعقوب علیہ السّلام) کو حضرت یوسف علیہ السّلام سے زیادہ محبت تھی۔ بھائیوں کو اس پر رشک ہوا۔

اُنھوں نے حضرت یُوسف علیہ السّلام کو جنگل میں لے جا کر ایک اندھے کنوئیں میں ڈال دیا جس میں پانی نہیں تھا۔ اس طرف سے گذرنے والے قافلے کا ایک آدمی اس کنوئیں پر پانی بھرنے آیا۔ وہاں پانی کے بجائے یہ خوبصورت لڑکا مل گیا۔ اس نے اس کو غلام بنا لیا اور مصر لیجا کر فروخت کر دیا۔ جوان ہوئے تو مالک کی عورت اُن پر فریفتہ ہو گئی۔ مگر جب یہ ہر طرح پاکدامن رہے تو سازش کر کے اُن کو جیل میں ڈلوا دیا۔ بادشاہ نے خواب دیکھا جس کی تعبیر حضرت یوسف علیہ السّلام نے یہ دی کہ مصر میں سات سال قحط پڑے گا اور اس سے پہلے سات سال اچھی پیداوار ہوگی۔

قحط کی تباہی سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ کاشت زیادہ سے زیادہ کی جائے اور جو غلّہ پیدا ہو اس کو صاف کئے بغیر اسی طرح بالوں سمیت اسٹاک کیا جاتا رہے۔ اس طرح کیڑا نہیں لگے گا۔ پھر قحط کے زمانے میں احتیاط سے تقسیم کیا جائے۔ تو نہ صرف مصر بلکہ شام والوں کے لئے بھی کافی ہو جائے گا۔

بادشاہ اس تعبیر سے مطمئن ہوا۔ اس نے حضرت یوسف علیہ السّلام کو جیل سے رِہا کرا کر بات چیت کی۔ حضرت یوسف علیہ السّلام کی گفتگو سے بادشاہ یہاں تک متاثر ہوا کہ ان کو اپنا وزیر بنا لیا۔ اور یہ تمام معاملہ اُن کے سُپرد کر دیا، جس کو انھوں نے ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ یہ سات سالہ قحط کا ہولناک زمانہ اطمینان سے گذر گیا۔ اور مصر کے علاوہ شام کے باشندے بھی آسودہ رہے۔

اس وقت حضرت یوسف علیہ السّلام نے اپنے والد اور سب بھائیوں کو مصر میں بُلا لیا۔

یعقوب علیہ السّلام کی اولاد (بنو اسرائیل) تقریباً چار سو سال تک یہاں رہی۔ لاکھوں تک اُن کی تعداد پہنچ گئی۔ اوّل یہ امن اور اطمینان سے رہے پھر مصر کے اصل باشندوں نے ان کو ستانا شروع کر دیا اور اُن کو غلام بنا لیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام

اب ہم ایک نئے دور میں داخل ہو رہے ہیں۔ تمدن کافی ترقی کرچکا ہے۔ بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوگئی ہیں۔ ان میں ملوکیت اور بادشاہت کی پوری خوبو ہے۔ بادشاہوں کی کیبنٹ یا مجالس ہیں وزرار بھی ہیں، بڑے بڑے جاگیردار بھی ہیں جن کے نظام میں کاشتکاروں کی وہی حیثیت ہے جو ہل چلانے والے مویشی کی۔ کاشتکاروں کی قسمت گاؤں کی زمینوں کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ گاؤں فروخت ہوتا ہے تو اس کے ساتھ کاشتکار بھی فروخت ہوتے ہیں۔

بیگار لینے کا طریقہ بھی شباب پر ہے۔ بڑے بڑے پونجی پتی بھی ہیں جن کے یہاں بے شمار دولت ہے۔ بادشاہت کا عروج یہ ہے کہ کہیں بادشاہ کو خدا کا کہیں سب سے بڑے دیوتا کا اوتار اور مظہر سمجھا جاتا ہے۔

کاہنوں اور ساحروں کا یہ کام ہے کہ وہ بادشاہ کی پوجا کا فلسفہ ذہنوں میں بٹھاتے رہیں۔ ابھی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے پیدا ہونے میں تقریباً ڈیڑھ ہزار سال باقی ہیں۔ تاریخ نے قلم ہاتھ میں لے لیا ہے۔ مگر اسے کاغذ میسر نہیں آیا۔ پتھروں پر یا کسی دھات کی پلیٹ پر اہم اور غیر معمولی واقعات اور بادشاہوں کے حالات کندہ کردیئے جاتے ہیں۔

مصر کے باشندے مختلف دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ بڑا دیوتا سورج تھا جسے اَرَعْ کہتے تھے اور چونکہ بادشاہ کو اس کا اوتار سمجھتے تھے اس لئے اس کا لقب فارع عبرانی میں فاراعو اور عربی میں فرعون ہوگیا۔[1]

کہتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے زمانے میں جو مصر کا بادشاہ تھا۔ وہی سب سے

---

[1] ترجمان القرآن ص۲۰ جلد ۲

پہلا فرعون تھا۔ پھر خاندان بدلتے رہے۔ مگر تقریباً ڈھائی ہزار برس تک شاہان مصر کا خطاب فرعون ہی رہا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ سے گھٹا ٹوپ اندھیری میں ایک روشنی نمودار ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اس روشنی میں چلتی رہی۔ مگر ستارہ پرستی جو جمہور کا مذہب ہوگیا تھا وہ ختم نہیں ہوا۔

اس زمانہ میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں بنواسرائیل پر فرعون کا ظلم انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ تمام بنی اسرائیلی فرعون اور اس کی قوم کے غلام تھے۔ ان سے کاشت کرائی جاتی۔ سخت سخت بیگاریں لی جاتیں اور اُن کی طاقت کو قابو میں رکھنے کے لئے جب ضرورت سمجھی جاتی نسل کشی بھی کرادی جاتی۔ یعنی لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کرادیا جاتا اور لڑکیوں کو باندی بنانے کے لئے زندہ رکھ لیا جاتا تھا۔

اس لرزہ خیز جبر و قہر کے زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی والدہ کے دل میں ڈال دیا کہ جب وہ خطرہ محسوس کریں تو بچہ کو صندوق میں بند کرکے دریائے نیل کے بہاؤ پر ڈالدیں۔

ان کی والدہ نے ایسا ہی کیا۔ فرعون کا محل لب دریا تھا۔ جب صندوق بہتا ہوا محل کے قریب پہنچا تو اس کو نکال لیا گیا۔ فرعون کی بیوی کے سامنے یہ بچہ پیش ہوا تو اُس کو محبت آئی اُس نے اپنی پرورش میں لے لیا۔

دودھ پلانے کے لئے ماں کی تلاش ہوئی تو حضرت موسیٰؑ کی بہن جو صندوق کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچ گئی تھیں اُنھوں نے اپنی ماں کا نام لے دیا جو حضرت موسیٰؑ کی والدہ تھیں۔ اس طرح شاہی نگرانی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش ہوئی اور خاص اس بادشاہ کے محل میں وہ جوانی تک پہنچے۔ جس کے خلاف انقلاب برپا کرنے کے

لئے ان کو پیدا کیا گیا تھا۔

مگر موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے قلب بیدار عطا فرمایا تھا۔ شعور کی پہلی ہی منزل میں جذبۂ خدا پرستی کے ساتھ ایک مظلوم مخلوق کی ہمدردی کا جذبہ بھی ابھرا۔ انھوں نے ستم رسیدہ بنی اسرائیل کی حمایت شروع کی، فرعون اور اس کی قوم کو خدا پرستی کی دعوت دی اور وہ تمام مصیبتیں جھیلیں جو ایک منظم سلطنت کے ایسے متکبر اور جبار بادشاہ کی طرف سے پہنچ سکتی ہیں۔ جو ظلم و ستم اور جبر و قہر کی ایسی بدترین مثال ہو۔ کہ اس کی وجہ سے لفظ فرعون قابلِ نفرت بن گیا ہو۔

مطالبہ یہ نہیں تھا کہ سلطنتِ مصر موسیٰ یا اُن کی قوم بنی اسرائیل کے حوالے کر دی جائے، یا ملک مصر میں اُن کے کچھ حقوق محفوظ کر دیئے جائیں۔ مطالبہ صرف یہ تھا کہ اُن کی غلامی کی زنجیریں صرف اتنی ڈھیلی کر دی جائیں کہ وہ ملک مصر سے نکل کر اپنے پرانے وطن (شام) چلے جائیں۔ جہاں حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق علیہما السلام نے زندگیاں گذاری تھیں۔

لیکن جن جاگیرداروں اور دولت مندوں کو ان بیگاریوں سے فائدہ پہنچ رہا تھا وہ اپنا مفاد خود اپنے ہاتھوں کس طرح تباہ کر سکتے تھے۔ مدت گذر گئی۔ سخت ترین کشمکش جاری رہی۔ بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ربِّ موسیٰ کا حکم ہوا کہ ایسا انتظام کرو کہ پوری قوم ایک ہی رات میں سمندر کی طرف روانہ ہو جائے۔

بنو اسرائیل نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ لیکن جیسے ہی فرعون کو علم ہوا اس نے فوج کو تیاری کا حکم دیا اور تیزی سے اُن کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔

توریت کے بیان کے بموجب اس وقت بنو اسرائیل کی تعداد چھ لاکھ تھی۔ مگر کئی پشتوں کی غلامی نے اُن کی ہمتیں اتنی پست کر دی تھیں کہ جیسے ہی انھیں فرعون کی فوج نظر آئی گھبرا گئے اور واویلا کرنے لگے۔ مگر وہ ارحم الراحمین جو اس مظلوم قوم کو

نجات دلانے اور ظالم کو تباہ کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ اس نے اپنی قدرت کا عجیب نظارا کرایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ دریا پر اپنا عصا ماریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جیسے ہی اس حکم کی تعمیل کی دریا کا پانی کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا اور بیچ میں (بروایت توریت) بارہ راستے ہوگئے۔

بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے اپنے تمام سامان اور مویشیوں کے ساتھ ان راستوں سے گذر کر پار ہوگئے۔

فرعون پہنچا تو اس نے اپنی فوجیں ان راستوں پر دوڑا دیں لیکن جب یہ فوجیں بیچ دریا میں پہنچیں تو پانی کے ٹکڑے جو پہاڑ کے تودوں کی طرح کھڑے ہوئے تھے جڑ گئے، پوری فوج غرق ہوگئی۔

فرعون کی موت وہیں آئی مگر اس کی لاش کو دنیا کی عبرت کے لئے بچا لیا گیا جو تقریباً ساڑھے تین ہزار سال گذر جانے کے بعد بھی اب تک مصر کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔

توریت کا نزول

حضرت ابراہیم علیہ السلام وران کے علاوہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کو بھی دستور العمل کے طور پر ہدایتیں دی گئیں۔ مگر ان کی حیثیت کتابچوں کی تھی۔ لیکن اب تمدن اتنا آگے بڑھ چکا تھا کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کے ہر میدان میں اس کی شاخیں پھیل گئی تھیں۔

اب ایسے دستور العمل کی ضرورت تھی جو روحانی ترقی کا ضامن ہو تو دنیاوی زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے بھی وہ رہنما ہو۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وہ کتاب نازل کی گئی جس کو توریت یا بائبل کا عہدِ قدیم کہا جاتا ہے اور بنواسرائیل کو ہدایت کی گئی کہ اس پر پورے استقلال اور مضبوطی سے عمل کریں اس میں اُن کا دنیوی مفاد بھی ہے اور دینی فلاح بھی۔

بنواسرائیل ایک عرصہ تک اس پر عمل کرتے رہے تو وہ دینی لحاظ سے بھی دنیا کی تمام قوموں میں سب سے افضل اور بہتر رہے اور دنیاوی لحاظ سے بھی یہاں تک ترقی کی کہ حضرت داؤد (۹۶۲ ق م) اور حضرت سلیمان (۹۳۲ ق م) علیہما السلام جیسے فرماں روا ان میں ہوئے جو نبی بھی تھے اور بہت کامیاب حکمراں بھی۔

اُن کا یہ دور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے تقریباً نوسو برس پہلے تھا۔ مگر پھر بنی اسرائیل میں حرص، طمع و خود غرضی، مکر و فریب جیسے امراض بڑھے مظالم کی کثرت ہوئی تو اُن پر ایک تباہی آئی۔

کلدانی بادشاہ بخت نصر (تاجدار بابل) نے حملہ کرکے ان کے ملک شام کو تباہ کر دیا۔ یروشلم میں ہیکل سلیمانی کو شہید کیا۔ شہر میں آگ لگا دی۔ گھروں میں گھس کر جان، مال، ناموس سب کو برباد کیا، توریت کے نسخے بھی جلا ڈالے۔

بنواسرائیل خالی ہاتھ رہ گئے تو اس زمانہ کے نبی حضرت عُزیرؑ (عزرا) نے اپنی یاد سے توریت کو دوبارہ مرتب کیا۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے تقریباً چھ سو برس پہلے کا واقعہ ہے۔ اس تباہی کے بعد بنواسرائیل جو اَب یہود کے نام سے مشہور ہو گئے تھے کچھ سنبھلے۔ مگر کچھ عرصہ بعد ہی ان میں وہ خرابیاں پھر لوٹ آئیں۔ ان کے علماء اور مفتی صاحبان بھی عوام کے رنگ میں رنگ گئے۔ اغراض پرستی ان کا دھرم ہو گیا۔

یہاں تک کہ توریت کے احکام میں بھی اپنی اغراض کے بموجب تبدیلی کر دی

لہ اعلام القرآن ص۱۳۸ (اعلام القرآن از مولانا عبدالماجد دریابادی)

دلوں کی سختی یہاں تک بڑھی کہ سمجھانے والوں کو وہ اپنا دشمن سمجھتے تھے ۔ جو نبی آتے رہے اُن کو ستاتے رہے، یہاں تک کہ بعض کو شہید کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو بطنِ مریم سے پیدا کیا۔ ان کا مقصد بنو اسرائیل کی اصلاح تھا۔ اُن پر انجیل نازل ہوئی۔ جو گویا توریت کا تکملہ تھی جس میں کچھ احکام نئے تھے باقی پوری انجیل توریت کی وضاحت اور اس کے اصل احکام کی تصدیق و تائید تھی اور ان خرابیوں کی اصلاح تھی جن کو یہود جزو مذہب اور قومی خصلتیں بنا چکے تھے۔

مگر یہود نے کوئی اثر نہیں لیا۔ بلکہ اپنی قومی خصلتوں کے بموجب وہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے درپئے ہوگئے۔ اور بغاوت کا الزام لگا کر ایک رومی عدالت سے اُن کے لئے سولی کا حکم دلوا دیا۔

عدالت کا فیصلہ جاری کیا گیا۔ سولی دی گئی۔ لیکن سولی پر کون چڑھا۔ یہودی پوری سینہ زوری سے یہی کہتے رہے کہ ہم نے حضرت مسیح بن مریم رسول اللہ کو قتل کرا دیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی قدرت کا کرشمہ دکھایا۔ آیاتِ قرآنی کی روشنی میں مسلمانوں کا یقین یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو اللہ تعالیٰ نے اوپر اٹھا لیا اور صبح کے جھٹ پٹے میں سولی دینے والوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے دھوکے میں ایک یہودی کو سولی پر چڑھا دیا۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے مشابہ تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے ماننے والے بہت تھوڑے تھے۔ انہیں کے ذریعہ ان کے دین کی اشاعت ہوئی۔ مگر یہودیوں میں جو بری خصلتیں پیدا ہوگئی تھیں، ان میں کمی نہیں آئی وہ دن بدن بڑھتی رہیں۔

نظریات میں تلاطم اور تصادم

توریت نے صرف خدا اور آخرت کے بارے میں عقائد کی تلقین نہیں کی تھی بلکہ دنیا کی معاشی اقتصادی

اور سیاسی زندگی کے متعلق بھی ضابطے بنائے تھے اور نظریات کی تلقین کی تھی۔ پھر بنو اسرائیل کی حکومتیں قائم ہوئیں اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام جیسے حکمراں ہوئے تو ان نظریات پر بھی عمل ہوا۔ اور ان کی شہرت یہاں تک ہوئی کہ متمدن دنیا کے لئے بحث و نظر اور تحقیق و تفتیش کا موضوع بن گئے دوسری طرف فلسفہ بھی انسانی دماغوں پر حاوی ہوتا رہا۔

اور جس طرح داؤد اور سلیمان علیہما السلام بنو اسرائیل میں عظیم الشان فرمانروا تھے، دوسری قوموں اور ملکوں میں بھی بڑے بڑے بادشاہ اور راجہ ہوئے۔ انھوں نے دستور اور قانون بنائے ان میں سے رُوم کے قانون نے ہمہ گیر شہرت حاصل کی۔

برہمنوں کا فلسفہ ہندوستان میں پہلے سے موجود تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام سے چار پانچ سو سال پہلے بودھ اور مہا بیر جیسے رہنما ہندوستان میں ہوئے، جنھوں نے سیاسی اقتدار کے ساتھ اپنی قوم کو قانون اور فلسفہ بھی دیا۔

اس طرح یہ تو ہوا کہ انسان کی ذہنی اور فکری صلاحیت نقطۂ عروج پر پہونچ گئی۔ مگر خرابی یہ تھی کہ ان تمام فلسفوں اور قانونوں کا مدار صرف عقل اور قیاس پر تھا۔ عقلی دلائل اور قیاسی نتائج دماغوں کو متاثر تو کر سکتے ہیں مگر دلوں کو مطمئن نہیں کر سکتے۔ اور اگر یہ فلسفے ایک دوسرے سے مختلف اور متصادم بھی ہوں تو بے اطمینانی اور اضطراب اور بڑھ جاتا ہے اور ایک طالب حق حیران اور سرگردان ہو جاتا ہے کہ حق کس کو سمجھے، یا پھر اپنی عقل کی پرستش شروع کر دے کہ جو اچھا معلوم ہو وہ اختیار کرے۔
ان مختلف فلسفوں کا اثر بنو اسرائیل پر بھی ہوا۔

توریت کے ماننے والے پہلے ہی توریت کی تعلیم کو اپنی اغراض کے قالب میں ڈھال چکے تھے۔ کچھ عرصہ بعد انجیل کے ماننے والوں نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا

یہاں تک کہ توحید کی سیدھی تعلیم کو تثلیث کے تاروں میں الجھا دیا۔

بہت بڑی مصیبت یہ تھی کہ ہر ایک نے اپنا اپنا دائرہ الگ بنا لیا تھا وہ دائرہ ہی عظمت اور تقدس کا مستحق تھا۔ عمل خواہ کچھ ہو، عقیدہ خواہ کتنا ہی غلط ہو، لیکن جو اس دائرہ میں ہے، وہ خدا کا چہیتا ہے، فرزندِ خدا ہے۔ پاکی اور بلندی اسی کا حصّہ ہے جو اس دائرہ سے باہر ہے وہ ناپاک ہے، پست اور ذلیل ہے۔ علم کا دریا جس کا کوئی کنارا نہیں، اس کو بھی انہی دائروں کی چھولکیوں اور تالابوں میں بند کر دیا تھا۔

اس وقت دنیائے انسانیت حیرت زدہ تھی، انسان اپنا مقصد فراموش کر چکا تھا۔ کوئی اپنی پیشانی ذلیل سے ذلیل چیز کے سامنے رگڑتا اور کوئی اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگتا تھا۔ کہیں دہریت تھی جس میں خدا سے انکار تھا۔ کہیں عقل پرستی کہیں مشتبہ تعلیم جس میں کھرے کھوٹے اور اصل اور بناوٹ کا پتہ چلنا مشکل تھا۔ ایک طالبِ حق ماہیٔ بے آب کی طرح بیتاب پھرتا تھا۔ مگر اطمینان کی سیرابی اُس کو میسّر نہیں آسکتی تھی یہ مصیبت پوری دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔

فطرتِ انسانی صحیح رہنمائی کے لئے مضطرب تھی۔ وہ ایسے نور کی تمنّا کر رہی تھی جس کی روشنی ایک ایک کونے کی تاریکی کو اُجالا بنا دے۔

وہ ارحم الرحمین کے سامنے گڑگڑا رہی تھی کہ ایسا دستور عطا فرما جس سے نوعِ انسان کا ہر طبقہ فیض پا سکے۔ اور جملہ اقوام عالم کے لئے وہ رحمت بن سکے۔

رحمۃ للعالمین کی آمد

ارحم الرحمین نے مضطرب فطرت کی التجا سُنی اور نوعِ انسان کے تمام طبقات پر رحم کرنے کیلئے ایک ایسا نبی مبعوث فرمایا جسکی بعثت کا مقصد ہی یہ قرار دیا کہ تمام اقوام عالم پر رحمت ہو، سارے جہان اسکے لطف و کرم سے فیضیاب ہوں اُس کو ایسا مکمل ضابطۂ حیات دیدیا جو دینی اور دنیاوی کامیابیوں کا ضامن اور کفیل ہے اور یقین دلا دیا کہ یہ ضابطہ، یہ دستور اساسی ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گا اور انسان کو ایسی

مصیبت کبھی نہیں برداشت کرنی پڑے گی کہ طالبِ حق مضطرب ہو اور اُس کو نورِ حق کی جھلک نظر نہ آئے۔

دلیلِ صداقت پہلی دلیل خود اس نبی کی زندگی تھی۔ کیا ایسا شخص جھوٹ بول سکتا ہے، دھوکا دے سکتا ہے جس کی پوری زندگی پاکبازی، سچائی، امانت داری، نیک دلی، اعلیٰ اخلاق اور شریفانہ خصلتوں کی حسین تصویر اور نہایت صاف و شفاف آئینہ رہی ہو اور کیا اس خدا کے نام پر جھوٹ بول سکتا ہے جس کی عظمت اور بڑائی اس کے دل میں بچپن سے گھبی ہوئی ہے اور جس کے جلال و جبروت سے وہ ہر وقت ڈرتا رہتا ہے۔

(۲)

دوسری دلیل قرآن شریف ہے جو صرف اس نبی کو دیکھنے والوں کے لئے نہیں بلکہ دنیا کے ہر انصاف پسند طالبِ حق کے لئے ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی دلیل ہے۔

قرآن، کسی انسان کا بنایا ہوا کلام نہیں ہے، یہ اللہ کا کلام ہے جو بلا کسی ردّ و بدل اور بلا کسی تبدیلی کے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوا۔ اور جس طرح یہ یقینی بات ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں، ایسے ہی یہ بھی یقینی بات ہے کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے کیونکہ یہ اگر اللہ کا کلام نہیں ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی انسان کا بنایا ہوا کلام ہے تو تمام دنیا کو چیلنج ہے کہ اس جیسا کلام بنا کر پیش کر دے۔

پورا قرآن شریف مقابلہ پر نہ پیش کر سکیں تو اس کا کوئی حصہ ہی پیش کر دیں۔ قرآن شریف میں ایک سو چودہ سورتیں ہیں۔ ایک سو چودہ نہیں صرف دس سورتیں پیش کر دیں، دس سورتیں نہ پیش کر سکیں صرف ایک سورت اس جیسی بنا کر پیش کر دیں۔ اور اگر نہ پیش کر سکیں تو یہ یقین کر لیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔

اور جو کچھ اس میں انسان کی موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کی فلاح و بہبود کے

لئے کہا گیا ہے اور مخالفت کی صورت میں جس عذاب، بربادی اور تباہی کی خبر دی گئی ہے، وہ سب حق ہے، اس کی مخالفت حق کی مخالفت ہے جس کی سزا تباہی، بربادی اور دائمی عذاب ہوتی ہے۔

جو کتابیں الہامی یا آسمانی مانی جاتی ہیں وہ اپنی اصلی زبان میں نہیں رہیں۔ یا اس زبان کے بولنے والے نہیں رہے، لیکن قرآن حکیم جس زبان میں نازل ہوا، بجنسہ اپنی اسی زبان میں انھیں لہجوں اور طرز تلاوت کے ساتھ موجود ہے۔ اور جس زبان میں نازل ہوا، وہ بھی موجود ہے، اسکے بولنے والے مسلم اور غیر مسلم کروڑوں، اُسکا ادب زندہ، اس کے ادب ترقی پذیر، مگر قرآن پاک جس طرح زمانۂ نزول میں معجزہ تھا، آج بھی معجزہ ہے۔ عربی ادب میں اس کو آج بھی وہ مقام حاصل ہے کہ بڑے بڑے ادیب اس کے فقروں اور جملوں سے اپنے کلام آراستہ کرتے ہیں، کسی بھی ادبی مضمون میں اس کی کوئی آیت آجاتی ہے تو پورے کلام میں جان ڈال دیتی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن حکیم کی تعلیم کو دیکھو وہ تعلیم خود اپنی صداقت اور سچائی کی دلیل آپ ہے۔ پوری تعلیم اس کتابچہ میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ صرف بنیادی تعلیمات کا خلاصہ چند نمبروں میں پیش کیا جارہا ہے۔

غور کیجئے، کیا اس سے بہتر مقدس، اس سے زیادہ سچی کوئی تعلیم ہوسکتی ہے۔ اور کیا اس کے پیش کرنے والے کے تقدس پر کوئی شبہ کیا جاسکتا ہے۔

(۱)
توحید

یہ مضامین جو ذیل کے نمبروں میں پیش کئے گئے ہیں، قرآن حکیم میں ان کو بار بار دُہرایا گیا ہے۔ قدرتی مشاہدات تاریخ کے مسلمہ واقعات اور خود انسان کے فطری احساسات سے نہایت مؤثر اور بلیغ انداز میں استدلال

کیا گیا ہے ہم نے تمام آیتوں کا حوالہ نہیں دیا بلکہ کسی آیت یا دو آیتوں کے حوالے کو کافی سمجھا ہے۔

اللہ ایک ہے وہ بے نیاز ہے۔ کسی کی اُس کو ضرورت نہیں ہے ہر ایک ضرورت اور احتیاج سے وہ پاک ہے، اس کے اولاد نہیں، نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ نہ کوئی اس کا ہمسر اور اُس کے برابر ہے۔

(سورۂ اخلاص ۱۱۲)

اُس کو کسی کے ساتھ تشبیہ نہیں دی جا سکتی، کیونکہ اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ کوئی چیز اُس کے مثل نہیں ہے۔ (سورۂ شوریٰ ۴۲)

نگاہیں اسے نہیں پا سکتیں، وہ تمام نگاہوں کو پا رہا ہے وہ بڑا ہی لطیف اور ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے۔

(سورۃ الانعام ۶ آیت ۱۰۲)

اسی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمینوں پر، وہی حیات دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ وہی ہر چیز پر قادر ہے، وہی پہلے ہے اور وہی پیچھے، وہی ظاہر ہے اور وہی مخفی ہے اور وہی ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے۔ (سورۂ حدید ۵۷ آیت ۱ و ۲)

(۲)

جتنے نبی اور رسول آئے ان سب کی تصدیق کرو اور ایمان لاؤ

ہر قوم کے لئے رہنما ہوئے ہیں۔ (سورۂ رعد ۱۳ آیت ۷)

ہر ایک اُمت (انسانی گروہ۔ قوم) میں نبی گذرے ہیں۔

(سورۂ فاطر ۳۵ آیت ۲۴)

جتنے نبی گذرے ہیں، بلا تفریق سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔
سورۂ بقرہ ع۲ آیت ۱۳۶ (خلاصہ) آیت ۲۸۵ (خلاصہ)

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ سورۂ آل عمران ع۳ آیت ۸۴ (خلاصہ)

وہ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ان میں سے بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ (سورہ نساء ع۲۱ آیت ۱۵۰ (خلاصہ)

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے سے جدا نہیں کیا (کہ اس کو نہ مانا ہو) تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں (جو سچے مومن ہیں) ہم عنقریب انہیں ان کے اجر عطا فرمائیں گے۔ (سورۂ نساء ع۲۱ آیت ۱۵۲)

(۳)

انبیاء اور رسولوں کی حیثیت

تمام انبیاء اور رسولوں کا یہی قول رہا ہے "ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہاری طرح کے آدمی ہیں۔ لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے فضل اور احسان کے لئے چن لیتا ہے۔ (سورۂ ابراہیم ع۱۲ آیت ۱۱)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت

(اے پیغمبر) اعلان کر دیجئے میں تو اس کے سوا کچھ نہیں ہوں کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں (البتہ) اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے تمہارا معبود وہی ایک ہے۔ اس کے سوا اور کوئی نہیں۔

سورۂ ع۱۲ (کہف) آیت ۱۱۰

(۴)
(رواداری)

جو لوگ خدا کے سوا دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں۔ تم ان کے معبودوں کو برا بھلا نہ کہو۔ (ان کے حق میں بدکلامی نہ کرو) کہ پھر وہ بھی حد سے بڑھ کر بے سمجھے بوجھے اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنے لگیں۔

قدرت نے انسان کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ فکر و عمل اور سب کے سوچنے کا ڈھنگ ایک نہیں ہوتا۔ ہر گروہ اپنی سمجھ کے بموجب اپنی رائے رکھتا ہے۔ تمہاری نظر میں اس کی رائے کتنی ہی بری ہو مگر اس کی نظر میں وہ راہ ایسی ہی اچھی ہے جیسی تمہاری نظر میں تمہاری راہ اچھی ہے۔ بس ضروری ہے کہ اس بارے میں برداشت اور رواداری سے کام لو۔ جس بات کو تم اچھا سمجھتے ہو، اس کی دعوت دو مگر اس کی کد نہ کرو کہ سب لوگ تمہاری بات مان ہی لیں۔ تم ان پر پاسبان نہیں بنائے گئے ہو۔ نہ تم پر اس کی ذمہ داری ہے کہ دوسرے کو ضرور ہی نیک بنا دو۔ (خلاصہ آیات ۱۰۳-۱۰۸ سورہ انعام ع۹

سورۂ ہود ع۱۱ آیت ۱۱۸)

(۵)
دین و مذہب دل سے ہے زور زبردستی سے نہیں

دین کے معاملہ میں زور زبردستی کا کوئی موقع نہیں۔ کسی طرح کا جبر و اکراہ دین کے بارے میں جائز نہیں۔ دین کی راہ دل کے اعتقاد اور یقین کی راہ ہے اور دل کی تبدیلی خیر خواہانہ نصیحت اور ہمدردانہ

دعوت اور تفہیم سے ہوتی ہے۔ زور و ظلم سے نہیں ہوتی۔

(سورۂ بقرہ ع۲ آیت ۲۵۵ - سورۂ یونس ع۱۰ آیت ۹۹)

(۶)

انسان کا درجہ اور مقصد

تمام دنیا انسانوں کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

(سورۂ بقرہ ع۲ آیت ۲۸ - سورہ جاثیہ ع۴۵ آیت ع۱۲، ۱۳)

انسان خدا کی عبادت کے لئے بنایا گیا ہے۔

(سورۂ الذاریات ع۵۱ آیت ۵۶)

انسان دنیا میں خدا کا خلیفہ اور نائب ہے (سورۂ بقرہ ع۲ آیت ع۲۹)

جو انسان اپنی حقیقت اور خدا داد حیثیت نہیں پہچانتے وہ اس گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ فرشتوں کو دیوتا مان کر ان کی پوجا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ربّ العالمین اور خالق کائنات نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ وہ سجدہ کریں۔ چنانچہ سب نے سجدہ کیا۔ صرف ایک نے چوں چرا کی تو وہی راندۂ درگاہ ہو گیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم (مردود و ملعون) ہو گیا۔ (سورۂ بقرہ ع۲ آیت ۳۳۔)

وَلَقَدْ خَلَقْنٰکُمْ تا مِنْ طِیْنٍ ۝ (سورۂ اعراف ع۷ آیت ۱۱ ۔ ۱۲)

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِکَةُ تا رَجِیْمٌ (سورۂ حجر ع۱۵ آیت ۲۹ - ۳۴)

وَّ اٰخَرِیْنَ مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ (سورۂ ص ع۳۸ وغیرہ)

پس انسان کے لئے کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ وہ خدا کے علاوہ کسی کے سامنے ماتھا ٹیکے۔ یہ شرک ہے۔ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

(سورۂ لقمان ع۳۱ آیت ع۱۳)

(خود اپنے اوپر ظلم ہے سب سے بڑی خودکشی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ہر ایک مخلوق پر عزت بخشی اور یہ مخلوق کے سامنے پیشانی رگڑ کر اپنی عزت خاک میں ملا رہا ہے اور اپنی انسانیت کو فنا کے گھاٹ اُتار رہا ہے) آفتاب اور چاند کو سجدہ مت کرو۔ سجدہ اس کو کرو جس نے آفتاب و ماہتاب کو پیدا کیا ہے۔ (سورۂ سجدہ ۴۱ آیت ۳۷)

رب اور پروردگار صرف اللہ ہے اسی پر جمے رہو۔

(سورۂ سجدہ ۴۱ آیت ۳۰)

آپس میں ایک دوسرے کو رب نہ بناؤ، ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرے گویا خدا کو چھوڑ کر اس نے اپنا پروردگار اس کو بنا لیا ہے۔ (سورۂ آل عمران ۳ آیت ۶۴)

(۷)

انسانی بھائی چارہ

اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف گوت اور مختلف خاندان اس لئے بنا دیا کہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم سب میں بڑی عزت والا (بڑا شریف) وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

(سورۂ حجرات ۴۹ آیت ۱۳)

اے ایمان والو نہ تو مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہیئے، کیا عجب ہے کہ وہ ان سے (ہنسنے والوں سے) بہتر ہوں۔ اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہیئے۔ کیا عجب ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔ نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو۔ نہ ایک دوسرے کو بُرے لقب سے پکارو۔ (سورۂ حجرات ۴۹ آیت ۱۱)

نہ ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے بُرائی کرو۔ (سورۂ حجرات ۴۹ آیت ۱۲)

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی نازل کی ہے کہ تواضع اور عاجزی سے کام لو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی مرد کسی مرد کے مقابلے میں فخر کرے اور بڑائی جتائے نہ یہ ہو کہ کوئی کسی پر ظلم کرے۔ (مسلم شریف)

یہ اسلامی تعلیم سے پہلے زمانۂ جاہلیت کی بات ہے کہ لوگ باپ دادوں پر فخر کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نسل و خاندان کے فخر و غرور کو ختم کر دیا ہے۔ اب انسان کی تقسیم اخلاق و کردار کے لحاظ سے ہے کہ کوئی صاحبِ ایمان اور پرہیزگار ہے اور کوئی بدکار و بدبخت (فاجر و شقی) تمام انسان آدم علیہ السّلام کی اولاد ہیں اور آدم کی سرشت مٹّی سے ہوئی تھی۔ (ترمذی شریف ۲/۲۳۴ وغیرہ)

(۸)

عورت

تم سب کو اکیلی جان سے پیدا کیا اور اسی سے بنایا اس کا جوڑا تاکہ اس کی رفاقت میں چین پائے۔ (اعراف ۷ آیت ۱۸۹)

عورتوں کے لئے بھی اسی طرح کے حقوق مردوں پر ہیں جس طرح کے حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں کہ اُن کے ساتھ اچھا سلوک کریں البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک خاص درجہ دیا گیا ہے۔

(سورۂ بقرہ ۲ آیت ۲۲۸)

اور عورتوں کے ساتھ اچھی طرح زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں (تب بھی تمہارا سلوک اچھا رہنا چاہیئے کیونکہ) ممکن ہے تمہیں ایک چیز

پسند نہ آئے مگر اللہ نے اس میں بہت بھلائی رکھی ہو۔

آیت ۱۹ سورہ ۴ (بقرہ)

(۹)

عدل و انصاف

ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر اُبھار دے کہ تم انصاف نہ کرو۔ ہر حال میں انصاف کرو۔

(سورۂ مائدہ ۵ آیت ۷)

(۱۰)

نیکی کیا ہے

نیکی اور بھلائی یہ نہیں ہے کہ تم عبادت کے وقت اپنے مونھ پُورب کی طرف پھیر لو یا پچھم کی طرف (یا اسی طرح کی کوئی اور رسم و ریت پوری کرلو) نیکی یہ ہے کہ انسان (اپنی شخصیت کی تعمیر اور اپنی اصلاح کو نصب العین بنا کر) اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، آسمانی کتابوں اور خدا کے تمام نبیوں اور رسولوں پر ایمان لائے۔

جب خود اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے اس کا مال اس کو محبوب ہو (تو ایثار سے کام لے اور اس مال کو) رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں مسافروں اور سائلوں کو دے (غلاموں یا مقروضوں کی) گردن چھڑانے میں خرچ کرے۔ نماز پوری پابندی کے ساتھ قائم رکھے۔ زکوٰۃ ادا کرے اپنی بات کا سچا اور قول کا پابند رہے۔ جو قول و قرار کرے اس کو پوری طرح نبھائے۔ تنگی یا مصیبت کی گھڑی ہو، یا خوف و ہراس کا وقت ہر حال میں صبر اور (ضبط و تحمل) سے کام لے۔ (سورۂ بقرہ ۲ آیت ۱۷۶)

(۱۱)

حرام کام

اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں سے کہدو میرے پروردگار نے جو کچھ حرام ٹھہرادیا وہ تو یہ ہے:

بے حیائی کی باتیں جو کھلے طور پر کی جائیں اور جو چھپا کر کی جائیں گناہ کی باتیں، ناحق کی زیادتی، اور یہ کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ، جس کی اس نے کوئی سند نہیں اتاری اور یہ کہ خدا کے نام سے ایسی بات کہو کہ جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں۔

(سورۂ اعراف ۷ آیت ۳۲)

جہاد

ضرورت دفاع

اگر اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرتا کہ انسانوں کے ایک گروہ کے ذریعہ دوسرے گروہ کو ہٹاتا رہتا ہے تو دنیا خراب ہو جاتی (امن و انصاف کا نام و نشان باقی نہ رہتا) لیکن اللہ تعالیٰ سب جہانوں کے لئے فضل رکھنے والا ہے۔ (سورۂ بقرہ ۲ آیت ۲۵۱)

یعنی اگر لوگوں میں انقلاب کی روح نہ ہوتی اور جو جماعت کسی حالت میں ہے وہ سدا اسی حالت میں چھوڑ دی جاتی تو نتیجہ یہ نکلتا کہ دنیا ظلم و تشدد اور فتنہ و فساد سے بھر جاتی اور حق و انصاف کا نام و نشان نہ ملتا۔ پس اللہ کا بڑا ہی فضل ہے کہ جب کوئی ایک گروہ ظلم و فساد میں منہ چھوٹ ہوجاتا ہے۔ تو مزاحمت کے محرکات دوسرے گروہ کو مدافعت کے لئے کھڑا کر دیتے ہیں۔ اور اس کے اقدام کو

روک دیتے ہیں۔ اور اس طرح ایک قوم کا ظلم دوسری قوم کی مقاومت سے دفع ہو جاتا ہے۔

مذہبی جنگ اگر نہ ہوتا اللہ کا ہٹا دینا لوگوں کو بعض کو بعض کے ذریعہ تو منہدم کر دی جاتیں راہبوں کی خانقاہیں۔ عیسائیوں کے گرجے۔ یہود کے عبادت خانے۔ اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ یقیناً مدد کرے گا اس کی جو مدد کرے گا اس کی (اللہ کی)۔ (سورۂ حج ۲۲ آیت ۳۹)

یعنی بقاء باہم، امن و آشتی، مذہبی آزادی اور حریتِ فکر، بڑی اچھی چیزیں ہیں۔ انسان اور انسانیت کے بنیادی حقوق ہیں۔ مگر کسی قوم اور ملت کو یہ اسی وقت حاصل ہوتے ہیں اور اسی وقت تک باقی رہتے ہیں جب اس قوم میں دفاع کی قوت اور طاقت ہو۔ پس مقصدِ جہاد یہ ہے کہ اگر بنیادی حقوق سلب ہونے لگیں تو قوت اور طاقت کے ذریعہ ان کو محفوظ رکھا جائے اور سلب ہو چکے ہوں تو طاقت کے ذریعہ ان کو بحال کر دیا جائے۔

خاتمۂ جہاد اور ان لوگوں سے لڑائی جاری رکھو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ ہی کے لئے ہو جائے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (البقرہ آیت ۱۹۳)

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (۸ الانفال آیت ۳۹)

فتنہ مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد ہیں اور کتنی ہی عورتیں ہیں، کتنے ہی بچے ہیں جو فریاد کر رہے ہیں۔ اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نجات

والا جہاں کے باشندوں نے ظلم پر کمر باندھ لی ہے اور اپنی طرف سے کسی
کو ہمارا کارساز بنادے۔ اور کسی کو مددگاری کے لئے کھڑا کردے ۔
(سورہ ۴ نساء آیت ۷۵)

ملاحظہ ہو حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما' بخاری شریف ص۲۲۵' ص۶۴۸' ص۶۷۰ وغیرہ ۔
جس میں فتنہ کی یہی تفسیر کی گئی ہے جو آیت کا مفہوم اور مضمون ہے۔ یعنی کسی قوم کا
ایسا بے بس ہونا کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر عمل نہ کرسکے۔ اور جس کو وہ حق سمجھے اس
کو اختیار نہ کرسکے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

رُوحانیت، شرافت اور مکارمِ اخلاق کا نقطۂ عروج

بیسویں صدی عیسوی کی موجودہ دنیا میں امریکہ اور یورپ سب سے زیادہ ترقی یافتہ
متمدن اور مہذب مانے جاتے ہیں، مگر امریکہ تو نئی دنیا ہے۔ چودھویں صدی عیسوی سے پہلے پرانی دنیا کو
اس کے وجود کی بھی خبر نہیں تھی' اور انگلینڈ، فرانس جرمنی وغیرہ یورپ کے مغربی ممالک
اگرچہ پرانی دنیا کے نقشہ میں موجود تھے۔ مگر ساتویں صدی عیسوی میں جب اسلام کا
آفتاب طلوع ہوا۔ اس زمانہ میں سب سے زیادہ پس ماندہ تعلیم سے محروم ہی نہیں، بلکہ
کلیسا کے حکم کے بموجب عمومی تعلیم ممنوع تھی۔ تہذیب و تمدن کی روشنی دُور دُور نہیں تھی ۔
شہروں کی آبادیاں بھی خس پوش تھیں انسانوں کی جھونپڑیوں ہی میں مویشی بھی رات گذارا
کرتے تھے۔ پرال کے بچھونے، کھال کے لحاف، چمڑے کے کپڑے ۔

البتہ مشرقی یورپ بیشک تمدن سے آشنا تھا اور آشنا رہا تھا۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام
دنیا میں تشریف لائے۔ تو روم ایک وسیع شہنشاہیت کا مرکز تھا۔ اسی کی ایک عدالت
تھی جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے سولی کا فیصلہ کیا تھا۔

یونان میں سقراط، افلاطون، ارسطو جیسے باکمال ہوچکے تھے۔ فیثاغورث جو زمین کی گردش کا قائل ہوا یونان ہی کا تھا۔ ان فلاسفروں اور دانشوروں کو اگرچہ اپنی زندگی میں آسودگی میسر نہیں آئی۔ مگر دنیا ان کے دانش و حکمت اور ان کے فلسفہ کی آج تک قائل ہے۔ عربوں نے ارسطو کو "معلم اوّل" کا خطاب دیا۔ یورپ کی یونیورسٹیوں میں اس کا فلسفہ آج بھی داخلِ کورس ہے اور انھیں یونانی فلاسفہ کے نظریات آج کی سائنس کا بنیادی سرمایہ ہیں۔

لیکن دوسری صدی عیسوی سے مشرقی یورپ کی ترقی بھی تنزل سے بدلنے لگی اور اس دور تنزل کی سب سے بڑی خصوصیت علم دشمنی تھی۔

اسکندریہ کا عظیم الشان کتب خانہ جو بطلیموسی دور کی یادگار تھا جس میں کہتے ہیں سات لاکھ کتابیں تھیں[1] اسی علم دشمنی کی نظر ہوا۔

قسطنطنیہ کے کتب خانوں کے متعلق مشہور فرانسیسی مورّخ موسیو لیبان کی شہادت ہے کہ چمڑے کے اوراق پر جو کتابیں لکھی ہوئی ہیں ان کے حروف صاف کرکے چمڑا بیچ لیا کرتے تھے۔[2] عام تعلیم کی ممانعت تھی۔ مخصوص حلقوں میں پوپ کی اجازت سے کچھ لکھنا پڑھنا سکھا دیا جاتا تھا۔ جو اس کے خلاف آواز اٹھاتا اس کے لئے کفر کا فتویٰ اور آگ کی دہکتی ہوئی بھٹی تیار رہتی تھی۔ خدا جانے کتنے ہزار یا لاکھ انسان ان بھٹیوں میں جھونکے گئے یا تہ تیغ کئے گئے۔

یہ دور جو چوتھی صدی عیسوی سے شروع ہوا اس کو قرون وسطیٰ کہا جاتا ہے جو تاریخ یورپ کا سب سے زیادہ تاریک دور مانا جاتا ہے۔ جن کی نظر صرف یورپ کی تاریخ پر ہوتی ہے۔ یہ بات ان کے تصور میں بھی نہیں آتی، کہ جب مغرب (یورپ) میں آدھی رات کی اندھیری چھائی ہوئی تھی۔ مشرق وسطیٰ میں تہذیب و شرافت، روحانیت اور مکارم اخلاق

---

[1] العلم والعلماء۔ مولانا ملیح آبادیؒ [2] تمدن عرب ۱۲

کا آفتاب نصف النہار پر پہنچا ہوا تھا۔ اس کھلی ہوئی شہادت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ چند ہزار کی وہ جماعت جس نے محمّد رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے شمسِ منیر سے براہِ راست نور سمیٹا تھا وہ پوری کائنات کے لئے ایسی مثال گذری ہے جس کی نظیر پوری دنیا کو نہ کبھی پہلے میسّر آئی تھی اور نہ اس کے بعد میسّر آسکی۔

یہ جماعت جس کو سرتاج انبیاء محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا شرف حاصل ہوا جو قرآن حکیم کی مخاطبِ اوّل تھی جس کو قرآن حکیم نے خیرِ اُمّۃٍ کہا جو ساتویں صدی عیسوی کی پیشانی کا جھومر تھی، انسانیت کی پوری تاریخ میں رُوحانی کمالات اور مکارمِ اخلاق کا نقطۂ عروج تھی۔

جو انسان اس وقت تاریکی میں تھے (مثلاً اہل یورپ) اُن کے یہاں اگرچہ صدیوں بعد روشنی پہنچی مگر وہ روشنی مادیت کی تھی جس کی نظر میں روحانیت کھوٹا سکہ تھی جس کا چلن ختم ہو چکا تھا اخلاق کے صرف وہ باب ان کی زندگی میں داخل ہو سکے جن کا تعلق صرف کاروباری ترقی سے تھا وہاں روحانیت اور اخلاق کے ترقی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جن ممالک میں قرون وسطیٰ کی وہ تاریکی نہیں تھی جو تمدن اور اخلاق سے آشنا تھے، وہ مشرقِ وسطیٰ کے اس نور سے منوّر ضرور ہوئے لیکن اُن کے حصّہ میں صرف چھنی ہوئی کرنیں آئی تھیں جو دن بدن مدھم ہوتی رہیں اور ہو رہی ہیں۔

تاریخ کے اس نظارہ کے بعد کیا یہ حقیقت آفتاب کی طرح روشن نہیں ہو جاتی کہ روحانیت کا نقطۂ عروج وہ دور تھا جس کو اسلام کا قرن اوّل اور سب سے پہلا دور کہا جاتا ہے۔

چودہ سو برس گذر گئے، دُنیا کھلی آنکھوں دیکھ رہی ہے کہ اس دور میں کوئی اور آفتاب روشن نہیں ہوا جو رُوحانیت یا اخلاق کے چاند تاروں میں نئے نظریات کا نور بھرتا۔

اعلیٰ تہذیب۔ مکارمِ اخلاق اور رُوحانیت کے متعلق وہی مبادی اور وہی نظریات جو رحمۃٌ للعالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دورِ مسعود میں زیرِ بحث تھے یا انسانی علم و تفکر کا اثاثہ

بن چکے تھے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کی اصلاح یا تکمیل کی، وہی آج بھی انسانی علم و فکر کا سرمایہ ہیں۔ انھیں کے طول و عرض میں تمام مذاہب کے فلسفے گھوم رہے ہیں۔ مادیات میں دنیا بہت آگے بڑھی، زمین سے پرواز کر کے آسمان کے تاروں تک پہنچ گئی اور اس سے بھی آگے بڑھنا چاہ رہی ہے۔ مگر شرافت، انسانیت، اخلاق اور روحانیت کا قطب مینار جو حضرت خاتم الانبیاء علیہم السلام نے تعمیر کیا تھا اس سے اونچا کوئی مینار تو کیا بنایا جاتا، تہذیب و اخلاق کی دنیا کے لئے اس قطب مینار کے کنگروں کا چھونا بھی دن بدن مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔

وہ بشارت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تقریباً تین ماہ پہلے حجۃ الوداع کے موقع پر اُمتِ محمدیہ کو ربِ محمد کی طرف سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دی گئی تھی کہ

"آج کے دن میں نے تمہارے لئے
تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت
تم پر پوری کر دی اور تمہارے لئے پسند
کر لیا دین اسلام کو۔" (سورہ مائدہ ۵ آیت ۳)

چودہ صدیوں کے تجربہ کے بعد بھی کیا اس کی صداقت میں شک و شبہ کی گنجائش ہے۔ بیشک لوگوں کی نظر ہمارے کردار پر ہے (جو اس زمانہ میں اُمتِ محمدیہ ہیں) ہمارے کردار نے بے شک اس بشارت کو مشکوک و مشتبہ بنا دیا ہے۔ مگر خود بشارت شک و شبہ سے پاک ہے۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

دیباچہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

عرب قبل اسلام اپنے آئینے میں

چشم کائنات نے بے شمار انقلاب دیکھے۔ مگر کوئی انقلاب ایسا نہیں دیکھا کہ ایک قوم جو اپنی تہذیب اور اپنی روایات پر نازاں تھی، اپنی روشن خیالی اور سلیقہ مندی پر فخر کیا کرتی تھی۔ وہ اپنی خوشی سے اپنی مکمل آزادی اور خود مختاری کے باوجود بلا کسی جبر و اکراہ اور بلا کسی دباؤ کے خود اپنے احساس کی بنا پر اپنی تہذیب کو وحشت، اپنے تمدن کو جاہلیت اور اپنے علم کو جہل سمجھنے لگی ہو۔ یہ عجیب و غریب انقلاب اس قوم میں آیا تھا، جو سرزمین حجاز میں آباد تھی جو عرب کہلاتی تھی جس کا مرکز مکہ تھا اور جس کو اپنی نسلی برتری اور اپنے ادب پر اتنا ناز تھا کہ وہ اپنے مقابلہ میں دنیا کی تمام قوموں کو تہذیب سے ناآشنا، خاندانی عظمت سے محروم ایسی جاہل اور نابلد سمجھتی تھی کہ ان کو بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے۔

یہ قوم اپنے آپ کو "عرب" کہتی تھی یعنی خالص النسب، صاف اور واضح کلام کرنے والے۔ اور تمام دنیا کو "عجم" کہا کرتی تھی یعنی گونگے جو مافی الضمیر کو صفائی سے نہ بیان کرسکیں اور "عجماوات" یعنی مویشیوں کی طرح رہوں۔

پھر ایسا ہوا کہ اس مغرور اور متکبّر قوم نے خود اپنی خوشی سے گردن جھکائی۔ گردنوں کے ساتھ دل بھی جھک گئے اور ایسے جھکے کہ وہ خود بھی اپنے دورِ ماضی سے نفرت کرنے لگے اور جس تہذیب ادب اور علم پر وہ فخر کیا کرتے تھے اس کو وحشت اور جہل کہنے لگے۔

محمد رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو اس قوم نے آزمایا اور تقریباً چالیس سال تک اس کو دیکھتی۔ برتتی۔ پرکھتی اور آزماتی رہی۔ اور جب ہر طرح اُس کو سچّا، کھرا اور یکّا ہی پایا تو اس قوم کی انصاف پسندی اور عاقبت اندیشی نے یہ احساس پیدا کر دیا کہ اگر دوپہر کے وقت آفتاب کا انکار کیا جا سکتا ہے تو محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی سچّائی اور صداقت کا انکار کرنا بھی ممکن ہے۔

عرب قوم ایک متحرک۔ فعّال۔ باہمّت مضبوط ارادہ والی قوم تھی۔ جب محمّد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے جھکی تو اس طرح جھکی کہ صرف اسی کی شخصیت کو شخصیت اور اُسی کے ارشاد کو ہدایت اور اُسی کے علم کو علم سمجھنے لگی اور اس کے سوا جو کچھ اس کے پاس تھا وہ خود اُس کی نظر میں ضلالت ظلمت اور جہالت کا انبار معلوم ہونے لگا۔

یہاں تک کہ قرآن حکیم نے اُس کے پچھلے دور کو جس پر اسے گھمنڈ تھا "جاھلیۃ اولیٰ" کہا تو ایک متنفس نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ پوری قوم اس کو "جاہلیت" کہنے لگی، اس سے نفرت کرنے لگی اور اُس کا مذاق بنانے لگی۔

ایک غلط فہمی

ابوبکر صدیق۔ عمر فاروق۔ عثمان غنی۔ سعد بن ابی وقاص۔ عبدالرحمٰن بن عوف۔ ابو عبیدہ بن الجراح۔ عبداللہ بن سلام۔ عدی بن حاتم (رضی اللہ عنہم اجمعین) جیسے اصحاب علم و فضل اور ارباب عزم و ہمّت نے جب اپنے سابق دور کو "دَورِ جاہلیت" کہا تو عام تصوّر یہ ہو گیا کہ جاہلیت سے مُراد وحشت اور حیوانیت ہے

عرب قوم ایک وحشی قوم تھی جو حیوانوں کی طرح تہذیب و تمدن سے نا آشنا اور علم و ہنر سے بے بہرہ تھی۔ اس میں نہ سنجیدگی تھی نہ شرافت نہ اس کا کوئی خاص سلیقہ تھا نہ اُس کا کوئی خاص ادب تھا۔ یہی تصوّر تھا جس کی بنا پر تاریخ نویسوں خصوصاً مصنّفینِ سیرت نے عربوں کی صرف وہی خصلتیں پیش کیں جن سے اس غلط تصوّر کی تصدیق ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ ہندوستان کے ایک مشہور قومی شاعر (علّامہ حالی) نے عربوں کے اس دور کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا:

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا　　جہاں سے الگ ایک جزیرہ نما تھا
زمانہ سے پیوند جس کا جدا تھا　　نہ کشورستاں تھا نہ کشور کشا تھا

تمدّن کا اُس پر پڑا تھا نہ سایہ
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا

نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی　　نہ یونان کے علم و فن کی خبر تھی
وہی اپنی فطرت پہ طبعِ بشر تھی　　خدا کی زمیں بن جُتی سربسر تھی

پہاڑ اور صحرا میں ڈیرا تھا سب کا
تلے آسماں کے بسیرا تھا سب کا

چلن اُن کے جتنے تھے سب وحشیانہ　　ہر ایک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا اُن کا زمانہ　　نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ

وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بیباک جیسے

آئینہ عرب

بدوی قبائل کے متعلق مولانا حالی کے یہ اشعار درست ہیں۔ لیکن ایسے پس ماندہ قبائل کسی ملک کی تہذیب کا معیار نہیں مانے جاتے۔ چودہ سو سال کے بعد آج کی مہذّب دنیا بھی ایسے قبائل سے اپنا دامن نہیں

جھاڑ سکی۔ موجودہ دور میں جو ممالک دنیا بھر میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور تہذیب وتمدن کا گہوارہ مانے جاتے ہیں اُن کے پس ماندہ گوشوں میں بھی ایسے قبائل موجود ہیں جو علامہ حالی کے ان اشعار کا مصداق ہیں۔ بدوی قبائل کے علاوہ مکہ، طائف، دومۃ الجندل، یمامہ یا یکر، صحار جیسے شہروں کے متعلق یہ تصوّر سراسر ظلم ہے۔

جس زمانہ کا تذکرہ مولانا حالی نے ان اشعار میں کیا ہے اُسی زمانہ کا ایک مکالمہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے جو فی الحقیقت اس دور کے عربوں کی تہذیب کا آئینہ ہے۔ اس مکالمہ کے ضروری اقتباسات یہاں پیش کئے جارہے ہیں۔

سلطنت ایران اس زمانہ میں کم از کم ایشیا کی سب سے بڑی منظم اور طاقت ور شہنشاہیت تھی جس کی شان وشوکت سے رومن شہنشاہیت بھی دم بخود رہتی تھی۔

چھٹی صدی عیسوی کا آخری ربع جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جوانی کا دور ہے اس شاہنشاہیت کا سب سے زیادہ کامیاب دور تھا جب اُس کی فوجوں نے رومن شاہنشاہیت (بازنطینی ملوکیت) کی فوجوں کو شکست دیکر تقریبًا تباہ کردیا تھا۔ خسرو پرویز جس کو عرب کسریٰ کہا کرتے تھے، اس سلطنت کا تاجدار تھا۔

یہ مکالمہ جس کو تاریخ نے پوری احتیاط سے محفوظ رکھا جس کے ضروری اقتباسات یہاں درج کئے جارہے ہیں۔ اسی خسرو پرویز (شہنشاہ ایران) اور عرب کے ایک رئیس "نعمان[2] بن منذر" کے درمیان ہوا تھا۔

---

[1] "تاریخ طبری۔ یہی خسرو پرویز ہے جس نے نامہ مبارک کو چاک کیا تھا جس کے نتیجہ میں اس کی پوری شہنشاہیت پارہ پارہ بلکہ بے نام ونشان ہوگئی۔ یہ نوشیروان عادل کا پوتا تھا۔ باپ کا نام ہرمز تھا

[2] نجف اشرف ہمارے زمانہ کا ایک مشہور شہر ہے۔ اسی مقام پر خلیج فارس کے ساحل پر کوئی تین میل ایک شہر تھا جس کو حیرہ کہا جاتا تھا (معجم البلدان) یہ عربوں کی ایک خود مختار ریاست کا مرکز تھا نعمان بن المنذر اسی ریاست کا حکمراں تھا۔ یہ ریاستیں حبش کی یلغار سے تحفظ کے لئے (باقی ص۶۷ پر)

ایران کا شہنشاہی دربار پوری شان وشوکت کے ساتھ آراستہ ہے۔ خسرو پرویز تاجدار ایران، تختِ شاہنشاہیت پر جلوہ افروز ہے۔ روم، شام، ہندوستان اور چین وغیرہ ممالک کے سفراء دربار میں حاضر ہیں۔ عرب کا یہ رئیس نعمان بن المنذر بھی موجود ہے۔ سفراء نے خطابات شروع کئے۔ ہر ایک سفیر نے اپنے ملک کے کچھ حالات بیان کئے۔ نعمان بن منذر کھڑا ہوا اور اُس نے اس شان سے تقریر کی کہ سب حیران رہ گئے اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ عرب کا درجہ دنیا میں سب سے زیادہ بلند ہے۔ شہنشاہ

(بقیہ حاشیہ صلا) شاہانِ ایران سے اپنا تعلق قائم کئے ہوئے تھیں۔ شاہان ایران بھی ان کے معاملات میں کافی دخیل رہتے تھے۔ یہاں تک کہ نعمان کے پردادا امرؤ القیس نے نوشیروان بن قباذ (نوشیروان عادل) کی مدد سے ہی یہاں کی حکومت حاصل کی تھی (معارف ابن قتیبہ) نعمان کی کنیت ابو قابوس تھی۔ باپ اور دادا دونوں کا ایک ہی نام ہے المنذر۔ نعمان بن المنذر بن المنذر بن امرؤ القیس۔ سلسلہ نسب ہے۔ عربی ادب سے دلچسپی رکھنے والے امرؤ القیس سے پوری طرح واقف ہیں۔ شعراء عرب میں استاذ الاساتذہ کا درجہ رکھتا تھا۔ عدی بن زید العبادی بہترین ادیب اور بلند پایہ شاعر شہنشاہ ایران "خسرو پرویز" (کسریٰ) کا عربی ترجمان اور وزارتِ خارجہ میں عرب سے متعلق امور کا انچارج تھا۔ نعمان کا دوست تھا۔ اُس نے نعمان کی تعریف کسریٰ سے کی جس کی بنا پر نعمان کو دربار کسریٰ میں باریابی کا موقع ملا۔ پھر تعلقات خراب ہو گئے، یہاں تک کہ نعمان نے اپنے اس محسن عدی کو قتل کرا دیا۔ باپ کے بعد اس کا بیٹا زید بن عدی، دربار ایران میں باپ کے منصب پر فائز ہوا۔ اس نے نعمان سے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لیا، کسریٰ کو نعمان سے برہم کر دیا۔ یہاں تک کہ کسریٰ نے نعمان کو طلب کیا وہ کچھ دنوں کے لئے غائب ہو گیا۔ پھر آخر کار حاضر ہوا تو کسریٰ نے گرفتار کر کے ساباط کے جیل خانہ میں ڈلوا دیا۔ پھر ہاتھی کے پیروں سے کچلوا کر مروا دیا۔ (معارف ابن قتیبہ) یہی نعمان بن المنذر ہے جس کے ایک تجارتی قافلہ کی بنا پر فجار کا معرکہ ہوا جس کو حرب فجار کہا جاتا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے اعمام کے ساتھ تشریف لے گئے تھے اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک دس بارہ سال تھی (ابن سعد ص۲۲)

ایران اس جرأت کو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اُس نے عرب پر سخت تنقید کی۔ نعمان بن منذر سے کہا۔ تم ایسی قوم کو فوقیت دینا چاہتے ہو جس کی نہ دنیا درست ہے نہ دین درست جس کی نہ کوئی مملکت ہے نہ اُس کے پاس کوئی دستور اور قانون ہے۔ نہ اس کی آبادی باضابطہ ہے جنگلوں اور پہاڑوں میں وحشی جانوروں کے ساتھ اُس کا گذران ہے دنیا کی لذتوں سے ناواقف۔ لباس و پوشاک سے بے بہرہ۔ تمدن سے ناآشنا۔ لوٹ مار ذریعہ معاش ہے۔ کھانے کو نہیں ملتا تو بچوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ زندہ لڑکیوں کو زمین میں دفن کر دیتے ہیں۔ اونٹ کا گوشت اُن کی محبوب غذا ہے، مہمانوں کی سب سے بڑی مدارات یہی ہے کہ اونٹ کا گوشت پیش کیا جائے جس کو درندے بھی نہیں کھاتے اور پھر قصائد اور اشعار میں اس پر فخر کیا جاتا ہے۔

نعمان بن منذر کا جواب:

"شہنشاہِ عجم آپ کی قوم کو جو عظمت حاصل ہے میں اُس کا انکار نہیں کرتا۔ بیشک وہ عقل و دانش اور ضبط و نظم میں ایک خاص درجہ رکھتی ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ بحیثیت مجموعی دنیا کی کسی قوم کو وہ مقام حاصل نہیں ہے جس کے عرب مالک ہیں۔

سیاسی عظمت

بیشک آپ اور آپ کے بزرگ فاتح رہے ہیں۔ بہت سے ملک اُنھوں نے فتح کئے اور اُن کے مضبوط قلعوں پر اپنی عظمت کے پرچم لہرائے۔ لیکن آپ یہ بھی خیال فرمائیں کہ عرب انہیں فاتح شہنشاہوں کے پڑوسی رہے ہیں مگر کیا کبھی کسی فاتح کی ہمت ہوئی کہ عرب کا رخ کر سکے۔ کیونکہ دنیا کی قوموں کی حفاظت اُن قلعوں پر موقوف ہے جو چونے کی گچّی اور پتھروں سے تعمیر کئے جاتے ہیں یا اُن جزیروں پر جو سمندروں کی موجوں میں رُوپوش ہیں۔ مگر عرب کے قلعے گھوڑوں کی پیٹھ ہیں، فرش زمین اُن کا گہوارہ۔ آسمان چھت۔ اور اُن کی محافظ اُن کی تلوار ہے۔ اُن کی رسد اُن کا صبر و استقلال، پامردی اور استقامت، جفاکشی اور

سخت کوشی۔

شکل وصورت اور ظاہری وجاہت

عرب، حسن ظاہری، تناسب اعضاء، رُو واری اور وجاہت کا معیار رہیں۔ نہ اُن کی آنکھیں بھُوری یا پتلی نہ اُن کی ناک پھدّی، نہ رخسار چوڑے، نہ ہونٹ موٹے، نہ چہرے جھُلسے ہوئے، نہ سفید فاموں کی طرح کھُرچے ہوئے، نہ بالشتی قد، نہ بے ڈول لانبے، نہ نازک بدن، نہ مرجھائے ہوئے

نسب

صرف عرب ہی کو حق ہے کہ خالص النسل اور محفوظ النسب ہونے کا دعویٰ کریں ہر ایک پشت میں ماہرین انساب چھان بین کرتے رہے۔ خاندانی یادداشتوں میں اور شعراء کے قصیدوں میں ہر ایک دور کے نسب محفوظ ہوتے رہے چنانچہ ہر ایک عرب کو اپنے مورث اعلیٰ تک کا نسب معلوم ہے۔ پُورا نسب نامہ اس کی زبان پر چڑھا ہوا ہے[1] لیکن دنیا کی دوسری قوموں سے اگر دریافت کیا جائے تو اکثر قومیں وہ ہیں کہ دو تین پشتوں سے آگے اپنے بزرگوں کے نام سے بھی وہ واقف نہیں ہیں۔

سخاوت اور حوصلہ

ایک معمولی عرب جس کی کل ملکیت ایک اونٹنی ہو، وہی اُس کی مزدوری کا ذریعہ اور وہی اُس کی زندگی کا سہارا ہو۔ اگر اس کے یہاں مہمان آجائے تو اگرچہ گوشت کے چند پارچوں اور کسی مشروب سے وہ اس کی خاطر کرسکتا ہے۔ مگر اس کا حوصلہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس معمولی مدارات پر کفایت کرے، وہ اپنی اونٹنی ذبح کرڈالتا ہے۔ گوشت کے بہترین پارچوں سے اس کی مدارات کرتا ہے اور اگرچہ وہ اپنا سب کچھ قربان کرچکا ہے مگر وہ خوش ہے کہ اُس نے مہمان کی خدمت کرنے میں حوصلہ سے کام لیا۔

---

[1] جس قوم کے یہاں گھوڑوں اور اونٹوں کے نسب بھی محفوظ ہوں۔ ہر ایک کو اپنی گھوڑی اور اپنے اونٹ کا سلسلہ نسب یاد ہو، کیسے ہوسکتا ہے کہ اس کو خود اپنا نسب نامہ یاد نہ ہو۔ محمد میاں

ادب اور تہذیب | نظم، نثر، قصیدہ گوئی، خطابت اور تقریر میں جو غیر معمولی امتیاز عرب کو حاصل ہے دنیا کی کوئی قوم اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ جہاں تک تہذیب کا تعلق ہے تو عرب کا لباس سب سے بہتر، سب سے زیادہ شاندار۔ ان کی عورتیں با عصمت۔ اُن کی سواریاں وہ عربی گھوڑے جن کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی۔ اُن کے اونٹ گویا صحرا کے جہاز ہیں۔ سونے اور چاندی کی کانیں زمین کے سینہ میں اور قیمتی ہیرے جواہر اُن کے پہاڑوں میں موجود ہیں۔ سمندر اُن کی بغل میں ہے جس کے سینہ پر اُن کے جہاز رینگتے ہیں اور مشرق کی آخری سرحدوں تک اُن کو پہنچاتے ہیں۔

دین اور مذہب | عرب کا مذہب جانا پہچانا ہے۔ اس کے فرائض اور مراسم معلوم ہیں۔ عرب اُن کے پابند ہیں۔ اُن کا ایک بیت (کعبہ) ہے جس کا وہ حج کرتے ہیں، وہاں قربانیاں پیش کرتے ہیں۔ اس کعبہ کا وہ احترام کرتے ہیں۔ جس شہر میں یہ کعبہ ہے اس کا احترام کرتے ہیں۔ اس کی کچھ حدود ہیں جن کو حرم کہتے ہیں اس حرم کا وہ احترام کرتے ہیں۔ اس کی مقررہ حدود ہیں۔ انسان تو کیا کسی جاندار کو بھی وہ ایذا نہیں پہونچا سکتے اس کے درخت نہیں کاٹ سکتے، سال میں چار مہینے مقرر ہیں جن کو اشہر حرام کہتے ہیں۔ وہ ان کا احترام کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک بہادر عرب اپنے باپ یا بھائی کے قاتل کو اپنے سامنے دیکھتا ہے، وہ اُس کے خون کا پیاسا ہے، اُسے پوری قدرت ہے کہ وہ اس قاتل کا کام تمام کرکے اپنے باپ یا بھائی کا قصاص لے لے اور انتقام کی پیاس بجھالے مگر اس کا دین و مذہب ہی ہے جو اس کے جذبات کو روکتا ہے۔ اس کے ہاتھ باندھ دیتا ہے وہ خون کے گھونٹ پیتا ہے اور حرم مکہ یا حرم کے مہینوں میں اپنے باپ اور بھائی کے قاتل سے قصاص نہیں لے سکتا۔

قول وعہد کی پابندی | باقاعدہ عہد و پیمان تو درکنار، عہد کی قسم کا اشارہ بھی ہو جاتا ہے تو عرب اس کو ایسی گرہ سمجھتا ہے جو اسی وقت کھل سکتی ہے جب

اس کی جان جاتی رہے۔

ایک عرب کو معلوم ہوتا ہے کہ کسی مصیبت زدہ نے جس کو اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں جو اس سے کوسوں دور ہے، اُس کے نام کی دُہائی دی ہے۔ اب اُس کی پوری قوت اور تمام وسائل اُس کی امداد کے لئے اس عزم کے ساتھ وقف ہوتے ہیں کہ یا ظالم ختم ہو جائے گا یا وہ اور اُس کا پورا قبیلہ فنا ہو جائے گا۔

ایک اجنبی شخص جس سے نہ تعارف ہے نہ کوئی تعلق پریشان حال پہونچتا ہے اور کسی قبیلہ کی پناہ لے لیتا ہے۔ تو اب اگر یہ اجنبی کوئی جرم کر کے آیا ہے تب بھی اس قبیلہ کی پناہ میں آنے کے بعد محفوظ ہو جاتا ہے۔ پناہ دینے والا قبیلہ اپنی جانیں قربان کر سکتا ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی موجودگی میں اس پناہ لینے والے کو آنچ آجائے۔

لڑکیوں کو قتل کر دینا بیشک کچھ لوگ یہ جرم کرتے ہیں۔ مگر اس لئے کہ ان کی غیرت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اُن کے گھر پر داماد آئے یا لڑکی کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے جو اُن کے لئے عار ہو۔

اُونٹ کا گوشت بیشک وہ اُونٹ کا گوشت کھاتے ہیں۔ مگر اس لئے کہ وہ سب سے گراں پڑتا ہے۔ مخصوص پارچے مثلاً کوہان کا گوشت ایسا عمدہ اور بہتر ہوتا ہے کہ کوئی گوشت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ خاص طور پر کوہان کا گوشت[1] ہی ضیافتوں میں پیش کیا جاتا ہے اور اسی پر فخر کیا[2] جاتا ہے۔

---

[1] ایک تصور یہ تھا کہ زندہ اونٹ کا کوہان پہلے کاٹ لیا جائے تو وہ زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ لہذا پہلے کوہان کاٹ کر مہمانوں کے لئے اس کے پارچے تل دیئے جاتے تھے یا کباب بنا لئے جاتے تھے ——— باقی اونٹ کا گوشت نقرار کا حصہ ہوتا تھا اسلام نے کسی زندہ جانور کے کسی حصہ کے کاٹ لینے کو ظلم اور اس طرح کے گوشت کو حرام اور ناپاک قرار دیا [2] جنگِ بدر میں قریش کے جو سردار مارے گئے اُن کے ہم مسلک شاعر نے ان کے مرثیہ میں ان کی مہمانداری کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ دعوت کے موقع پر کوہان کے پارچے اور کباب پیش کیا کرتے تھے جو آبنوس کی کشتیوں میں سجے ہوئے ہوتے تھے۔ (بخاری شریف ص ۵۵۸)

خانہ جنگی یہ درست ہے قبائل میں جنگ رہتی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ان کے یہاں کوئی ایسا نظم نہیں ہے کہ سب قبائل کو منسلک کردے، نہ اُن کے یہاں کوئی شاہنشاہ ہے۔ تو واقعہ یہ ہے کہ سیاسی نظم کا محرک یہ ہوتا ہے کہ ایک گروہ اپنے آپ کو کمزور محسوس کرتا ہے۔ اُس کو حملہ آوروں کا خطرہ بھی ہوتا ہے تو وہ دوسرے گروہ کے ساتھ منسلک ہوجاتا ہے، یا ایسا ہوتا ہے کہ کسی مملکت میں کوئی ایک خاندان اپنی قوت اور قابلیت سے ایسی عظمت حاصل کرلیتا ہے کہ اہلِ مملکت اس کا لوہا ماننے لگتے ہیں تو وہ اس کو بادشاہ بنادیتے ہیں اور اپنی گردنیں اس کے سامنے جھکادیتے ہیں لیکن عرب کی حالت یہ ہے کہ ہرایک قبیلہ وہ قابلیت رکھتا ہے کہ بادشاہت کرسکے۔ وہ کسی سے مرعوب ہونا نہیں جانتا، اپنی قوت پر اس کو اعتماد ہوتا ہے۔ بس ہرقبیلہ اپنی جگہ بادشاہ ہے۔ نہ کسی کے سامنے گردن جھکانے کو تیار ہوتا ہے۔ نہ یہ برداشت کرسکتا ہے کہ کسی کو خراج یا ٹیکس دے۔ یا کسی کا بیگاری بنے۔" (ماخوذ از عقد الفرید لابن عبدربہ جلد اوّل باب الوفود علی الملوک)

نعمان بن منذر کی تقریر کے کچھ حصوں سے اور اس کے بعض خیالات سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عربوں کا تصور اپنے متعلق یہی تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو خصلتیں اور جو خصوصیات بیان کیں وہ اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔ عرب فی الواقع ان خصوصیات کے حامل تھے۔ کسی قدر تفصیل آئندہ باب میں ملاحظہ فرمائیے۔

خصوصیات عرب

عرب قبل از اسلام (عرب جاہلیت) کی قصیدہ خوانی مقصود نہیں ہے لیکن ان حقائق سے گریز بھی درست نہیں ہے جو افق تاریخ پر صبح صادق کی طرح روشن ہیں۔ سیرۃ مبارکہ اور تاریخ اسلام کے بھی تمام گوشے اسی وقت اُجاگر ہو سکتے ہیں، جب ماحول کی صحیح تصویر سامنے ہو۔

تاریخ کا کوئی مبصر بھی انکار نہیں کر سکتا کہ عربی معاشرہ (سماج) میں سخاوت، بہادری، خود اعتمادی، غیرت وحمیت، خودداری، روایات کی حفاظت، عہد اور قول کی پابندی، عہد شکنی اور غلط بیانی سے نفرت، ایسے اوصاف[ل] تھے کہ کم از کم اس دور میں کوئی دوسری قوم ان کی نظیر نہیں پیش کر سکتی تھی۔ اس دعویٰ کی تصدیق کے لئے تاریخ کا وسیع دفتر جو حقائق پیش کر سکتا ہے ان میں سے چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی جا رہی ہیں۔

سخاوت (جُود وسخا) سخاوت کے یہ معنے نہیں تھے کہ پیٹ بھرنے پر کچھ نوالے کسی فقیر کو دیدیئے جائیں بلکہ سخاوت کا مطلب یہ مانا جاتا تھا کہ جذبہ یہ ہو کہ خود بھوکا رہے اور دوسرے کو شکم سیر کرے۔ اور اسی کو وہ اپنی کامیابی سمجھے اور اس پر ایسا خوش ہو گویا اُس کی مُراد پوری ہو گئی۔

ل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی کس قدر معنی خیز ہے بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم) "میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم (اخلاق عالیہ) کی تکمیل کردوں" اس ارشاد گرامی میں اخلاق کی نفی نہیں ہے بلکہ نہ صرف اخلاق بلکہ مکارم اخلاق (اعلیٰ اخلاق) کا اعتراف مضمر ہے۔ البتہ ان میں افراط وتفریط ہے جس کی اصلاح کی ضرورت ہے یہی تکمیل ہو۔ واللہ اعلم

نعمان بن منذر کی یہ بات صحیح تھی (جو اُس نے شہنشاہِ ایران کے دربار میں کہی تھی)، کہ معمولی عرب جس کا کل اثاثہ ایک اونٹنی ہے۔ اگر اُس کے یہاں مہمان آجاتا تو وہ اُس میں بڑی خوشی محسوس کرتا تھا کہ اپنی زندگی کی پونجی (اس اونٹنی) کو ذبح کردے اور دل کھول کر اپنے مہمان کی مدارات کرے۔ قبیلہ طے کا سردار "حاتم" سخاوت میں مشہور تھا۔ وہ صرف دو چیزیں محفوظ رکھتا تھا اور باقی سب کچھ بخش دیا کرتا تھا۔ گھوڑا اور اسلحہ۔ مگر موسم سرما میں ایک روز ایسا ہوا کہ وہ تہی دست تھا۔ اس کے یہاں فاقہ تھا۔ رات ہوئی تو بچوں کو بھوکے پیٹ کسی طرح لوری دیکر اور تھپک تھپک کر سُلا دیا۔ مگر جب بچے سو چکے تو خیمہ کا ایک کنارہ اُٹھا۔ اور ایک عورت اپنے بچے ساتھ لئے ہوئے خیمہ میں داخل ہوئی اور حاتم سے فریاد کی کہ وہ خود بھی بھوکی ہے۔ بچے بھی بھوک سے تڑپ رہے ہیں۔ رات آدھی ہو رہی ہے۔ مگر بھوک کی وجہ سے نہ اس کو نیند آتی ہے نہ بچوں کو۔

ابھی عورت کے یہ الفاظ پورے نہیں ہوئے تھے کہ حاتم اُٹھا۔ چھری ہاتھ میں لی اور اپنے محبوب گھوڑے کو ذبح کر ڈالا۔ پھر آگ جلائی اور چھری اس عورت کو دیدی کہ گوشت کے پارچے کاٹے اور خود کھائے اور بچوں کا پیٹ بھرے۔ پھر حاتم اپنے خیمے سے نکلا اور قرب وجوار کے تمام غریب لوگوں میں گھوم آیا کہ گھوڑا ذبح ہوا ہے چلو گوشت کھاؤ۔ چنانچہ آس پاس کے تمام لوگ آ گئے۔

حاتم کی بیوی کا بیان ہے کہ تھوڑی دیر میں گوشت ختم ہو گیا صرف ہڈیاں باقی رہ گئیں اور حاتم اور اس کی بیوی اور بچے جیسے پہلے بھوکے تھے اب بھی بھوکے رہے کسی کو ایک بوٹی بھی نصیب نہیں ہوئی [1]۔

شیخ قبیلہ رات کو اونچی جگہ پر آگ جلوا دیا کرتا تھا۔ اس طرف سے گذرنے والے

---

[1] عقد الفرید ص۱۰۸ ج۱ وغیرہ

مسافر اور قافلے، آگ کو دیکھ کر قبیلے میں پہونچتے شیخ قبیلہ اُن کا میزبان[1] ہوتا۔

لطف یہ ہے کہ یہ آنے والے مسافر اگر عرب ہوتے تو وہ اس کو اپنا حق[2] سمجھتے تھے کیونکہ وہ خود اپنے قبیلہ میں آنے والوں کی اسی طرح مدارات کیا کرتے تھے۔

ایسی ضیافتوں کے لئے ہر وقت سامان تیار رہتا تھا۔ ایک عورت نے اپنے شوہر کی یہ خصوصیت فخریہ بیان کی تھی:

"اس کے اونٹ زیادہ اصطبل ہی میں رہتے ہیں۔ تھوڑے سے اونٹ چراگاہوں میں بھیج دیئے جاتے ہیں یہ اونٹ جیسے ہی باجے کی آواز سنتے ہیں یقین کر لیتے ہیں کہ اب ذبح ہو جائیں گے"۔[3]

اس خاتون کے ان مختصر الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اس کے شوہر کا طریقہ یہ ہے کہ جب مہمانوں کے آنے کی اس کو اطلاع ملتی ہے تو وہ اُن کے استقبال میں باجے

---

[1] حضرت خدیجہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف شمار کرتے ہوئے فرمایا تھا: تقری الضیف "آپ مہمانوں کی ضیافت کیا کرتے ہیں"۔ تو مہمانوں سے ایسے ہی مہمان مراد تھے۔ تفصیل نزول وحی کے تذکرہ میں آگے آئے گی۔ انشاء اللہ

[2] متعدد احادیث (مثلاً حدیث عقبۃ بن عامر جس میں یہ ہے: خذوا من حق الضیف الذی ینبغی لھم (بخاری شریف ص۹۰۶)۔ نیز حدیث ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ جس میں یہ ہے لقد استضفنا کم فلم تضیفونا (بخاری شریف ص۳۰۴) اس حق کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں نہ کوئی بازار ہو نہ مسافروں کی سرائے وہاں انسانی ہمدردی کا تقاضہ یہ ہے کہ مسافر کو مہمان مانا جائے۔ ہندوستان میں بھی یہ رواج ہے۔ فرق یہ ہے کہ ہمارے یہاں اجنبی مسافر کو سر پڑا مہمان سمجھا جاتا ہے اور عرب اُس کو معزز مہمان سمجھتے تھے اور اس کی وہی مدارات کیا کرتے تھے جیسے مدعو مہمان کی۔ سنا ہے عرب قبائل میں اب بھی یہ جذبہ ہے (۳ بخاری شریف ص۷۸ حدیث ام زرع)۔

بجوانا ہے اور جب وہ آجاتے ہیں تو اونٹ ذبح کراکر بڑے حوصلہ سے اُن کی ضیافت کرتا ہے۔ یہ صورت گاہے گاہے نہیں ہوتی بلکہ اتنی کثرت سے ہوتی رہتی ہے کہ عقل و شعور سے محروم اونٹ بھی اس سے آشنا ہو گئے ہیں کہ جہاں وہ باجے کی آواز سنتے ہیں یقین کر لیتے ہیں کہ اب اُن کا نمبر آگیا کیونکہ مہمان آئے ہیں جن کی مدارات کے لئے اُن کو یقیناً ذبح کر دیا جائے گا[1] اور چونکہ مہمانوں کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں اس لئے وہ اپنے اونٹ چراگاہ نہیں بھیجتا کہ وہاں سے منگوانے میں دیر ہوگی۔ بلکہ مکان کے قریب ہی اصطبل (مبرک) میں اُن کو محفوظ رکھتا ہے اور اُن کے چارے کا خرچ برداشت کرتا رہتا ہے۔

میزبانی اور مہمانی کی تقریب کے علاوہ بڑے آدمی کی شان یہ ہوتی تھی کہ اس کے ہاں خورونوش کی مجلسیں آباد رہیں۔ رقص و سرود بھی رہے اور غربا پروری بھی۔ قومی شعراء ایسی مجالس کی تعریفوں میں رطب اللسان رہتے تھے۔ سیکڑوں اشعار اس کی شہادت میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن یہاں صرف ایک عورت کا بیان نقل کیا جارہا ہے جس سے عرب کے تمدن پر روشنی پڑتی ہے۔ اس عورت کا نام کبشہ بتایا گیا ہے:

زوجی رفیع العماد، طویل النجاد، عظیم الرماد، قریب البیت من النادِ[2]

اس باسلیقہ خاتون نے چار لفظ بولے ہیں۔ مگر ہر لفظ اس دور کے تہذیب و تمدن کے پورے پورے باب کا عنوان ہے۔

(الف) امراء اور رؤسا (شیوخ) اپنے محل کے لئے بلند مقام تجویز کرتے تھے[3]۔

---

[1] مجمع البحار۔ تحت لفظ زھر [2] بخاری شریف ص۷۸۰ حدیث ام زرع۔

[3] بڑے لوگ اپنے محلات بلند مقام پر اس لئے بناتے تھے کہ باہر سے آنے والے وفود آسانی سے پہنچ سکیں خصوصاً رات کی اندھیری میں ان کی روشنی رہنما ثابت ہو۔ (فتح الباری ص۲۱۶ ج۹)

مکان کی چوکی بھی اونچی رکھتے تھے ۔ دروازے بڑے بڑے ۔ دیوان خانوں کے ستون بہت اونچے اونچے ۔خوش منظر اور ہوادار ہونے کے علاوہ اس بلندی کا مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ باہر سے آنے والوں کو تلاش اور پوچھ گچھ کی ضرورت نہ پیش آئے۔ رات کے وقت بلند مکان کی کسی بلند جگہ پر آگ جلادیا کرتے تھے تو رہنمائی کے کے علاوہ صاحب خانہ کی طرف سے سفر کرنے والوں کے لئے قیام وطعام کی خاموش پیش کش بھی ہو جاتی تھی ۔

کبشہ نے اپنے پہلے لفظ میں اس تمام تفصیل کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میرے شوہر کے محل کے ستون بہت بلند ہیں جن کی وجہ سے یہ محل دُور سے نظر آتا ہے ۔ اور آنے والے قافلے ، وفود ، اور رات کو سفر کرنے والے آسانی سے وہاں پہنچ جاتے ہیں[1]

(ب) دوسرے لفظ طویل النجاد سے اشارہ کیا ہے کہ وہ بہادر ، باوجاہت اور تلوار کا دھنی ہے ۔

(ج) تیسرا لفظ عظیم الرماد یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس کے یہاں مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا ہے ۔ ہر وقت کھانے پکتے رہتے ہیں ۔ پکانے والوں کو اتنی فرصت بھی نہیں ملتی کہ تنوروں اور چولھوں کی راکھ صاف کر دیں ۔ اس لئے راکھ کے ڈھیر لگتے رہتے ہیں۔

(د) چوتھے لفظ کا منشا یہ ہے کہ وہ عوامی لیڈر ہے ۔ دانش منداور صاحب الرائے ہے ۔ نادی یعنی قبیلہ کی پنچایت گھر کے قریب ہی اس کو اپنی قیام گاہ اور آرام گاہ رکھنی پڑتی ہے ۔ تاکہ لوگ آسانی سے مل سکیں اور یہ اُن کو مشورہ دے سکے ۔

اب یہ معلوم کر لینا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ بیرونی مہمانوں یا مقامی احباب کی دعوت میں بکری یا دنبے کا گوشت یا مرغ مسلم نہیں پیش کیا جاتا تھا ۔ نہ ایسے گوشت کی کوئی اہمیت اور قدر تھی ۔ صرف اونٹ کے کوہان کا گوشت ان کی نظر میں مخصوص طعام

---

[1] فتح الباری صـ ۲۱۶ ج ۹

ہوتا تھا۔ بڑے لوگوں کی میزبانی یہی ہوتی تھی کہ اونٹ کے کوہان کا گوشت اس کے پسندے اور رائش کے کباب پیش کریں۔ ظاہر ہے یہ اسراف اور فضول خرچی کی آخری حد تھی۔

قریش کے بڑے بڑے سردار اور رؤسا، عتبہ، اُمیہ بن خلف، ابوجہل وغیرہ جو جنگ بدر میں مارے گئے تھے اور جن کی لاشیں ایک پُرانے کنویں میں جو اب بیکار ہوچکا تھا، ڈلوادی گئی تھیں اُن کے ہم مشرب اور ہمدرد شاعر ابوبکر بن شعوب نے اُن کے مرثیہ میں کہا تھا[1]

وماذا بالقلیب قلیب بدر — من الشیزی تـزین بالسنام
وماذا بالقلیب قلیب بدر — من القینات والشرب الکرام[2]

---

[1] بخاری شریف ص۵۵۵

[2] ابن ہشام نے اس مرثیہ کے ۹ شعر نقل کئے ہیں مطلع یہ ہے۔ تحیی بالسلامۃ ام بکر وھل بعد قومی من سلام "ام بکر (بیوی کی کنیت) مجھے سلام کرتے ہوئے سلامتی کی دعا دیتی ہے کیا سلامتی کی دعا کا کوئی موقع ہے جب میری قوم ختم ہو چکی"۔ دلچسپی کے لئے آخری شعر ملاحظہ فرمایئے یحدثنا الرسول بان سنحیا ÷ وکیف حیاۃ اصداء وھام "یہ جو رسول ہیں ہم سے کہتے ہیں کہ ہم عنقریب زندہ کئے جائیں گے اور حالانکہ جبکہ مرنے والوں کی رُوحیں صدار اور ھام بن چکیں تو پھر وہ دوبارہ زندگی کیسے پا سکتے ہیں" اُن کا عقیدہ تھا کہ جس مقتول کا قصاص نہ لیا جائے تو اس کی رُوح اُلّو (بوم) میں حلول کر جاتی ہے اور پکارتی پھرتی ہے کہ اسقونی اسقونی "پیاسی ہوں مجھے پانی پلاؤ" جب قصاص لے لیا جاتا ہے تب یہ صورت ختم ہو جاتی ہے۔ اُلّو کو صدار اور اس قسم کی رُوح کو ھام کہا کرتے تھے۔ ھام کے معنی کھوپڑی کے بھی ہیں اُن کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ یہ رُوح کھوپڑی کے راستہ سے نکلتی ہے اس لئے روح کو ھام کہا کرتے تھے۔ بخاری نے صرف یہ چار شعر نقل کئے ہیں۔ قصیدے کی جان یہی ہیں۔ ہمارے موضوع سے متعلق صرف یہ دو شعر تھے جو نقل کئے گئے۔

یہ کیا ہے؟ اس کنوئیں میں جس کو قلیبِ بدر کہا جاتا ہے، وہ سردار پڑے ہوئے ہیں جن کے یہاں آبنوس کی کشتیاں (طشت) (دعوت کے موقع پر) پیش کی جاتی تھیں جو کوہان کے گوشت سے آراستہ ہوتی تھیں۔ (جن پر کوہان کے پارچے اور کباب چنے ہوئے ہوتے تھے)

اور یہ کیا ہے کہ بدر کے اس اندھے کنوئیں میں ان سرداروں کو دیکھ رہا ہوں جن کے یہاں معززین کا اجتماع ہوتا تھا۔ گانے والیاں اپنا فن دکھاتی تھیں۔ شراب کا دور چلتا تھا۔ ان کی محفلیں خورونوش اور رقص وسرود سے پُرکیف رہتی تھیں [1]

کوہان کا گوشت اگرچہ گراں پڑتا تھا کیونکہ چند سیر گوشت کے لئے پورا اونٹ ختم کرنا ہوتا تھا۔ مگر من چلے سردار سخاوت کی جولانیوں کو اقتصاد کے پیمانے سے نہیں ناپتے تھے۔ معمولی سا اشارا ہوا اور کوہان حاضر۔

محفلِ مے میں مغنیہ نے حضرت حمزہؓ کو مخاطب کرکے کہدیا۔ الا یا حمز للشرف النواء۔ ("ہاں ہاں حمزہ۔ یہ اونچے کوہان والی فربہ اونٹنیاں") حضرت حمزہ فوراً اٹھے۔ دو اونٹنیاں جو صحن میں کھڑی ہوئی تھیں اُن کے کوہان تراش لئے۔ کوکھیں چاک کرکے ان کے جگر نکال لئے۔ یاران محفل کی خوشی کے لئے انھیں کی ضرورت تھی [2]

---

[1] فتح الباری ومجمع البحار [2] یہ سید الشہداء حمزہ ہیں رضی اللہ عنہ۔ اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔ اور جب حرمت شراب کا اعلان ہوا تو انھیں مے خواروں نے جن کی گھٹی میں شراب پڑی تھی وہ مستعدی دکھائی جس کی نظیر نہیں مل سکتی جیسے ہی کانوں میں آواز پڑی کہ شراب حرام ہوگئی تو تحقیق کی ضرورت بھی نہیں سمجھی جو ہاتھ جام وسبو کی گردش میں مصروف تھے مٹکوں کی طرف بڑھے اور خُم ہارے ریزہ ریزہ کردیئے گئے۔ گلی کوچوں میں شراب کا سیلاب آگیا۔ چلنا پھرنا مشکل ہوگیا (بخاری شریف [3])

[3] بخاری شریف ص ۳۱۹ و ص ۳۲۰

حجر بن خالد اپنی مہمان نوازی[1] کی صورت ــــ یہ بیان کرتا ہے۔

یحلب ضرس الضیف فینا اذا شتی

سدیف السنام تستریہ اصابعہ

یعنی موسم سرما میں جب کہ عموماً قحط ہوا کرتا ہے ہم اپنے مہمان کی مدارات اس طرح کرتے ہیں کہ کوہان کے پارچے اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ وہ چربی دار بوٹیوں کو خود منتخب کرتا ہے جن کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ کھاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی داڑھ دودھ دُوہ رہی ہے اور اس بوٹی سے دُودھ کی دھاریں چھوٹ رہی ہیں۔

سبرۃ بن[2] عمر فقعسی نے مندرجہ ذیل شعر میں اگرچہ اپنے قبیلہ کا بجٹ پیش کیا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ عرب کے ہر ایک قبیلہ کا آمد و خرچ یہی ہوا کرتا تھا:

نحابی بھا اکفاءنا و نُھینھا

و نشرب فی اثمانھا و نقامر

یعنی اونٹوں سے چار کام لئے جاتے ہیں۔

ہم سر[1] اور ہم کفو (دوستوں اور رشتہ داروں) کو بخشش میں دیئے جاتے ہیں مہمانوں[2] کے لئے ذبح کئے جاتے ہیں۔ اُن کی جو قیمت وصول ہوتی ہے وہ شراب[3] نوشی اور قمار بازی[4] (جوئے) میں خرچ کر دی جاتی ہے۔

یہ سخاوت جو فضول خرچی کی حدود کو بھی پار کر جاتی تھی۔ اُن کے ضابطۂ اخلاق میں صحت مندی تھی۔ اس کے برخلاف کنجوسی کے متعلق یہ تصور تھا:

ای داءٍ ادوأ من البخل[3]

---

[1] دیوان حماسہ [2] ایضاً [3] بخاری شریف صلى ۴۴۲

کونسی بیماری بخل سے زیادہ خراب بیماری ہوسکتی ہے

چُستی، مستعدی، جفاکشی خود اعتمادی اور بہادری	خشک و بے آب و گیاہ صحرا اور گرم پہاڑوں میں اُن کی قبائلی زندگی نے اُن کو قدرتی طور پر جفاکش

محنتی اور چُست بنادیا تھا۔ تھوڑی سی غذا پر قناعت اور ہر وقت چوکنا اور ہوشیار رہنا اُن کا مزاج بن گیا تھا۔

نوجوان کی تعریف یہ تھی:

مضجعہ کمسل شطبۃ - وتشبعہ ذراع الجفرۃ [1]

یعنی پیر پھیلا کر نہیں سوتا۔ کروٹ سے کچھ نیند لے لیتا ہے۔ مگر سونے کے وقت بھی اُس کی چستی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کروٹ بستر پر نہیں لگتی۔ بلکہ بستر سے الگ اُٹھی ہوئی رہتی ہے جیسے برہنہ تلوار زمین پر رکھ دی جائے تو اُسکے بیچ کا خمدار حصہ زمین سے اُٹھا رہے گا اور اس چستی، مستعدی اور کم خوابی کے ساتھ خوراک کی حالت یہ ہے کہ بکری کے بچّہ کے صرف ایک دست کا گوشت اس کو شکم سیر کر دیتا ہے۔

عرب میں کوئی سلطنت نہیں تھی۔ نہ پولیس یا فوج کا کوئی نظام تھا۔ ہر ایک قبیلہ اپنی جگہ آزاد مملکت تھا۔ وہ اپنی آزادی کا خود ذمہ دار اور محافظ ہوتا تھا۔ پھر جس طرح قبیلہ کو اپنے اوپر اعتماد کرنا پڑتا تھا۔ ایسے ہی اس کا ہر ایک فرد بھی خود اعتمادی کا پیکر ہوتا تھا۔ وہ اپنے اشعار اور قصائد میں انہیں اوصاف پر فخر کیا کرتے تھے۔

تأبّط شرا اپنی حالت بیان کرتا ہے:

قلیل غرار النوم اکبر ھمہ — دم الثار او یلقی کمیا مسقعا

قلیل ادّخار الزاد الا تعلۃ — فقد نشز الشرسوف والتصق المعا

"نیند کا تھوڑا سا جھپکا لے لیتا ہے (یہی اس کا معمول ہے) اس کی تمام توجہ اس

---

[1] بخاری شریف صفحہ ۷۸۰

میں مصروف رہتی ہے کہ دشمن سے قصاص کس طرح لے یا کسی ایسے مسلح بہادر سے جو ایسا جفاکش اور جنگجو ہو کر جنگ بازی سے اُس کے چہرہ کا رنگ بدل گیا ہو۔) مقابلہ کس طرح کرے۔

وہ صرف طبیعت کو بہلانے کے لئے تھوڑا سا توشہ اپنے ساتھ رکھتا ہے اور قلّتِ غذا کے سبب سے وہ ایسا دُبلا ہو گیا ہے کہ پسلیوں کی ہڈیوں کے سرے اوپر کو اُبھر آئے ہیں اور انتڑیاں جڑ گئی ہیں (ایک دوسرے سے مل گئی ہیں)۔"

مَردوں کی طرح خود اعتمادی عورتوں میں بھی ہوتی تھی۔ ازدواجی تعلقات میں بھی خود اعتمادی کی پوری جھلک ہوتی تھی۔ بظاہر یہی سبب تھا کہ رشتہ نکاح ایک دوسرے کو عمر بھر کے لئے جکڑ بند نہیں کر دیتا تھا۔ جب ضرورت ہوتی طلاق کے ذریعہ یہ رشتہ توڑ دیا جاتا تھا۔ پھر مطلقہ کے بھی طلبگار رہتے تھے۔ نکاح اور طلاق زندگی کے معمولی واقعات سمجھے جاتے تھے۔

پابندیٔ قول وعمل قول و پیمان کی پابندی، بدعہدی سے نفرت، اپنی روایات کو زندہ رکھنا اور ضرورت پڑے تو تحفظ روایات کے لئے مرمٹنا، عرب کے جوہری اوصاف تھے۔ وہ شخص عرب کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا تھا جو ان اوصاف کا حامل اور امین نہ ہو۔ بڑے بڑے قومی شعراء کے قصائد کا موضوع یہی اوصاف ہوا کرتے تھے اور انہیں اوصاف کے معیار پر قبائل کی عظمت و شرافت کے مراتب قائم کئے جاتے تھے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) سید البشر محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا سفر ہجرت قریش مکہ کے علی الرغم ایک انقلاب انگیز مگر نہایت پُرخطر اور حد درجہ رازدارانہ اقدام تھا۔ اس سفر کا بیدا انتظام سب سے زیادہ فداکار اور رازدار مخلص رفیق ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس رازداری کے ساتھ کیا کہ اپنے والد ماجد ابو قحافہ رضی اللہ عنہ کو بھی اس کی خبر نہیں ہونے دی۔

خفیہ راستوں سے سفر کی کامیابی کا مدار۔ رہنمار سفر کی مہارت اور اس کی خیر خواہی اور دیانتداری پر ہوتا تھا ایسے ماہرین سفر کو خرّیت کہا جاتا تھا۔

سب سے زیادہ عجیب بات جو اس موقع پر عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ اس نہایت پُرخطر اور رازدارانہ سفر کا خرّیت کوئی مسلمان نہیں تھا۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو منتخب کیا تھا جو کفار قریش[1] کا ہم مذہب تھا ——— وہ اونٹنیاں جن پر یہ خطرناک سفر طے کرنا تھا اسی خرّیت کے حوالے کردی گئی تھیں جس کا نام عبداللہ بن اریقط تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ رات کی اندھیری میں مکّہ سے روانہ ہوئے غار ثور میں روپوش ہو گئے، تین روز وہاں قیام فرمایا۔ قریش مکّہ نے ان کو گرفتار کرنے والے کے لئے بڑے بڑے انعام کا اعلان کردیا۔ اور خدا جانے اس انعام کے لالچ میں کتنے لوگ دوڑے۔ لیکن عبداللہ بن اریقط کو کوئی بھی لالچ متاثر نہیں کرسکا۔ وہ طے کردہ پروگرام کے مطابق تیسرے روز ٹھیک وقت پر دونوں اونٹنیاں لے کر "غار ثور" پر پہونچا اور ہجرت کرنے والے رفقاء کو لے کر غیر معروف راستہ سے روانہ ہوگیا اور تقریباً تین سو میل لمبی مسافت کو چار روز میں طے کراکر مدینہ طیبہ پہونچا دیا۔ کفار قریش کے ہم مذہب عبداللہ بن اریقط کی یہ وفاداری کیا اس لئے تھی کہ وہ اپنے پیشہ خرّیتی (رہنمائی) میں دیانتدار تھا یا اس لئے تھی کہ وہ درپردہ اسلام کا خیر خواہ تھا؟

اس واقعہ کی روایت کرنے والی حضرت عائشہؓ ابن اریقط کی وفاداری اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے اعتماد کی وجہ یہ بیان فرماتی ہیں:

قد غمس حلفا فی آل العاص بن وائل السھمی .... فامناہ

اُس نے عاص بن وائل السہمی کے خاندان سے وہ معاہدہ کر رکھا

---

[1] علیٰ دین کفار قریش۔ بخاری شریف ص۵۵۳

تھا جس کو یمین غموس[1] کہا کرتے تھے۔ اس پر یہ دونوں مقدس بزرگ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ) مطمئن ہو گئے تھے۔

عاص بن وائل سہمی وہی رئیس ہے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حلیف تھا۔ جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

(۲) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو پورا مکہ بیافروختہ ہوگیا۔ ایک بہت بڑا ہجوم ان کے مکان پر چڑھ دوڑا۔ آپ کے صاحبزادے عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) بیان فرماتے ہیں: میں مکان کی چھت پر کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا پورا میدان برافروختہ ہجوم سے پٹا ہوا تھا۔ سب طرف یہی شور تھا:

صبا عمر "عمرؓ دین سے پھر گیا"۔

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ ایک شخص آیا۔ بڑی شان و شوکت کا آدمی تھا۔ یمنی ازار اور چادر جو حبرہ کہلاتی تھیں زیب تن تھیں۔ قمیص میں ریشمی کپڑے کی کفیں لگی ہوئی تھیں، وہ مجمع کو چیرتا ہوا مکان کے اندر والد صاحب (حضرت عمرؓ) کے پاس پہونچا۔ ان سے دریافت کیا کیا بات ہے۔ یہ ہجوم کیسا ہے؟ آپ کی قوم کے آدمی کہہ رہے ہیں کہ عمر کو مار ڈالیں گے اس جرم میں کہ میں مسلمان ہوگیا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔ اس رئیس نے برجستہ کہا ہرگز ایسا نہیں کر سکتے میں نے تم کو امن دیدیا۔

---

[1] بڑے پیالہ یا بادیہ میں خون یا خاص قسم کا خوشبودار سیال جس کو خلوق کہا کرتے تھے۔ یا رنگ دار پانی بھر کر اس میں معاہدہ کرنے والے ہاتھ ڈال کر عہد کیا کرتے تھے اس کو یمین غموس کہا کرتے تھے۔ ہندوستان میں بھی پانی میں نمک ڈال کر معاہدہ کیا کرتے تھے کہ اگر ہم اس کی خلاف ورزی کریں تو نمک کی طرح گھل کر فنا ہو جائیں۔

یہ رئیس حضرت عمر فاروق سے یہ گفتگو کرکے باہر آیا۔ لوگوں کو مخاطب کیا۔ یہ ہجوم کیسا ہے۔ کیا چاہتے ہو۔ ہجوم نے جواب دیا۔ عمر اپنے دین سے برگشتہ ہوگیا ہے۔ ہم اس کو قتل کریں گے۔

رئیس: عمر میری پناہ میں ہیں تم اُن کا بال بیکا نہیں کرسکتے۔

عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں' جیسے ہی اس شخص کی زبان سے امن اور پناہ کے الفاظ نکلے سارا مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔ یہ شخص کون ہے مجھے بتایا گیا یہ عاص[1] بن وائل ہے۔ قبیلہ بنوسہم کا سردار جو ہمارے قبیلہ کا حلیف[2] ہے۔

---

[1] تاریخ اسلام کے مشہور سیاستداں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دستِ راست حضرت عمرو بن العاص کے والد (قسطلانی ج۶ ص۲۴۴) اور مشہور عابد و زاہد صحابی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے دادا۔ یہ عاص بن وائل جس کو عاصی بن وائل بھی کہتے ہیں مسلمان نہیں ہوا ہجرت سے پہلے اس کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بیٹے عمرو بن العاص واقعۂ ہجرت سے چھ سال بعد مسلمان ہوئے مگر جو معاہدات تھے وہ عاص بن وائل کے مرنے سے ختم نہیں ہوئے۔ عبداللہ بن اریقط اسی خاندان کا حلیف تھا اور عجیب بات یہ ہے کہ عاص بن وائل ان چار مشہور افراد میں سے ایک تھا جو دہریہ اور زندیق مشہور تھے۔ معاذاللہ خدا کو بھی نہیں مانتے تھے۔ یہ چار یہ تھے: عاص بن وائل، عقبہ بن ابی معیط، ولید بن مغیرہ، ابی بن خلف۔ عینی شرح بخاری ص۲۴۴ ج۷۔ یہی عاص بن وائل ہے کہ حضرت خبّاب بن ارتؓ کے کچھ دام اس پر واجب تھے انھوں نے تقاضا کیا تو عاص نے جواب دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ چھوڑ دو تو میں دام ادا کروں گا۔ حضرت خباب نے جواب دیا: تُو مر جائے' مر کر زندہ ہو تب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ عاص کو اب مذاق سوجھا۔ اُس نے کہا جب میں مر کر زندہ ہوں گا تو میری دولت اور میری اولاد بھی مجھے ملے گی بس تمہارے دام وہاں ادا کردوں گا۔ بخاری شریف ص۳۰۲

[2] لیکن معاہدات کا معاملہ عقائد سے جدا تھا۔ ایک طرف اسلام کا سخت مخالف' دوسری جانب حضرت عمرؓ کو پناہ دے رہا ہے۔ لقد صدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ یؤید ھذا الدین بالرجل الفاسق۔ ۱۲ بخاری شریف ص۵۴۵

(۳) ابوسفیان، قریش مکہ کا سربراہ، اسلام اور مسلمانوں کا سخت دشمن، جنگ احد کا بانی جو غزوۂ احزاب میں مسلمانوں سے بُری طرح شکست کھا چکا تھا جس کے بعد اس کی قیادت کا آفتاب بھی ڈھلنے لگا تھا۔ وہ قریش کے تاجروں کے ساتھ شام پہنچا ہوا ہے۔ شہنشاہِ روم "ہرقل" بھی یروشلم کی زیارت کے لئے شام آیا ہوا ہے۔ اسی زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب گرامی ہرقل "عظیم الروم" کے نام پہونچتا ہے۔ ہرقل اس " مدعی نبوت " ذاتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ اور جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ عمائدین مکہ۔ بسلسلۂ تجارت یہاں آئے ہوئے ہیں تو انھیں دربار میں طلب کرتا ہے۔ ابوسفیان امیر قافلہ تھے۔ لہٰذا ان سے سوالات کرتا ہے۔

ہرقل نے اپنے طور پر ایسا انتظام کر لیا تھا کہ ابوسفیان اس پر مجبور ہوں کہ وہ ہر ایک سوال کا جواب صحیح صحیح دیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ابوسفیان نے ہر ایک سوال کا جواب نہایت معقول اور نہایت صحیح دیا۔ مگر اس بنا پر نہیں کہ وہ ہرقل کے انتظام سے متاثر تھا بلکہ خود ابوسفیان کے الفاظ میں اس کی وجہ یہ تھی:

فواللہ لولا الحیاء یومئذ من ان یاثر اصحابی عنی
الکذب لکذبت عنہ حین سالنی عنہ۔ [1]

"یعنی مجھے اس سے شرم آئی کہ میرے ساتھی یہ کہیں گے کہ میں نے غلط بیانی کی
قسم بخدا اگر یہ شرم نہ ہوتی کہ میرے ساتھی میری غلط بیانی نقل کریں گے تو میں
اپنی طرف سے کچھ باتیں کہدیتا جب وہ مجھ سے سوال کر رہا تھا [1]

---

[1] بخاری شریف ص۱۲۴ و ص۴

معاہداتی حکومت

عرب کے آزاد خود مختار قبائل جن کی گردنیں کسی بادشاہت یا شاہنشاہیت کے سامنے کبھی نہیں جھکیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ قول و قرار اور عہد و پیمان کی شوکت و حشمت کے سامنے اُن کی گردنیں ہمیشہ خم رہتی تھیں۔

جب پُورے ملک میں حکومت کا کوئی نظام نہیں تھا تو ظاہر ہے پولیس یا فوج کا بھی کوئی سلسلہ سرزمین عرب میں نہیں تھا۔ البتہ پابندی عہد کے اصول نے پورے عرب میں ایک ایسا نظام قائم کر دیا تھا جو باضابطہ حکومت کی طاقت اپنے اندر رکھتا تھا۔ اس کی موجودگی میں اُن کو پولیس یا فوج کی بھی ضرورت نہیں تھی کیونکہ افراد کے جان و مال کی حفاظت جو پولیس کا کام ہوتا ہے اور بیرونی حملہ آوروں کا دفاع جو فوج کا فرض ہے، یہ معاہداتی نظام ان تحفظات کا ذمہ دار تھا۔

قبائل کے معاہداتی گروپ تھے۔ جو فرد کسی گروپ سے تعلق رکھتا تھا تو پورا گروپ اس کی حفاظت کا ذمہ دار تھا۔ اگر اس کا بال بیکا ہوتا تو پورے گروپ کی ہزاروں تلواریں اس کا انتقام لینے کے لئے برہنہ ہو جاتیں۔ کسی فریاد کرنے والے کی فریاد پورے گروپ کے جذبات حمایت کے لئے چنگاری کا کام کرتی تھی۔ یہ فریاد اور دُہائی ہی دعویٰ ہوتی تھی اور یہی دلیل۔ اب تحقیق و تفتیش بھی پہلوتہی اور بزدلی سمجھی جاتی تھی۔ قریط بن انیف شاعر، قبیلہ بنی مازن کی خوبی یہ بیان کرتا ہے:

(۱) قوم اذا الشر ابدی ناجذیہ لھم — طاروا الیہ زرافات ووحدانا

(۲) لا یسئلون اخاھم حین یندبھم — فی النائبات علی ما قال برھانا[۱]

ترجمہ (۱) بنی مازن ایسی قوم ہے کہ جب جنگ اُن کے سامنے دانت نکالتی ہے تو وہ اکٹھے

---

[۱] دیوان حماسہ

اُس کے پاس پہونچ جاتے ہیں۔ ٹولی بن کر گروہ در گروہ یا اکیلے اکیلے۔ جیسا موقع ہوتا ہے، دوڑ پڑتے ہیں اس کا نہیں خیال کرتے کہ تنہا جا رہے ہیں یا جماعت اور گروہ میں۔

(۲) جب اُن کا بھائی (اُن کے گروپ کا آدمی) ہنگاموں میں اُن کو پکارتا ہے (کوئی فریاد کرتا ہے) تو پھر اُس کے دعوے اور قول کے لئے کوئی دلیل نہیں مانگتے

ایک اور شاعر کہتا ہے:

انی لمن معشر افنی اَوَائِلَھُمْ قول الکماۃ الا این المحامونا[1]

میں ایسے معاشرہ (سماج) کا فرد ہوں جس کے متقدمین ختم ہو چکے ہیں اور اُن کے ختم ہونے کا سبب بہادروں کی یہ پکار ہوا کرتی تھی:

الا این المحامونا "کہاں ہیں ہمارے حمایتی۔"

یعنی جہاں انھوں نے یہ پکار سُنی، وہ فوراً حمایت کے لئے میدان جنگ میں پہونچ جاتے تھے اور وہیں ختم ہو جاتے تھے۔

وداک بن ثمیل مازنی نے اپنے بہادروں کی تعریف یہ کی ہے:

اذا استنجدوا لم یسئالوا من دعاھم لایۃ حرب ام بای مکان

"جب اُن سے مدد مانگی جاتی ہے تو یہ نہیں دریافت کرتے کہ طالب کون ہے۔ کس لڑائی کے لئے کس مقام پر لڑنے کے لئے دعوت دے رہا ہے۔ نہ یہ تحقیق کرتے ہیں کہ کس جنگ کے لئے۔"

بیشک لڑائیوں کے طویل طویل سلسلوں نے اس دور کی تاریخ کو وحشتناک بنا رکھا ہے لیکن جنگ کی بنیاد عموماً یہی معاہداتی حمیت ہوتی تھی، یعنی گروپ کے کسی فرد کو کسی نے جانی یا مالی نقصان پہونچا دیا ہے تو یا تو اس کے نقصان کی تلافی کی جائے ورنہ اعلان جنگ۔

---

[1] دیوان حماسہ صکا

جنگ کے شعلے پہلے دو قبیلوں میں بھڑکتے تھے پھر رفتہ رفتہ پُورے پورے گروپ اُن کی لپیٹ میں آجاتے تھے۔

اس تصادم اور تقابل میں پناہ کا ذریعہ صرف وہ مہینے ہوتے تھے جو باتفاق عرب اشہرحرم کہلاتے تھے، جن میں اسلحہ اُتار دیئے جاتے تھے اور قتل وخون ظلم و فساد ممنوع سمجھا جاتا تھا۔ یہ بین القبائلی رواج عقیدہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

ان میں ایک مہینہ رجب کا ہوتا تھا جس کو منصل الاسنہ کہا کرتے تھے یعنی نیزوں کے بھال اُتار دینے والا مہینہ۔

قبائلی پاسپورٹ اور ویزا

یہ معاہداتی گروپ جس طرح جنگ یا طوالت جنگ کا ذریعہ بن جاتے تھے یہ تحفظ کا ذریعہ بھی ہوا کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ معاہدات کی غیر معمولی پابندی صرف اخلاقی قدر نہیں تھی بلکہ اقتصادی ضرورتوں اور معاشی وسماجی مصلحتوں کا بھی تقاضا تھا کہ معاہدات کی پوری پابندی کی جائے۔ ہر ایک قبیلہ پھر ہر ایک معاہداتی گروپ کا ایک حلقہ ہوتا تھا۔ اس حلقہ کے حدود میں کوئی شخص بلا اجازت داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن اگر کسی نے اجازت حاصل کر لی ہے تو جہاں تک اس گروپ کے حلقہ کی حدود میں اس کی حفاظت اس گروپ کے ذمہ ہوتی تھی۔ تجارتی قافلے اسی طرح کی اجازتوں کی پناہ میں منزلیں طے کرتے تھے۔

حرب فجار[1] کا چوتھا دور جس کے معرکوں میں ابو طالب وغیرہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمام، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی لے گئے تھے اور اس وقت عمر مبارک

ابن قتیبہ نے فجار اول وثانی کی تفصیل بیان کی ہے۔

(معارف ص۲۰۱) مزید تفصیل شیخ محمود سید الطہطاوی نے بیان کی ہے (سیرۃ ابن ہشام مطبوعہ بمطبع محمد علی۔ مصر، حاشیہ ص۱۱۵) اموی نے اور تفصیل سے ایام جاہلیت کا تذکرہ کیا اور

تقریباً چودہ [1] سال تھی۔ اس دور چہارم کا محرک بھی اسی قسم کا اجازت نامہ تھا۔

حیرہ کا راجہ (ملک حیرہ) نعمان بن منذر جس نے شہنشاہ ایران کے دربار میں عرب کے فضائل بیان کئے تھے اس کا تجارتی قافلہ مکہ کے مشہور میلہ سوق عکاظ میں جانا چاہتا تھا عروہ بن عتبہ نے جس کا تعلق ہوازن سے تھا، اس کو اجازت دیدی۔ یہ جرأت براض بن قیس کو ناگوار گذری اُس نے عروہ کو قتل [2] کر دیا۔

بنو کنانہ اور قریش کو خطرہ ہوا کہ مقتول کا قبیلہ (ہوازن) اپنے مقتول کی حمایت میں اُن پر حملہ کر دیگا۔ اشہر حرم شروع ہونے والے تھے انھوں نے چاہا کہ وہ فی الحال حرم مکہ میں داخل ہو جائیں تو حملہ سے بچ جائیں گے اس کے بعد اشہر حرم شروع ہو جائیں گے تو سر دست جنگ ٹل جائے گی۔ لیکن قریش اور بنو کنانہ ابھی حرم میں داخل نہیں ہونے پائے تھے کہ مقتول کے قبیلہ والوں نے اُن کو گھیر لیا اور حملہ کر دیا [3]۔ بہر حال چار روز تک جنگ ہوتی رہی۔ اول

---

[1] ابن ہشام۔ دوسری روایت یہ بھی ہے کہ عمر مبارک ۲۰ سال تھی۔ مگر جو کام اس جنگ میں آپ کے سپرد کیا گیا تھا کہ انبل علی عمومتی (مجمع البحار) کہ اپنے چچا صاحبان کو تیر اٹھا اٹھا کر دے رہا تھا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ عمر چودہ سال ہو گی۔ مگر ابن سعد میں یہ بھی ہے ورمیت فیہ السھم وما احب انی لم اکن فعلتہ۔ ص۱۲۶ ج۱

[2] براض بن قیس کا تعلق بنو کنانہ اور قریش سے تھا۔ اس علاقہ میں اجازت دینا کنانہ اور قریش کا حق تھا، ہوازن کا حق نہیں تھا۔ براض نے عروہ کے اجازت نامہ کو اپنے قبیلہ کے حق میں مداخلت سمجھا چنانچہ اوّل زبانی گفتگو کی اور اس کے اس فعل کو ناجائز قرار دیا۔ اور جب عروہ نے پرواہ نہیں کی تو براض نے موقع پاکر عروہ کو قتل کر دیا اور مکہ سے بھاگ کر خیبر چلا گیا۔ تجارتی قافلہ بہر حال محفوظ رہا (ابن سعد ص۱۲۶ ج۱ ابن ہشام ص۱۱۸ ج۱)

[3] اگرچہ قاتل کا معاہداتی تعلق قریش سے تھا مگر جہاں تک عدل و انصاف کا تعلق ہے مجرم صرف قاتل تھا پورا قبیلہ قریش و کنانہ مجرم نہیں تھا اور جب مقتول کے قبیلہ نے اُن پر حملہ کیا تو اُن کی حیثیت مدافع کی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دفاع میں مدد کی جو قبیلہ کے ہر ایک فرد کا مشترک فریضہ تھا۔

قیس کو غلبہ رہا پھر قریش غالب رہے۔[۱]

شہریت (تمدن) اور شہری تہذیب

عرب میں اب بھی ایک بڑی تعداد ان کی ہے جن کو "بدو" کہا جاتا ہے۔ یہ خانہ بدوش (بدوی) زندگی بسر کرتے ہیں۔ عرب کا ایک حصہ جس کو "ربع خالی" کہا جاتا ہے اب بھی غیر آباد ہے۔ لیکن اس کے باوجود، بہت بڑی تعداد وہ تھی جن کو "حضری" کہا جاتا تھا۔ یعنی جو شہری زندگی کے عادی تھے اور اپنی شہری تہذیب میں دیگر ممالک کی تہذیب سے نہ صرف ہمسری اور مساوات بلکہ برتری کا دعویٰ رکھتے تھے۔

شہر مختلف صوبوں کے مشہور شہروں کے نام[۲] ملاحظہ فرمایئے

حجاز میں۔ مکہ، مدینہ، طائف، ینبوع۔

یمن میں۔ جُرش، صنعاء، عدن۔

عمان میں۔ صحار، دَبا۔[۳]

بحرین میں۔ ھجر۔

نجد میں۔ یمامہ، فید۔

شمالی عرب میں۔ دومۃ الجندل، خیبر، فدک، وادی القری۔

---

[۱] غلبہ کے باوجود قریش کے ایک سردار عتبہ بن ربیعہ نے صلح کی تجویز پیش کی جس کو طرفین نے منظور کیا۔ اور طے یہ ہوا کہ جس فریق کے آدمی زیادہ مارے گئے ہیں اس کو ان زیادہ مقتولین کی دیت دی جائے مقتول کے قبیلہ یعنی قیس بن غیلان کے چالیس آدمی زیادہ مارے گئے تھے قریش نے ان کی دیت ادا کی اور عتبہ بن ربیعہ نے اس کی ذمہ داری لی (ابن ہشام وابن سعد وغیرہ) یہ عتبہ بن ربیعہ وہی ہے جو اس وقت سے تقریباً چالیس سال بعد جنگ بدر میں ابوجہل کے ساتھ مارا گیا۔ ابوسفیان اس کے داماد ہوئے اور حضرت معاویہؓ اس کے نواسے

[۲] عہد نبوی میں نظام حکمرانی از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب ۲۳ [۳] بفتح اول والقصر معجم البلدان ۱۲

صحرا سینا کے مشرقی ساحل پر۔ ایلہ، مقتار۔

محل | عالیشان محل بنانے کے متعلق امرار اور رؤسا کے مذاق کا اندازہ کبشہ کے بیان سے ہوتا ہے جو "رفیع العماد" کی تشریح میں پہلے گذر چکا ہے۔

یمن کا وہ عمرانی دور تو اب رہا نہیں تھا جو حضرت سلیمان علیہ السّلام کے زمانہ میں تھا۔ یا ان تبابعہ کے دور میں تھا جنھوں نے مارب کا عظیم الشان بند بنوایا تھا اور نہریں نکلوا کر پورے یمن کو چمن زار بنا دیا تھا۔ مگر اب بھی یمن کے راجاؤں (ملوک) کے بعض محل ایسے تھے کہ شہنشاہِ ایران بھی اُن پر رشک کرتا تھا۔

نعمان بن منذر جس کا ذکر پہلے گذر اہے اسکے دادا نعمان[1] بن امرار القیس کا بنوایا ہوا محل

---

[1] اس کو نعمان اکبر بھی کہتے ہیں۔ یہ یک چشم تھا۔ نوشیرواں کا ہم عصر تھا۔ بہت شان و شوکت کا امیر تھا شام پر کئی مرتبہ حملے کر چکا تھا۔ آخر میں تارک الدُّنیا ہوگیا اور سلطنت کے بجائے فقیری لباس میں سیاحت شروع کردی۔ سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک روز قصر خورنق کی سب سے اونچی منزل پر پہنچا ہوا تھا۔ وہیں وزرا اور مصاحبین حاضر تھے۔ خوش عیشی اور شادکامی کے تمام اسباب فراہم تھے۔ یہ سب سے اونچی منزل عجیب غریب تفریح گاہ تھی ایک طرف جانب غرب میں نجف کا سرسبز اور شاداب علاقہ تھا جہاں باغوں کی قطاریں اور ان کے بیچ میں نہریں بہہ رہی تھیں۔ مشرق کی جانب دریا فرات تھا جو پیچ و خم کھاتے ہوئے قصر خورنق کے گرد گھوم رہا تھا۔ اس کی لہریں خورنق کی بنیادوں کو سجدہ کر رہی تھیں۔ نعمان کی نظر اس عجیب وغریب منظر پر پڑی۔ اُس نے اپنے معتمد علیہ وزیر سے دریافت کیا۔ کیا اس جیسا منظر تم نے دیکھا ہے؟

"کوئی نہیں دیکھا' بے نظیر منظر ہے۔ کاش یہ پائیدار ہوتا"؟ وزیر نے جواب دیا۔

نعمان اگرچہ ایک آنکھ کی بصارت سے محروم تھا مگر بصیرت سے محروم نہیں تھا۔ وزیر کے جواب نے چشم بصیرت میں چمک پیدا کردی۔ اُس نے وزیر سے دریافت کیا: پائیدار کیا ہے؟

وزیر — آخرت کی نعمتیں۔

خورنق۔ اور اسی طرح کا دوسرا محل سدیر[1] ضرب المثل تھے۔

دیوان حماسہ کا مطالعہ کرنے والے "منخل بن حارث یشکری" کو خوب پہچانتے ہیں اور اُس کی بدمستی سے بھی واقف ہیں۔ اسی بدمست شاعر کے قصیدہ کے یہ شعر ہیں:

ولقد شربت من المدا مۃ بالصغیر و بالکبیر

فاذا انتشیت فاننی رب الخورنق والسدیر

(۱) بلاشبہ میں چھوٹے جام اور کبھی قدح (بڑے بادیئے) کو منھ سے لگا کر شراب پینے کا عادی ہوں؛

(۲) اور جب میں نشہ میں چور ہو جاتا ہوں تو مجھ میں وہ شاہانہ شان پیدا ہو جاتی ہے

حاشیہ متعلق صفحہ گذشتہ: نعمان ــــ وہ کیسے حاصل ہوتی ہیں؟

وزیر ــــ اس دنیا کو چھوڑ کر یادِ خدا میں مشغول ہو جانے سے۔

وزیر کی اس گفتگو نے نعمان کی دنیا بدل دی۔ وہ اب خاموش ہو گیا۔ مگر جب رات ہوئی تو شاہانہ لباس اُتارا، ٹاٹ کا کرتہ پہنا، راہبانہ زندگی اختیار کی اور ایسا غائب ہوا کہ پھر پتہ ہی نہیں چلا کہ کہاں گیا کیا ہوا۔

(معارف ابن قتیبہ ص۲۱۲ و معجم البلدان ص۵۷ج۲)

[1] سدیر۔ فارسی لفظ سہ ولہ۔ کا معرب ہے۔ سہ دَل۔ تین دل والا۔ اس محل کا گنبد اس طرح بنایا گیا تھا کہ اُس میں تین دَل یعنی اوپر تلے تین گنبد تھے۔ یعنی ایک گنبد پھر کچھ خلا چھوڑ کر اس کے اوپر دوسرا دل (یا گنبد) پھر کچھ خلا چھوڑ کر تیسرا گنبد (معجم البلدان)۔ ظاہر ہے وہ بہترین ایرکنڈیشنڈ ہو جاتا ہوگا۔ تاج محل کے گنبد کے متعلق تو معلوم نہیں ہو سکا۔ باقی دیواروں کے متعلق معلوم ہے کہ وہ دوہری ہیں۔ باہر کی دیوار اور ہے اندر کی دیوار اور ہے اور بیچ میں خلا ہے۔ ڈاکٹر اشرف صاحب مرحوم جو محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائریکٹر تھے انھوں نے تحقیق کرنی چاہی کہ اس خلا کو کس چیز سے پُر کیا گیا تھا۔ انھوں نے اس خلا میں ایک آدمی کو اتارا تو سطح زمین کے قریب لکڑی کے بُرادے جیسی چیز ملی۔

کہ گویا قصر خورنق[1] اور قصر سدیر کا مالک میں ہی ہوں[2]۔

منخل کے خلاف۔ اسود بن یعفر۔ دنیا کی بے ثباتی کے سلسلہ میں ان کا ذکر کرتا ہے:

ماذا أؤمل بعد آل محرق ترکوا منازلهم وبعد إياد

أهل[3] الخورنق والسدير وبارق والقصر ذي الشرفات من سنداد

"آل محرق جنھوں نے اپنے محلات چھوڑ دیئے اور ایادی سبا کے بعد میں کیا اُمید لگاؤں (آل محرق[4]، قصر خورنق، قصر سدیر اور چشمۂ بارق اور ان عالی شان بلند کنگروں والے محلات کے مالک تھے جو سنداد[5] کے نام سے مشہور تھے)۔"

---

[1] اس قصر کے متعلق ایک عجیب لطیفہ مورخین نے بیان کیا ہے کہ اس کو روم (اٹلی) کے ایک انجینیر نے جس کا نام "سنم مار" تھا، بنایا تھا۔ یہ کچھ عرصہ کام کرتا پھر غائب ہو جاتا۔ اس کو تلاش کرایا جاتا تو کئی سال بعد کہیں ملتا تو پھر تعمیر کا باقی سلسلہ شروع ہوتا۔ اس طرح کئی مرتبہ ایسا ہوا اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ محل نصف صدی میں تیار ہوا۔ جب تعمیر مکمل ہو چکی اور نعمان نے ملاحظہ بھی کر لیا تو "سنم مار" نے اپنی قابلیت اور مہارت پر فخر کرتے ہوئے کہا کہ عظیم الشان قلعہ نما محل میں صنعت یہ رکھی گئی ہے کہ یہ ایک اینٹ پر قائم ہے اگر وہ اینٹ نکال لی جائے تو سارا محل گر جائے۔ نعمان اس عجیب وغریب صنعت کو سُن کر چونکا۔ اُس نے دریافت کیا۔ کیا اس اینٹ کی خبر تمہارے سوا کسی اور کو بھی ہے۔ سنم مار نے کہا میرے سوا کسی کو خبر نہیں۔ نعمان نے جب معلوم کر لیا کہ اس اینٹ کی خبر کسی اور کو نہیں ہے، تو سنم مار کو محل کی سب سے اونچی منزل سے نیچے پھِکوا کر ختم کرا دیا۔ (معجم البلدان صفحہ ۴۸۴ ج ۵)

[2] حافظ شیرازی صاحب نے منخل سے بھی آگے بڑھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں،

چو بے خرد گشت حافظ کے سشمارد بیک جو ملک کیکاؤس و کے را

[3] معجم البلدان جلد ۵ اور معارف میں اہل کے بجائے لفظ ارض ہے جو بظاہر غلط ہے [4] محرق۔ آگ لگانے والا۔ نعمان بن منذر کے پیش رو ملوک میں سے حارث بن عمر بن عدی بھی تھا اسی کو محرق کہا کرتے تھے۔ کہ اُس نے مخالف آبادیوں کو آگ لگا دی تھی (معارف ابن قتیبہ) [5] السنداد۔ منازل لایاد نزلها لما قاربت البیت (معجم البلدان صفحہ ۱۴۹ ج ۵)

خورنق ۔ اور سدیر کے علاوہ اور بھی شاندار محل اور کوہ نما قلعے تھے جن پر اہل قبائل فخر کیا کرتے تھے ۔ مثلاً:

(۱) نعمان بن المنذر کے فریق مقابل کا مشہور شاعر المتلمس اپنے قلعہ پر فخر کرتا ہے:

الم تر ان الجون اصبح راسیا — تطیف بها الایام ما یتأیّس
عصی تبعا ایام اهلکت القری — یطان علیه بالصفیح و یکلس

" کیا تم نے دیکھا نہیں کہ قلعہ "جون" اپنی جگہ جما کھڑا ہے ۔ کتنے ہی حوادث اس کے چکر کاٹتے رہتے ہیں مگر وہ کسی حادثہ کے سامنے نرم نہیں پڑتا" ۔ اس نے یمن کے مشہور فاتح تبع کی اطاعت قبول نہیں کی اس کے حکم کو ٹھکرا دیا (جب کہ تبع نے بہت سی آبادیوں کو برباد کر ڈالا تھا ۔ اس پر پتھر کی چوڑی چوڑی سلیں پلستر کی طرح لگائی جاتی ہیں اور چونے سے جوڑی جاتی ہیں ۔

دارالقواریر شیش محل — خود مکہ معظمہ میں جہاں کی عورتوں کا دعویٰ یہ تھا کہ ہمارے قدم زمین پر نہیں رکھے جاتے ہم قالینوں پر چلا کرتے ہیں، اس کہنے والی[1] کے باپ نے ایک شیش محل بنایا تھا جس کو دارالقواریر کہا جاتا تھا ۔

---

[1] جب یہ شعر پڑھ رہی تھیں اس وقت ان کا عقیدہ اور مذہب کچھ بھی ہو مگر اب تو ہم اُن کا نام ادب سے لیتے ہیں کیونکہ اُنھوں نے اسلام لانے کے بعد عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ ؐ پہلے میرے نزدیک آپ اور آپ کے اہل خانہ اور آپ کے دولت کدہ سے زیادہ قابلِ نفرت اور مبغوض چیز کوئی نہیں تھی اور اب ان سے زیادہ محبوب کوئی نہیں ہے ۔ یہ حضرت ہندہ رضؓ ہیں حضرت ابوسفیان کی اہلیہ محترمہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی والدہ ۔ حضرت ہندہ کے والد عتبہ بن ربیعہ تھے جو غزوہ بدر میں سب سے پہلے مارے گئے یہ شیش محل انہیں عتبہ بن ربیعہ نے بنایا تھا ۔ (فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ مصر ص۶۳ و ص۶۴)

آرائش منزل | خورنق کی فلک بوس بلندی اور سدیر کے سہ دلہ گنبد۔ آپ نے باہر سے دیکھے۔ اب اندر تشریف لائیے۔ سب سے پہلے فرش پر نظر ڈالئے۔ چودہ صدی پہلا فرش آپ اپنی نظر سے نہیں دیکھ سکتے تو بیگمات قریش کے بیان کا اعتبار کیجئے۔ رؤسا مکّہ کی بیگیات کا ایک ترانہ بہت مشہور ہے جو وہ نوجوانوں میں جوش پیدا کرنے کے لئے اُحد کے میدانِ جنگ میں گا رہی تھیں۔ پورے ترانے کی ضرورت نہیں اس کا پہلا شعر ملاحظہ فرمالیجئے:

نحن بنات طارق نمشي على النمارق

(ترجمہ) ہم آسمان کے تارے کی بیٹیاں ہیں ہم قالینوں پر چلا کرتی ہیں

پہلا مصرع خاندانی فخرو غرور کی غمازی کر رہا ہے جو اپنے آپ کو چندر بنسی یا سورج بنسی کہا کرتے تھے اُن کا تصور بھی یہی ہوتا تھا۔ دوسرا مصرع تمدن کی نشان دہی کر رہا ہے۔ یعنی اُن کے پاؤں زمین پر نہیں رکھے جاتے۔ ان کے محلوں میں قالین کے فرش ہیں جن پر وہ چلا کرتی ہیں۔

زمین پر قالین کا فرش۔ فرش پر گدّے اور تکیے، جن کو وسادہ کہا جاتا تھا' یہ گدّے مخمل کے بھی ہوتے تھے جن کو "زرابی" اور نمارق کہا جاتا تھا۔

مسہری | دہلی اور اطراف دہلی میں ہی نہیں بلکہ اس طرح کے جتنے بھی شہر ہیں اُن کے عالی شان مکانات میں، مسہری کو خوش حالی اور پرتکلف زندگی کی علامت مانا جاتا ہے ہندی بھاشا میں اس کا نام چھپر کھٹ ہے کیونکہ اس کے چاروں پایوں پر حسین اور نازک ڈنڈے ہوتے ہیں جن کے اوپر خوبصورت چھتری ہوتی ہے۔ چھتری کے ساتھ چاروں طرف پردے ہوتے ہیں جن کے جھالر پٹیوں سے نیچے تک لٹکے رہتے ہیں۔ چھتری اور پردے اکثر ریشم کے ہوتے ہیں جن پر سنہری کشیدہ کاری ہوتی ہے۔ یہ پردے روئے عروس کے لئے نقاب بھی ہوتے ہیں اور مچھر دانی کا کام بھی دیتے ہیں۔

مسہری پر دری یا قالین خالی نہیں چھوڑی جاتی بلکہ اس پر خوبصورت چادر ہوتی ہے

جس کے چاروں کنارے سیج بند سے کس دیئے جاتے ہیں۔ ریشم کی ڈوریاں جو موباف کی طرح ہوتی ہیں سیج بند کہلاتی ہیں ان میں کبوتر کے انڈے کی برابر ریشم کی گھنڈیاں ہوتی ہیں۔

اس مسہری کی قدرومنزلت اور اس کے تکلفات آج بھی یورپ کے صوفا سیٹ سے کہیں زیادہ ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ آرائش منزل کے کم از کم اس باب میں ہمارا تمدن، عرب جاہلیت کے تمدن سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا، کیونکہ نہ صرف امراء اور رؤسا بلکہ متوسط درجہ کے خوش حال عرب کے گھر میں بھی مسہری ہوتی تھی جس کو وہ حُجلہ اور سیج بند کی گھنڈی کو زرالحجلہ[۱] کہتے تھے۔ اور امراء القیس کی ناز پروردہ محبوبہ کے بستر پر تو مشک کے ریزے بھی بکھرے ہوئے ہوا کرتے تھے[۲]

چلمن کا رواج عام تھا۔ اسلام نے تو ایک حد تک چلمن یعنی دروازے پر پردہ کو ضروری قرار[۳] دیا ہے۔ لیکن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اور ایسے ہی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے

---

[۱] شمائل نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ ایک عام لفظ ہے کیونکہ خاتم نبوت کو زرالحجلہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔

[۲] کما قال: وتضحی فتیت المسك فوق فراشها - نؤوم الضحی لم تنتطق عن تفضل۔ یعنی "اس قدر بے پرواہ اور فارغ البال ہے کہ سوتے سوتے دوپہر کر دیتی ہے اور جب سو کر اٹھتی ہے تو اس کے بستر پر مشک کے ریزے بکھرے ہوئے ہوتے ہیں اور جب کپڑے پہن لیتی ہے تو کپڑے بھی ڈھیلے ڈھالے رہتے ہیں کسی نوکر چاکر کی طرح کمر پر پٹکا نہیں باندھتی"۔ (المعلقات السبعہ)

[۳] کیونکہ کمرہ میں داخل ہونے سے پہلے اجازت لینے کی یہ اہمیت ہے کہ قرآن شریف میں اس کے متعلق ایک آیت نہیں بلکہ کئی آیتیں نازل ہوئیں۔ مگر یہ اذن لینا اسی وقت ضروری ہے جب کمرے کے دروازہ پر پردہ ہو یعنی چلمن پڑا ہو یا کمرے کا دروازہ بند ہو۔ البتہ مکان کا مسئلہ جدا ہے۔ مکان میں داخل ہونے کے لئے بہر صورت اذن لینا ضروری ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ [۴] بخاری شریف صفحہ ۸۸ [۵] ابوداؤد شریف باب اتخاذ الستور کتاب اللباس

بھی ایک مرتبہ یہ تکلف کیا کہ دروازہ پر عمدہ کپڑے کا پردہ آویزاں کر لیا جس پر پھول بوٹے تھے اور تصویر بھی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے طاق کو جو حجرہ کے ایک کونہ میں تھا ایک خوبصورت باتصویر طاق پوش سے سجایا[۱]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو اُتروا دیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پردے کو ایک غریب گھرانے میں بھجوا دیا کہ وہ پہننے کا کوئی کپڑا بنالیں۔

ان واقعات کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں تصاویر کی ممانعت فرمائی یہ تعلیم بھی دی کہ کپڑا انسانوں کے پہننے کے لئے ہے، دیواروں کو پہنانے یا دروازوں اور طاقوں کے سجانے کے لئے نہیں ہے۔

عائشہ صدیقہ یا سیدتنا فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا دولتمند نہیں تھیں۔ جن کی زینت فقر وفاقہ ہو اُن کو خوش حال کہنا بھی مشکل ہے۔ خود عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ دو دو مہینے گذر جاتے تھے اور چولھا ٹھنڈا پڑا رہتا تھا۔ چند کھجور اور پانی سد رمق کا ذریعہ ہوتا تھا۔ مگر یہ صرف ان کی سلیقہ مندی اور خودداری تھی کہ آل رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نشیمن کو خوش حال گھرانوں کی طرح ستھرا اور آراستہ رکھنا چاہتی تھیں۔ خانہ داری کے سلسلہ میں یَحۡسَبُهُمُ الۡجَاهِلُ[۲] اَغۡنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ" کی عملی صورت یہی ہو سکتی ہے[۳]۔ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسراف کو پسند نہیں فرمایا مگر ان دونوں محترمہ کا یہ عمل اس دور کے عام رواج کی غمازی کرتا ہے۔

مذکورہ بالا چند تفصیلات کے تحت عرب کے آرام گاہ کی شان ملاحظہ فرمائیے:

فرش پر قالین۔ بیٹھنے کے لئے غالیچے اور مخملی گدے۔ کمر لگانے کے لئے تکئے۔ آرام

---

[۱] بخاری شریف صفحہ ۸۸۰ [۲] یعنی ان کے رکھ رکھاؤ کی شان یہ ہوتی ہے کہ جو شخص ان کے پوست کندہ حسالات سے واقف نہیں ہوتا وہ ان کو غنی اور دولت مند سمجھتا ہے۔ [۳] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جذبہ کی تردید نہیں فرمائی البتہ اس میں اسراف کی ممانعت فرمائی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا پردہ ایک غریب گھرانے میں بھجوادیا۔ نیز تصویر کی ممانعت فرمائی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا پردہ اتروا دیا۔

کرنے کے لئے مسہری۔ دروازوں اور کمرے کے طاقوں پر پھولدار یا تصاویر کپڑے کے پردے یا موتیوں یا مونگوں کی لڑیاں جن کو "حبائل" کہا جاتا تھا۔

قرآنی اشارات ترغیب اور ترہیب کے موقع پر انہیں چیزوں کے نام لئے جاتے ہیں جو عام طور پر مشہور اور رائج ہوتی ہیں۔ اس بنا پر ہمیں قرآن حکیم سے بھی استدلال کا حق پہونچتا ہے۔ اب آپ ذیل کی چند آیتیں ملاحظہ فرمایئے اور عربوں کے تمدنی ذوق کا اندازہ لگایئے:

وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ (سورہ کہف ۱۸ آیت ۳۱)

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ (سورہ رحمٰن ۵۵ آیت ۵۴)

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ (سورہ رحمٰن ۵۵ آیت ۷۶)

چند نام اور ملاحظہ فرمایئے جو مختلف آیتوں میں وارد ہوئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کا بھی رواج تھا:

مشکوٰۃ۔	(طاق) شمع دان	اکواب۔	آب خورے
مصباح۔	چراغ	علاوہ ازیں۔	قرطاس، کاغذ
زجاج۔	شیشہ	سجل۔	دستاویز، کھاتہ
کافور۔	کافور	صحف۔	جمع صحیفہ۔ کتابچہ
قواریر۔	شیشے کے گلاس	قلم۔	مراد روشنائی

دسترخوان مغربی یورپ کا تو اس وقت ذکر ہی بے موقع ہے[1] وہ تو اس وقت تہذیب درکنار انسانیت کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھا۔ مشرقی یورپ میں

---

[1] ہم جس زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں یہ چھٹی صدی عیسوی کا دور ہے۔ یعنی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور قدسی کا دور اس سے تقریباً آٹھ سو برس بعد ۱۳۴۳ء میں اینٹس سلوٹس ——— (باقی صفحہ ...)

بیشک رومۃ الکبریٰ کا اقتدار سربفلک تھا۔ وہ ایک تہذیب کا بھی مالک تھا۔ ممکن ہے اس کی تہذیب میں اس وقت بھی میز اور کرسی داخل ہو۔ مگر عرب اس سے متاثر نہیں ہوئے۔

دوسری جانب ایران کی تہذیب تھی۔ یہاں کرسیاں نہیں تھیں۔ البتہ تقریباً ایک بالشت اونچی چھوٹی چوکیاں ہوتی تھیں جن پر کھانا رکھا جاتا تھا۔ اِن کو خوان کہا جاتا تھا۔ پیچھے گاؤ تکیہ، آگے خوان پر کھانا۔ یہ ایرانی تہذیب تھی۔ چھوٹی تشتریوں اور پیالوں میں مختلف قسم کے سالن اور چٹنیاں ہوتی تھیں۔

مگر عربوں کا مذاق اس سے مختلف تھا۔ یہ چمڑے کا بڑا دسترخوان زمین پر پھیلاتے اور بڑے طشت یا قاب میں کھانا رکھتے اور سب ساتھ کھاتے تھے جو برتن ایشیائی ممالک

(بقیہ حاشیہ صفحہ) نے (جو آگے چل کر پائیس دوم کے نام سے پوپ ہوا) جزائر برطانیہ کی سیاحت کی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ کسانوں کے مکان خشک چنائی کے پتھروں کے تھے جن میں چونا نہیں لگایا گیا تھا، چھتیں گھاس پھونس کی تھیں اور بیل کی ایک اینٹھی ہوئی کھال دروازے کا کام دیتی تھی۔ خوراک کی قسم سے وہ ساگ پات موٹھ مٹر، یہاں تک کہ درختوں کی چھال تک استعمال کرتے تھے۔ بعض مقامات کے باشندے روٹی کے نام تک سے واقف نہیں تھے۔ گارے سے لیپے ہوئے سرکنڈوں کی کوٹھریاں۔ بھدے اور بے ڈھنگے ٹوٹن کے گھر بے دودھ کش کی بے رونق دھواں دار انگیٹھیاں، جوؤں، کھٹملوں اور پسوؤں سے بھرے ہوئے، جسمانی، اخلاقی غلاظستان کے بھٹ، سردی سے بچنے کے لئے بدن کے گرد پیال کے لپیٹے ہوئے تھے۔ بخار سے سسکنے والے کسانوں کے لئے عاملوں اور سیانوں کے جھاڑ پھونک کے سوا اور کسی تدبیر کا نہ ہونا۔ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے کیسے ممکن تھا کہ آبادی ترقی کر سکے، مرد عورت اور بچے ایک ہی کوٹھری میں سوتے تھے اور گھر کے جانور بھی اس میں ٹھونس دیئے جاتے تھے۔ (معیار العلم والعلماء صفحہ ۱۳ و ۱۴)

[1] علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ نے غالباً عرب کے تہذیب و تمدن پر تفصیلی نظر نہیں ڈالی اور عام خیال کے بموجب آپ نے بھی عرب کو پس ماندہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ آپ نے تین دلیلیں پیش فرمائی ہیں (۱) تمدن اور اسباب معاشرت سے تعلق رکھنے والے الفاظ عربوں کے پاس نہیں تھے تو انھوں (باقی بر صفحہ آئندہ)

میں آج رائج ہیں وہ اس وقت بھی تھے۔ ایسے بڑے بڑے ٹب بھی ہوتے تھے جن میں بیٹھ کر غسل کیا جاتا تھا۔ آفتابہ کا بھی استعمال عام تھا۔ البتہ ٹونٹی دار لوٹے نہیں ہوتے تھے

لباس و پوشاک

پہلے گذر چکا ہے کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو لوگ آپ کے گھر پر چڑھ دوڑے۔ سامنے کے میدان میں بہت بڑا ہجوم ہو گیا۔ اس وقت مکہ کا ایک رئیس، عاص بن وائل سہمی، پہنچ گیا تھا۔ اس نے پناہ کا اعلان کیا تھا جس کے بعد مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا تھا۔ آپ اس رئیس کے لباس پر نظر ڈالئے۔ قمیص کی آستینوں میں ریشم کی کفیں ہیں۔ اوپر ریشمی قبا[1] یمن کا دھاری دار خاص کپڑا جس کو حبرہ کہا کرتے تھے اس کی چادر ہے اور اسی کپڑے کا تہبند ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نے ایران وغیرہ سے لئے تھے مثلاً سراویل (پاجامہ) شلوار سے۔ چراغ سے سراج۔ آب ریز سے ابریق (یعنی لوٹا) مگر اس سے ایرانی تہذیب کا تقدم تو ثابت ہو سکتا ہے عربوں کی پس ماندگی ثابت نہیں ہوتی ہاں پس ماندگی جب تھی کہ یہ چیزیں عرب میں رائج نہ ہوتیں۔

دوسری دلیل یہ کہ مدینہ منورہ میں چراغ کا رواج نہیں تھا لوگ چھلنی بھی نہیں جانتے تھے۔ مگر جب اسی مدینہ میں گدّے، تکیئے، مسہری، چارپائی۔ دروازوں پر پردوں کا رواج تھا تو صرف چراغ کا عام رواج نہ ہونے کو پیش کرنا قرین انصاف نہیں۔ اس کا سبب یہ بھی تھا کہ تیل اتنا آسانی سے نہیں ملتا تھا۔ سرسوں کا تیل اب بھی عرب میں کمیاب ہے۔ پھر اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ مدینہ تمدن میں مکہ کے ہم پلّہ نہیں تھا۔ یہاں کاشتکار اور زمیندار رہتے تھے اور مکہ کے باشندے تاجر تھے۔

تیسری دلیل آپ نے یہ دی ہے کہ حشرات الارض کھائے جاتے تھے تو اس طرح کے پسماندہ آج کے دور میں ہندستان میں بھی موجود ہیں جو کچھوا وغیرہ کھاتے ہیں۔ ایک مرتبہ بھنا ہوا گوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دسترخوان پر رکھ دیا گیا۔ آپ نے تناول نہیں فرمایا اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ ہمارے یہاں (مکہ میں) یہ نہیں کھائی جاتی۔

بہرحال حضری یعنی شہری لوگ حشرات الارض کو قابل نفرت ہی سمجھتے تھے۔

[1] قبا من دیباج بخاری شریف ص ۵۴۵

عرب کا تقریباً یہی لباس آج بھی ہے۔ سر پر رومال یا عمامہ کا طریقہ بھی تھا۔ رومال کو قناع کہا جاتا تھا۔ رومال پر "عقال" کا دستور غالباً اس وقت نہیں تھا۔

سردیوں میں برنس کا بھی استعمال ہوتا تھا (جو بران کوٹ کی طرح ہوتا تھا۔ ہاتھوں میں قفازیں (دستانے) اور پیروں میں خفین، چمڑے کے موزے بکثرت استعمال ہوتے تھے۔

عورتوں کے لباس میں نطاق بھی تھا۔ اس کو دوہراتہ بند کہا جا سکتا ہے۔ مگر دوہرا کرنے کی شکل یہ ہوتی تھی کہ چوڑائی میں دوہرا ہو جاتا تھا۔ یعنی اس کا عرض اتنا ہوتا تھا کہ ٹخنوں سے لیکر سر تک پہنچ جاتا تھا، بیچ میں کمر بند باندھ لیا کرتی تھیں، پھر اوپر کا حصہ جو سر تک پہونچا ہوا ہوتا تھا نیچے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس میں کنی اور حاشیہ بھی ہوتا تھا جو ٹخنوں اور پنڈلیوں پر رہتا تھا اور اس سے خاص زیبائش ہو جاتی تھی۔

سنگار چاندی سونے کے علاوہ ہاتھی دانت، مونگا، موتی، سیپ وغیرہ کے زیورات بھی استعمال کئے جاتے تھے۔ ان کی تفصیل طویل بھی ہے اور بے سود بھی۔ خاص بات یہ ہے کہ معرکوں میں بھی عورتیں زیورات پہن کر جاتی تھیں۔ رؤسا قریش کی بیگمات جب گھبرا کر بدحواس بھاگیں تو ازار یں سمیٹ رکھی تھیں۔ پنڈلیوں میں ٹخنوں سے اوپر جو پازیب (خلخال) تھے وہ کھل گئے تھے۔[1]

دانتوں اور مونھ کی صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ شعراء اشعار تشبیب میں اس کا ذکر مزے لے لیکر کیا کرتے تھے۔ "عدیل بن فرج عجلی" کے چند اشعار سے آپ بھی لطف اندوز ہو لیجئے:

(۱) الا یا اسلمی ذات الدمالیج والعقد ؛ وذات الثنایا الغر والفاحم الجعد

وذات اللثات الحمر والعارض الذی ؛ به ابرقت عمداً یا بیض کالشهد

---

[1] قد بدت خلاخلهن۔ بخاری شریف ص۵۷۹

کان ثنایا هن اغتبقن مدامة ثوت بجّانی راس ذی قنة فرد
(دیوان حماسہ)

(۱) ہاں ہاں، زندہ باش، حسن کی دیوی، جو بازو بند اور ہار سے آراستہ ہے دانت آبدار بال بہت سیاہ گھونگریالے۔

(۲) مسوڑھے مسّی سے سیاہ سامنے کے دانت صاف شفاف چمکدار جن میں خاص طور سے سفید رنگ کے لعاب دہن نے چمک پیدا کر دی ہے جو شہد کی طرح شیریں ہے۔

(۳) سامنے کے دانتوں میں ایسی ہلکی سرخی ہے۔ جیسے شراب کہنہ نوش جان کی ہو۔ اور وہ شراب بھی ایسی ہو کہ اونچے پہاڑ کی اکیلی چوٹی پر جس کی برابر کوئی دوسری چوٹی نہ ہو۔ رکھی رہی ہو جس کی وجہ سے نشہ اور اس کا ارغوانی رنگ پختہ ہو گیا ہو۔

خوشبو خوشبو سے گویا عرب کو عشق تھا۔ مشک، عنبر اور زعفران تو عام تھا۔ زعفران میں کپڑے بھی رنگا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی خوشبوئیں تھیں جن کو غازہ کی طرح غسل میں یا غسل کے بعد استعمال کیا کرتے تھے۔

امرء القیس کا یہ طرب انگیز شعر محض شاعرانہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے:

اذا قامتا تضوّع المسك منهما نسیم الصبا جاءت بریا القرنفل

(پہلی بیوی اور دوسری بیوی۔ دونوں کی شان یہ تھی کہ) جب کھڑی ہوتی تھیں تو مشک کی ایسی تیز خوشبو مہکتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا قرنفل (لونگوں) کے باغیچہ سے نسیم صبا کا جھونکا آ گیا ہے۔

مدینہ کے ایک یہودی رئیس نے بڑے فخر سے کہا تھا: عندی اعطر سیّد العرب[۱]۔ کچھ زیور ایسے ہوتے تھے جن میں مشک وغیرہ کے سفوف بھر دیئے جاتے تھے[۲]۔ ان سے خوشبو مہکتی رہتی تھی۔

---

[۱] بخاری شریف ص۵۷۶ ای اعطر نسار سادات العرب (مجمع البحار)۔

[۲] مثلاً قسط اظغار یا جزع اظفار (مجمع البحار لفظ ظفر)

یہ تھی عام عرب کی تہذیب اور اُن کا تمدن۔ مگر ہمارے پیشِ نظر خاص طور پر مکہ معظمہ ہے جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا مولدِ پاک اور آفتابِ اسلام کا مشرق ہے۔ آئندہ ابواب میں مکہ کے حالات ملاحظہ فرمائیے۔

مکّہ

محلِّ وقوع ــــ اہمیّت

دنیا کے وہ مقام جن کو بین الاقوامی تعلقات کے بارہ میں درمیانی کڑی (جنکشن) کی حیثیت حاصل تھی، مکّہ ایسے ہی مقامات میں ایک ممتاز مقام تھا۔

مکّہ شہر بعد میں آباد ہوا۔ مگر اس کے محل وقوع کی یہ حیثیت اس وقت سے تھی جب سے ہند، سندھ، افغانستان، ایران، یمن اور شام کے ممالک تمدّن سے آشنا ہوئے تھے اور ابناءِ آدم کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں نے اجناس و مصنوعات کے تبادلہ کا سلسلہ ایجاد کیا تھا۔

عرب کا یہ صوبہ جس میں مکہ شہر ہے اس کو "حجاز" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ صحراءِ اعظم کے ریگ بالو اور دو سمندروں (بحرِ احمر و بحرِ قلزم) کی موجوں کے درمیان قدرتی آڑ[1] (حجاب) ہے۔

حجاز نے بے شک سمندر کو صحراءِ عرب اور اس کے شمال مشرقی شہروں سے کئی سو میل دُور ہٹا دیا۔ مگر سمندر کا یہ قدرتی احسان ہے کہ اس نے حجاز کے ساتھ علیٰحدگی پسندی کا سلوک نہیں کیا۔ بلکہ پہلے تو عربوں کو جہازرانی سکھائی۔ پھر اُن کے جہازوں کو اپنے سینہ پر چڑھا کر نہ صرف یمن، سندھ، مصر، افریقہ اور ایران بلکہ دنیا کے مشرقی کناروں (جزائر شرق الہند) تک پہونچایا۔ حجاز جس کا قلب "مکہ" ہے اس کی یہی اہمیت تھی جس کی وجہ سے اس پر قبضہ کے لئے تین ہم عصر

---

[1] حجاز کے معنیٰ آڑ ہیں۔

سلطنتوں میں رقابت چلی آتی تھی (رومی ، ایرانی ، اور حبشی) یہ تینوں اس پر قبضہ کے خواہشمند رہیں۔

روایت ہے کہ سکندر ذوالقرنین نے ضروری خیال کیا تھا کہ اس شہر کے معبد "خانہ کعبہ" کی زیارت کرے۔ جدہ جو مکہ سے صرف پچاس میل کے فاصلہ پر حجاز کی بندرگاہ ہے جو فی زمانہ حجاج ہند کے استقبال کا عادی ہے کہتے ہیں کہ جب نوع انسان کا گلہ وجود و حیات کی پہلی منزل میں تھا تو جدہ نے حضرت آدم علیہ السلام اور اُن کی اہلیہ محترمہ (حضرت حوا) کا استقبال بھی اسی شان سے کیا تھا جب وہ لنکا سے روانہ ہو کر ہندوستان سے گذرتے ہوئے سرزمین حجاز میں فروکش ہونے کے لیے مکہ جا رہے تھے جہاں اُنھوں نے پہلی بار خانہ خدا "کعبہ[1]" کی بنیاد رکھی۔

بنارِ مکہ ، بانی مکہ ، اور کعبہ

تقریباً ساڑھے چار ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ جب حضرت ابراہیم[2] علیہ السلام نے شام سے آکر علاقہ حجاز کی ایک وادی غیر ذی زرع (بنجر میدان) میں اپنے جگر گوشہ اسمٰعیل (علیہ السلام) کو آباد کیا[3]۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد خدا کے گھر کی مٹی ہوئی بنیادیں اُبھاریں۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ص۱۰۳ تا ص۱۰۵ ج ۲ [2] جو طوفان نوح میں اُٹھالیا گیا تھا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انھیں بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیا (تفصیل کے لیے عہد زریں جلد اول ملاحظہ فرمائیے)

[3] ہندوستان کی جنتا برہم کو پوری عظمت کے ساتھ مانتی ہے۔ مگر یہ نہیں بتا سکتی کہ "برہم" کون تھے۔ کوئی انسان تھے تو کہاں کے رہنے والے تھے اور ان کا مذہب و مسلک کیا تھا۔ گر بائبل برہام، اور ابرہام کو موجودہ نسل انسانی کا باعظمت انسان، توحید کا علم بردار اول اور ان مذاہب کا ہادی اعظم مانتی ہے جو الہام، وحی اور نبوت و رسالت کے قائل ہیں۔ قرآن حکیم نے بھی حضرت ابراہیم کو یہی حیثیت دی ہے کہ پوری تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عہد زریں جلد اول۔

اس خانہ خدا کا نام کعبہ ہے اور جو شہر یہاں آباد ہوا وہ مکہ ہے۔
اس نونہال (حضرت اسمٰعیلؑ) کے ساتھ صرف اس کی ماں تھی۔ وہی اس چشمہ کی مالک تھی جو یہاں اُن کی سکونت کے ساتھ ساتھ[1] برآمد ہوا تھا۔
یہ چشمہ برآمد ہوا تو حضرت ہاجرہؑ سے اجازت لے کر یہاں قبیلہ جرہم[2] بھی آباد ہوگیا تھا حضرت اسمٰعیلؑ جوان ہوئے تو اُن کی شادی بھی اسی قبیلہ میں ہوگئی۔
حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے اولاد ہوئی تو عرب قدیم میں ایک نئی نسل کا اضافہ ہوگیا جس کو عرب[3] مستعربہ اور بنو اسمٰعیل کہا گیا۔
حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام یہاں تنہا تھے۔ ایک ماں کے علاوہ نہ ان کا کوئی دادھیالی رشتہ دار تھا نہ ننھیالی۔ بنوجرہم سے اُن کو مدد ملی۔ ادھر بنوجرہم پر حضرت اسمٰعیل[4]ؑ کے اخلاق کا یہ اثر ہوا کہ وہ اُن کے معتقد ہوگئے، پھر اُن کا مسلک قبول کرلیا۔ توریت کی روایت کے

---

[1] حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی اور لختِ جگر کو یہاں آباد کیا تو تھوڑے سے کھجور اور پانی کا ایک مشکیزہ توشہ میں دیا تھا۔ چند روز بعد پانی ختم ہوگیا۔ ماں سے پہلے بچہ پیاس کی وجہ سے لب دم ہوگیا تو قدرتی طور پر ایک چشمہ برآمد ہوگیا۔ اسی کا نام "زمزم" ہے جو اب خانہ کعبہ کے قریب کنویں کی شکل میں ہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے عہد زرّیں جلد اول)

[2] اس قبیلہ کا اصل وطن یمن تھا۔ اب وہ الگ سرزمین اپنی آبادی کے لئے چاہتا تھا۔ یہ میدان اور چشمہ اس کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھا جس نے اس قبیلہ کی مراد پوری کردی۔

[3] یعنی جو پہلے عرب نہیں تھے اب عرب بن گئے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم اگرچہ عربوں کی طرح اولاد سام میں سے تھے۔ مگر ان کا اصل وطن عراق تھا۔

[4] حضرت اسمٰعیل علیہ السلام خدا کے نبی تھے۔ نبی کی اخلاقی اور روحانی تربیت خود قدرت کی جانب سے ہوتی ہے اور ظاہر بظاہر حضرت ابراہیم علیہ السّلام مربی تھے وہ یہاں آتے رہتے تھے۔

بموجب حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی عمر ایک سو سینتیس ۱۳۷ سال ہوئی۔[1] اس عرصہ میں مکہ چند گھر کی آبادی کے بجائے پورا شہر بن چکا تھا اور کعبہ نے بھی مرکزی عبادت گاہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام اپنی قوم کے مقتدا بھی تھے اور کعبہ کے متولی بھی۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے بارہ لڑکے ہوئے۔[2] اگر وہ سب مکہ میں رہتے تو بہت ممکن تھا مکہ میں ان کی اکثریت ہو جاتی۔ مگر یہ صاحبزادگان جو اولوالعزم نبی کی اولاد تھے اُن کا مطمحِ نظر اور نصب العین دعوت الی اللہ اور اصلاحِ خلق تھا۔ وہ اسی مقصد کو لے کر مکہ سے نکلے اور ملک کے مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے۔ جہاں جہاں وہ پہونچے وہاں اس زمانہ کی گمراہیوں یعنی کواکب پرستی اور اصنام پرستی وغیرہ کے مقابلہ میں خدا پرستی کا علم بلند ہو گیا۔[3]

مکہ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے صرف ایک فرزند قیدار قیام پذیر رہے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے بعد وہی خانہ کعبہ کے متولی ہوئے پھر ان کی اولاد متولی ہوتی رہی اور سیاسی اقتدار ان کے ننھیال "بنوجرہم" کو حاصل رہا۔ کئی صدی تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر وہ وقت آیا کہ بنوجرہم اپنے اقتدار کے نشہ میں ایسے مست ہوئے کہ ان کو اولادِ اسمٰعیل (علیہ السّلام) کی اتنی مداخلت بھی گوارا نہ ہوئی کہ وہ خانہ کعبہ کے متولی رہیں۔ چنانچہ اُن کو مکّہ سے نکال دیا۔ اور اب مرکزِ توحید یعنی خانہ کعبہ پر بھی انھیں کا اقتدار ہو گیا۔

مگر جب قوت اور اقتدار کے نشہ میں وہ اپنے مخدوم زادوں کا احترام نہ کر سکے وہ دوسروں کے حقوق کا احترام کب کر سکتے تھے۔ چنانچہ زائرین کعبہ کے حق میں بھی اُن کا یہ نشہ ستم پرور ہی رہا۔ انتہا یہ کہ سرزمین پاک (مکہ معظمہ) کا ذرّہ ذرّہ اُن کے مظالم سے نالاں ہو گیا۔

---

[1] توریت (بائبل قدیم) باب پیدائش ۲۵ فقرہ ۱۶، ۱۷ [2] ایضاً [3] فلما ضاقت مکۃ علی ولد اسمٰعیل انتشروا فی البلاد فلا یناوئون قوما الا اظہرہم اللہ علیہ بدینہم فوطئوہم (سیرۃ ابن ہشام ص ۱۲ ج ۱)

بنو جرہم اگرچہ اب بھی توحید پرست اور دینِ ابراہیمی کے دعوے دار تھے ۔ مگر صحت عقیدہ ۔ اوراد و وظائف یا پوجا پاٹ کے منتر سے حکومت اور اقتدار کی حفاظت نہیں کی جا سکتی۔ خصوصًا حرم مکّہ کے متعلق عرب کا عقیدہ یہ تھا:

انها ماسميت ببكة الا انها كانت تبك اعناق الجبابرة اذا احد ثوا فيها شيئًا۔ [1]

("اس کا بکہ نام اسی لئے ہوا کہ وہ جابر حکمرانوں کی گردنیں توڑ دیتا ہے جب وہ اس سرزمین پر ظلم کرتے ہیں۔")

چنانچہ قدرت کے "کید متین[2]" نے قبیلہ بنو خزاعہ کے مورث کو اُن کی سرکوبی کے لئے ان پر مسلّط کر دیا۔

عَمر و بن لُحَیّ[3]، جو یمن کا ایک چالاک سردار تھا آگے بڑھا۔ اُس نے بنو جرہم کو مکّہ سے نکال باہر کیا اور در و بست کا مالک خود بن گیا۔ اسی کے اخلاف بنو خزاعہ تھے، جو تقریبًا تین[4] سو برس تک مکّہ پر حکمراں رہے۔

یہی عَمرو بن لُحَیّ ہے جو شام گیا تو وہاں ایک بُت ہُبل کا گرویدہ ہو گیا، جس کی صفت یہ بیان کی گئی تھی کہ وہ بارش کا دیوتا ہے اور لڑائیوں میں بھی مدد کرتا ہے[5]۔ عمرو بن لحیّ ایسے دیوتا کو کب چھوڑ سکتا تھا۔ وہ خوشامد کر کے یا کچھ نذرانہ دیکر اس بت کو مکّہ معظمہ لے آیا اور خانہ کعبہ[6] کے وسط میں جو خزانہ کا کنواں تھا اس کے اوپر نصب کر دیا۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص ۱/۲۷ [2] خفیہ تدبیر سنجیدہ اور مستحکم [3] بضم لام فتح حاء و تشدید یاء بصیغہ تصغیر۔ فتح الباری ص ۲۴۹/۶ [4] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے عہد زریں جلد اوّل [5] یعنی گنیش اور کالی دیوی دونوں کے پورٹ فولیو کا انچارج ہے [6] اس زمانہ میں خانہ کعبہ پر چھت نہیں تھی، چاروں طرف صرف دیواریں تھیں اور انکے بیچ میں کنواں تھا (پختہ گڈھا) اس میں نذرانے ڈالے جاتے تھے۔

قریش - اور قصی بن کلاب مصلح قریش

قریش کا تعارف حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں تقریباً بیس پشت کے بعد ایک شخص مُضر ہوا ہے۔ باپ کا نام "کنانہ" اُس کی اولاد کو "قریش" کہا جاتا ہے[۱]

مُضر کی آٹھویں پُشت میں ایک شخص ہوا جس کا عرفی نام قُصیؓ تھا (اصل نام زید، باپ کا نام کلاب۔ ماں کا نام فاطمہ بنتِ سعد) قُصیؓ بن کلاب کو قوم نے مُجَمِّع کا خطاب دیا۔ اب پُورا نام مع القاب و خطاب یہ ہوگیا: "زید بن کلاب عرف قصی مخاطب بخطاب مُجَمِّع"

قُصی اور تولیت کعبہ قُصی، بچپن ہی میں باپ کے سایہ سے محروم ہوگیا تھا۔ ماں نے قبیلہ بنی عذرہ کے ایک شخص سے جس کا نام ربیعہ بن حرام تھا، دوسرا نکاح کرلیا۔ بنو عذرہ، شمال عرب کے حدود میں شام کے قریب سُرغ میں آباد تھے[۴] قُصی نے ماں کی آغوش میں یہیں پرورش پائی۔ ہوش سنبھالا تو وطن اور نسل کی جستجو ہوئی۔ کچھ سراغ لگا تو یہ مکہ پہونچا۔ وہاں بڑے بھائی سے ملاقات ہوئی جس کا نام زہرہ تھا۔ جو بوڑھا ہوچکا تھا۔ اُس کی بصارت بھی جاتی رہی تھی[۵]

---

[۱] معارف ابن قتیبہ [۲] جس کی پانچویں پشت میں فخر موجودات، سیدالانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور اقدس ہوا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصیؓ [۳] سمی قصی لتقصیھا بہ الی الشام ابن سعد ص۳۶ ج۱ یعنی چونکہ اس بچہ کو اس کی ماں عرب کے آخری کنارہ میں لے گئی تھی۔ اس لئے اس کو قصی کہا جانے لگا۔ یعنی آخری کنارہ والا چھوٹا سا بچہ۔ [۴] ابن سعد ص۳۶ ج۱ [۵] کہتے ہیں زہرہ نے دو علامتوں سے چھوٹے بھائی کو پہچانا: ایک تو آواز سے پہچانا، دوسرے یہ کہ جس طرح زہرہ کے بدن پر بہت بال تھے ایسے ہی قصی کے بدن پر بھی بال تھے۔ ابن سعد ص۳۷ ج۱

مکہ پر قبیلہ خزاعہ کا قبضہ تھا۔ قصی نے یہیں بود و باش شروع کردی اور یہاں تک تعلقات بڑھائے کہ خانہ کعبہ کے متولی[1] نے اپنی لڑکی کا نکاح قصی سے کردیا۔

اب ایک روایت یہ ہے کہ حلیل نے اپنی وفات کے وقت قصی کو خانہ کعبہ کا متولی بنایا مگر مشہور روایت یہ ہے کہ حلیل نے لڑکی کو متولی اور ایک شخص ابوغبشان[2] کو اس کا نائب بنادیا اور کاروبار اُس کے سپرد کردیا۔

ابوغبشان شراب کا دھنی تھا۔ شراب کی بدمستی میں قصی نے اس سے نیابت تولیت منتقل کرنے کا معاملہ کیا اور شراب کے ایک مشکیزہ پر معاملہ طے ہوگیا۔

ابوغبشان کو مشکیزہ شراب ملا اور قصی بن کلاب کو سند نیابت اور وہ جملہ اختیارات جو ابوغبشان کو حاصل تھے۔ اس واقعہ سے ایک مثل مشہور ہوگئی۔ گھاٹے کے سودے کے متعلق کہا جانے لگا "اخسر من صفقۃ ابی غبشان" ابوغبشان کے سودے سے بھی زیادہ خسارہ مند۔

قصی کی کامیابی اور قریش کا مکہ پر تسلّط

واقعہ کچھ بھی ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ خزاعہ کے دوسرے سرداروں نے اس کو برداشت نہیں کیا کہ ایک قریشی نوجوان خانہ کعبہ کا متولی ہو۔ انھوں نے اس تولیت نامہ کو بجبر منسوخ کرنا چاہا۔ مگر قصی اس کے لئے پہلے سے تیار تھا۔ وہ قریش کے منتشر اجزاء کو جمع کرکے بنوخزاعہ سے مقابلہ کی تیاری کرچکا تھا۔ اُس نے مزید کمک اپنے ننہیالی قبیلہ بنو قضاعہ سے حاصل کی۔ اپنے حلیف قبائل سے بھی امداد طلب کی اور اس طرح "بنوخزاعہ" کے مقابلہ پر ایک مضبوط محاذ قائم کرلیا۔ چند بار خونریز معرکے ہوئے فریقین کا کافی نقصان ہوا۔

معاملہ خانہ کعبہ کی تولیت کا تھا، جس سے ہر ایک عرب کو دلی تعلق تھا۔ کچھ امن پسند

---

[1] حلیل بن حبشیہ، خزاعی، لڑکی کا نام حبی۔ البدایہ والنہایہ صفحہ ۲۱۰ جز ۲

[2] اصل نام سلیم بن عمرو

عناصر بھی تھے۔ وہ بیچ میں پڑے اور فریقین کو اس پر راضی کر لیا کہ یہ پورا معاملہ ثالث کے سپرد کر دیں۔

یعمر بن عوف ایک مشہور دانش مند اور صاحب الرائے تھا، فریقین نے اس کو ثالث تسلیم کر لیا۔ اس نے تمام واقعات کی چھان بین کی۔ فریقین کے دلائل کو پرکھا۔ اس کا فیصلہ یہ ہوا:

"تولیتِ کعبہ اور مکہ کے نظم و نسق کا مستحق قصی ہے۔ بنوخزاعہ کو یہ حق نہیں پہونچتا۔ لہذا کعبہ اور مکہ کا نظم و نسق قصی کے حوالہ کیا جائے بنوخزاعہ مکہ کو خالی کر دیں۔ بنوخزاعہ حملہ آور تھے۔ ان کا یہ اقدام غلط تھا۔ لہذا جتنے آدمی اُن کے اور اُن کے حلیفوں کے مارے گئے اُن کا کوئی معاوضہ نہیں ہے البتہ قصی اور قصی کے حامیوں کے جتنے آدمی ہلاک ہوئے ہیں ان کی دیت بنوخزاعہ ادا کریں۔"

یعمر بن عوف نے اپنے فیصلہ میں بنوخزاعہ کے مقتولین کا شدخ کیا۔ یعنی اُن کا کوئی تاوان لازم نہیں کیا۔ اس بنا پر یعمر کا لقب[1] شدّاخ پڑ گیا (معاوضہ خون کو ساقط کرنے والا) قصی نے قریش کے انتشار کو ختم کر کے اُن کو ایک مرکز پر جمع کیا اس لئے اس کا لقب[2] مُجَمِّع ہو گیا[3]

قریش کا مکہ پر تسلط ہوا تو کئی ہزار سال کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ بنو اسمٰعیل کو مکہ پر سیاسی اقتدار حاصل ہوا۔

سیاسی رابطہ شام کے قریب جو عربی قبائل آباد تھے اگرچہ وہ خود مختار تھے مگر بازنطینی شہنشاہیت (سلطنت روم) کے زیر اثر تھے۔ کچھ قبیلوں نے عیسائی

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص ۱۲۴ ج۱ [2] معارف ابن قتیبہ ص ۲۷ [3] حذافہ بن غانم عدوی نے ابوجہل کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ابوکم قصی کان یُدعٰی مُجمّعًا ۔ بہ جمّع اللّٰہ القبائل من فہر (ابن سعد ص ۴۲ ج۱)

مذہب بھی قبول کر لیا تھا۔ قصی اس علاقہ میں بڑھ کر جوان ہوا تو اس کی بلند پرواز فطرت نے اس کو شاہنشاہ روم تک پہونچا دیا۔ بنو خزاعہ کی اس جنگ میں قیصر روم (بازنطینی شہنشاہ) کی حمایت بھی قصی کو حاصل تھی اور بقول ابن قتیبہ قیصر روم نے اس کو کمک بھی پہونچائی تھی[1] یہ بھی ایک گٹھ جوڑ تھا۔

بین الاقوامی سیاست کبھی بھی پھندوں سے آزاد نہیں رہی ہے بظاہر منشا ریہ بھی تھا کہ عرب کے اندر اپنے اثرات بڑھائے اور ہندستان سے خشکی کی راہ سے ہونے والی تجارت کے گذرگاہ کو اپنی نگرانی اور حفاظت میں لے لے[2]

قصی اور تعمیر مکہ

مکہ کے باشندے اس کو بے ادبی سمجھتے تھے کہ خانہ کعبہ کے قریب رات کو آرام کریں یا اللہ کے گھر کی برابر اپنا گھر بنائیں۔ ضرورت کے وقت وہ خیمے یا چھولداریاں لگا لیتے تھے مکان یہاں نہیں بناتے تھے۔ اس لئے شہر کی آبادی کعبہ سے کچھ فاصلہ پر نشیبی حصہ میں تھی[3] کعبہ کے قریب جب آبادی نہیں تھی اور اس علاقہ (حرم) میں خود رو درخت کا کاٹنا ممنوع تھا تو قدرتی بات تھی کہ انسانوں کے بجائے درختوں کے ہجوم نے خانہ کعبہ کے احاطہ کو گھیر رکھا تھا۔ سب طرف کیکر کے درخت تھے یا بیروں کی جھاڑیاں۔ خود انسانوں کے رہنے کا علاقہ (شہر مکہ) تنگ ہوگیا تھا۔ اس کو توسیع کی ضرورت تھی۔

---

[1] واعانہ قیصر علیہا۔ معارف ابن قتیبہ ص۲۱۵ طرک الشام [2] عہد نبوی میں نظام حکمرانی ص۳۰

[3] مسفلہ یہی حصہ ہے اس کے بالمقابل بلند حصہ کو "معلات" کہتے تھے۔ کعبہ اسی حصہ میں تھا۔ مورخین نے مکہ اور بکہ میں یہ فرق کیا ہے کہ بکہ وہ بلند حصہ جس میں "کعبہ" ہے اور مکہ پورا شہر یا مکہ کا وہ مقابل حصہ جس میں شہر آباد تھا (معجم البلدان۔ لفظ بکہ) اس حصہ کو بکہ اس لئے کہتے تھے کہ یہاں زائرین کا ہجوم رہتا تھا نیز اس لئے کہ عقیدہ یہ تھا کہ یہ جابر اور ظالم طاقتوں کی گردن توڑ دیتا ہے۔ (ص۴۲ج۱ سیرۃ ابن ہشام)

قصی نے مکہ پر قبضہ کیا تو شہر مکہ کی تعمیر جدید کا منصوبہ بھی تیار کیا۔ اس جنگل کو صاف کرایا لوگوں کے وہم کو دُور کرنے کے لیے سب سے پہلے خود کلہاڑا چلایا۔ اور اعتراض کا جواب یہ دیا کہ ہمارا مقصد آبادی ہے۔ بربادی مقصود ہو تو بے شک درخت کاٹنے ممنوع ہیں۔[1]

پھر ایک خاص نقشہ کے ساتھ مکہ کو آباد کرنا شروع کیا۔ خالی اراضی کے پلاٹ بنائے اور قریش کے ہر ایک خاندان کو ایک پلاٹ دے دیا۔ یعنی ہر قبیلہ کی الگ کالونی آباد کردی۔[2] انھیں کالونیوں کے محل وقوع کے لحاظ سے قریش ظواہر اور قریش بطاح کی اصطلاحیں ایجاد ہوئیں۔[3]

اس عقیدے کو بھی ختم کیا کہ خانہ کعبہ کے قریب مکان نہ بنائے جائیں بلکہ قریش کے کچھ خاندان یہاں آباد کئے اور کچھ خاندان شہر کے بیرونی حصہ میں۔ البتہ یہ ہدایت کردی کہ کعبہ کے قریب دوسری منزل تعمیر نہ کی جائے۔[4]

اس جدید نقشہ میں خانہ کعبہ وسط میں رہا۔ خانہ کعبہ کے گرد بہت وسیع میدان چھوڑ دیا گیا۔ محلوں (کالونیوں) کے بیچ میں راستے رکھے گئے۔ یہ راستے (سڑکیں) خانہ کعبہ کے میدان پر آکر ختم ہوتے تھے۔ ان میں وہ سڑک بھی تھی جس کو "طریق ابی شیبہ" کہا جاتا تھا۔ یہ سڑک بہت وسیع اور سب سے زیادہ چالو تھی۔

---

[1] وضاق البلد وكان كثير الشجر العضاة والسلم فهابت قريش قطع ذلك في الحرم فامرهم قصي بقطعه وقال انما تقطعونه لمنازلكم ولخططكم بهلة الله على من اسادفسادا وقطع هو بيده واعوانه ابن سعد ص ۴۰ ج ۱

[2] قطع قصي مكة ارباعا بين قومه فانزل كل قوم من قريش منازلهم التي اصبحوا فيها اليوم۔ (ابن سعد ص ۴۰ ج ۱) ابن سعد و ابن ہشام نے قبیلوں اور کالونیوں کو نام بنام بیان کیا ہے (ابن سعد ص ۴۰ و ص ۴۱ ج ۱۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۴۹ ج ۱)

[3] ادخل قصي بطون قريش كلها الابطح فسموا قريش البطاح واقام بنو معيص بن عامر بن لوی وبنو تيم وبنو محارب وبنو الحارث بظهر مكة فهؤلاء الظواهر (ص ۴۱ ج ۱ ابن سعد)

[4] كما امر بان لا يرفعوا بيوتهم عن الكعبة فتظل مشرفة عليها تاريخ مكة احمد سباعی ص ۳۴ ج ۱

ایک سڑک[1] باب صفا سے شروع ہو کر جنوب کی جانب باب اجیاد تک جاتی تھی اسی راستہ پر بزازہ تھا سقیفہ بنی عائذہ بھی اسی راستہ پر تھا۔ اسی سڑک کے قریب وہ مکان تھا جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کرایہ پر لیا تھا۔ جب آپ نے بعثت سے پہلے سائب بن ابی سائب کی شرکت میں تجارت شروع کی تھی[2] آباد ہونے والوں کو اجازت دے دی کہ وہ کعبہ کے میدان میں اپنی نشست رکھیں۔ چنانچہ اسی میدان میں الگ الگ محلہ (قبیلہ) والوں کی الگ الگ مجلسیں ہوا کرتی تھیں۔

دارالندوہ۔ کعبہ کے سامنے قصی نے اپنا مکان بنوایا۔ اس کا صدر دروازہ کعبہ کی طرف رکھا۔ اس کو قومی کاموں کے لئے عام کر دیا۔ اور دارالندوہ اس کا نام رکھا[3] (کمیٹی گھر)۔

محبّ قوم قصیّ کا سیاسی اور مذہبی مسلک

وہی قصی جس کا بچپن یتیمی میں گذرا تھا، اس انقلاب کے بعد اپنی قوم کا سب سے بڑا شخص تھا۔ وہ گویا پوری قوم کا مالک تھا جس کی عظمت دلوں کی گہرائیوں تک پہونچی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ لوگ اس سے برکت حاصل کیا کرتے تھے[4]

قوم کے پاس پہلے سے کوئی دستور العمل یا قانون نہیں تھا تو اسی کا قول قانون ہوتا تھا اور نہ صرف زندگی میں بلکہ بقول ابن سعد اُس کے مرنے کے بعد بھی اس کے قول کی ایسی ہی تعظیم کی جاتی تھی جیسے کسی مذہبی حکم کی[5] مگر

---

[1] بظاہر پرانی آبادی کو نئی آبادی سے طریق ابی خیبہ ملاتا تھا [2] تاریخ مکہ لاحمد السباعی ص ۱۲۶ [3] ابن سعد ص ۳۹/۱۲۰ سیرۃ ابن ہشام ص ۴۹/۱۲۰ [4] تیمنت به وبامره وشرفته قریش وملكته (ابن سعد ص ۳۹/۱۲۰) تملك على قومه واهل مكة فملكوه (ابن ہشام ص ۴۹/۱۲۰) لحاز شرف مكة كله (ابن ہشام ص ۴۹/۱۲۰)

[5] ويتبعون امره كالدين المتبع لا يعمل بغيره في حياته وبعد موته۔

(ابن سعد ص ۳۹/۱۲۰)

(۱) نہایت عجیب اور دورِ حاضر کے سیاست دانوں کے لئے بہت زیادہ قابلِ قدر اور سبق آموز بات یہ ہے کہ اس تمام عظمت اور اقتدار کے باوجود قصی نے نہ تاجِ شاہی سر پر رکھا، نہ اپنے آپ کو بادشاہ کہلوانا پسند کیا۔ اس نے اپنے رسمی اعزاز اور اپنی وجاہت وعظمت کے مقابلہ میں قوم کی روایات اور ان کے مذاق کا احترام کیا حریت اور آزادی اس قوم کا وہ جوہر تھا جس نے کبھی بھی کسی شاہ یا شاہنشاہ کے سامنے اس قوم کی گردن نہیں جھکنے دی تھی، قصی نے تختِ سلطنت اور تاج شاہی کے مقابلہ میں اس جوہر کو محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کی کوشش کی۔ اس سے بڑھ کر اپنی قوم کے ساتھ اخلاص کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے دربار شاہی کے بجائے دارالندوہ تعمیر کیا اور اس کا ایسا نظام بنایا جس کے لئے جمہوری کے علاوہ اور کوئی لفظ مناسب نہیں ہو سکتا جس میں فرد یا شخص کی نہیں بلکہ نظام کی تعظیم تھی اور ملوکیت یا شخصی اقتدار سے یہاں تک اجنبیت تھی کہ نہ دارالندوہ کا کوئی صدر (چیرمین) تھا نہ اس جمہوری نظام میں صدر کا کوئی عہدہ تھا۔ بہت سے فرائض، پورٹ فولیو تھے جو مختلف قبائل پر تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ قبیلہ کا سربراہ اس فریضہ کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ تفصیل آگے آئیگی (انشاء اللہ)

یہ قصی کا سیاسی ذوق اور سیاسی مسلک تھا۔

(۲) سیاسی رہنما عموماً مذہب کو سیاست کی حد تک مانا کرتے ہیں قصی کا مذہب بھی تابع سیاست تھا۔ قریش میں اب تک بُت پرستی عام نہیں ہوئی تھی مگر توحید پرستی کا جذبہ بھی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ بنو خزاعہ نے جو بت اور مورتیاں خانہ کعبہ میں رکھ دی تھیں قریش نے بھی ان کو بنو خزاعہ کی نظر سے دیکھا اور قصی جیسا فاتح جس کو دین ابراہیمی کا علمبردار ہونا چاہیئے تھا وہ مفتوح قوم (بنوخزاعہ) کا جانشین بن گیا۔ بقول حافظ عماد الدین ابن کثیر:

"بیت عتیق" "خانہ کعبہ" اس کی تحویل اور تولیت میں آگیا۔ مگر مورتیوں
کی پُوجا، خانہ کعبہ کے گرد نئی نئی مورتیاں استھاپت کرنے، بتوں کے
نام پہ قربانیاں دینے اور چڑھاوا چڑھانے وغیرہ وغیرہ کی ان تمام قبیح
رسموں اور بدعتوں کے ساتھ جو بنوخزاعہ۔ یہاں جاری کرچکے تھے [1]

اس وقت تقاضا رسیاست یہی تھا کیونکہ بنوخزاعہ کے کئی سو سال کے اقتدار نے عرب کا مذاق یہی بنا دیا تھا۔

قصی بنوخزاعہ کو شکست دے سکتا تھا۔ مگر پورے عرب سے مقابلہ کے لئے اس کو پیغمبرانہ عزم کی ضرورت تھی جس سے وہ محروم تھا۔

(۳) حج جس کی ابتدا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم سے ہوئی تھی بنوخزاعہ نے اگرچہ اس میں شرک کی آمیزش کردی تھی اور اللہ رب العالمین کے بجائے اس کا رُخ غیر اللہ کی طرف پھیر دیا تھا مگر اس کی ٹیپ ٹاپ اور شان وشوکت میں فرق نہیں آنے دیا تھا،
بنوخزاعہ نے خانہ کعبہ کی مختلف خدمات اور حج کے انتظامات مختلف قبائل کے سپرد کر رکھے تھے۔
قصی کی یہ فراخ حوصلگی اور دانش مندی تھی کہ اس نے ان انتظامات کو بحال رکھا جو خدمت جس خاندان کے سپرد تھی، قصی نے اس میں تبدیلی نہیں کی۔ اس کی سیاسی مصلحت یہ ہوسکتی ہے کہ اس طرح ان تمام خاندانوں کی حمایت قصی نے حاصل کرلی اور ابن اسحاق کی رائے یہ ہے کہ

انه كان يراه دنيا فى نفسه لا ينبغى تغييره۔ [2]

یعنی جن روایات کی بنا پر جو خدمت کسی خاندان کے سپرد تھی قصی خود بھی ان کو ایسی روایات مانتا تھا جن میں تبدیلی جائز نہیں ہوتی۔

(۴) قصی کی طرح قصی کی قوم بھی سیاست داں تھی۔ اُس نے اس رائج مذہب پر اتنی شدت سے عمل کیا کہ حمس کہلانے لگے۔ (کٹر مذہبی)

---

[1] البدایہ والنہایہ ص۲ ج۲ [2] سیرۃ ابن ہشام ص ج۱

شہر مکہ کی قدیم تنظیمات

قصی سے پہلے چند نظام یا رسمی ادارے قائم تھے۔ مثلاً

(۱) ایک نظام وہ تھا جس کے ذریعہ قصی اور بنو خزاعہ کی جنگ کا خاتمہ ایک ایسے فیصلہ پر ہوا جو بظاہر یک طرفہ اور بنو خزاعہ کے حق میں نہایت سخت تھا۔ مگر وہ فیصلہ ہوا اور وہ نافذ بھی ہوا۔ اس کا جج یعمر بن عوف تھا۔

(۲) اشہر حرم یعنی وہ مہینے جن میں جنگ ممنوع ہو جاتی تھی، ہتھیار باندھ کر رکھ دیئے جاتے تھے اور بطور عقیدہ ظلم و فساد کو حرام سمجھا جاتا تھا۔ ان مہینوں کے نام اگرچہ مقرر[۱] تھے، مگر وقت مقرر نہیں تھا۔ نام کے لحاظ سے یہ قمری مہینے ہوتے تھے، مگر معاشی ضرور تیں خصوصاً حج کی ضرورت ان کو مجبور کرتی تھی کہ قمری کو شمسی سال کے سانچہ میں ڈھالتے رہیں۔ کیونکہ زائرین اور منتظمین حج دونوں کی سہولت[۲] اس میں ہوتی تھی کہ حج کا مہینہ ایسے موسم میں ہو کہ کھجور پک کر ٹوٹنے لگیں، یہ پوری قوم کی مشترک ضرورت تھی، کبھی جنگی ضرورت کا تقاضا ہوتا تھا کہ ان مہینوں کو آگے پیچھے کر دیا جائے۔

ہندوستان میں پانڈوں کو یہ حیثیت حاصل ہے کہ وہ لوند کا مہینہ بڑھاتے ہیں اور یہ

---

[۱] ماہ رجب۔ پھر تین ماہ کے بعد ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم الحرام۔ مگر رجب کے بارہ میں اختلاف تھا ہم جس کو ماہ رجب مانتے ہیں جو جمادی الاخریٰ اور شعبان کے بیچ میں ہوتا ہے یہ مضری قبائل کا مسلمہ رجب تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق فرمائی اور قبائل ربیعہ رمضان کو رجب قرار دیتے تھے یعنی وہ شعبان اور شوال کے بیچ کے مہینہ کو رجب مانتے تھے۔ (البدایہ والنہایہ ص۲۰۲ ج۲)

[۲] جیسے ہمارے علاقہ۔ شمالی ہند میں گیہوں کٹنے کے موسم میں کاشتکاروں کو سہولت ہوتی ہے تو عموماً شادی بیاہ اسی موسم میں کئے جاتے ہیں۔

طے کرتے ہیں کہ اس سال مثلاً ساون دو ہوں گے۔ عرب میں ایک مخصوص خاندان[1] تھا جس کے لئے یہ حق پورے عرب میں تسلیم کیا جاتا تھا اور اسی کے فیصلہ پر پورے عرب میں عمل ہوتا تھا۔ اُن کو نُساۃ کہا جاتا تھا کیونکہ وہ نَسِیٔ[2] (لوند کے مہینہ) کے ذمہ دار تھے۔ اس زائد مہینہ کو (کبیسہ) بھی کہا جاتا تھا جو عموماً قمری سال کے ختم پر یعنی محرم اور ذی الحجہ کے درمیان بڑھایا جاتا تھا

(۳) "حج" ایک مُرکّب عبادت ہے جو ۸رذی الحجہ سے ۱۲رذی الحجہ تک ۵ دن میں چند مقامات پر (حرم کعبہ، منیٰ، مزدلفہ، عرفات، صفا مروہ) مختلف صورتوں میں عمل میں لائی جاتی ہے ایک ایسا مجمع جو ہزاروں سے بھی متجاوز ہو جس میں بوڑھے، جوان، عورتیں اور بچے سب ہی شامل ہوں۔ اس انبوہ کثیر کا ان مقامات پر پہنچنا اور وہاں کی عبادتوں یا رسومات کو پورا کرنا کسی نظم کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ ایک خاندان (آل صفوان) کی یہ حیثیت تسلیم کرلی گئی تھی کہ اس کے افراد اس مجمع کی قیادت کریں گے اور تمام قبائل ان کے طے کردہ پروگرام کے پابند ہوں گے۔ اس خاندان کے افراد کو صوفہ کہا جاتا تھا[3]

قصی نے ان تنظیمات کو باقی رکھا۔ اس کے علاوہ تقریباً ایک درجن جدید نظام قائم کئے گئے جن کی تفصیل آگے آئے گی۔ مگر قریش نے صوفہ کی قیادت حج کے سلسلہ میں تسلیم نہیں کی اُنھوں نے صوفہ کے نظام سے بغاوت بھی نہیں کی بلکہ اپنے لئے یہ طے کرلیا کہ وہ ان مقامات پر نہیں جائیں گے جہاں صوفہ کی قیادت نمایاں ہوتی تھی جس کی صورت یہ ہوئی کہ قریش نے دعویٰ کیا کہ وہ جار اللہ ہیں (اللہ کے پڑوسی) خانہ خدا کے خاص محافظ اور خصوصی خدام۔

---

[1] اس کے مورث اعلیٰ کا نام حذیفہ بن عبد تھا جو قلمس کے نام سے مشہور تھا اور ظہور اسلام کے وقت اس سلسلہ کا آخری شخص ابو ثمامہ جنادہ بن عوف تھا۔ ابن ہشام صہ۲ و صہ۲۹۔ قلمس کا جوڑ کیلنڈر سے بھی لگایا گیا ہے یعنی کیلنڈر والا۔ نظام حکمرانی صہ۲۹

[2] یہ وہی نَسِی ہے جس کو قرآن حکیم میں زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ فرمایا گیا ہے۔ ھو تاخیر بعض الاشھر الحرم الی شھر اٰخر (المفردات فی غریب القرآن) [3] سیرۃ ابن ہشام صہ۸ و صہ۸۴ ج۱ و ابن سعد صہ۳۸/۱۲۰ و قاموس لفظ صوف۔

ان کو حج کے موقع پر حدود حرم سے باہر نہیں جانا چاہئے اس دعوے کی بنا پر ان کو حج کے قواعد میں کچھ ترمیم کرنی پڑی[1] مگر اس طرح صوفہ کی تیادت سے ان کی عظمت محفوظ ہو گئی۔

شہری مملکت مکّہ

جدید تنظیمات

نادی ۔ دارالندوہ ۔ شعبے اور منصب

دیہات[2] اور قصبات کے محلوں میں ایسے مکانات ہوتے ہیں جن کو چوپال کہا جاتا ہے۔ یہ عموماً محلہ یا گاؤں کے بڑے آدمی کی حویلی کا مردانہ حصہ ہوتا ہے جس میں گاؤں یا محلہ والوں کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ کوئی تقریب منائیں۔ کوئی مشاورتی اجتماع یا تفریحی مجلس کریں۔ چوپال میں وعظ کے جلسے بھی ہوتے ہیں، بیاہ شادی کی تقریبات بھی۔ مشاعرے اور ادبی مجلسیں بھی ہوتی ہیں اور کبھی رقص و سرود کی رنگین محفلیں بھی جمتی ہیں۔

چوپال۔ ایک بڑا ہال ہوتا ہے اور موجودہ زمانہ میں بھی۔ عموماً دیہات میں یہ ہال خام ہوتا ہے یعنی دیواریں مٹی یا کچی اینٹوں کی ہوتی ہیں اور چھت کڑیوں کی۔ بیچ میں شہتیر (اور دورِ حاضر میں) گاڈر رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے اوپر دو طرفہ کڑیاں ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے اس کو دوکڑیہ بھی کہتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے مدینہ والے اس کو سقیفہ کہتے تھے۔ مگر مکہ معظمہ میں اس کے لئے "نادی" کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔

---

[1] عرفات، حدود حرم سے خارج ہے۔ دین ابراہیمی میں یہاں جانا بھی حج کا ایک رکن تھا مگر قریش نے اپنے حق میں اس رکن کو ختم کر دیا۔ وہ صرف مزدلفہ جاتے اور وہیں سے واپس آجاتے تھے (بخاری شریف ص۲۲۵ و ص۶۴۲ فتح الباری ص۴۰۹ ج ۳)۔

نادی[1] (مقاصد اور فوائد)

جو کام ہمارے یہاں چوپالوں میں ہوتے ہیں وہ ان اندیہ (نادیوں) میں بھی ہوا کرتے تھے اس پر مستزاد یہ کہ

(۱) سلسلۂ نسب کے بارے میں کوئی اعلان ہوتا تھا تو وہ ان نادیوں میں کیا جاتا تھا۔[2]

(۲) قبیلہ میں داخل کر لینے کا ایک خاص قاعدہ اور رواج تھا جس کو داخل کرتے تھے وہ مولی کہلاتا تھا اور جو معاہدہ اُس سے ہوتا تھا اس کو "عقد موالات" کہا کرتے تھے۔ یہ عقد موالات نادی ہی میں ہوتے تھے۔

(۳) عقد موالات کے برعکس خلع یا طرد کا اعلان بھی اسی نادی میں ہوتا تھا۔ یعنی جس کو "مولی" بنایا گیا تھا۔ اگر وہ "معاہدہ" کی پابندی نہ کرتا یا اپنے عمل اور کردار میں غلط ثابت ہوتا تو اس کو قبیلہ سے خارج بھی کیا جاسکتا تھا۔ اس کو "خلع" کہتے تھے (الگ کر دینا) اور طرد کا لفظ بھی اس کے لئے استعمال کرتے تھے (دھکے دے کر نکال دینا) یہ شخص خلیع[3]۔ مخلوع یا مطرود کہلاتا تھا۔

(۴) خرید و فروخت کے اہم معاملات۔ تجارتی کاروانوں کا استقبال اور ان کی روانگی کی تقریب۔

(۵) تفریحی مجلسیں، رات کو قصہ خوانی (مسامرہ) رقص و سرود اور سوانگ (ڈرامے) بھی نادی میں ہوا کرتے تھے۔

---

[1] نادی۔ نَدیٰ سے ماخوذ ہے۔ نَدیٰ کے معنی ہیں رطوبت، تراوٹ اسی سے ندا بمعنی آواز بھی ماخوذ ہے کہ جس کے حلق میں تراوٹ زیادہ ہوتی ہے اس کی آواز بلند ہوتی ہے۔ نادی۔ میں جام و سبو کی تراوٹ بھی رہا کرتی تھی اور داد و دہش کی سیرابی بھی اور جس طرح بحث و مباحثہ میں آوازیں بلند ہوتی تھیں، شعراء کے ترنم اور مغنیوں کے طرب انگیز نغمے بھی ہوتے تھے۔ یہی مناسبتیں وجہ تسمیہ ہیں۔

[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے چند سال پہلے زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) کو متبنیٰ بنایا (جس کی بعد میں ممانعت کردی گئی) تو آپ نے انہیں اندیہ (مجالس) میں جا کر اعلان فرمایا تھا (جس کی تفصیل حصہ سیرت میں آئے گی) [3] ملاحظہ فرمایئے بخاری شریف باب القسامہ۔

نظم ونسق کے لحاظ سے یہ نادی قبیلہ کی ہیئت حاکمہ اور شیخ قبیلہ کی اجتماعی طاقت[1] ہوتی تھی۔ ہر ایک "نادی" کے ساتھ ایک اعلانچی بھی ہوتا تھا جس کو موذن منادی یا نقیب کہا کرتے تھے۔

دارالندوۃ قبیلہ وار نظام کی طرح پورے شہر کا کوئی مرکزی نظام نہیں تھا۔ ضرورت کے وقت عام اجتماع ضرور ہو جاتے تھے۔ مگر نہ اُن کا کوئی ضابطہ تھا، نہ کوئی جگہ اُن کے لئے معین تھی۔ مصلح قوم "قصی" کا قابلِ فخر کارنامہ یہ تھا کہ اُس نے شہری اجتماع کا ایک نظم اور ضابطہ مقرر کیا، اپنا مکان جو اُس نے کعبہ کے شمالی میدان میں اس طرح بنایا تھا کہ اس کا دروازہ مسجد حرام کی طرف تھا، مرکزی نظام کے لئے عام کردیا اور دارالندوۃ[2] اُس کا نام رکھا۔

دارالندوۃ کے ضابطے ندوہ کمیٹی یا مجلس کو کہتے ہیں۔ یہ کمیٹی جس کے نام پر یہ دارالندوۃ تھا اس کی تشکیل کا ضابطہ ہمارے علم میں نہیں ہے۔ قیاس

---

[1] فلیدع نادیہ (سورہ علق) [2] آخر میں یہ حویلی حکیم بن حزام کی ہوگئی۔ انھوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں اس کو ایک لاکھ درہم میں فروخت کردیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ناراض ہوئے بعت شرف قومک بمائۃ الف درھم (تم نے اپنی قوم کے روایتی شرف کو ایک لاکھ درہم میں بیچ دیا۔ اس پر حکیم بن حزام نے جو جواب دیا وہ نہایت دلچسپ ہے۔ حضرت حکیم نے فرمایا۔ آج کے دور میں شرف صرف تقویٰ کا نام ہے اور میں گھاٹے میں نہیں رہا۔ میں نے زمانہ جاہلیت میں اس کو شراب کی ایک مشک کے بدلے میں حاصل کرلیا تھا، اب ایک لاکھ ملے ہیں تو کیا گھاٹا ہے۔ اور میں آپ سب کو گواہ بناتا ہوں کہ یہ پورا ایک لاکھ فی سبیل اللہ ہے۔ اب فرمائیے گھاٹے میں کون ہے (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۰) ابن سعد نے حضرت حکیم رضی اللہ عنہ کے اس معاملہ کا ذکر نہیں کیا۔ اس کا بیان یہ ہے کہ عبدالدار (جسکو قصی نے دارالندوۃ کا متولی بنایا تھا) کے پڑپوتے عکرمہ بن عامر نے اس کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ فروخت کیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو دارالامارۃ (گورنمنٹ ہاؤس) بنادیا ص ۴۸ ج ۱ پھر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ان کے بعد دور اموی میں ولید بن عبدالملک نے پھر عباسی خلفاء نے لوگوں کے مکانات پوری پوری قیمت بلکہ پوری سے بھی زیادہ قیمت پر خرید ے اور حرم شریف کی توسیع کی۔ بالآخر سنہ ۲۸۱ھ میں خلیفۂ عباسی معتضد باللہ کے حکم سے دارالندوہ حرم شریف میں داخل کردیا گیا (اخبار مکہ ص ۱۱۰ و ۱۱۱ ج ۲) کہا جاتا ہے اسی جگہ "مصلّیٰ حنفی" بنایا گیا جو اَب ماذنہ بن گیا ہے۔ اس میں لاؤڈ اسپیکر فٹ ہے اذان پر تکبیر یہیں پڑھی جاتی ہے۔

یہ ہے کہ قبائلی مجلس (نادی) کے شیوخ اور سربراہ اس کے ارکان ہوتے تھے۔ البتہ ارزقی نے اخبار مکہ[1] میں اور ابن درید نے کتاب الاشتقاق[2] میں تصریح کی ہے کہ دارالندوہ کے اجلاس میں صرف وہی لوگ شریک ہو سکتے تھے جن کی عمر کم سے کم چالیس سال ہوتی تھی۔ صرف دارالندوہ کے بانی (قصی) کی اولاد اس شرط سے مستثنیٰ تھی[3]

اجلاس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ جب ضرورت ہوتی اجلاس کر لیا جاتا تھا۔ دارالندوہ کا منتظم اجلاس کا داعی ہوتا تھا۔ صدر کوئی مقرر نہیں تھا۔

دارالندوہ میں انجام پانے والے کام	(۱) شہر مکہ اور قوم قریش سے تعلق رکھنے والے معاملات کے متعلق مشورے اور فیصلے[4]

(۲) کسی قبیلہ یا گروہ سے جنگ یا صلح کے فیصلے (۳) مدافعتی تدابیر (۴) جنگ کے وقت علمبردار کا تقرر (۵) تجارتی معاہدات (۶) بیرونی مہمانوں کا استقبال (۷) قصی کی شخصیت سے برکت حاصل کرنے کے لئے شادی کی تقریبات بھی یہاں ہوا کرتی تھیں (۸) قافلوں کی روانگی اور واپسی پر ان کا استقبال بھی یہاں ہوتا تھا۔ (۹) ایک خاص رسم رائج تھی کہ جب لڑکی سن بلوغ کو پہونچ جاتی تھی تو اس کو درع پہنایا جاتا تھا (بڑا کرتا) اور چھوٹا کرتا اتروا دیا جاتا تھا۔ یہ رسم بھی یہاں انجام دی جاتی تھی[5] (۹) قومی ملکیت کی چیزیں بھی یہیں محفوظ کر دی جاتی تھیں[6]

---

[1] اخبار مکہ صفحہ ۱۰۱ ج ۱ [2] کتاب الاشتقاق صفحہ ۹۷۔ [3] بعد میں اس استثناء میں توسیع کی گئی۔ چنانچہ ابوجہل کو تیس ۳۰ سال کی عمر ہی میں دارالندوہ کے اجلاس میں شریک کیا جانے لگا۔ بجودۃ راجرہ کتاب الاشتقاق صفحہ ۹۷ اور حکیم بن حزام کو پندرہ بیس سال کی عمر ہی میں یہ عزت حاصل ہوگئی تھی۔ تاریخ دمشق لابن عساکر جلد ۴ صفحہ ۱۹۴ سطر ۲ (بحوالہ عہد نبوی میں نظام حکمرانی از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب حیدرآبادی)

[4] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دینے کا فیصلہ بھی یہیں کیا گیا تھا۔ [5] سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۶۹ ج ۱ ابن سعد صفحہ ۳۹ ج ۱ [6] مثلاً غزوہ احد کی تیاری کے لئے جو تجارتی مال لایا گیا تھا کہ اس کا نفع مصارف جنگ میں صرف کیا جائے گا وہ مال یہیں جمع رکھا گیا تھا۔ (ابن ہشام وغیرہ)

مختلف شعبے اور منصب

مکہ جو صرف ایک شہر یا ایک آزاد ریاست نہیں بلکہ پورے عرب کا متبرک مرکز بھی یہی تھا جہاں عرب کا مرکزی معبد کعبہ تھا۔ اس کے انتظامات کی جو صورتیں پہلے قصی نے ان کو باقی رکھا (تفصیل پہلے گذر چکی ہے) ان کے علاوہ اور بہت سے شعبے قائم کئے' ان کے منصب اور منصبدار (عہدہ دار) مقرر کئے۔ کچھ شعبے اپنے پاس رکھے۔ تفصیل یہ ہے:

(۱) دارالندوہ۔ اس کا نظم و نسق مستقل شعبہ تھا۔ جو قصی سے متعلق تھا۔ اس کے بعد عبدالدار سے متعلق ہوا۔

(۲) مشورہ یعنی مشاورتی اجتماع کا انتظام۔

(۳) حجابت۔ کلید برداری یعنی کھولنے اور بند کرنے کی ذمہ داری اور خانہ کعبہ کے اندر داخل ہونے کی اجازت دینے کا اختیار۔

(۴) سدانت۔ دربانی، کھولنے بند کرنے اور صاف رکھنے کی خدمت۔ یہ کوئی مستقل منصب نہیں تھا بلکہ منصب حجابت ہی سے متعلق تھا۔

(۵) ..... (حرم کعبہ کا عام انتظام اور نگرانی) اس منصب کا ذمہ دار یہ نگرانی بھی رکھتا تھا کہ حرم میں شور و غل یا جھگڑا فساد نہ ہو۔

(۶) ایسار[۱]۔ بتوں سے استخارہ یعنی فال لینا جس کا قاعدہ مقرر تھا۔

(۷) اموال محجرہ[۲]۔ خانہ کعبہ کو جو چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے ان کی حفاظت کا شعبہ۔

---

[۱] اس کا ماخذ میسرہ ہے۔ میسرہ کے معنی قمار اور جوا (قاموس) چھوٹے چھوٹے تیر جن کو ازلام کہا جاتا تھا وہ جوا کھیلنے کے کام میں آتے تھے انھیں کے ذریعہ فال بھی نکالا جاتا تھا [۲] اموال محجرہ۔ یعنی محفوظ مال۔ حجر سے ماخوذ۔ حجر کے معنے حفاظت کے بھی آتے ہیں (قاموس) یہی دولت ہے جس کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارادہ فرمایا تھا کہ تقسیم کر دیں مگر پھر یہ ارادہ ملتوی کر دیا کیونکہ اُن کے پیش رو یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلیفہ اول حضرت صدیق اکبر نے ایسا نہیں کیا تھا (بخاری شریف ص ۲۱۷)

خانہ کعبہ میں ایک پختہ گڑھا کنوئیں کی طرح تھا۔ چڑھاوے کی طلائی اور نقرئی چیزیں اس کنوئیں میں ڈالدی جاتی تھیں۔ اسی کنوئیں کے کنارہ پر صنمخانہ کعبہ کا سب سے بڑا بُت ہُبل تھا۔

حج سے متعلق

رِفادہ۔ حجاج کے کھانے کا انتظام:

قصی کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ جب اُس نے قریش کو مکہ میں آباد کیا تو اُن کے ذہن نشین کرایا کہ آپ محافظ اور خادم کعبہ ہیں۔ زائرین جو عرب کے کونہ کونہ سے آتے ہیں یہ آپ کے مہمان ہونے چاہئیں اور ان کے خورونوش کا انتظام آپ کو کرنا چاہیے۔ یہ قریش کی عالی حوصلگی تھی کہ اُنھوں نے اس تجویز کو منظور کیا۔ اور پھر یہ طے ہوگیا کہ اپنی آمدنی کا ایک حصّہ اس مقصد عظیم کے لئے جمع کرادیا کریں گے۔ تجارتی مال میں یہ حصّہ کم سے کم عشر (دسواں حصّہ) ہوتا تھا بعض باحوصلہ اس سے بھی زیادہ دیدیا کرتے تھے۔ اس تجویز کی سیاسی مصلحت یہ تھی کہ

(۱) عرب خزاعہ کو بھول گئے، جن سے قصی نے اقتدار چھینا تھا۔

(۲) قریش کے تسلّط کو نعمت اور رحمت سمجھنے لگے۔

(۳) شہر مکّہ اور حرم کعبہ میں قصی نے جو انقلاب برپا کیا تھا کہ عرب کے عقیدے کے خلاف جنگل اور درخت کٹوا کر قریشی خاندان آباد کر دیئے۔ عرب نے اس کو برداشت کیا۔ فریق مخالف (خزاعہ) جو اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرکے عرب کو مشتعل کر سکتے تھے، اس کے راستے بند ہو گئے۔ خطرات ختم ہو گئے۔

(۴) نہ صرف سرزمین مکہ میں بلکہ پورے عرب میں قریش کے لئے کوئی خطرہ نہیں رہا چنانچہ عام عرب کے لئے صرف چار ماہ حرَم تھے، جن میں اُن کو کہیں آنے جانے میں خطرہ نہیں ہوتا تھا اور قریش کے لئے پورے بارہ مہینے حرم ہو گئے۔ اس سے بسل کی اصطلاح ایجاد ہوگئی

لہ جیسے قصی کے پوتے ہاشم جن کا ذکر آگے آئے گا (انشاء اللہ)۔

یعنی باقی آٹھ ماہ کا بھی حرام ہونا۔[1]

یہ قریش کا اعلیٰ درجہ کا تدبر تھا کہ رفادہ کے باعث اُنھوں نے خرچ سے زیادہ منافع کی صورتیں پیدا کرلیں اور اُن کے عظمت و احترام میں بھی چار چاند لگ گئے پھر احرام کا انتظام بھی قریش نے اپنے ذمہ لے لیا۔ یعنی جب عرفات سے واپس ہوکر طواف کعبہ کریں جو ۱۰ تا ۱۲ ذی الحجہ کو ہوا کرتا تھا تو یہ طواف ان کپڑوں میں نہ ہونا چاہیئے جو سال بھر پہنے جاتے ہیں جن کو پہن کر سیکڑوں گناہ کئے جاتے ہیں بلکہ اس طواف کے لئے احرام کا کپڑا قریش دیں گے اور اگر کوئی شخص کسی وجہ سے قریش کا یہ عطیہ حاصل نہ کرسکے تو وہ برہنہ بدن طواف کرے۔[2]

سقایہ حجاج کے لئے پانی کا انتظام۔ یہ شعبہ بھی رفادہ کی طرح بہت اہم اور بہت کٹھن تھا۔

خزاعہ سے شکست کھا کر جب بنو جرہم مکہ سے فرار ہوئے تھے تو ان بھاگنے والوں نے "سب کچھ تباہ کردینے" کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے زمزم کو بھی (جو پہلے چشمہ تھا پھر یہاں کنواں بنا لیا گیا تھا اور چشمہ کنویں کا سوت ہوگیا تھا جس کی وجہ سے کنوئیں کا پانی کبھی کم نہیں ہوتا تھا) نہ صرف بند کردیا تھا بلکہ لاپتہ کردیا تھا۔ قصی نے جب کعبہ کا حرم بنایا اور اُس کے قریب قریش کو آباد کیا تو یہاں کوئی کنواں نہیں تھا تو زائرین کے لئے پانی کی سخت دشواری ہوتی تھی۔ شعبہ سقایہ کا کام یہ تھا کہ مکہ کے مختلف محلوں میں جو کنوئیں تھے وہاں سے پانی لاتے اور حوضوں میں بھر دیتے تھے۔

زائرین صرف حرم کعبہ ہی میں نہیں رہتے تھے بلکہ عرفات اور مزدلفہ بھی جاتے تھے۔

---

[1] البسل هو تحريم ثمانية اشهر لهم من كل سنة البداية والنهاية ص۲۰۲ ج۲ قد عرفت ذلك لهم العرب لا ينكرونه ولا يدفعونه يسيرون به الى اى بلاد العرب شاؤوا لا يخافون منهم شيئا۔ ابن ہشام ص۶۶ ج۱ [2] ابن سعد ص۴۱ ج۱

اور منیٰ میں تو کئی روز تک جشن رہا کرتا تھا۔ پانی کا انتظام سب جگہ کیا جاتا تھا۔ واٹر پروف کی قسم کی کوئی چیز اس وقت نہیں تھی البتہ چمڑہ اُن کے یہاں ہوتا تھا، جو حبش وغیرہ بھی بھیجا جاتا تھا۔ بڑے بڑے حوض چمڑے[1] ہی کے بنائے جاتے تھے۔ یہ سب انتظام شعبۂ سقایہ سے متعلق تھا۔

وقادۃ[2]۔ ۹ ذی الحجہ کی شام کو حاجی عرفات سے روانہ ہو کر مزدلفہ پہنچتے ہیں۔ رات کو مزدلفہ میں قیام رہتا ہے۔ صبح کو وہاں سے منیٰ آتے ہیں۔ یہی دستور زمانہ جاہلیت میں تھا۔ یہ رات اگرچہ چاندنی ہوتی ہے مگر پھر بھی قصی نے یہ انتظام کیا تھا کہ مزدلفہ کے ٹیلوں پر آگ جلائی جاتی تھی جس سے میدان مزدلفہ روشن رہتا تھا اور آنے والوں کو سہولت ہوتی تھی[3] اس کو وقادہ کہا جاتا تھا۔

اجازہ یا افاضہ۔ روانگی کا پروگرام بنانا۔ پہلے گذر چکا ہے کہ یہ اختیار "صوفہ" کو حاصل تھا کہ وہ طے کیا کرتے تھے کہ مثلاً عرفات سے کونسا قبیلہ پہلے اور کونسا بعد کو روانہ ہوگا۔

قُبّہ۔ حج کے موقعہ پر ہر ایک قبیلہ کا قیامگاہ (پڑاؤ) الگ ہوتا تھا جس کو منزل کہا جاتا تھا۔ کمبلوں کے خیمے ہوتے تھے مگر قریش کے خیمے سُرخ چمڑے کے ہوتے تھے۔ ایسے خیمہ کو قبّہ کہا جاتا تھا (جمع قباب)، اُن کے انتظام کا ایک شعبہ تھا اُس کو قبّہ ہی کہتے تھے[4]۔

عدالت اور فصل خصومات

حکومت۔ عام مقدمات کی سماعت اور فیصلہ اس شعبہ سے متعلق تھا۔

اشناق۔ قتل کے سلسلہ میں بعض صورتیں ایسی ہوتی تھیں جن میں دیت واجب

۱؎ ابن سعد ص۴۱ ج۱ ۲؎ وقادۃ۔ آگ روشن کرنا۔ بھڑکانا ۳؎ ابن سعد ص۴۱ ج۱

۴؎ کانوا اھل القباب الحمر۔

ہوتی تھی ـــــ دیت کی ایسی صورت ہوتی تھی کہ اس کو اجتماعی جُرمانہ کہا جا سکتا ہے۔ پُوری دیت کے سو[1] اونٹ ہوتے تھے جو مقتول کے وارثوں کو دیئے جاتے تھے۔ مگر یہ اونٹ قاتل نہیں دیتا تھا۔ بلکہ اس کی ادائیگی عاقلہ کے ذمہ ہوتی تھی یعنی وہ سوسائٹی جس میں یہ رہتا تھا، پھر قبائل کے جو معاہدات ہوتے تھے اُن میں ایک دفعہ یہ بھی ہوتی تھی کہ اگر کسی قبیلہ پر دیت ادا کرنی لازم ہو تو اس کا اتنا حصّہ وہ قبیلہ ادا کرے گا اور اتنا حصّہ اُس کا حلیف اور معاہد قبیلہ ادا کرے گا۔

پھر اگر جان ہلاک ہوئی ہے تو پوری دیت لازم ہوتی تھی۔ اور اگر ناک، کان یا کوئی عضو کاٹ دیا ہے تو بعض صورتوں میں پُوری دیت اور بعض صورتوں میں دیت کا ایک حصّہ لازم ہوتا تھا۔ چونکہ اسلام نے بھی دیت کے طریقہ کو (جزوی اصلاحات کے بعد باقی رکھا) تو اس کے احکام کتب فقہ میں بھی ہیں۔ بہرحال قتل و دیت کے مقدمات نہایت اہم ہوتے تھے اور اُن میں فیصلہ طلب امور یہ ہوتے تھے کہ پُوری دیت لازم ہوتی ہے یا دیت کا جزو۔ اور جو بھی صورت ہو اس کی ادائیگی صرف قاتل کے قبیلہ اور اس کے عاقلہ پر لازم ہوگی یا اس قبیلہ کے حلیف قبائل پر بھی۔ اور اگر حلیفوں پر بھی لازم ہوتی ہے تو رُوئے معاہدہ کتنی۔ اور اس کی ادائیگی کی کیا صورت ہوگی۔ اس شعبہ کا نام (جس کے ذریعہ ان مقدمات کا فیصلہ کیا جاتا تھا) اشناق[2] تھا اور اس کا ذمہ دار وہی ہو سکتا تھا جو اونچے درجہ کا معاملہ فہم

---

[1] پہلے ایک انسان کی دیت دس اونٹ ہوا کرتی تھی جب عبدالمطلب کی منت ماننے کے مشہور واقعہ میں عبداللہ کے فدیہ میں سو اونٹ پر قرعہ نکلا اور عبدالمطلب نے عبداللہ کے فدیہ میں سو اونٹ ذبح کئے تب سے ایک انسان کی دیت سو اونٹ قرار دی گئی جس کو اسلام نے بھی باقی رکھا۔ ابن سعد ص ۵۳ ج ۱۔ [2] اشناق شنق سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ ہیں جز۔ دیت اور زکوٰۃ کے جو نصاب اسلام نے مقرر کئے ہیں تو دو نصابوں کے درمیان جو کسر ہوتی ہے اس کو بھی شنق کہا جاتا ہے۔ مثلاً چالیس بکریوں پر ایک بکری زکوٰۃ میں ادا کرنی ہوتی ہے اور ایک سو بیس پر دو بکریاں، تو چالیس سے زائد اور ایک سو بیس سے کم تعداد شنق ہوئی۔

ہو۔ اور صحیح فیصلہ کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اسلام سے پہلے یہ شعبہ ابو بکر بن قحافہ کے سپرد تھا۔ جن کو اسلام نے صدیق اکبر کا خطاب دیا۔" رضی اللہ عنہ"

فوجی نظام

غیر موزوں نہ ہوگا اگر یہاں " بے ضابطہ فوج " کا لفظ استعمال کیا جائے۔ بے ضابطہ فوج" سے مراد قبائل کے وہ جنگجو ہیں جو کسی بھی مقابلہ کے وقت میدان میں آجاتے تھے۔ ان کے اسلحہ[1] خود اپنے ہوتے تھے۔ ان کا کوئی کمانڈر مستقل نہیں ہوتا تھا۔ اس کا انتخاب[2] وقت پر ہوتا تھا۔ ہر قبیلہ کا جھنڈا الگ ہوتا تھا اس کو لوار کہا جاتا تھا اور ایک علم پوری فوج کا ہوتا تھا۔ اس کو عُقاب کہتے تھے۔ پوری فوج کے سالار اعظم کو قائد۔ اس منصب کو قیادت[3] اور اس کے کیمپ کو قبہ[4] کہا کرتے تھے۔

خاص خاص رسموں کے ساتھ یہ عہدے اور جھنڈے سپرد کئے جاتے تھے۔ سپرد کرنے والے بھی خاص سردار ہوتے تھے۔

قسمیں | فوج کی چند قسمیں ہو جاتی تھیں۔ تیر انداز[1]، رُماۃ جمع رامی ؛ پیادہ[2]، رجالہ ؛ سوار[3]، خیل۔

سوار فوج کے لئے اَعنّہ[4] کا لفظ بھی استعمال ہوتا تھا۔

---

[1] تلوار، نیزہ، تیر اور حفاظت کے لئے ڈھال، ذرہ (درع) اور خود (بیضہ)، خود کے آہنی جھالر جن سے گردن کی حفاظت ہوتی تھی مِغفَر کہلاتے تھے۔

[2] جو عموماً قرعہ کے ذریعہ ہوتا تھا۔ قبائل کے سردار اُمیدوار ہوتے تھے۔ جنگ فجار کے موقع پر حضرت عباسؓ کا نام نکل آیا۔ یہ اس وقت بچے تھے تو ان کو ایک ڈھال پر بٹھا کر لے گئے۔ العقد الفرید ص ۱۰۶ ج ۳

[3] اخبار مکہ [4] العقد الفرید [5] اعنہ۔ عنان کی جمع ہے۔ عنان یعنی باگ۔

فتح کے وقت لوٹ کے مال کو غنیمت کہا جاتا تھا۔ اس کا اتنا نظام تسلیم شدہ تھا کہ ایک چوتھائی قائدِ فوج یا سردار اعظم کا ہوتا تھا۔ اس چوتھائی کو مرباع کہتے تھے[1] (چوتھ) باقی تین حصے مختلف طریقوں سے تقسیم کئے جاتے تھے[2]

اس خاکہ کے بموجب فوج کے منصب دار یہ ہوتے تھے:

(۱) قائد اعظم (۲) علبردار جس کے پاس عقاب رہتا تھا (۳) کیمپ یعنی قبہ کا منتظم اور محافظ (۴) سوار فوج کا سردار، صاحب اعنہ۔ اس کو مختصر کر کے اعنّہ کہتے تھے۔

باضابطہ فوج یا پولیس قریش نے حفاظتی مقاصد کے لئے ایک مستقل نظام بھی بنایا تھا اس کو قائم کہتے تھے۔ مگر اس کی حیثیت تنخواہ دار پولیس کی تھی۔

لڑائیوں کے وقت قبائل کے جنگجو بھی اپنے مفاخر کے ترانے گاتے ہوئے میدان میں آیا کرتے تھے اور مقابلہ بھی ان سے کرتے تھے جو ان کے ہمسر ہوتے تھے۔ غزوۂ بدر میں سرداران قریش نے انصاری مجاہدین کو مقابلہ پر دیکھا تو لڑنے سے انکار کر دیا۔ کہ یہ کاشتکار اور کسان ہیں۔ قریش کے ہم پلّہ نہیں ہیں۔ یہ بھی ایک ضابطہ تھا۔

---

[1] عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان بھی چوتھ سے ناآشنا نہ تھا۔ شیواجی عالمگیر سے اس پر لڑتا رہا کہ وہ چوتھ مانگتا تھا۔ یعنی یہ کہ عالمگیر یہ تسلیم کرے کہ شیواجی کو اپنے میں چوتھ حاصل کرنے کا حق ہوگا۔ سلطان عالمگیر اس کے لئے تیار نہیں ہوئے۔

[2] عموماً تین چوتھائی باقی ساتھیوں پر۔ اگر کچھ مال دشمن کی شکست اور عام لوٹ سے پہلے مل جاتا تھا اس کو نشیطہ کہا جاتا تھا۔ "فضول" سے مراد ناقابل تقسیم کسرات ہوتے تھے اور صفی کسی ایسی منتخب چیز کو کہتے تھے جو مہم کا سردار اپنے لئے منتخب کر لیا کرتا تھا۔ مثلاً کوئی تلوار یا کوئی گھوڑا وغیرہ۔ سردار کو اس انتخاب کا حق ہوتا تھا۔

تقسیم مناصب[1] جب آفتاب اسلام طلوع ہوا تو مناصب کی تقسیم اس طرح تھی :

شعبے	نمبر شمار	منصب	خدمات و فرائض	قبیلہ	منصب دار
نظم و حفاظت کعبہ مکرمہ	۱	حجابہ و سدانہ	خانہ کعبہ کی کلید برداری	بنو عثمان بن عبدالدار بن قصی	عثمان بن طلحہ
	۲	عمارت	حرم کعبہ کا عام انتظام اور نگرانی	" "	" "
	۳	الیسار	فال نکالنے کی خدمت جس کا قاعدہ مقرر تھا	بنو جمح	صفوان بن امیہ
	۴	اموال محجّرہ	بتوں کے نام پر حاصل شدہ نذرانوں کی حفاظت اور انکا انتظام	بنو سہم	حارث بن قیس
حجاج ــــ اور زائرین حج	۵	سقایہ	حاجیوں کے لئے پانی کا انتظام	بنو ہاشم	ابو طالب
	۶	رفادہ	حاجیوں کیلئے کھانے اور احرام کے کپڑوں کا انتظام	"	"
	۷	اجازہ یا افاضہ	عرفات سے واپسی میں ترتیب قائم کرنا	صوفہ	"
	۸	وقادہ	مزدلفہ میں روشنی کا انتظام	بنو عبد مناف	
	۹	نسی	لوند کا مہینہ معین کرنا	صوفہ	ابو ثمامہ جنادہ بن عوف
	۱۰	قبہ	حج کے موقع پر قبائل کے لئے قیام گاہوں نیز جنگ کے وقت خیموں اور خرگاہوں کا انتظام		
عدل و انصاف اور انتظامی امور	۱۱	ندوہ	سماعت مقدمات اور درع وغیرہ کی تقریبات کا انتظام	بنو عبدالدار	عثمان بن طلحہ
	۱۲	مشورہ	اہم امور میں مجلس مشاورت کا انتظام	بنو اسد	یزید بن زمعہ
	۱۳	اشناق	خون بہا، جرمانہ اور مالی تاوان کا فیصلہ اور نظم	بنو تمیم	ابو بکر (الصدیق)
	۱۴	حکومت	مقدمات کی سماعت و فیصلہ	بنو سہم	حارث بن قیس
فوج و جنگ	۱۵	قیادت	فوجوں کی کمانداری	بنو امیہ	ابو سفیان بن حرب
	۱۶	لواء	علم برداری	بنو عبدالدار	
	۱۷	اَعِنّہ	سواروں کے رسالہ کی سپہ سالاری	بنو مخزوم	خالد بن الولید
امور خارجہ	۱۸	سفارت	دوسرے ملک یا دوسرے فریق جنگ سے جنگ یا صلح کی گفتگو اور پیغام رسانی	بنو عدی	عمر فاروق رض

[1] ماخوذ از طبقات ابن سعد ج ۱۔ اخبار مکہ۔ العقد الفرید۔ و سیرۃ ابن ہشام ج ۱

قُصیؒ کے جانشین

کشمکش - احلاف مطیّبین واحلاف لعقۃ الدم اور مفاہمت

قصی کہا کرتا تھا: میرے چار لڑکے ہوئے۔ دو کے نام میں نے اپنے دیوتاؤں کے نام پر رکھے۔ عبدمناف اور عبدالعزیٰ۔ ایک کا نام دار کے نام پر عبدالدار اور ایک کا نام عبدالقصی رکھا۔ عبدالقصی کو عبد بن قصی بھی کہتے تھے۔ دو لڑکیاں تھیں تخمر، برّہ[1]

عبدالدار سب سے بڑا تھا۔ باپ کی خدمت میں رہتا تھا۔ کچھ کرتا کراتا نہیں تھا۔ اور لڑکوں نے باپ سے الگ ہو کر اپنا اپنا مقام پیدا کر لیا تھا۔

قُصیؒ نے اپنے بعد عبدالدار کو جانشین کر دیا اور جو شعبے قصی کے پاس تھے وہ سب عبدالدار کے حوالے کر دیئے۔

ممکن ہے قصیؒ کا منشا یہ ہو کہ باپ کے بعد سب سے بڑے بیٹے کی جانشینی کا قاعدہ رائج کر دے۔ مگر اس کا یہ منشا پُورا نہ ہو سکا۔ بیشک قصیؒ کے بیٹے باپ کے فیصلے کے پابند رہے مگر پوتوں کا دور آیا تو یہ بحث شروع ہو گئی کہ ان سب شعبوں پر ایک بیٹے کی اولاد کا قبضہ کیوں رہے جب کہ دادا کے سب پوتے استحقاق میں برابر ہیں اور قابلیت اور صلاحیت میں بڑھے ہوئے ہیں۔ اب قصیؒ کے پوتوں کی دو پارٹیاں ہو گئیں اور ہر ایک کے ساتھ اور قبیلے بھی ہو گئے۔

اولاد عبدالدّار کے حامی بنو مخزوم، بنو سلیم، بنو جمح ، بنو عدی۔ اور اولاد عبدالمناف کے حمایتی بنو اسد، بنو زہرہ، بنو تیم، بنو الحارث۔

ہر ایک فریق کے حامیوں نے حلف اُٹھائے اور عہد کئے۔ عبدمناف کے لڑکوں

---

[1] ابن سعد ص ۳۹ / ج ۱

نے ایک طشت یا (تسلے) میں عطر بھر کر خانہ کعبہ کے سامنے رکھ دیا۔ ان کے تمام حامیوں نے عطر میں ہاتھ ڈال کر عہد کیا:

"ہم نہ مدد چھوڑیں گے نہ کسی ساتھی کو دشمن کے حوالے کریں گے
جب تک سمندر میں یہ صلاحیت باقی ہے کہ وہ اون کو بھگو سکے"۔

حلف کے وقت کسی مقدس کتاب کو ہاتھ میں لینے کے بجائے وہ خانہ کعبہ کی دیوار پر ہاتھ رکھتے تھے اور عہد کے الفاظ ادا کرتے تھے۔ چونکہ انھوں نے عہد کے وقت خوشبو سے کام لیا تھا تو اُن کو "مطیبین" کہا گیا۔

عبد الدّار کے لڑکوں نے عطر کے بجائے تسلے میں خون بھرا اور اسی طرح حلف لیا۔ خون کی نسبت سے ان کو "احلاف لعقۃ الدم" کہا گیا۔ لیکن یہ تیاریاں تیاری کی حد سے آگے نہ بڑھیں، کیونکہ با اثر امن پسند سرداروں نے بیچ میں پڑ کر طے کرا دیا کہ جنگ کے بجائے گفت وشنید سے معاملات طے کئے جائیں اور یہ شعبے دونوں ٹولیوں میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ چنانچہ باہمی گفت گو سے شعبوں کی تقسیم اس طرح کر دی گئی کہ: بنو عبد مناف کو رفادہ اور سقایہ دیدیا گیا اور باقی شعبے بنو عبد الدّار کے پاس باقی رکھے گئے[1]

قیادت اس تقسیم میں قیادت کا ذکر نہیں ہے لیکن مورخ علامہ ازرقی کا بیان ہے کہ منصب قیادت بھی عبد مناف کے حوالہ کیا گیا — عبد مناف کے بعد اس کا بیٹا عبد شمس، عبد شمس کے بعد اس کا بیٹا امیہ۔ اس کے بعد حرب بن امیہ اس منصب پر فائز ہوا۔ قریش کی سب سے زیادہ مشہور لڑائیوں میں قائد حرب بن امیہ ہی رہا۔ پہلے جنگ "ذات نکیف" میں قیادت کی جو قریش اور بنی بکر کے درمیان ہوئی تھی۔ اطراف مکہ کے دو اعرابی جن کو احابیش کہا جاتا تھا۔ اس وقت بنو بکر کے ساتھ تھے۔ (غزوہ حدیبیہ کے موقع پر قریش نے ان کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا (بخاری باب غزوۃ الحدیبیہ صفحہ ۶)

پھر قریش اور قیس عیلان کی جنگ میں جو یوم عکاظ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد پہلی اور دوسری جنگ فجار میں حرب بن امیہ ہی قائد رہا۔ حرب کے بعد اس کا بیٹا ابوسفیان قائد بنایا گیا۔ غزوہ بدر

---

[1] ابن سعد ص ۴۴ ج ۱ ابن ہشام ص ۱۴۳ ج ۱ البدایہ والنہایہ ص ۲۰۹ ج ۲

کے موقع پر یہ مکہ میں نہیں تھا۔ اس لئے عتبہ بن ربیعہ قائد بنایا گیا۔ مگر اس کے بعد جنگ احد اور جنگ احزاب میں قائد اعظم یہی ابو سفیان تھا۔ (اخبار مکہ ص۱۱۵ ج ۱)

عبد مناف کے بلند حوصلہ فرزند فرزندانِ عبد مناف کی حوصلہ مندی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان چار بھائیوں میں سے صرف عبد شمس مکہ میں مرا۔ باقی ہاشم کا انتقال شام کے علاقہ "غزّہ" میں ہوا مطّلب کا انتقال یمن کے علاقہ "ردان" میں اور نوفل کی وفات "سلمان" میں ہوئی جو عراق میں تھا[1]

کارنامہ ۔ قصیٰ نے اگرچہ بادشاہت کا دعویٰ نہیں کیا۔ مگر قریش پر اور قریش کے ذریعہ پورے عرب پر اس کا اقتدار کسی بادشاہ سے کم نہیں تھا۔ اور اس لحاظ سے اس کی اولاد کی حیثیت وہی تھی جو شاہزادوں اور راج کماروں کی ہوا کرتی تھی۔

عبد مناف کی اولاد نے اپنی شخصیت اور اپنی اس حیثیت کو پہچانا اور اس سے کام لیا۔ چنانچہ انھوں نے پڑوسی ممالک کے بادشاہوں اور شاہنشاہوں سے تعلقات پیدا کئے اور ان کو بڑھایا اور قابل قدر بات یہ ہے کہ ان تعلقات کے فوائد کو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان تعلقات سے کام لے کر اپنی قوم کے لئے تجارتی مراعات اور سفروں میں آسانیاں پیدا کیں۔ چنانچہ مطلب نے جو سب سے بڑا تھا شاہ حبش نجاشی اور یمن کے ملوک (ملوک حمیر) سے ہاشم نے بازنطینی شہنشاہ ہرقل سے اور نوفل نے شہنشاہ ایران "کسریٰ" سے اپنی قوم کے لئے آزاد تجارت کے فرامین حاصل کر لئے کہ قریشی تاجر جو ان کے ملکوں میں جائیں گے ان سے کوئی محصول یا ٹیکس نہیں لیا جائے گا[3] ظاہر ہے تجارت پیشہ قوم کے لئے اس سے بڑی نعمت کیا ہو سکتی ہے۔ اسی لئے ان کو "مجیرون" کہا جاتا تھا[4]

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص۸۷ ج۱ [2] عبد شمس کے کسی کارنامہ کا تذکرہ نہیں ہے یہاں ایک تاریخی لطیفہ قابل تذکرہ ہے کہتے ہیں ہاشم اور عبد شمس جوڑواں پیدا ہوئے تھے اس طرح کہ ہاشم کا پیر عبد شمس کے سر سے چپکا ہوا تھا۔ اس کو الگ کیا گیا تو خون نکلا۔ اس پر اس زمانہ میں لوگوں نے کہا تھا کہ ان کی اولاد میں آپس میں خونریزی ہوگی بنو عباس اور بنو امیہ کی جنگ جو ۱۳۲ھ میں ہوئی جس نے بنو امیہ (اولاد عبد شمس) کو نہ صرف عرب، بلکہ ایشیا سے بھی باہر نکال دیا۔ اس کو اس پیشین گوئی کا مصداق کہا جا سکتا ہے۔ البدایہ والنہایہ ص۲۵۳ ج۲

[3] البدایہ والنہایہ ص۲۵۳ ج۲ [3] طبقات ابن سعد ص۴۳ ج۱ البدایہ والنہایہ ص۲۵۳ ج۲ [4] ایضاً

بلند حوصلہ ہاشم بن عبد مناف

رفادہ اور سقایہ سب سے اہم شعبے تھے جن کے لئے دولت کی ضرورت بھی تھی اور محنت کی بھی۔ یہ اگرچہ عبد مناف کے چاروں بیٹوں کے سپرد ہوئے تھے مگر ان میں پیش پیش ہاشم رہا۔ یہ سب بھائیوں میں سب سے زیادہ بلند حوصلہ، با سلیقہ، صاحب الرائے اور رسا آدمی تھا۔ رفادہ اور سقایہ کو جس قدر رقم کی ضرورت تھی ہاشم کا حوصلہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا۔

پہلے گذر چکا ہے قصیؔ نے قریش کو سمجھایا تھا کہ زائرین (جو حج کو آتے ہیں) وہ قریش کے مہمان ہونے چاہئیں۔ قریش نے اس فلسفہ کو بخوشی تسلیم کر کے ایک ٹیکس بھی مقرر کر لیا تھا جس کو ہر ایک امیر اور غریب اپنے اپنے حوصلہ اور ہمّت کے بموجب عقیدت مندی سے ادا کیا کرتا تھا۔ بعض بعض عطیے سو سو "مثقال[1] ہرقلی" کے ہوتے تھے۔ مگر ہاشم کے عطیے کی کوئی حد نہیں تھی، جو کچھ کمی رہتی وہ اپنی جیب سے پوری کیا کرتا تھا۔

اب تک رفادہ کے سلسلہ میں کھجور دیئے جاتے تھے جو عرب خصوصاً بدوؤں کی عام غذا تھی۔ اور رفادہ کے اس فیض سے ضرورت مند ہی فیضیاب ہوتے تھے۔ مگر ہاشم نے رفادہ کو پُر تکلف دعوت کی صورت دیدی۔ ہر ایک حاجی مدعو ہوتا تھا اور عرب کا سب سے بڑھیا کھانا یعنی "ثرید[2]" پیش کیا جاتا تھا۔

ثرید کبھی گوشت کا ہوتا تھا، یعنی شوربے میں چُوری ہوئی روٹی اور کبھی روٹی گھی میں چُوری جاتی تھی اور گھی روٹی کا ثرید پیش کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ شربت، ستّو، کھجور وغیرہ

[1] ایک مثقال ساڑھے چار ماشہ کا سو مثقال ۳۷ تولہ آٹھ ماشے کے تقریباً ۳۹ تولہ سونا۔

[2] کسی کھانے کے اجزاء ترکیبی بتا دینے سے کھانے کی پوری صفت سامنے نہیں آتی۔ مثلاً بریانی کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ایک کھانا ہے۔ گوشت کی یخنی پکا کر اس میں چاول (باقی برصفحہ آئندہ)

دعوتوں کا یہ سلسلہ ، ۸ ذی الحجہ (یوم الترویہ سے ایک دن پہلے سے) شروع ہوکر ۱۳ تک رہتا تھا۔ عرفات، منیٰ اور مزدلفہ جہاں جہاں حاجی جاتے تھے یہ دعوتیں[۱] ہوتی تھیں۔[۲]

ہاشم کا ذریعہ آمدنی تجارت تھی۔ شہنشاہ روم (ہرقل) سے تعلقات بہت اچھے تھے ایسے ہی شاہان ایران و یمن اور حبش سے تعلقات تھے۔ اس نے ان تمام فرامین کی تجدید کرائی جو پہلے ہوچکے تھے اور رحلۃ الشتاء والصیف کا طریقہ اسی نے ایجاد کیا کہ قریش کا تجارتی قافلہ سردیوں میں یمن اور حبش جاتا تھا اور گرمیوں میں شام سے غزہ تک اور کبھی انقرہ تک پہنچ جاتا تھا۔ یہاں کے بادشاہ اور امراء ان قافلوں کا اعزاز کرتے تھے۔[۳]

وجہ خطاب کہتے ہیں اصل نام عَمرو تھا، ہاشم خطاب تھا۔ اس خطاب کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک مرتبہ قحط کے زمانہ میں جب مکہ میں غلہ کا نام و نشان نہیں رہا تھا تو ہاشم شام گیا اور وہاں سے سیکڑوں مَن کیک" بوروں میں بھروا کر لے آیا۔ واپس آکر جن اونٹوں پر وہ کیک لایا تھا، اُن کو ذبح کراکر قورما بنوایا اور کیک اس میں چور کر ان کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ڈال دیتے ہیں۔ اس سے بریانی کی پوری صفت سامنے نہیں آتی یہی صورت ثرید کی ہے اگرچہ اس کی حقیقت یہی ہے کہ شوربے میں روٹی ڈالی جاتی ہے مگر شوربا اس طرح بنایا جاتا ہے اور پھر روٹی کے ٹکڑے اس میں اس طرح ڈالے جاتے ہیں اور اس طرح پکائے جاتے ہیں کہ نہایت لذیذ اور زود ہضم کھانا ہوجاتا ہے۔

[۱] ابن سعد ص۴۵ ج۱ وکان یطعمھم اول مایطعم قبل یوم الترویہ بیوم بمکہ و بمنی وجمع وعرفۃ وکان یثرد لھم الخبز واللحم والخبز والسمن والسویق۔ والتمر ابن سعد ص۴۵ ج۱

[۲] ابن اسحاق کی شہادت یہ ہے کہ دعوتوں کا یہ طریقہ جو ہاشم نے جاری کیا تھا آج تک قائم ہے۔ چنانچہ سلطان کی طرف سے منیٰ میں دعوت ہوتی ہے ص۲۰۴ ج۲ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ابن اسحاق کے زمانہ کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ البدایہ والنہایہ ص۲۰۴ ج۲۔ ازرقی کی شہادت یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ھ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو انتظام حج کے لئے بھیجا۔ تو حجاج کے مصارف طعام کے لئے بھی آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو رقم عنایت فرمائی۔ اخبار مکہ ص۱۱۲ ج۱ [۳] ابن سعد ص۴۳ ج۱

باقاعدہ ثرید کی طرح پکا کر تمام مکہ والوں کو بڑی افراط سے ثرید کھلایا۔ تب سے ہاشم خطاب ہوگیا۔ یعنی روٹی چور کر کھلانے والا۔ ہشم کے معنیٰ ہیں چورنا[1]

کہتے ہیں ہاشم کے برادرزادہ امیہ بن عبد شمس نے بھی ہاشم کی طرح نام پیدا کرنا چاہا مگر وہ بے چارہ حوصلہ سے محروم تھا۔ لہٰذا مقابلہ میں تو شکست کھائی البتہ اس نے ایک عناد دل میں ضرور بٹھالیا۔ یہیں سے بنوہاشم اور بنوامیہ میں مخالفت کا آغاز ہوا[2]

شیبہ عرف عبدالمطلب بن ہاشم

ہاشم کا زیادہ وقت سفروں میں گذرتا تھا۔ ایک مرتبہ شام جا رہا تھا۔ راستہ میں یثرب میں قیام ہوا (جس نے بعد میں مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے غیر فانی شہرت پائی) وہاں ایک میلہ لگ رہا تھا۔ ہاشم نے بھی اس میلہ سے فائدہ اٹھایا۔ میلہ میں ایک عورت کو دیکھا۔ بڑے اچھے موقع پر اس کی بہت بڑی دوکان تھی۔ وہ تمام کام کی نگرانی نہایت ہوشیاری اور سلیقہ مندی سے خود کر رہی تھی۔ شریف صورت، صاحب جمال۔ اس کی سلیقہ مندی اور سمجھ بوجھ سے ہاشم متاثر ہوئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ قبیلۂ نجار کی یہ خاتون ہے سلمیٰ نام ہے (بنت عمرو بن زید) شوہر کا نام اُحیحہ تھا۔ اس سے چھوٹ چھٹا ہو چکا ہے۔ اب اگر کوئی نکاح کا پیغام بھیجتا ہے تو یہ شرط لگاتی ہے کہ اس کو طلاق کا اختیار ہوگا، وہ جب چاہے گی جُدا ہو جائے گی۔ اس عورت سے ہاشم اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ انھوں نے بھی اپنا پیغام بھیجدیا۔ سلمیٰ، واقعی ہوشیار تھی۔ وہ ہاشم بن عبد مناف کو جانتی تھی کہ قریش کا نگ ہے۔ مکہ کا بے تاج بادشاہ، پورے عرب میں اس کی طوطی بول رہی ہے۔

سلمیٰ نے یہ رشتہ منظور کر لیا۔ نکاح ہوا۔ ہاشم نے شاندار ولیمہ کیا۔ کچھ عرصہ مدینہ میں قیام کیا، پھر وہ شام روانہ ہوگیا۔ ہاشم کا اسی سفر میں بمقام غزّہ انتقال ہوگیا۔ وہیں اس کو دفن کر دیا

---

[1] ابن سعد ص ۴۳ ج ۱ [2] ابن سعد ص ۴۴ ج ۱

گیا۔ یہاں سلمیٰ کے لڑکا پیدا ہوا۔ سر کے بال سفید تھے۔ اس لئے اس کا نام "شیبہ" رکھا گیا۔

ہاشم نے اپنے بھائی مطلب کو اپنی اولاد کی نگرانی کی وصیت کی تھی۔ مطلب نے بھائی کی وصیت کا پورا خیال رکھا[1] وہ مدینہ آیا۔ شیبہ ہوشیار ہو گیا تھا۔ اس نے شیبہ کو کو لیجانا چاہا۔ اولاً ماں اور ماموں راضی نہیں ہوئے، سختی سے انکار کیا۔ مگر جب مطلب نے ان کو سمجھایا کہ یثرب میں اس بچہ کی زندگی خراب ہوگی یہاں ترقی کا موقع نہیں ملے گا۔ مکہ میں اپنے خاندان کی بڑی عزت ہے۔ ہاشم کے قدردان بھی ابھی موجود ہیں، وہاں شیبہ کو ترقی کا موقع ملے گا۔ یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ انھوں نے شیبہ کو مطلب کے حوالے کر دیا۔
مطلب نے شیبہ کو اپنے ہی اونٹ پر پیچھے بٹھا لیا، اسی صورت سے وہ مکہ میں داخل ہوا لوگوں نے سمجھا کہ یہ غلام ہے مطلب خرید کر لائے ہیں تو اس کو عبدالمطلب کہنا شروع کر دیا۔ مطلب نے بتایا کہ غلام نہیں برادر زادہ ہے مگر عبدالمطلب کا لفظ چل چکا تھا یہ ایسا چلا کہ یہی نام ہو گیا۔

مطلب ہاشم سے بڑے تھے۔ ہاشم کے بعد رفادہ اور سقایہ انھیں کے سپرد رہا مگر یہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے۔ کچھ دنوں بعد یمن گئے وہیں "ردمان" میں ان کا انتقال ہو گیا۔[2]
مطلب کے بعد عبدالمطلب جانشین ہوئے۔ یہ اُن کی خداداد صلاحیت تھی کہ ہاشم کے صحیح جانشین ثابت ہوئے اور چند کام ایسے کئے جن سے نہ صرف قریش یا عرب کی تاریخ متاثر ہوئی بلکہ تاریخ اسلام بھی ان سے متاثر ہے۔ مثلاً:

(۱) چاہ زمزم کی برآمدگی (۲) خزاعہ سے معاہدہ (۳) دیت کے اونٹوں کی تعداد

---

[1] یہی تعلق تھا جس کی بنا پر ہاشم اور مطلب کی اولاد میں اتحاد رہا۔ کانوا کیلہ واحدۃ اور ان کے بالمقابل عبد شمس اور نوفل کی اولاد ایک ہاتھ کی انگلیوں کی طرح متحد رہی (ابن سعد ص۴۶)۔

[2] ابن سعد ص۴۵-۴۶ ج۱ ابن ہشام ص۵۶ ج۱

میں اضافہ (۴) اصحاب فیل کے واقعہ میں اہل مکہ کو محفوظ کرلینا جس کا ذکر "قریش کے ہمہ گیر اثرورسوخ" کے سلسلہ میں آگے آئے گا۔ (انشاء اللہ)

چاہ زمزم کا ظہور زمزم جو ایک چشمہ تھا، جب آبادی کی سطح بلند ہونے لگی تو "بنو جرہم" نے جو مکہ پر قابض تھے اس کو کنوئیں کی شکل دیدی تھی یہ چشمہ اس کنوئیں کا ایک سوتہ ہوگیا تھا اور اسی وجہ سے اس کا پانی کبھی ٹوٹتا نہیں تھا۔ مگر خزاعہ نے مکہ پر حملہ کیا اور بنو جرہم کو شکست کھاکر مکہ سے نکلنا پڑا تو انھوں نے خزانہ کعبہ کی قیمتی چیزیں مثلاً سونے کے ہرن، سونے کی تختیاں اور سات تلواریں جو بہت عمدہ اور قیمتی تھیں، وہ چاہ زمزم میں ڈالیں اور کنوئیں کو پاٹ کر اس طرح زمین کی برابر کر دیا کہ وہ لاپتہ ہوگیا۔

بنو خزاعہ کی خاندانی روایات کا کوئی تعلق زمزم سے نہیں تھا، لہٰذا ان کو اس سے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی، پھر اُن کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ کعبہ کے قریب سونا بے ادبی ہے وہ یہاں مکان بنانا بھی بے ادبی سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ حرم سے فاصلہ پر آباد ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ علاقہ ویران ہوگیا اور آبادی کے بجائے یہاں کیکروں اور جھڑبیریوں کا جنگل آباد ہوگیا۔

بنو خزاعہ کو شکست دینے کے بعد جب قُصَیّ نے اس جنگل کو کٹوایا۔ حرم کعبہ کو صاف کیا اور نئے نقشہ پر مکہ کو دوبارہ آباد کیا تو زمزم کا نام ونشان نہیں تھا اور اس کئی صدی کے عرصہ میں ایسے آدمی بھی باقی نہیں رہے تھے جو اس کا پتہ بتا سکیں۔ البتہ سینہ بہ سینہ خاندانی روایات کا ذخیرہ ان کے پاس تھا جس کی بنا پر زمزم سے ان کی عقیدت قائم تھی اور ذہنوں میں جستجو کا جذبہ تھا اور ہر سال حج کے موقعہ پر مکہ کے مختلف کنوؤں سے پانی فراہم کرنے کی جو پریشانی پیش آتی تھی وہ جذبہ جستجو میں نئی حرکت پیدا کر دیتی تھی۔ قصی کے پڑپوتے عبدالمطلب کی قدرت نے مدد کی۔ دو تین روز تک اک ہی خواب دیکھتا رہا، الفاظ میں فرق تھا

کہ پہلے دن کہا گیا احفر طیبہ[1] (طیبہ کو کھودو) دوسرے روز کہا گیا احفر برّہ۔ "برّہ کو کھودو"۔ تیسرے روز کہا گیا۔ احفر المضنونہ۔ المضنونہ "نہایت قیمتی چیز کو کھودو" اور چوتھے روز اس کو بتایا گیا کہ کھود کر زمزم کو برآمد کرو اور اس کا پتہ یہ بتایا گیا[2] گوبر اور خون کے بیچ میں جہاں سفید پنجوں والا کوا[3] ٹھونگ مارے وہاں کھودو۔

عبد المطلب نے اس مقدس خدمت کو خود ہی انجام دینا چاہا۔ صرف بڑے لڑکے حارث کو ساتھ لیا اور کھودنا شروع کر دیا۔ تین روز بعد ان کو کنوئیں کی من نظر آئی جو کامیابی کی بشارت تھی۔ پھر تلواریں، سونے کی تختیاں اور سونے کے ہرن بھی نکل آئے۔ عبد المطلب نے ان سب چیزوں کو خانہ کعبہ ہی میں آراستہ کر دیا[4]۔

کم و بیش پانچ سو برس بعد چاہ زمزم برآمد ہوا تو سقایہ میں سہولت ہو گئی۔ اب زائرین کے لئے زمزم کا پانی ہوتا تھا۔ مکہ کے کنوؤں سے فراہم کرنے کی ضرورت نہ رہی بلکہ عرفات و منیٰ وغیرہ میں یہی پانی پہنچایا جاتا تھا، جہاں چمڑے کے بڑے حوضوں میں جمع کر دیا جاتا تھا[5]۔

بنو خزاعہ سے معاہدہ

بنو خزاعہ اگرچہ اپنی شکست کا قریش سے انتقام نہ لے سکے مگر درپئے انتقام رہنا ایک قدرتی امر تھا۔ عبد المطلب نے بغض و عداوت کی فضا کو ختم کیا۔ دار الندوہ میں ایک اجتماع ہوا۔ تناصر و مواسات (باہمی تعاون اور غمگساری) کا عہد نامہ لکھا گیا اور اس کو خانہ کعبہ میں آویزاں کر دیا گیا۔ عبد المطلب کے بھائی (فرزندانِ ہاشم) اور مطلب کے وارث اس معاہدہ میں شریک ہوئے۔

---

[1] طیبہ: پاکیزہ۔ برّہ: نیک۔ المضنونہ: نہایت قیمتی چیز جس کے حق میں لوگ بخیل ہوں۔ کسی کو بخشتے نہ ہوں

[2] وہی بین الفرث والدم عند نقرۃ الغراب الاعصم۔ ابن سعد ص۴۹ و الغراب الاعصم ہو ابیض الجناحین وقیل ابیض الرجلین (مجمع البحار)

[3] عربی لفظ غراب اعصم ہے جس کے معنی سفید پنجے والا کوا یا سفید ڈینوں والا کوا۔

[4] ابن سعد ص۴۹ ج۱ [5] ایضاً

عبد شمس اور نوفل کے اخلاف اس معاہدہ میں شریک نہیں ہوئے[1]

دیت عبد المطلب نے جب غیبی اشارہ کی بنا پر چاہ زمزم کے برآمد کرنے کے لئے زمین کھودنی شروع کی تو یہ منت مان لی تھی کہ میرے دس لڑکے ہو جائیں گے تو ایک لڑکے کو خدا کے نام پر ذبح کر دوں گا۔ خدا کا فضل و کرم تھا کہ عبد المطلب کے دس لڑکے ہوئے۔ عبد المطلب نے اپنی منت پوری کرنے کے لئے قرعہ ڈالا۔ قرعہ میں عبد اللہ کا نام نکلا۔ عبد المطلب نے چھری ہاتھ میں لی اور عبد اللہ کو مذبح کی طرف لے جانے لگے تو عبد اللہ کی بہنوں نے شور مچایا۔ عبد المطلب کے دوست احباب بھی آڑے آئے۔ بہ مشکل تمام عبد المطلب کو اس پر آمادہ کیا کہ عبد اللہ کے فدیہ میں اونٹ ذبح کر دیئے جائیں۔ طے یہ ہوا کہ فال نکالنے کے قاعدہ کے بموجب دس اونٹ اور عبد اللہ کے ناموں میں قرعہ ڈالا جائے اگر پہلی مرتبہ اونٹوں کے نام پر قرعہ نہ نکلے تو دس اونٹ اور بڑھائے جائیں اور اسی طرح دس دس اونٹ بڑھائے جاتے رہیں۔ یہاں تک کہ قرعہ اونٹوں کے نام پر نکلے۔ تو جس تعداد پر قرعہ اونٹوں کے نام پر نکلے اونٹوں کی اتنی ہی تعداد بطور فدیہ ذبح کی جائے۔ اس قرارداد پر عمل کیا گیا اور اتفاق ایسا ہوا کہ جب سو اونٹ اور عبد اللہ کے درمیان قرعہ ڈالا گیا تو اونٹوں کے نام کا قرعہ نکل آیا۔ عبد المطلب نے فوراً تعمیل کی۔ سو اونٹ بطور فدیہ صفا اور مروہ کے درمیان ذبح کر دیئے[2]

استسقاء کئی سال گذر گئے مکہ میں بارش نہ ہوئی، کنوئیں خشک ہونے لگے۔ مکہ کے باشندے سخت پریشان تھے مخرمہ بن نوفل زہری کا بیان ہے کہ ان کی والدہ رُقیقہ بنت ابی صیفی بن ہاشم جو عبد المطلب کی بھتیجی تھیں اور ہم عمر بھی تھیں انھوں نے خواب

---

[1] ابن سعد ص۵۵ صلح حدیبیہ کے موقع پر بھی یہی صورت ہوئی کہ بنو خزاعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف ہوگئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت آل ہاشم اور آل مطلب کے واحد نمائندہ تھے اس وقت بھی عبد شمس اور نوفل کی اولاد فریق مخالف کے ساتھ تھی۔ [2] ابن سعد ص۵۳

میں دیکھا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے کہ نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت ہو چکی ہے پھر اُس نے ایک شخص کا حلیہ بتایا اور کہا کہ اس حلیہ کا جو آدمی تمہارے یہاں ہو اُس سے کہو کہ وہ مکہ کے ہر ایک خاندان کے ایک ایک آدمی کو ساتھ لے اور یہ سب لوگ نہا دھو کر صاف سُتھرے کپڑے پہن کر پہلے حرم میں جائیں وہاں حجر اسود کو بوسہ دیں پھر کوہ ابو قبیس کی چوٹی پر پہنچ کر دعا مانگیں۔ یہ شخص دعا مانگے، سب آدمی آمین کہیں۔

رقیقہ کا بیان ہے کہ عبدالمطلب کا یہی حلیہ تھا جو خواب میں بتایا گیا۔ لہٰذا عبدالمطلب کو بتایا گیا کہ وہ خواب کے اشارہ کی تعمیل کریں۔ عبدالمطلب نے پورے اہتمام سے تعمیل کی اور اپنے پوتے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی ساتھ لیا۔ ابو قبیس پر پہونچکر دعا مانگی۔ ابھی یہ دعا مانگ رہے تھے کہ بادل آسمان پر چھا گئے پھر زور کی بارش برسی۔ سرزمین مکہ جل تھل ہو گئی [۲]

عبدالمطلب کے بعد خواجہ ابو طالب اور حق سقایہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر تقریباً ۸ سال تھی جب عبدالمطلب کا انتقال ہوا۔ عبدالمطلب کے جانشین ابو طالب قرار دیئے گئے۔ خدمت سقایہ ان کے سپرد ہوئی۔ ابو طالب اخلاق اور کمالات میں سب بھائیوں سے ممتاز تھے مگر دولت میں کم تھے۔ حج کا زمانہ آیا تو ہاتھ خالی تھے اور خدمت سقایہ کے لئے دس ہزار کی ضرورت تھی۔ انھوں نے یہ رقم اپنے بھائی "عباس" سے ایک سال کے وعدہ پر قرض لی۔ دوسرا سال آگیا۔ قرض ادا نہ ہو سکا اور مزید خرچ کی ضرورت پیش آگئی تو بھائی عباس سے پھر ایک سال کے لئے چودہ ہزار قرض لئے۔ مگر اس مرتبہ عباس نے یہ طے کر لیا کہ اگر آئندہ سال تک یہ رقم ادا نہ ہو سکے تو

---

[۱] خواجہ ابو طالب نے اپنے قصیدہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتے ہوئے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کی تفصیل حصہ سیرت میں آئے گی۔ (انشاء اللہ) [۲] ابن سعد ص ۵۵ ج ۱

آپ خدمت سقایہ میرے حوالہ کر دیں۔ خواجہ ابوطالب نے یہ شرط منظور کر لی۔ پھر اتفاق ہوا کہ ابوطالب ادائیگی قرض کا انتظام نہ کر سکے تو حسب وعدہ خدمتِ سقایہ عباس کے حوالے کر دی[1]۔

پورے عرب پر قریش کا ہمہ گیر اثر

مذہبی عظمت، سیاسی قیادت، اقتصادی برتری، تجارتی سربراہی

ہندوستان کے پنڈت ہمارے پڑوسی ہیں۔ مگر چھوت چھات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم پڑوسیوں کو معلوم نہیں کہ دیوتاؤں کے نام پر جو جانور چھوڑے جاتے ہیں، کیا اُن کا کوئی ضابطہ ہے یا ایک آزادانہ عمل ہوتا ہے جس کا کوئی ضابطہ نہیں ہے اور بے ضابطگی ہی اس کا ضابطہ ہے۔ مگر عربوں کے یہاں یہ عمل بے ضابطہ نہیں ہوتا تھا۔ اُن کے یہاں "تسییب سوائب" مویشی کو چھوڑنے اور پُن کر دینے کی بہت سی قسمیں تھیں اور ہر ایک قسم کے بہت سے ضابطے مقرر تھے۔ اور صرف دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے یہ عمل نہیں ہوتا تھا بلکہ ایسی صورت بھی ہوتی تھی جس کو بچہ کشی کا سارٹیفکٹ کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً اونٹنی کے سات بچے ہو گئے تو وہ آزاد کر دی جاتی تھی۔ بعض صورتوں میں اس سے کم تعداد پر بھی یہ آزادی ضروری ہو جاتی تھی۔ مثلاً کسی اونٹنی کے مادہ بچے متواتر تین نمبروں تک ہوتے رہے[2] وغیرہ وغیرہ۔

پھر کبھی ایسا ہوتا تھا کہ ذبح کی ممانعت ہوتی تھی ——— کسی کے گوشت پر یہ پابندی

---

[1] البدایہ والنہایہ ص۲۴۴ ج۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا احترام فرمایا۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد بھی یہ خدمتِ سقایہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے نام پر ہی باقی رکھی۔ (صحاح)

[2] کسی قدر تفصیل عہد زریں میں کی گئی ہے۔ ص۳۱۹ (حاشیہ)

ہوتی تھی کہ مرد کھا سکتے تھے۔ عورتیں نہیں کھا سکتی تھیں وغیرہ وغیرہ۔

غرض ان تمام صورتوں کے لئے قواعد وضوابط تھے اور ان کے موجد بنوخزاعہ تھے اور جب قریش ان کے جانشین ہوئے تو یہ بھی انہیں ضابطوں کے پابند اور ان رسومات پر عمل پیرا ہو گئے۔ تسییب سوائب سے کہیں زیادہ مکمل ان کا ضابطہ بت پرستی تھا۔

نظامِ بُت پرستی پُورے عرب کو چند منطقوں پر تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر ایک منطقہ کا بُت الگ ہوتا تھا۔ اس کا سندر الگ ہوتا تھا جس کے ساتھ اس کے تمام لوازمات ہوتے تھے۔ مثلاً بنو ثقیف[۱] نے "لات" کو اپنا دیوتا بنا رکھا تھا۔ طائف میں اس نام کا بُت تھا۔ باشندگانِ[۲] یثرب (قبائل اوس اور خزرج) اور جو اُن کے ہم مشرب وپیرو تھے اُن کا مخصوص دیوتا "منات" تھا جو ساحل سمندر پر مُشَلَّل کے ایک جانب قُدَیْد میں تھا[۳] جو ایک مقام کا نام تھا۔

قبیلہ[۴] دوس، قبیلہ خثعم، قبیلہ بُجیلہ اور جو اس منطقہ میں تھے اُن کا دیوتا ذوالخلصہ تھا۔ جس کا بیت (مندر) تبالہ میں تھا اس کو کعبہ یمانیہ بھی کہا جاتا تھا[۵]۔

آجا[۶] وسلمےٰ یعنی جبال طےؔ کے باشندوں کا دیوتا قلس تھا۔ حمیر[۷] اور اہل یمن نے رُبرلام کو اپنا دیوتا مان رکھا تھا، جس کے نام کا بیت (مندر) یمن کے شہر صنعاء میں تھا۔

بنی[۸] ربیعہ اور بنی کعب کا دیوتا الگ تھا اس کا نام رضار تھا۔ بنو[۹] بکر، بنو ثعلب، بنووائل اور ایاد کا دیوتا "ذوالکعبات" تھا۔ سنداد میں اس کا بیت تھا۔

قریش اور بنی کنانہ کا مخصوص دیوتا عزیٰ تھا جس کا بیت نخلہ میں تھا[۱۰] (مقام کا نام)

عجیب بات یہ ہوئی کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے جو دیوتا بنا رکھے تھے جب عرب میں بُت پرستی کا رواج ہوا تو احیائی ذہنیت نے ان فراموش شدہ دیوتاؤں کو پھر یاد دلا دیا۔ پھر کسی طرح وہ مورتیاں بھی برآمد کر لی گئیں۔ تو مختلف قبائل ان دیوتاؤں کے بھگت (پجاری)

---

۱ بخاری شریف ص۲۲۲ ۲ ایضاً ص۵۲۹ ۳ سیرۃ ابن ہشام ص۵۲ تا ص۵۶ عہد زریں ص۲۸۵

ہوگئے۔ سیدنا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کی تفصیل یہ بیان کی ہے۔[1]

وُدّ: بمقام دُومۃ الجندل[2] - قبیلہ کلب اس کا بھگت تھا۔

سُواع: بمقام رہاط[3] ساحل سمندر کے قریب۔ قبیلہ ہذیل اس کا بھگت تھا۔

یَغُوث، بمقام جُرت (یمن) پہلے قبیلہ مراد اس کی خدمت کیا کرتا تھا۔ پھر بنو غطیف اس کے خادم اور بھگت بن گئے۔

یَعُوق: اہل ہمدان اس کے پُوجاری تھے۔

نَسر: ذی الکلاع (جو علاقہ حمیر کا مشہور خاندان تھا) اس کا بھگت تھا۔

یہ تمام صنم اور اُن کے مندر اگرچہ علاقائی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر طواف نذرانہ اور قربانی وغیرہ کی رسومات جو کعبہ میں انجام دی جاتی تھیں وہ یہاں بھی پُوری کی جاتی تھیں اور خانہ کعبہ کے خدام کے جو منصب تھے۔ کلید برداری، دربانی اور ایسار وغیرہ یہ تمام منصب ان علاقائی کعبوں کے خدام کے بھی ہوا کرتے تھے۔ اس طرح پورے عرب میں مندروں یا چھوٹے بڑے کعبوں کا ایک جال پھیلا ہوا تھا۔ خدام اور پُوجاریوں کے سیکڑوں خاندان اس نظام سے وابستہ تھے، اس پُورے نظام کا مرکز کعبہ[4] تھا، اسی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا "بیت اللہ" سمجھا جاتا تھا اور اسی کے گرد طواف کر کے حج کا مقدس فرض انجام دیا جاتا تھا۔ پس جو یہاں کے خادم تھے وہ پُورے عرب کے مخدوم تھے۔ اور جب کہ یعمر بن عوف کا یہ فیصلہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ وراثت ابراہیمؑ اور تولیت کعبہ کا حق قریش کو ہے تو قریش پُورے عرب کے مخدوم اور مذہبی مقتدا تھے۔

تنظیم سے پہلے بُت پرستی کا آغاز اگرچہ بنوخزاعہ کے دور میں ہوا جس کو قریش نے منظم کیا۔ مگر اس کے جراثیم ذہنوں میں پہلے سے سرایت کر چکے تھے

---

[1] بخاری شریف ص ۷۳۲، [2] شام کا ایک شہر جو عراق سے متصل تھا۔ فتح الباری ص ۵۲۴ ج ۸ [3] رہاط: بفتح راء۔ ساحل سمندر کے قریب صوبہ حجاز کا ایک شہر (فتح الباری) [4] سیرۃ ابن ہشام ص ۵۳ ج ۱

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی اولاد جب عرب کے مختلف علاقوں میں منتقل ہوئی تو مکہ سے ہجرت کرنے والا خاندان حرم کعبہ کا ایک پتھر اپنے ساتھ لے جاتا تھا، جس کو وہ "تبرک" سمجھتا تھا۔ یہ خاندان جہاں سکونت اختیار کرتا اس تبرک کو وہاں کسی مناسب جگہ پر نصب کر دیتا تھا اور اس کی زیارت کر کے اپنے وطن اور اپنے آبائی معبد کی یاد تازہ کیا کرتا تھا چند پشتوں کے بعد اس متبرک یادگار نے اصل کی حیثیت اختیار کرلی۔ یہ خود ایک چھوٹا کعبہ بن گیا۔ اور کعبہ کی طرح اس کا بھی طواف کیا جانے لگا[1]۔ اور جب خزاعہ نے بُت پرستی اختیار کی تو اس متبرک یادگار نے بھی معبودیت کا درجہ حاصل کرلیا اور اس کی پُوجا ہونے لگی پھر رفتہ رفتہ حالت یہ ہوگئی کہ سنگِ حرم کی بھی قید نہیں رہی بلکہ جو اچھا پتھر مل جاتا تھا پہلے پتھر کو الگ کر کے اس اچھے پتھر کی پُوجا شروع کر دی جاتی تھی اور کسی جگہ پتھر نہ ملتا تو ریت اکٹھا کر کے ڈھیری بنا دی جاتی تھی۔ پھر بکری کو پکڑ کر اس کا دودھ اس چھوٹے سے تودۂ خاک پر دوھا جاتا۔ یہ "شیر نوش" تودۂ خاک ہی معبود بن جاتا[2] جس کے چرنوں میں ناک رگڑی جاتی۔ ماتھا ٹیکا جاتا تھا (معاذاللہ) یہ پرستش خواہ کتنی ہی مضحکہ انگیز تھی مگر اس سلسلہ میں بھی مرکزیت بیت اللہ اور خدام بیت اللہ یعنی قریش ہی کو حاصل تھی۔

سیاسی قیادت

بُت پرستی کے اس نظام نے قریش کو پُورے عرب کا مذہبی پیشوا ضرور بنا دیا تھا مگر قریش کی عظمت صرف اس نظام پر موقوف نہیں تھی بلکہ اس زمانہ کے بین الاقوامی سیاسی گٹھ جوڑ نے بھی قریش کو ایسی حیثیت دیدی تھی کہ پورے عرب کا اس سے متاثر ہونا ضروری تھا۔

روم (بازنطینی)، ایران اور حبش تینوں سلطنتوں کے بیچ میں عرب حدفاصل تھا۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص۵۱ [2] بخاری شریف ص۶۲

تینوں سلطنتیں عرب پر نظر رکھتی تھیں۔ قریش اس حیثیت کو پہچانتے تھے اور اس سے کام لینا بھی جانتے تھے۔ قصی نے بنوخزاعہ کا مقابلہ کیا اور ان کو مکہ سے نکالا تو نہ صرف یہ کہ شہنشاہ روم (بازنطینی شہنشاہ) کی حمایت اس کو حاصل تھی، بلکہ ابن قتیبہ کی شہادت یہ ہے کہ اَعَانَہٗ قَیْصَرُ عَلَیْھَا[۵۱] (قیصر روم[۵۲] نے اس کو کمک بھی پہنچائی تھی)۔

قُصَیؔ کے پوتوں نے ان تعلقات کو وسیع کیا اور لطف کی بات یہ ہے کہ ایران، روم حبش اور ملوک یمن آپس میں ایک دوسرے کے حریف تھے۔ مگر آل عبد مناف (قصی کے پوتوں) نے سب سے قریش کے لئے یکساں حقوق اور رعایتیں حاصل کرلیں چنانچہ مطلب نے شاہ حبش (نجاشی) اور اس کے حریف شاہان یمن (ملوک حمیر) سے نوفل نے شہنشاہ ایران (کسریٰ) سے اور ہاشم نے بازنطینی شہنشاہ "ہرقل" سے قریش کے لئے آزاد تجارت کے فرامین حاصل کرلئے[۵۳]

ابن سعد کا بیان ہے:

> "ہاشم ایک شریف آدمی تھا۔ یہی ہاشم ہے جس نے قیصر (شہنشاہِ روم) سے یہ حلف لیا تھا (فرمان حاصل کرلیا تھا) کہ اس کے حدود مملکت میں قریش کو آزادی ہوگی۔ اُن کے جان و مال کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ قیصر روم نے یہ فرمان اپنی مملکت کے لئے دیا اور اپنے دوست ملک (حبش) کے بادشاہ نجاشی کو بھی لکھ دیا کہ وہ اپنے ملک میں قریش کو آمد و رفت اور کاروبار کی اجازت دیں۔[۵۴]

---

[۵۱] معارف ابن قتیبہ صـ۲۱۵ ملوک الشام [۵۲] بازنطینی شہنشاہ کو عرب قیصر کہا کرتے اور ایران کے شہنشاہ کو "کسریٰ" اور شاہ حبش کو نجاشی کہا کرتے تھے۔ [۵۳] طبقات ابن سعد صـ۴۳ ج۱
[۵۴] ابن سعد صـ۴۵ ج۱

ہاشم نے فرامین سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قریش کی تجارت کو منظم کیا۔ تجارتی قافلوں کا ایسا پروگرام بنایا کہ وہ سال بھر رواں دواں رہتے اور جہاں جاتے موسم کی خوشگواری ان کا استقبال کرتی۔ سردیوں میں یمن کی طرف جاتے اور حبشہ تک تجارتی قافلے پہونچتے اور گرمیوں میں شام کی طرف غزہ تک اور کبھی انقرہ تک تجارتی قافلے پہونچتے تھے۔ بسا اوقات ہاشم خود ان کی قیادت کرتا تھا[۱]

دیگر قبائل کے لئے مراعات ان طویل راستوں میں جو قبائل پڑتے تھے اُن کے لئے مراعات یہ تھی کہ قریشی قافلے ان کا سامان بھی لے جاتے۔ مزید احسان یہ کرتے کہ سامان لیجانے لانے کا محصول تو درکنار بار برداری کا خرچ بھی نہ لیتے تھے[۲]

مکہ مکرمہ پورے عرب کا مرکزی شہر (ام القریٰ) تھا۔ سیاسی قیادت کے لئے یہی کافی تھا کہ قریش اُم القریٰ پر قابض اور اس کے مالک تھے، مزید برآں آل مناف نے پڑوسی ممالک سے یہ رعایتیں حاصل کر کے قریش کے آسمانِ قیادت کو ماہ و پروین اور کہکشاں سے آراستہ کر دیا۔ اب پورا عرب قریش کا کلمہ گو اور اس کے احسانات کا ممنون تھا۔

عرب کا تجارتی نظام اور قریش کی سربراہی

بُت پرستی کے منطقوں کی طرح عرب کے ایسے علاقے بھی ہو گئے تھے جن کو تجارتی منطقہ کہا جا سکتا تھا۔

قصبوں اور شہروں میں چھوٹے بڑے بازار بھی تھے۔ ہفتہ وار بازار بھی جگہ جگہ لگا کرتے تھے۔ لیکن ہر ایک منطقہ کے مرکزی مقام پر ایک میلہ سالانہ ہوتا تھا جس میں نہ صرف عرب

---

[۱] ابن سعد ص۴۳ و ص۴۶ جز ا [۲] ابن سعد ص۴۵ قرآن حکیم نے اس سلسلہ کو ایلاف سے تعبیر کیا ہے (یعنی مانوس کرنا) تشریح آگے آئے گی۔ انشاء اللہ۔

بلکہ قریب کے (غیر عرب) علاقوں کے تاجر بھی مال لاتے ۔ دوکانیں لگاتے اور نفع کماتے تھے۔ یہ میلے سال کے بارہ مہینوں میں دائر سائر رہتے ۔ مورخین نے ان میلوں کی تفصیل و ترتیب یہ بیان کی ہے :

(۱) دومۃ الجندل میں جو شام و حجاز کے مابین ہے ۔ یکم ربیع الاول کو میلہ لگتا جو پورے مہینہ رہتا۔

(۲) یہاں سے لوگ چل کر بحرین میں مُشَقَّر آتے ۔ یہاں یکم سے آخر جمادی الاخریٰ تک میلہ لگتا اور دومۃ الجندل کی طرح یہاں بھی مقامی حکمران کو عشر (دس فیصدی) (چنگی یا کسٹم) دیا جاتا۔ ایران تک کے تاجر سامان لے کر یہاں آتے ۔

(۳) یکم رجب کو مُشَقَّر سے بازار اُجڑتا تو صُحار کے لئے روانگی ہوتی جو عمان کا پُر رونق شہر تھا ۔ تقریباً بیسؔ دن راستہ میں صرف ہوتے ۔ یہاں پانچ دن کا میلہ ہوتا اور بادشاہ جُلندی کو عشر دیا جاتا تھا۔

(۴) رجب کے آخر میں دَبا کا میلہ شروع ہوتا ۔ یہ عرب کی دو بڑی بندرگاہوں میں سے ایک تھا ۔ یہاں سندھ، ہند، چین اور مشرق و مغرب کے لوگ آتے اور خشکی اور سمندر کے راستوں سے سامان لاتے یہاں کا عُشر بھی بادشاہ جلندی کو ملتا ۔

(۵) اس کے بعد مہرہ کے شہر شِحر میں وسط شعبان سے میلہ لگتا جہاں بَرّی اور بحری تاجر دبا سے چل کر آتے ۔ یہ کھالوں اور کپڑے کی خاص منڈی تھی ۔ مقامی پیداوار کی جنسیں ایلوا، لوبان وغیرہ بھی یہاں سے خریدی جاتیں ۔

(۶) پھر یکم رمضان سے عدن میں میلہ لگتا ۔ عدن میں جو عطر بنتا تھا ۔ اُس کی دُور دُور تک شہرت تھی ۔ بحری راستہ سے آنے والے سندھ اور ہند تک اور خشکی کے راستہ سے آنے والے ایران اور روم تک یہاں کا عطر لے جاتے تھے ۔ یہاں کا عُشر ایران کے نوآباد کار افسر لیتے تھے ۔

(۷) عدن کے بعد صنعاء (یمن) کا میلہ لگتا جو وسط رمضان سے آخر رمضان

تک رہتا۔ یہاں روئی، زعفران، مختلف قسم کے رنگوں اور لوہے کی منڈیاں تھیں۔ یہاں کا عشر بھی شاہ ایران کا گورنر لیتا تھا۔

(۸) و (۹) وسط ذی قعدہ سے آخر ماہ تک دو میلے لگتے:

(الف) رابیہ میں جو علاقہ "حضرموت" کا ایک شہر تھا۔

(ب) عکاظ میں جو مکہ اور عرفات کے درمیان تھا۔

(۱۰) عکاظ کے قریب ذی المجاز ہے۔ یہاں یکم ذی الحجہ سے میلہ لگتا جو دس ذی الحجہ تک رہتا۔

(۱۱) زمانہ حج میں (۱۰ ذی الحجہ سے ۱۵ ذی الحجہ تک) منیٰ میں میلہ لگتا۔

(۱۲)، (۱۳) منیٰ سے فارغ ہوکر لوگ خیبر یا یمامہ جاتے جہاں محرم کی دسویں سے میلے لگتے۔

(۱۴)، (۱۵) اس کے بعد جنوبی فلسطین میں بُصریٰ اور اَذرِعات کے میلے لگتے۔[1]

ان تمام میلوں میں سب سے زیادہ اہمیت عکاظ اور ذوالمجاز کے میلوں کو تھی۔ کیونکہ

(الف) یہ میلے اشہر حرم میں لگتے تھے جو پورے عرب کے لئے امن اور پناہ کے مہینے تھے۔ اس لئے سب طرف سے بڑی بڑی تعداد میں تاجر اور زائرین امن کی بانسری بجاتے ہوئے یہاں آتے رسومات حج ادا کرتے، مال خریدتے اور عیش و تفریح کی مجلسیں جماتے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس میلہ میں عام نگرانی، حفاظت اور جو ہنگامے ہوجاتے اُن کے مقدمات کی سماعت اور ان کا فیصلہ کرنا "قبیلہ تمیم" کے متعلق ہوتا تھا جبکہ قبیلہ تمیم کا مسکن عرب کی انتہا مشرق تھا اور مکہ و عکاظ انتہا مغرب میں تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ان میلوں سے پورے عرب کا تعلق رہتا اور تعلق بھی عقیدتمندانہ ہوتا تھا۔

میدان تجارت میں قریش کی سربراہی

(۱) عکاظ اور ذی المجاز کے مذکورہ بالا عظیم الشان میلوں کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ

---

[1] کتاب المحبر و اسواق العرب محمد بن حبیب (مرزوقی)

تھی کہ اس موقع پر بڑے بڑے اجتماعات بھی ہوا کرتے تھے جن میں پورے عرب کے اساتذۂ شعروسخن شرکت کرتے، ادبی مقابلے ہوتے، دھوم دھام سے مشاعرے ہوتے، مشہور مقررین کی تقریریں ہوتیں جن میں وہ اپنے قبائل کے کارنامے بیان کرتے۔ مختصر یہ کہ مذہبی جشن (حج) کے ساتھ قومی جشن بھی منائے جاتے تھے۔ ان میلوں کے جملہ انتظامات قریش سے متعلق تھے یا قریش کے تعاون سے ہوتے تھے۔ اس طرح میلوں کے سلسلہ میں بھی قریش کو سربراہی حاصل تھی۔

(۲) قریش نے جب تجارت کو منظم کرتے ہوئے "رِحلۃ الشِّتاء والصَّیف" موسم گرما اور سرمائی قافلوں کا طریقہ ایجاد کیا اور اس طرح ان کا تجارتی سلسلہ عرب کے چپہ چپہ میں پھیل گیا تو انھوں نے ایک حفاظتی فوج بھی تیار کی جس میں حبشی غلام اور تنخواہ دار سپاہی ہوتے تھے۔ اس کو قائمہ کہا جاتا تھا۔ یہ فوج قریش کے قافلوں کی طرح حلیف قبائل کے قافلوں کی بھی حفاظت کرتی تھی[1]

(۳) جیسا کہ پہلے[2] گذر چکا ہے عرب میں نہ کوئی سلطنت تھی نہ حکومت، نہ فوج، نہ پولیس۔ البتہ قبائلی معاہدات کا ایک سلسلہ تھا جو افراد کی جان و مال کی حفاظت کا ذریعہ ہوتا تھا۔ قبائل کے معاہداتی گروپ تھے۔ جو فرد کسی گروپ سے تعلق رکھتا تھا تو پورا گروپ اس کی حفاظت کا ذمہ دار تھا۔ اس ذمہ داری کا نام خَفارت[3] تھا۔ راہرو کو اس کی سند دیدی جاتی تھی تو وہ اس گروپ کے حدود تک محفوظ رہتا تھا۔ اس سند کو بھی خفارت ہی کہا جاتا تھا۔ (یعنی پروانہ راہداری یا ویزا) کبھی خفارت پر معاوضہ بھی لیا جاتا تھا اُس کو خُفارت (بضم خا) کہا جاتا تھا[4]۔

---

[1] المحبّر لمحمد بن حبیب [2] زیرعنوان معاہداتی حکومت [3] اس ذمہ داری کی خلاف ورزی کو اخفا کہتے تھے۔ کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانہ من صلی الغداۃ فی ذمۃ اللہ فلا یخفرن اللہ فی ذمتہ۔ (مجمع البحار) [4] قاموس اللغات

قریش کے تعلقات کا دائرہ پورے عرب کو گھیرے ہوئے تھا تو اس کا "پروانہ راہ داری" خفارہ بھی پورے عرب کے لئے کافی ہوتا تھا۔

(۴) تنظیم تجارت اور تجارتی قافلوں کے ذریعہ جب دوسرے ممالک سے تجارتی تعلقات قائم ہوئے تو پہلے تو یہ ہوا کہ تجارتی قافلے واپسی کے وقت شام اور یمن وغیرہ سے غلّہ بھر کر لاتے تھے تو مکہ اور اطراف مکہ جہاں کاشت کا نام ونشان نہیں تھا وہاں غلّہ کی فراوانی ہوگئی۔ پھر ان ممالک کے باشندوں نے خود بھی غلہ کی روانگی (سپلائی) شروع کر دی خشکی کے راستوں سے بھی غلّہ آتا اور بحری راستہ سے بھی جدّہ کی بندرگاہ پر غلّہ اُتارا جاتا تھا۔[1]

یہ تھے وہ اسباب جن کی بنا پر قریش کو مذہبی عظمت اور سیاسی قیادت کی طرح اقتصادی برتری اور تجارتی سربراہی بھی حاصل ہوگئی۔

واقعۂ اصحاب فیل

اسباب اور نتائج

قصی کا زمانہ بظاہر چوتھی صدی عیسوی کا وہ ابتدائی نصف ہے جب مسیحیت، جدید ترتیب کے ساتھ ظہور پذیر ہوئی تھی۔ تثلیث کو جزو دین بنایا گیا تھا اور قسطنطین اوّل نے مسیحیت قبول کر کے حکومت کا مذہب بھی عیسائیت قرار دیدیا تھا۔ جب مسیحیت کا مرکز روما الکبریٰ، اٹلی بنا تو مسیحیت کی لہران تمام علاقوں میں پہونچی جو بازنطینی شہنشاہیت کے زیر اثر اور اس بلاک میں داخل تھے۔[2] عرب کے وہ علاقے جو شام سے متصل تھے۔ افریقہ کے علاقے خصوصاً حبش اور یمن کے بھی کچھ علاقے عیسائیت سے متاثر ہوئے۔[3]

---

[1] ابن قتیبہ کے استاذ محمد بن حبیب المتوفی ۲۴۵ھ نے اپنی کتاب المحبّر میں اس کی تفصیل دی ہے ص۲۶۳ و ص۲۶۶

[2] دوسرا بلاک وہ تھا جس کی قیادت شہنشاہ ایران (کسریٰ) کیا کرتا تھا جس کے اثر اور رسوخ کا دائرہ ہندوستان تک پھیلا ہوا تھا

[3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عہد زریں ص۲۹۴ تا ص۳۰۱

بازنطینی شہنشاہ (قیصر روم) نے نقص کی امداد کی۔ پھر ہاشم کے ساتھ یہ مراعات کی کہ قیصر نے اپنی طرف سے بھی اس کو آزادانہ تجارت کا پروانہ دیا اور شاہِ حبش سے بھی مراعات دلوائی۔ اس کا مقصد خالص سیاسی بھی ہو سکتا ہے کہ ایران کے مقابلہ میں عربوں کو اپنی طرف مائل اور تجارتی راستوں کو اپنے زیرِ اثر رکھے۔ اور اس کا مقصد مذہبی بھی ہو سکتا ہے کہ عرب میں عیسائیت کو رواج دے۔ غالباً اسی سلسلہ کی آخری کڑی یہ تھی کہ ابرھہ نے (جو خود عیسائی تھا اور حبش کے عیسائی بادشاہ (نجاشی) کی طرف سے یمن کا گورنر تھا) یمن کے مرکزی شہر صنعار میں نہایت عظیم الشان[1] کلیسا تعمیر کرایا تو عربوں کو ہدایت کی کہ وہ خانہ کعبہ کے بجائے اس کلیسا کو اپنا معبد بنائیں اور اسی کا طواف کیا کریں۔ مگر جب عربوں نے اس کا جواب یہ دیا کہ عرب کے وہی پانڈے جو لوند کا مہینہ (نسی) مقرر کیا کرتے تھے[2] ان میں سے ایک نے رات کو اس کلیسا میں قیام کر کے کلیسا کے پاک اور مقدس حصہ کو گندگی سے ملوث کیا اور فرار ہو کر مکہ چلا آیا تو ابرھہ اور اس کے سرپرستوں کی یہ توقعات ختم ہو گئیں کہ عرب اُن کی مذہبی رہنمائی قبول کر سکتے ہیں اور اب اس گستاخی کے انتقام میں نیز اس تصور کی بنا پر کہ جب تک مکہ میں کعبہ ہے عرب میں عیسائیت کی دال نہیں گل سکتی۔ ابرہہ نے یہ طے کر لیا کہ وہ خانہ کعبہ کو منہدم کر دے۔

ابرھہ نے بڑی فوج تیار کی۔ تیرہ ہاتھی ساتھ لیے جن سے عمارتوں کے توڑنے کا کام لیا جاتا تھا، جن میں سب سے ممتاز ہاتھی وہ تھا جس کو "محمود" کہا جاتا تھا۔ اس شان و شوکت اور جلال جبروت کے ساتھ منزل بمنزل مارچ کرتا ہوا مکہ کے قریب پہنچ گیا اور "مُغمّس[3]" میں پڑاؤ ڈالا۔ فوج کو حکم دیا کہ وہ تمام اصطبل اور طویلے لوٹ لیں۔ جو مکہ سے باہر تھے جن میں قریش کے اونٹ اور گھوڑے رہا کرتے تھے۔ اس غارتگری میں عبدالمطلب کے دو سو اونٹ بھی فوج کے قبضہ میں پہونچ گئے

---

[1] سنگ مرمر اور سنگ رخام وغیرہ قیمتی پتھروں کی دیواریں ان پر سونے کا کام اور جگہ جگہ یاقوت اور ہیرے جڑے ہوئے وغیرہ وغیرہ۔ ابن سعد ص۵۵ ج۱۔ [2] ابن سعد ص۵۵ ج۱ اور بروایت ابن اسحاق پاخانہ بھر دیا ابن سعد ص۵۳ ج۱ ابن ہشام ص۳۴ ج۱ [3] مکہ سے چار میل (۳ فرسخ) کے فاصلہ پر طائف کے راستہ میں ایک مقام تھا۔

پھر ابرہہ نے حملے سے پہلے مکہ والوں کو پیغام بھیجا کہ:

"ہم اہل مکہ کو تباہ کرنا نہیں چاہتے نہ ان سے جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم صرف کعبہ کو منہدم کرنے کے لئے آئے ہیں اگر مکہ والے آڑے نہ آئیں تو محفوظ رہیں گے"

حناطہ حمیری یہ پیغام لے کر مکہ پہونچا اور قائد مکہ خواجہ عبدالمطلب کو پہونچایا خواجہ نے جواب دیا:

"ابرہہ اتنی طاقتور فوج لے کر آیا ہے کہ اہل مکہ تو کیا عرب کے دوسرے قبائل بھی مقابلہ کرنا چاہیں تو کامیاب نہیں ہو سکتے اس لئے ہم خود بھی ابرہہ سے جنگ کے لئے تیار نہیں ہیں البتہ یہ بیت ہمارا نہیں ہے۔ یہ اللہ کا بیت ہے خلیل اللہ کا بنایا ہوا۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے اور اپنے خلیل کے اس بیت کو کو بچانا چاہے گا وہ خود بچالیگا اور اگر اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ اس کا بیت محفوظ رہے تو ہم میں یہ طاقت نہیں ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں"[1]

حناطہ نے کہا کہ آپ میرے ساتھ چلئے اور خود ابرہہ سے بات کر لیجئے۔

خواجہ عبدالمطلب بہت شریف صورت، حسین وجمیل باوجاہت اور نہایت شاندار سردار تھے۔ دیکھنے والوں پر رعب پڑتا تھا۔ جیسے ہی وہ ابرہہ کے سامنے پہونچے ابرہہ بھی متاثر ہوا۔ تخت پر اپنی برابر بٹھانا اپنے یہاں کے شاہانہ آداب اور مصلحت کے خلاف سمجھا تو خود تخت سے اتر کر خواجہ عبدالمطلب کی برابر بیٹھا۔ اور ترجمان کے ذریعہ بات چیت شروع کی۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص ۳۲ ج ۱

ابرہہ نے دریافت کیا آپ کیا چاہتے ہیں۔ خواجہ عبدالمطلب نے جواب دیا۔ آپ کی فوج نے میرے دو سو اونٹ لوٹ لئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اُن کو واپس کرا دیں۔ ابرہہ حیران ہوا۔ اُس نے ترجمان سے کہا: ان سے کہو کہ آپ کی وجاہت اور شاندار صورت سے میں متاثر ہوا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ آپ کوئی بڑا مطالبہ پیش کریں گے۔ آپ نے صرف اپنے اونٹوں کی واپسی کی درخواست کی اور تعجب ہے آپ نے اس کعبہ کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا جو آپ کا اور آپ کے آباو اجداد کا دین اور دھرم رہا ہے۔

خواجہ عبدالمطلب نے جواب دیا:

"اس بیت کا ایک رب ہے۔ اس کا محافظ وہ ہے اس کی فکر وہ کرے گا۔ میں اس بیت کا مالک نہیں ہوں۔ میں ان اونٹوں کا مالک ہوں جن کی واپسی کی میں نے درخواست کی ہے۔"

ابن ہشام[1] کی روایت ہے کہ حناطہ نے عبدالمطلب سے پہلے دو اور سرداروں کو پیش کیا تھا۔ ایک قبیلۂ بنی بکر کے شیخ عمر بن نفاثہ اور دوسرے قبیلۂ ہذیل کے سردار خویلد بن نائلہ۔ ان دونوں نے یہ پیش کش کی تھی کہ مکہ میں جو کچھ دولت ہے اس کی ایک تہائی ابرہہ منظور کر لے اور ہدم کعبہ کے ارادہ سے باز آجائے مگر ابرہہ نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔ اس روایت کو سامنے رکھا جائے تو عبدالمطلب کی یہ موقع شناسی تھی کہ اُنھوں نے کعبہ کے متعلق ابرہہ سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ صرف اپنے اونٹوں کی بات کی اور کعبہ کا معاملہ ربّ کعبہ کے حوالہ رکھا۔

ابرہہ نے اونٹ واپس دلوا دیئے۔ عبدالمطلب اُن کو لے کر مکہ میں آئے۔ تمام اونٹ[2] قربانی کے لئے وقف کر دیئے اور مکہ والوں کو ہدایت کی کہ شہر خالی کر کے پہاڑوں پر چلے جائیں۔

---

[1] ص ۳۳ ج ۱ [2] قلّدها النعال واشعرها۔ وجعلها هدايا وبثّها في الحرم (ابن سعد ص ۵۳ ج ۱)

پھر تنہا اور ایک روایت کے مطابق چند ساتھیوں[1] کو لے کر حرم کعبہ میں آئے اور خانہ کعبہ کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر حلقہ باب کو سنبھالا اور یہ منظوم[2] دعا کی:

۱۔ لاھمّ[3] ان العبد یمنع رحلہ فامنع حلالک

۲۔ لا یغلبن صلیبھم۔ ومحالھم غدوًا محالک

۳۔ ان کنت تارکھم وقبلتنا فامر ما بدالک

یہ تین اشعار ابن سعد اور ابن ہشام نے نقل کئے ہیں ان کے علاوہ یہ دو شعر بھی مروی ہیں:

۴۔ جروا جموع جموعھم والفیل کی یسبوا عیالک

۵۔ عمدوا حماک بکیدھم جھلا وما رقبوا جلالک

(ترجمہ) (۱) اے اللہ! ایک غلام اپنے کجاوہ کی حفاظت کرتا ہے۔ بس (خداوندا) تو ان کی حفاظت کر جو تیرے بیت کے پڑوسی اور مجاور ہیں۔

(۲) ایسا ہرگز نہ ہو کہ ان کی تدبیر اور اُن کا مکر و فریب کل کو تیری تدبیر پر غالب آجائے۔

(۳) اگر میں ان (دشمنان کعبہ) کو اور اپنے قبیلہ کو چھوڑ کر جا رہا ہوں (کہ میں مجبور اور بے بس ہوں میرے لئے کوئی چارہ کار نہیں ہے تو خداوندا) جو تیرا ارادہ ہو اس کا حکم کر دے۔

(۴) یہ اپنے بے شمار لشکروں کو لے آئے ہیں اور ہاتھیوں کو لائے ہیں تاکہ

---

[1] عمرو بن عائذ۔ مطعم بن عدی۔ ابومسعود ثقفی۔ ابن سعد ص۵۶ ج۱

[2] عبدالمطلب نے جو جوابات دیئے ان سے نیز اس دعا سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خدا پرست موحد تھے: والاشبہ انہ من اھل الفترۃ وممن لم تبلغہ الدعوۃ

[3] الاصل اللّٰھمّ (حاشیہ سیرۃ ابن ہشام ص۴۳ ج۱)

باشندگان مکہ کو جو تیرے عیال ہیں قید کرلیں۔

۵۔ انھوں نے اپنے مکروفریب اور جہالت سے تیرے حما (محفوظ علاقہ۔حرم) کا قصد کیا ہے۔ انھوں نے تیری عظمت کا پاس ولحاظ نہیں کیا۔"

اس کے بعد کیا ہوا ۔ تاریخ عالم کا وہ عبرت انگیز اور ہولناک حادثہ پیش آیا ۔ جس کا تذکرہ قرآن حکیم نے بھی کیا ہے ۔مورخین کا بیان ہے کہ ابرہہ عظیم الشان مسلح فوج کے ساتھ تیرہ قلعہ شکن ہاتھی لایا تھا۔ ان میں سب سے بڑا ہیبت ناک اور بڑے ڈیل ڈول کا ہاتھی محمود تھا۔ وہ ہاتھیوں کی کمان کر رہا تھا۔ جب حملہ کا وقت آیا تو یہ ہاتھی اپنی جگہ جم گیا۔ بہت مارا پیٹا مگر یہ آگے کی طرف حرکت نہ کرتا۔ دائیں بائیں اس کا رُخ کر دیا جاتا تو خوب لپک کر چلتا۔

یہاں ہاتھی کا یہ تماشا ہو رہا تھا۔ اُدھر آسمان پر پرندوں کی قطار نمودار ہوئی ۔ ہر ایک پرندہ تین کنکریاں لئے ہوئے تھا۔ ایک ایک چونچ میں دو دو پنجوں میں۔ یہ کنکریاں چنے کی اور مسور کے دانے کے برابر تھیں۔ یہ کنکریاں جس پر پڑتیں اس کا چورا کر دیتی تھیں[۱] ۔ پھر پانی کی ایک رو آئی اُس نے ان سب کو بہا کر سمندر میں ڈال دیا۔ ابرہہ اور اس کے مخصوص ساتھی اس وقت ختم نہیں ہوئے ۔ وہ بھاگے اور طرح طرح کی تکلیفوں میں

---

[۱] عقل پرستوں نے اس واقعہ کی تاویل کی۔ کسی نے کہا فوج میں چیچک کی وبا پھیل گئی۔ اُنھوں نے قرآن پاک کی آیتوں کو اپنی عقل کے تراشے ہوئے معنے پہنائے مگر یہ خیال نہیں کیا کہ قرآن حکیم کلام اللہ ہے۔ معمولی اور عام واقعہ کا تذکرہ کسی بادشاہ یا صدر جمہوریہ کے ایڈریس میں بھی نہیں آتا تو کلام اللہ کی شان تو بہت بلند ہے۔ کلام اللہ میں اسی واقعہ کا تذکرہ آسکتا ہے جو تاریخ عالم میں قطعاً غیر معمولی ہو۔ اس میں تاویل کرنا فہم کلام اللہ اور تعظیم کتاب اللہ سے تہیدستی کی دلیل ہے۔

[۲] لاتصیب شیئًا الاھشتہ۔ ابن سعد ص ۵۳ ایٹم کی ایجاد کے بعد وہ ذہنی مرعوبیت ختم ہو جانی چاہیے جو عقل پرستوں کو تاویل پر مجبور کیا کرتی تھی۔

مبتلا ہوکر راستہ ہی میں مر گئے۔ ابرہہ کو ایسی بیماری لگی کہ اس کا بدن گل گیا۔ ایک ایک عضو گل کر گرتا رہا۔ وہ صنعاء پہونچ گیا مگر اس حالت میں پہنچا کہ گوشت کا لوتھڑا تھا۔ وہاں پہنچکر اس کا سینہ پھٹا۔ دل باہر نکل آیا دل کے ساتھ جان بھی نکل گئی[1]

واقعۂ اصحابِ فیل کے نتائج

جیسے یہ واقعہ غیر معمولی تھا، قدرتی بات تھی اس کے نتائج بھی غیر معمولی ہوئے۔ سیاسی لحاظ سے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

(۱) عربوں کو قیصر روم اور اس کی ماتحت حکومتوں سے نفرت ہوگئی۔ اس واقعہ سے تقریباً پچاس سال بعد جب روم کی فوجوں کو ایران نے شکست دی تو مکہ والے بہت[2] خوش ہوئے۔

(۲) یمن کی وہ طاقتیں جو ابرہہ کی طاقت کے سامنے جھک گئی تھیں ابھریں اور انھوں نے شہنشاہ ایران (کسریٰ) سے مدد لے کر ابرہہ کے باقیماندہ اثرات کو یمن سے ختم کیا۔

(۳) یمن کی یہ ابھرنے والی طاقتیں اچھی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں ان میں خانہ جنگی شروع ہوگئی تو کسریٰ نے براہِ راست یمن کے ایک علاقہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور وہاں اپنا گورنر مقرر کر دیا[3]۔

(۴) مذہبی لحاظ سے پورے عرب پر اس کا اثر یہ ہوا کہ عقیدتمندی کی زنجیریں اور مضبوط ہوگئیں۔ قریش جو کہا کرتے تھے کہ ہم "جار اللہ" (اللہ کے پڑوسی ہیں) عرب کو یقین ہوگیا کہ کعبہ یقیناً بیت اللہ ہے اور قریش یقیناً جار اللہ ہیں، ان سے مقابلہ کرنا اور ٹکرانا اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ٹکرانا ہے۔

---

[1] ابن ہشام ص۳۵ ج ۱

[2] سورہ روم کی ابتدائی آیتوں میں اس کی طرف اشارہ ہے [3] جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو کسریٰ کی طرف سے یمن کا گورنر باذان تھا جو دولت اسلام سے مشرف ہوا (ابوالفداء)۔

(۵) یہ واقعہ ۵۷۰ء میں پیش آیا۔ اسی سال سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی۔ اس واقعہ کو علماء سیرت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا ارہاص (مقدمہ اور علامت) قرار دیا ہے۔ مگر حقیقت یہ بھی ہے کہ یہ واقعہ علامت سے زیادہ دعوتِ اسلام کے لئے غیر معمولی مشکلات کا باعث بن گیا اور اس واقعہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے کام کو کٹھن سے کٹھن تر اور دشوار سے دشوار تر کر دیا کیونکہ جس طرح عرب کی عقیدت قریش سے پختہ ہوئی قریش کو اپنی حق پرستی کا یقین ہو گیا۔ اسی واقعہ کے باقی ماندہ اثرات تھے کہ ابوجہل جیسے باطل پرستوں کے قائد اعظم نے غزوۂ بدر کے موقع پر دعا مانگی تھی اَللّٰھُمَّ اِنْ کَانَ ھٰذَا ھُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ (انفال ع ۵ آیت ۳۲)۔ یا اللہ اگر یہی دین (جس کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیش کر رہے ہیں) تیرے نزدیک حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا دردناک عذاب ہم پر نازل کر دے (سورہ انفال) ابوجہل کی یہ دعا یقیناً اپنے حامیوں کو متاثر کرنے کے لئے پروپیگنڈا تھی مگر واقعۂ اصحاب فیل کو سامنے رکھا جائے تو حامیان ابوجہل کا اس دعا سے متاثر ہونا بھی بے وجہ نہیں تھا۔ اس دعا کے وقت اگرچہ واقعۂ اصحاب فیل کو پچپن سال گذر چکے تھے مگر اس کا یقین ذہنوں میں موجود تھا کیونکہ اس واقعہ کے دیکھنے والے موجود تھے۔

تصدیقِ کلام اللہ

اصحاب فیل کا یہ واقعہ جس طرح قادر ذوالجلال کی قدرت بے پایاں کا مظاہرہ تھا ایسے ہی قریش پر احسان عظیم بھی تھا۔ قریش خراب و خستہ تھے۔ مگر ربّ ذوالجلال کو ان سے کام لینا تھا۔ یہی قریش تھے جنھوں نے کچھ دنوں بعد دنیا کا چولا بدلا اور عالم انسانیت کو ایسے زیور سے آراستہ کیا جو اسی طرح بے مثال و بے نظیر ہے جس طرح تاریخ عالم میں اصحاب فیل کا واقعہ بے نظیر ہے۔

سورہ فیل میں اللہ تعالیٰ نے اسی احسان عظیم کا تذکرہ فرمایا ہے۔ خطاب اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو (یا ہر اُس شخص کو ہے جو قابل خطاب ہو) مگر روئے سخن قریش کی طرف ہے۔ ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے الفاظ میں کسی قدر تشریح کے ساتھ یہ ہے:

"تو نے نہیں دیکھا، کیا کیا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا نہ کردیا اُن کا داؤ غلط۔ اور بھیجے اُن پر اُڑتے جانور تنک تنک (ٹکڑیاں بناکر) پھینکتے اُن پر پتھریاں کہنگر کی (ٹھیکرے کی)[1] پھر کر ڈالا اُن کو جیسے بھُس ہو کھایا ہوا۔"

ترجمہ کی تشریح کی ضرورت نہیں ہے البتہ جو عقل پرست اس کی تاویل کرتے ہیں کہ فوج میں چیچک کی وبا پھیل گئی تھی ان کو سمجھنا چاہیئے کہ اُن سے زیادہ عقل پرست قریش کے وہ معاندنتھے جو اسلام کے دشمن اور محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے درپے تھے۔ کلام اللہ کے کلمات اگر حقیقت کا مرقع نہ ہوتے اور اُن میں کچھ بھی بناوٹ ہوتی تو قریش کے جہاندیدہ چالاک سردار آسمان سر پر اُٹھا لیتے اور یہ سورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تردید و تکذیب کے لئے بہترین حربہ ہوتی مگر کیا کوئی روایت ہے کہ اہل مکہ نے اس خداوندی اعلامیہ کی تردید کی؟

سورہ فیل سے متصل دوسری سورت سورہ قریش ہے:

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۙ﴿۱﴾ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۚ﴿۲﴾ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۙ﴿۳﴾ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ۬ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾

حضرت شاہ صاحب نے سورت کا ترجمہ یہ کیا ہے:

---

[1] یعنی یہ کنکریاں پتھر کی نہیں تھیں بلکہ ایسی تھیں جیسے مٹی کے برتن مثلاً گھڑے کے ٹھیکرے کی کنکریاں ہوتی ہیں۔

اس واسطے کہ ہلا رکھا قریش کو (مانوس کر کے رکھا قریش کو) ہلا رکھنا (مانوس کرنا) ان کو کوچ سے جاڑے کے اور گرمی کے ۔ تو چاہیئے کہ بندگی کریں اس گھر کے رب کی جس نے ان کو کھانا دیا بھوک میں اور امن دیا ڈر میں ۔"

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے قریش کو خاص طور سے حکم دیا ہے کہ وہ رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ﴿٣﴾ کی عبادت کریں اور اس حکم کی معقولیت کے لئے وہ احسانات شمار کرائے ہیں جن کی تفصیل وہ ہے جو اس کتابچہ کے اوراق میں پیش کی گئی ۔ مختصر یہ کہ

(۱) اس سورت میں سب سے زیادہ بیت پر زور دیا گیا ہے ، یہاں تک کہ ذات معبود کے لئے اللہ یا رحمٰن کے بجائے " رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ " کا لفظ لایا گیا ہے کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ عظمت قریش کے قلعہ معلّٰی کا سنگ بنیاد بیت ہی تھا (یعنی کعبہ) ۔

(۲) یہی بیت تھا جس کی وجہ سے قریش کا اثر عرب پر قائم ہوا قریش نے بیت کی خدمت کی اور وہ عرب کے سرتاج بنے ۔

(۳) قریش نے بیت اللہ کی زیارت کرنے والوں (حجاج) کی خدمت کی وہ پورے عرب میں محبوب ہو گئے ۔

(۴) یہی محبوبیت تھی جس کی بنا پر پورے عرب کی پُر آشوب اور خوں آشام زمین اُن کے لئے امن کا گہوارہ بن گئی ۔ چار ماہ کے بجائے پورے بارہ ماہ اُن کے لئے حرم رہتے تھے اور وہ بلا خطر جہاں چاہتے جاتے تھے ۔

(۵) یہی عظمت تھی جس کی بنا پر وہ قیصر و کسریٰ اور نجاشی تک پہنچے اور ان سے تجارت کے پروانے حاصل کئے ۔

(۶) اندرون عرب عربوں کی عقیدت اور اُن کی ارادتمندی اور احسان شناسی اور بیرون عرب فرامین شاہی کی طاقت نے قریش کو موقع دیا کہ ان کا رہنما ہاشم رحلۃ الشتاء ،

اور رحلۃ الصیف کا طریقہ ایجاد کر سکا اور تجارت کو منظم کر سکا۔

(۷) مکہ اور اطراف مکہ میں غلّہ عنقا تھا۔ شکار کا گوشت اور کھجور عام غذا تھی۔ رحلۃ الشتاء والصیف کی ایجاد نے ان کو موقع دیا کہ وہ واپسی کے وقت غلّہ لا سکیں اور عرب کا فاقہ توڑ سکیں۔

(۸) کلبی کی تحقیق یہ ہے کہ ہاشم ابن عبد مناف پہلا شخص ہے جو شام کے علاقہ میں تجارتی قافلہ لے کر گیا اور وہاں سے گیہوں بھر کر لایا۔[1]

(۹) اسی سورت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد یہ ہے کہ قریش کی حالت نہایت ابتر تھی۔ وہ فاقہ کش تھے اللہ تعالیٰ نے ہاشم کو توفیق بخشی کہ انھوں نے رحلۃ الشتاء والصیف کا طریقہ ایجاد کیا، اب ان کو بہت کافی نفع ہوتا تھا۔ بڑے تاجر اپنے منافع غریبوں اور فقیروں کو تقسیم کر دیا کرتے تھے تو اُن کے فقیر بھی امیروں کی طرح ہو جاتے تھے۔[2]

(۱۰) جب رحلۃ الشتاء والصیف سے تجارتی تعلقات دوسرے ممالک سے قائم ہو گئے تو پھر غلّہ کی درآمد کیلئے ان قریشی قافلوں کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ بلکہ دوسرے ممالک خود غلّہ بھیجنے لگے۔ یمن میں تبالہ اور جُرَش میں بہت غلّہ پیدا ہوتا تھا، وہاں کے کچھ تاجر بحری راستہ سے بندرگاہ جدّہ پر غلہ پہونچاتے تھے۔ کچھ تاجر خشکی کے راستہ سے براہِ راست مکہ غلّہ پہنچاتے تھے اسی طرح شام کے تاجر بھی غلّہ سپلائی کرتے تھے[3] یہ اونٹ اور خچر اور گدھے جن پر خشکی کے راستوں سے غلّہ آتا تھا، اُن کا پڑاؤ محصّب ہوتا تھا جس کو ابطح، بطحا اور خیف بنی کنانہ بھی کہتے تھے جو[4] مکہ اور منیٰ کے درمیان ہے۔

یہ ہے اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ "(کھانا دیا بھوک میں) کا احسان عظیم۔"

(۱۱) حرم کعبہ کا احترام اگرچہ حضرت اسمٰعیل وحضرت ابراہیم علیہما السّلام کے زمانہ سے چلا آرہا تھا اور اس وجہ سے حرم مکہ کے رہنے والے مامون رہا کرتے تھے ـــــ مگر جب

---

[1] تفسیر مظہری (تفسیر سورت قریش)، [2] ایضاً [3] معالم التنزیل [4] معجم البلدان۔

رحلۃ الشتاء والصیف کے سلسلہ میں مامونیت کا تذکرہ ہے تو اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ قریش کے یہ سرمائی اور گرمائی قافلے مال لیجانے اور لانے میں راستہ کے قبائل کی جو خدمت کیا کرتے تھے اس حُسن سلوک نے قریش کو خارج حرم ان قبائل کی حدود میں بھی محفوظ و مامون کر دیا تھا جن کا پیشہ ہی غارتگری تھا۔ عبادتِ رب کے حکم کی معقولیت سمجھانے کیلئے ان گیارہ احسانات کی طرف اس سورت (سورۂ قریش) میں اشارہ کیا اور ایک احسان عظیم وہ تھا کہ مکہ اور اہل مکہ کو اصحاب فیل سے محفوظ رکھا۔ اس کی نوعیت چونکہ جُداگانہ تھی کہ وہ دنیاوی اسباب سے بالا و برتر محض اللہ تعالیٰ کی قدرت کا معجزہ تھا تو اس کو مستقل سورت میں ذکر فرمایا اور بظاہر یہی حکمت ہے ان دونوں سورتوں کے متصل ہونے کی۔

واللہ اعلم بالصواب

قبل مغرب یوم جمعہ ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ ۱۲ جولائی ۱۹۶۸ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

(سورہ ۳۹ زمر)

"جو ظلم وستم کی طاقتوں کی پُوجا کرنے سے الگ رہتے ہیں اور اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں وہ مستحق بشارت ہیں۔ پس خوش خبری دیدو میرے اُن بندوں کو جو کان لگاکر (پُوری توجہ سے) سنتے ہیں بات۔ پھر اچھی سے اچھی بات پر چلتے ہیں (اور اسی کی پیروی کرتے ہیں) یہی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی (کامیابی کی راہ بتائی) اور یہی ہیں وہ جو اہل عقل (دانشمند) ہیں۔" (سورہ ۳۹ زمر آیت ۱۸)

ایک شخص کہہ رہا ہے

میری بات سنو۔ آپ کے کام کی بات کہہ رہا ہوں۔ میں اسی لئے کھڑا ہوں کہ آپ کو کام کی بات بتاؤں۔ میں آپ سے کچھ نہیں چاہتا۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ سنیں، سمجھیں اور سمجھ سے کام لیں۔

اب آپ کا اخلاقی فرض کیا ہوگا؟

ہم سب کو اللہ تعالیٰ اداء فرض کی توفیق بخشے۔

(مؤلف)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعاء اور ظہور دعاء

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دُعائے خلیل و نویدِ مسیحا

حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ علیہما الصلوٰۃ والسّلام جب خانہ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے تو ان کے پاکیزہ دلوں سے یہ دعا نکل رہی تھی:

"اے ہمارے پروردگار! ہماری نسل میں جو قوم پیدا ہو۔ خداوندا اُن میں ایک رسول مبعوث فرما جو خود اسی نسل کا ہو۔ جو اُن کے سامنے تیری آیتیں پڑھے اُن کو اللہ کی کتاب اور حکمت و دانش کی باتیں بتائے اور ان کو سنوارے۔"

(سورہ ۲ بقرہ آیت ۱۲۹)

حضرت عیسٰی علیہ السّلام نے فرمایا تھا:

"میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے۔ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہیں آئے گا۔"

(یوحنا کی انجیل باب ۱۶، فقرہ ۸)

"جب وہ سچائی کی رُوح آئے گا۔ تو تم کو سچائی

کی راہ دکھائے گا اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے
نہیں کہے گا۔ لیکن جو کچھ سنے گا وہی
کہے گا۔ اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا
وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔ اس لئے کہ مجھ
ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا۔“
(یوحنا کی انجیل باب ۱۶ فقرہ ۱۴ و ۱۵)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

محمدؐ : جس کی تعریف کی جاتی ہو

احمد : بہت تعریفوں والا

یہ دو نام[۱] ہیں اُس ذات پاک کے جن کو مسلمان اللہ کا آخری نبی مانتے ہیں۔ آپ کی نعت دلوں کی راحت ہے اور آپ کی تعریف سے ایمان کی شمع روشن ہوتی ہے لیکن جو آپ کو نہیں پہچانتے وہ آپ کی تعریف سے پہلے آپ کی سیرت معلوم کرنا چاہتے

---

[۱] یہ دونوں لفظ 'حمد' سے ماخوذ ہیں۔ حمد جس طرح تعریف کرنے کو کہتے ہیں ایسے ہی اس کے معنے پورا پورا حق ادا کرنے کے بھی ہیں۔ پس "محمدؐ" جس کا حق پورا پورا ادا کر دیا گیا ہو۔ احمد جس نے پورا پورا حق ادا کر دیا یعنی قدرت کی طرف سے نوع انسان کو باطنی اور روحانی کمالات کی جس منزل تک پہنچانا تھا جس کا نام محمدؐ رکھا گیا وہ اُس کی آخری سرحد ہیں یعنی کمالاتِ انسانیت کا نقطۂ عروج جس کا تقاضا معراج تھا جس کا شرف آپ کو عطا ہوا۔ پس آپ من جانب اللہ "محمدؐ" ہیں اور بندہ اور عبد ہونے کے لحاظ سے انسان پہ اپنے رب اور خالق کے حضور میں جو عبدیت اور نیازمندی لازم ہے۔ احمد نے اس واجبی حق کو عجز و انکسار، اپنی نیازمندی، وفاداری اور اطاعت شعاری سے پورا پورا ادا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف آپ معصوم ہیں۔ تقویٰ، طہارت اور ہر طرح کے گناہ سے تحفظ اور عصمت آپ کی فطرت ہے چنانچہ آپ کو اور نہ صرف آپ کو بلکہ آپ کے رفقاء کو بھی مغفرت کی بشارت دیدی گئی۔ دوسری طرف تقاضاء عبدیت یہ ہے کہ دن کی چہل پہل کو آپ صوم وصال کی سخت جانی پر قربان کرتے ہیں اور رات کی نیند کو شب بیداری کے سوز و گداز پر۔ اس مخصوص نیازمندی کا مخصوص انعام یہ ہے کہ تہجد آپ پر فرض کیا گیا تاکہ روز محشر میں (باقی بر صفحہ آئندہ)

ہیں، اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ کردار و عمل کے آئینہ میں آپ کے جمال باکمال کی زیارت کریں۔ اوراق کے اس مجموعہ میں آپ کی پاک زندگی کی مختصر سی تصویر اس لئے پیش کی جا رہی ہے کہ نہ جاننے والے جان سکیں اور جاننے والے عمل کے لئے کچھ سبق سیکھ سکیں۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائے۔

حسن یوسفؑ، دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

بلغ العلیٰ بکمالہٖ کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ صلوا علیہ وآلہٖ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) آپ وہ اعلیٰ ترین مقام حاصل کر سکیں جس کا نام مقام محمود ہے پوری کائنات جس کی حمد و ستائش کرے گی اور جس پر تحسین و آفرین کی نذر عقیدت پیش کرے گی۔ کما قال اللہ تعالیٰ وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ عَسَىٰ أَن يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا

(سورہ ۱۷ اسراء (بنی اسرائیل) رکوع ۹۔ ج ۱۵)

لہ عرب میں ان ناموں کا رواج نہیں تھا۔ مگر کاہنوں، نجومیوں اور کتب سابقہ کی بشارتیں چونکہ عام ہو چکی تھیں تو اس تمنا اور آرزو میں کہ شاید یہ سعادت اُن کے لخت جگر کو میسر آجائے کچھ لوگوں نے یہ نام اپنے لڑکوں کے رکھے تھے۔ مورخین نے اُن کے یہ نام شمار کرائے ہیں۔ اُحیحہ بن الجلاح الاوسی۔ (۲) سلمۃ الانصاری (۳) البراء الکندی (۴) سفیان بن مجاشع (۵) حمران الجعفی (۶) خزاعی الاسلمی۔ ان لوگوں نے اپنے لڑکوں کے نام "محمد" رکھے تھے۔ لیکن نام "احمد" پھر بھی نرالا ہی رہا۔ یہ نام کسی نے نہیں رکھا۔ اور یہ بھی قدرت کا خاص کرشمہ ہے کہ یہ چھ مولود جن کے نام محمد رکھے گئے تھے ان میں سے کسی نے بھی "نبوت" کا دعویٰ نہیں کیا (البدایہ والنہایہ ص ۳۵۹ ج ۲)

ظہورِ بشارتِ عظمیٰ

وقت ۔ دن ۔ تاریخ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو بشارت دی تھی یَأْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗ اَحْمَدُ" "میرے بعد ایک رسول آئے گا جس کا نام احمد ہوگا"

۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو اس جان آفریں بشارت کا ظہور ہوا۔

صبح کا سہانا وقت تھا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ ہدایت و رحمت کا یہ آفتاب افق مکہ پر طلوع ہوا۔ ربیع الاول کی بارہ[1] تھی۔

شرافت اور انسانیت کے چمن میں آپ کی تشریف آوری
فصل گل کی آمد تھی تو آپ کی پیدائش بھی موسم بہار میں ہوئی۔

نام نامی اس چہیتے بچہ کا نام دادا نے "محمد" والدہ نے "احمد" رکھا[2]۔ باپ (عبداللہ) کا انتقال دو مہینے پہلے[3] ہوچکا تھا ماں کا نام

---

[1] مشہور یہی ہے۔ ھذا ھو المشھور عند الجمھور۔ (البدایۃ والنہایۃ صفحہ ۲۶۰ ج ۲) مگر مورخین نے ۱۲ کے علاوہ اور تاریخیں بھی بیان کی ہیں۔ فلکیات کے ماہر علامہ محمود فلکی نے ۹ ربیع الاول صحیح قرار دی ہے حضرت الاستاذ العلام المحدث مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ ان کے علاوہ علامہ شبلی رحمہ اللہ نے بھی علامہ محمود فلکی کی تحقیق کو تسلیم کیا ہے۔ یعنی ۹ ربیع الاول ۲۰ اپریل ۵۷۱ء۔

[2] روایت ہے کہ یہ نام ان کے سوچے ہوئے نہیں تھے بلکہ دادا اور ماں کو ان ناموں کی بشارت خواب میں ہوئی تھی (سیرۃ ابن ہشام، خصائص کبریٰ وغیرھما۔

[3] تجارتی قافلہ میں شام گئے تھے غلہ لینے کے لئے۔ واپسی میں جب قافلہ مدینہ پہنچا تو عبداللہ بیمار ہوگئے۔ مدینہ کے مشہور قبیلہ بنی عدی بن نجار سے ننھیالی رشتہ تھا۔ عبداللہ یہیں ٹھہر گئے۔ قافلہ والوں نے مکہ پہونچکر خواجہ عبدالمطلب کو عبداللہ کی بیماری کی خبر دی۔ عبدالمطلب نے اپنے (باقی بر صفحہ آئندہ)

"آمنہ[1]" تھا۔ اور دادا کا نام عبدالمطلب[2] جو قریش کے سردار اور مکہ کے بڑے لوگوں میں سے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بڑے لڑکے "حارث" کو مدینہ بھیجا۔ مگر عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ دارالنابغہ میں ان کو دفن کیا گیا۔ پچیس سال عمر ہوئی۔ ترکہ میں بکریوں کا ایک گلہ، پانچ اونٹ اور ایک باندی "اُم ایمن" چھوڑی۔ (طبقات ابن سعد ص۹۱ ج ۱)

[1] آمنہ کے باپ کا نام وہب تھا پسر عبدمناف پسر زہرہ پسر کلاب پسر مرہ۔ کلاب پر مادری اور پدری دونوں سلسلے جمع ہو جاتے ہیں۔ دیکھئے دوسرا حاشیہ عبدالمطلب کے متعلق۔

لطیفہ۔ آمنہ کے چچا کا نام وُہیب تھا وہ اُنھیں کے یہاں رہتی تھیں۔ خواجہ عبدالمطلب وہیب کے پاس گئے اور عبداللہ کی شادی کا پیغام دیا۔ اُنھوں نے منظور کیا اور عقد ہوگیا۔ اسی موقع پر خواجہ عبدالمطلب نے بھی وہیب کی صاحبزادی سے جن کا نام ہالہ تھا اپنا پیغام دیا اور شادی کرلی۔ حضرت حمزہ انھیں ہالہ کے بطن سے ہیں۔ ہالہ رشتہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ ہوئیں۔ اس بنا پر حضرت حمزہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خالہ زاد بھائی بھی ہوئے اور چچا بھی۔ (ابن سعد ص۵۸ ج ۱)

[2] عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مُرہ بن کعب بن لُوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار۔ یہ سلسلہ نسب خود آنحضرت ﷺ نے ایک تقریر میں برسرِ منبر ارشاد فرمایا تھا۔ البدایہ والنہایہ ص۲۵۵ ج ۲۔ اس کے بعد کا سلسلہ واضح نہیں ہے اسی لئے علماء نے اس کو نقل کرنا بھی پسند نہیں کیا۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ کے سامنے کسی نے حضرت آدم علیہ السلام تک سلسلہ بیان کیا۔ مگر حضرت مالک رضی اللہ عنہ نے اس کا ثبوت طلب فرمایا تو جواب کچھ نہیں تھا۔ اسی طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک سلسلہ نسب کے متعلق بھی آپ نے ناپسندیدگی ظاہر کی کہ کوئی قابل اعتماد ثبوت نہیں ہے۔ البتہ عدنان تک سلسلہ نسب کو صحیح کہا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے عدنان سے آگے سلسلہ نسب بیان کیا جاتا تو فرماتے "کذب النسابون" (نسب بیان کرنے والے غلط کہتے ہیں) ان کی غلط بیانی کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما (باقی صفحہ پر)

رضاعت و شیر خوارگی اور مرضعات (دودھ پلانیوالی مائیں)

زعمِ برتری اور خوش حالی کا ایک تکلّف یہ تھا کہ بیگمات اپنے بچوں کو خود دودھ نہیں پلاتی تھیں۔ کچھ عرصہ بچہ ماں کے پاس رہتا تو دودھ پلانے میں خاندان کی عورتیں یا باندیاں مدد کیا کرتی تھیں۔ پھر بچہ کو مستقل طور پر کسی ماما کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔

قریش کو اپنی زبان سے عشق تھا۔ وہ شخص قوم کا سردار نہیں مانا جا سکتا تھا جو فصیح نہ ہو۔ بچپن ہی سے زبان کی حفاظت کی جاتی تھی اور بچوں کو فصیح عربی کا عادی بنایا جاتا تھا۔ مکہ شہر میں یہ ممکن نہیں تھا کہ بچے ٹکسالی فصیح عربی کے عادی ہوں۔ کیونکہ یہ ایک تیرتھ تھا جہاں غیر قریشی عرب جو فصاحت سے ناآشنا ہوتے تھے ہمیشہ آتے رہتے تھے۔ یہاں قیام کرتے تھے۔ تجارت کے سلسلہ میں بھی آمد و رفت رہتی تھی اور زبان کے لحاظ سے سب سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ یہاں عجمی (شام اور افریقہ وغیرہ کے) غلام بکثرت رہتے تھے۔ ایک ایک گھرانے میں کئی کئی غلام ہوتے تھے۔ ان کی مخلوط عربی مضحکہ خیز ہوتی تھی اور بچوں کا واسطہ زیادہ تر انھیں غلاموں سے پڑتا تھا اس لیے قریش نے کچھ ایسے دیہاتی قبائل منتخب کر رکھے تھے جن کی زبان فصیح مانی جاتی تھی۔ انھیں قبائل کی عورتوں کو وہ اپنے بچوں کی "ماما" بناتے تھے۔ ان قبائل کی عورتیں مکہ میں آتیں اور بچوں کو لے جاتیں، وہی دودھ پلاتیں اور وہی پرورش کرتیں۔ انھیں کی ٹکسالی عربی کے الفاظ بچوں کے کانوں میں پڑتے۔ انھیں الفاظ کی ادائیگی کے لیے بچوں کی زبان پہلی مرتبہ ملتی اور فصاحت گویا ان کی گھٹی میں پڑ جاتی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نے اس آیت سے استدلال کیا: وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللّٰهُ (سورہ ابراہیم آیت ۹) یعنی جب اللہ تعالیٰ اس آیت میں یہ فرماتے ہیں کہ قوم نوح و عاد و ثمود اور جو اُن کے بعد قومیں گذریں ان کو صرف اللہ ہی جانتا ہے تو اب ان ادوار اور قوموں کے متعلق ماہرینِ انساب کا دعویٰ واقفیت یقیناً غلط ہے۔ [۱] آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فخریہ فرمایا کرتے تھے انا اعربکم انا قرشی و استرضعت فی بنی سعد بن بکر۔ سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۱۱۰ "میں تم میں سب سے زیادہ خالص صحیح اور شستہ عربی بولنے والا ہوں۔ میں قریشی ہوں (جن کی زبان ٹکسالی ہوتی ہے) اور قبیلہ بنی سعد بن بکر میں میں نے دودھ پیا ہے (جو فصاحت زبان میں مقام اعلیٰ رکھتے ہیں)

زبان کی حفاظت کے علاوہ صحت کے لحاظ سے بھی دیہات کی کھلی ہوا بچوں کے لیے مفید ہوتی تھی۔ اس سماجی رسم کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ بچوں کا نشو و نما صحت مندانہ ہو۔[۱] اخلاق و خصائل کے لحاظ سے بھی یہ قبیلے[۲] پست نہیں تھے۔ یتیم عبداللہ کے دَورِ رضاعت کو خاندانی آداب کے اسی سانچہ میں ڈھلنا پڑا۔ چنانچہ آپؐ کی والدہ نے تو صرف سات یا نو روز دودھ پلایا۔ پھر ابولہب[۳] کی آزاد کردہ باندی ثویبہ[۴] نے سات ماہ دودھ پلایا۔ ان[۵] کے علاوہ

(بقیہ ص۱۷۰) کا مالک ہے۔ ابن سعد کے الفاظ یہ ہیں لسانی لسان بنی سعد بن بکر (طبقات ج ۱ ص۷۱)۔

[۱] ماخوذ از سیرۃ ابن ہشام ص۱۰۱ ج۱۔ سیرۃ حلبیہ ص۹۶ ج۱ [۲] قبیلہ سعد جس سے حضرت حلیمہ اور اُن کے شوہر حارث بن عبدالعزیٰ کا تعلق تھا ثقیف کی ایک شاخ ہے جو بہادری شجاعت اور تیر اندازی میں مشہور تھا۔ اور شرافت میں قریش کے ہم پلّہ مانا جاتا تھا۔ چنانچہ قریش سے اس کی رشتہ داریاں بھی تھیں۔ [۳] ابولہب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوتیلے چچا۔ اصل نام عبدالعزیٰ تھا مگر چونکہ سرخ سپید رخسار انگارے کی طرح رہتے تھے۔ اس لیے ابولہب کنیت اختیار کی (خصائص و سیرۃ ابن ہشام وغیرہ) اپنی تعریف مقصود تھی کہ انگارہ کی طرح چمکدار اور روشن اتفاق سے یہ تعریف مذمت بن گئی کیونکہ حسین اور روشن رخسار کے بجائے "ابولہب" دوزخی کو کہا جانے لگا۔ (معاذ اللہ) [۴] ابولہب کی باندی ثویبہ نے جب گوشہ جگر عبداللہ کی ولادت کی خبر سنائی تو ابولہب نے اس خوشی میں اس باندی کو آزاد کر دیا۔ احادیث میں ہے کہ اس کارِ خیر کی وجہ سے ابولہب کے عذاب میں دوشنبہ کے روز تخفیف کر دی جاتی ہے۔ (البدایہ والنہایہ ص۲۷۳ ج۲)۔ ثویبہ کچھ عرصہ پہلے حضرت حمزہؓ کو بھی دودھ پلا چکی تھیں جنہوں نے اسلام میں سید الشہداء کا خطاب پایا یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوٹے چچا تھے اور ثویبہ کے رشتے سے دودھ شریک (رضاعی) بھائی بھی ہو گئے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلانے کے بعد ابو سلمہ کو دودھ پلایا۔ یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپی برّہ کے فرزند ارجمند تھے یعنی پھوپی زاد بھائی پہلے سے تھے اب دودھ شریک بھائی بھی ہو گئے۔ اسلام سے مشرف ہوئے۔ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں وفات ہوئی۔ اکمال فی اسماء الرجال و بخاری شریف ص۷۶۴ وغیرہما، ثویبہ کا لڑکا جس نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دودھ پیا اس کا نام مسروح تھا۔ ابن سعد ص۶۷ ج۱ ثویبہ کے اسلام میں علماء کا اختلاف ہے۔ حافظ ابو مندہ نے ثویبہ کو صحابیات میں ذکر کیا ہے ثویبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی کچھ خدمت کرتے ہجرت کے بعد بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ثویبہ کے لیے ہدیہ بھیجا کرتے تھے۔ فتح خیبر کے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا اور ان کے لڑکے مسروح کا بھی۔ فتح الباری ص۱۱۸ ج۹۔ [۵] تین لڑکیاں قبیلۂ بنی سلیم کی تھیں جن میں سے ایک کا نام عاتکہ تھا۔ ایک خاتون کا نام اُم فردہ تھا۔ ام ایمن کا نام بھی لیا جاتا ہے (سیرۃ حلبیہ ص۹۵ ج۱)

کچھ اور خواتین کے نام بھی لیے جاتے ہیں جنھوں نے دودھ پلایا۔ اس کے بعد آپ حضرت حلیمہ کے سپرد کیے گئے، جو آپ کو قبیلہ بنی سعد میں لے گئیں۔ کم و بیش چار سال آپ نے اسی قبیلہ میں گذارے۔

یتیم بچّہ اور کمزور ماما[1]

جیسا کہ رواج تھا۔ دیہات کی عورتیں دودھ پینے والے بچوں کو لینے کے لیے مکہ میں آئیں مگر یتیم عبداللہ کو کسی نے قبول نہیں کیا کہ "بیوہ ماں" سے کچھ زیادہ انعام کی اُمید نہیں تھی۔ دادا اگرچہ سردارِ مکہ تھے مگر چراغِ سحر تھے۔ قبیلہ سعد[2] کی ایک عورت حلیمہ تھی وہ بھی "ماما" بننے کے لیے آئی تھی مگر اس کو عورتوں نے اس لیے منظور نہ کیا کہ وہ فاقہ زدہ کمزور تھی۔ وہ خیال کرتی تھیں کہ یہ سوکھی عورت خود دودھ کی محتاج ہے۔ بچہ کو دودھ کیا پلائے گی۔ مگر نامرادی مراد بن گئی۔ جب حلیمہ سعدیہ سیدہ آمنہ کے پاس پہنچیں اور آمنہ کا لال اسے دودھ پلانے کے لیے مل گیا۔ حلیمہ کو شغل ہاتھ لگا اور آمنہ کی اپنی پڑوسنوں اور سہیلیوں میں آنکھ نیچی نہ ہوئی ورنہ انھیں صدمہ تھا کہ عورتیں کہیں گی کہ اس یتیم کو کوئی "ماما" بھی نصیب[3] نہ ہوئی۔

بھاگوان بچّے کی برکت[4] قدرت کا یہ حیرت انگیز کرشمہ تھا کہ جیسے ہی حلیمہ کی گود اس یتیم موتی سے آراستہ ہوئی اس پر برکتوں کا مینہہ برسنے لگا۔ پہلے اس سوکھی فاقہ زدہ عورت کے دودھ سے اس کے بچّے کا پیٹ بھی نہیں بھرتا تھا۔ اب دونوں شکم سیر ہونے لگے گھر کی بکریوں کے تھنوں میں بھی دودھ بڑھ گیا۔ اور وہ گدھی جس پر حلیمہ سوار ہو کر آئی تھیں پہلے مَٹھی اور مریل تھی اور جب واپس ہوئی تو سب سے آگے آگے چل رہی تھی جیسے کسی پیاسے نے پانی دیکھ لیا ہو۔ بارش نہیں ہوئی تھی جنگل سوکھ رہے تھے۔ گاؤں کی

---

[1] ماخوذ از سیرۃ ابن ہشام و بیہقی و خصائص کبریٰ۔ [2] قبیلہ سعد کی دس عورتیں آئی تھیں جن میں حلیمہ بھی تھیں۔ ابن سعد ج ۱ ص ۶۹
[3] الانوار المحمدیہ من المواہب اللدنیہ ص ۱۹ [4] سیرۃ ابن ہشام و بیہقی و خصائص کبریٰ و انوار محمدیہ

بکریاں بھوکی آتی تھیں مگر حلیمہ کی بکریاں شام کو گھر آتیں تو کوکھیں تنی ہوئی ہوتی تھیں اور تھن لٹکے ہوئے۔

حلیمہ کو حیرت حلیمہ کا اپنا بچہ بچّوں کی طرح دودھ پیتا تھا مگر یہ یتیم بچہ صرف دہنا دودھ پیتا تھا۔ بائیں کو لب بھی نہ لگاتا تھا۔ حلیمہ بایاں دودھ دیتیں تو اپنا منھ ہٹا لیتا تھا۔ حلیمہ کو اس پر حیرت ہوتی مگر اس کو کیا خبر تھی کہ یہ بچہ بڑا ہوگا تو قناعت کا علم عدل وانصاف کا پیکر اور مساوات کا سب سے بڑا علمبردار ہوگا۔

یہ بچہ کچھ اور بڑا ہوا۔ نوالہ لینے لگا تو اس کی مرضی ہوتی تھی کہ جو اس کو ملے وہ اس کے دودھ شریک کو بھی ملے۔ بچے روتے ہیں کہ کوئی چیز دوسرے بچے کو کیوں دی اور یہ بچہ اس پر روتا تھا کہ جو چیز اس کو ملی وہ اس کی بہن کو کیوں نہیں ملی۔ اسی لیے آپ کے رضاعی چچا ابو ثروان نے کہا تھا:

> میں نے آپ کا ہر ایک دَور دیکھا ہے اور ہر دَور میں آپ کو سب سے بہتر پایا۔ زمانہ شیر خوارگی میں سب سے بہتر شیر خوار۔ دودھ چھُوٹا تو سب سے بہتر فطیم[2]۔ جوان ہوئے تو سب سے زیادہ صالح نوجوان۔ آپؐ کے اندر خیر کی خصلتیں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہیں[3]۔

عجیب وغریب واقعہ اور حلیمہ کی پریشانی چار سال ہو گئے یہ معصوم بچہ حلیمہ کے کلیجہ کو ٹھنڈک اور گھر کو رونق بخش رہا ہے لیکن اب ماں کی مامتا چاہتی ہے کہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے پاس رکھے۔ یہی بیوہ کی زندگی کا آسرا تھا اور اسی کی خاطر وہ اپنی جوانی تج رہی تھی۔ اس گھر کو چھوڑ کر کسی دوسرے کا گھر آباد کرنے کا خیال کبھی نہیں کیا تھا۔ حالانکہ عرب کے دستور کے مطابق یہ عیب[4] کی بات نہیں تھی۔

---

[1] فیا بی ان یشرب منہ۔ ذکرہ ابن سبع فی الخصائص۔ خصائص کبریٰ ص ۵۹ ج ۱
[2] دودھ پینے والے بچہ کو رضیع یا مرضع کہتے ہیں اور دودھ چھوٹ جائے تو فطیم کہتے ہیں۔
[3] خصائص کبریٰ ص ۵۹ ج ۱ [4] بلکہ بیوہ رہنا عیب سمجھتے تھے۔ عرب میں اب بھی یہی رواج ہے۔

مگر حلیمہ اور اس کے شوہر حارث بن عبد العزیٰ کو اس بچہ سے اتنی محبت ہو گئی تھی کہ جُدا کرنا اُن کو گوارا نہیں تھا لیکن جب ماں اور دادے کا تقاضہ زیادہ ہوا تو چار و ناچار یہ دونوں اپنے گھر کے اس چراغ کو لے کر عبد المطلب کے یہاں پہونچے لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ انھیں دنوں میں مکہ میں وَبا پھوٹ پڑی۔ بس حلیمہ کو بہانہ مل گیا۔ وہ بچہ کو واپس لے آئیں کہ جب مکہ کی آب و ہوا ٹھیک ہو جائے گی تب پہنچا دیں گی۔

شقِ صدرِ مبارک دُلارا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پھر اسی طرح حلیمہ کے یہاں رہنے لگا۔ حلیمہ کے سب[1] بچے اس کا خیال رکھتے تھے۔ اس سے محبت کرتے تھے اور کہیں اکیلا نہیں چھوڑتے تھے۔

ایک روز گھر سے باہر یہ سب بچے کھیل رہے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ دو آدمی آئے یہ بڑے حسین وجمیل خوبصورت اور شاندار آدمی تھے۔ نہایت عمدہ صاف لباس پہنے ہوئے۔ انھوں نے بچّہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو اُٹھایا اور اُس کو الگ لے گئے۔ بچے دوڑے ہوئے گھر پہنچے وہاں سے حلیمہ اور ان کے شوہر دوڑے ہوئے آئے۔ دیکھا "محمد" اپنی جگہ موجود ہیں اور کوئی آدمی وہاں موجود نہیں ہے "محمد" خوش وخرّم ہیں۔ مسکرا رہے[2] ہیں۔ البتہ چہرے پر کچھ[3] اتر ہے۔ اُن سے پوچھا۔ بٹیا کیا ہوا۔ کون آدمی تھے۔ وہ تمھیں کیوں اُٹھا لائے تھے۔ وہ کہاں چلے گئے۔

معصوم بچّہ نے پھوکی پھوکی زبان سے سارا قصّہ سنا دیا کہ ان دونوں نے مجھے لٹا کر یہاں سے یہاں تک (سینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) چاک کیا۔ پھر گوشت کا ایک لوتھڑا (دل) نکالا۔ اُس کو چیر کر سیاہ دانہ اس میں سے نکالا۔ برف اُن کے پاس تھا اُس سے دھویا۔ پھر اس کو اپنی جگہ رکھدیا اور ٹھیک کر کے چلے

---

[1] حضرت حلیمہ کے اپنے بچے تین تھے۔ ایک لڑکا عبد اللہ بن حارث اور دو لڑکیاں انیسہ اور حذافہ۔ حذافہ کو شیما بھی کہتے تھے اور حلیمہ کہیں چلی جاتی تھیں تو شیما ہی (حضرت) محمدؐ کو ساتھ رکھا کرتی تھیں سیرۃ ابن ہشام ص۱۰۱ [2] خصائص کبریٰ بحوالہ بیہقی و ابن عساکر [3] فنجدہ قائما منتقعاً لونہ (سیرۃ ابن ہشام ص۱۰۱ ج۱)

گئے۔ مجھے تکلیف کچھ نہیں ہوئی بلکہ ٹھنڈک سی معلوم ہوئی اور اب تک معلوم ہو رہی ہے۔
حلیمہ اور حارث نے بچہ کو چمکارا۔ پیار کیا۔ سینہ سے لگا کر گھر لے آئے۔

حلیمہ اور اُن کے شوہر نے دیکھا وہاں کچھ نہیں تھا۔ البتہ محمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور دوسرے بچّوں سے جو سنا تھا اُس پر اُن کا خیال یہ ہوا کہ ہو نہ ہو یہ جنّات کا اثر ہے اور یہ دونوں آنے والے جن تھے۔ عرب جنّات کو مانتے تھے اور ایسی باتوں کو جنّات کی حرکت سمجھا کرتے تھے۔ لیکن ان دونوں کو خیال رہنے لگا کہ آج یہ ہوا ہے کل کو خدا جانے کیا ہو جائے۔ کچھ دن اسی سوچ وچار میں گذرے۔ اس واقعہ کا چرچا ہوا تو کچھ پڑوسیوں نے حلیمہ اور حارث کو مشورہ دیا کہ کسی کاہن یا کسی یہودی یا عیسائی عالم کے پاس لیجا کر بچّہ کو دکھائیں اور پوچھیں یہ کیا بات ہے۔ چنانچہ ایک یہودی عالم کے پاس لے گئے۔ مگر وہاں پہنچ کر جو واقعہ ہوا اس سے ان کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

جس یہودی کے پاس لے گئی تھیں اُس نے بچہ کو دیکھنے کے بعد شور مچانا شروع کر دیا ''یہی بچہ ہے جو عرب میں انقلاب برپا کرے گا اس وقت کے مذہبوں کو ختم کر دے گا پوجا پاٹ بند اور مُورتیوں کا کھنڈن کرے گا۔ اے لوگو اپنا مذہب بچانا چاہتے ہو تو اس بچّہ کو ختم کر دو[1]''

یہودی عالم کی یہ حرکت دیکھ کر حارث اور حلیمہ اور بھی گھبرا گئے۔ فوراً بچہ کو اُٹھایا۔ نظروں سے بچا کر گھر لائے اور طے کر لیا کہ بچہ کو خیریت کے ساتھ اس کی ماں اور دادے کے پاس پہنچا دیں —— آمنہ سمجھے ہوئے تھیں کہ ''حلیمہ'' بچہ کو اپنے شوق سے لے گئی ہیں تو جب تک میں اصرار اور تقاضہ نہیں کروں گی وہ واپس نہیں لائیں گی۔ لیکن اچانک ایک روز دیکھا کہ حلیمہ بچّہ کو لئے ہوئے آرہی ہیں۔ آمنہ کو حیرت ہوئی۔ حلیمہ سے اس طرح اچانک لے آنے کی وجہ دریافت کی۔ حلیمہ نے سارا قصہ سنایا اور جو اُن کا خیال تھا وہ بھی بتا دیا کہ شاید بچّہ پر کسی جن کی نظر ہے۔ مگر حلیمہ کو حیرت ہوئی کہ آمنہ اس قصہ کو سن کر پریشان نہیں ہوئیں۔ اُنھوں نے بچہ کو گلے لگایا اور حلیمہ کو جواب دیا کہ تمہارا

---

[1] سیرۃ ابن ہشام و ابن کثیر و خصائص وغیرہ۔

خیال غلط ہے۔ میرا یہ پھول جس کے چہرے پر نور کھل رہا ہے اس پر جنّات کا اثر نہیں ہو سکتا۔ یہ برکتوں والا بچّہ ہے اس کے سر پر رحمتِ خدا کا سایہ ہے۔ میں رحمت کے آثار شروع سے دیکھتی رہی ہوں مجھے طرح طرح کے انوار نظر آتے رہے ہیں۔ جنّات کے اثر سے دل پر دہشت اور دماغ میں وحشت ہوتی ہے مگر مجھے جو آثار[1] نظر آئے اُن سے ہمیشہ دل کو سکون اور طبیعت کو بشاشت اور فرحت ہوئی ہے۔ بچّہ کے چہرے پر بھی رونق ہے، نور چمک رہا ہے۔ جنّات کے اثر سے چہرہ مرجھا جاتا ہے اور بیماروں جیسی صورت ہو جاتی ہے۔ یہ تمہاری مہربانی ہے کہ بچہ کو لے آئیں۔ میرے دل کی مُراد پوری ہوئی۔ خدا تمھیں خوش رکھے۔ آمنہ نے حلیمہ کو رخصت کیا اور دادا عبد المطلب نے اس کو خوش کر کے واپس کیا۔

گُم شدگی اور عبد المطلب کی بے تابی

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ———— (سورۂ ضحیٰ)

"آپ کو پایا راستہ بھولا ہوا پس راستہ بتا دیا آپ کو[2]"

حلیمہ[3] ابھی پہنچا کر واپس نہیں ہوئی تھیں کہ آپ باہر نکلے اور راستہ بھول کر

---

[1] مثلاً یہ کہ زمانہ حمل میں طبیعت ہلکی پھلکی رہی۔ حتّٰی کہ مجھے احساس بھی نہیں ہوا۔ مجھے خواب میں بتایا گیا کہ تم حاملہ ہوا ور جو بچہ پیدا ہوگا وہ اُمّت کا سردار اور نبی ہوگا۔ ابن سعد ص ۶۰ ج ۱۔ پہلے خواب میں دیکھا کہ ایک نور میرے اندر سے نکلا جس سے شام کے محل روشن ہوگئے۔ خصائص کبریٰ ص ۴۵۔ پھر ولادت کے وقت بھی ایسا ہی نور دیکھا (مسند احمد و مستدرک وغیرہ)۔ فاطمہ بنت عبد اللہ جو وہاں ولادت کے وقت موجود تھیں انھوں نے دیکھا کہ تمام مکان نور سے روشن ہوگیا (خصائص ص ۴۵ ج ۱ بحوالہ ابن عساکر)

[2] حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ (تفسیر مظہری)۔

[3] ایک روایت یہ بھی ہے کہ عبد المطلب کا اونٹ کہیں بھاگ گیا تھا تو انھوں نے پوتے کو بھی تلاش دبا تی ہے

کہیں چلے گئے۔ تلاش کیا گیا۔ آپ نہیں ملے تو سب پریشان ہو گئے۔ اُس وقت بوڑھے اور غمزدہ دادا کی بے تابی عجیب تھی۔ اسی بے تابی میں وہ حرم میں پہنچے اور خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر دعا کرنے لگے۔ ابن سعد نے اس دعا (مناجات) کے چند شعر نقل کیے ہیں:

لاھم ادّ راکبی محمّدًا	ادّہ الیّ واصطنع عندی یدًا
"خداوندا میرے سوار محمد کو پہونچا دے	اس کو میرے پاس پہنچا دے اور مجھ پر احسان فرما
انت الّذی جعلتہ لی عضدًا	لا یُبعد الدھر فیبعدًا
تو ہی ہے جس نے اُسے میرا بازو بنایا ہے	اس کو کبھی بھی گردش زمانہ تباہی میں نہ ڈالے کہ اس پر بربادی آئے۔

انت الّذی سمّیتہ محمّدًا

تو ہی ہے جس نے اس کا نام محمّد رکھا ہے۔"

بہر حال یہ بے تابی بتقاضا رِ محبت تھی۔ تھوڑی دیر میں کسی نے آپ کو پہنچا دیا یا خود آپ پہونچ گئے۔ تو عبدالمطلب نے گلے لگایا، پیشانی کو بوسہ دیا (ابن سعد ص۷۰ ج۱)۔

سیّدہ آمنہ مدینہ میں

مدینہ منورہ جس کا نام اُس وقت یثرب تھا۔ سیدہ آمنہ کا وہاں ننہیالی رشتہ تھا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) حلیمہ سعدیہ کے یہاں سے آ گئے تو تقریبًا تیرہ سال بعد سیّدہ آمنہ مدینہ گئیں۔ اپنے نورِ چشم لختِ جگر کو بھی لے گئیں اور خدمت کے لیے متوفی عبداللہ کی باندی "ام ایمن" بھی ساتھ گئیں۔ وہاں دارالنابغہ میں قیام کیا یتیم عبداللہ۔ آمنہ کا لال جس طرح حُسن وجمال میں موتی تھا۔ اُس کی خصلتیں بھی سب بچوں سے نرالی تھیں۔ ذہین بچے شریر

(بقیہ حاشیہ ص۱۷۶) کرنے کے لیے بھیجا تھا آپ راستہ بھول گئے۔ جب آپ بہت دیر کے بعد ملے تو عبدالمطلب نے گلے لگایا اور کہا آئندہ کبھی کسی کام کو نہیں بھیجوں گا۔ طبقات ابن سعد ص۷۰ ج۱

ہوتے ہیں مگر آمنہ کے اس جگر گوشہ میں ذہانت تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی شرارت کا نام نہ تھا۔ ہر بات میں ادب اور تہذیب۔ ہر ایک کام سلیقہ کا۔ بھولی بھولی بات چیت بہت شیریں سمجھداری اور متانت ایسی کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے، دوسروں سے تذکرہ کرتے وہ اس بچہ کو دیکھنے آتے تھے۔ مدینہ سے دو دو تین تین میل کے فاصلہ پر یہودیوں کی بڑی بڑی بستیاں تھیں۔ وہاں بڑے بڑے عالم رہتے تھے۔ وہ آنے والے نبی کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے اور اس کی آمد کے منتظر تھے۔ نجومیوں اور جوتشیوں (کاہنوں) کی باتیں بھی مشہور تھیں۔ اس بچہ کی خبر رفتہ رفتہ ان یہودیوں کو پہونچی تو وہ دیکھنے آنے لگے۔ کوئی دیکھ کر بچہ کی تعظیم کرتا اور کوئی ہکا بکا دم بخود رہ جاتا کہ جو باتیں آنے والے نبی کی ہیں وہ اس بچہ میں پائی جاتی ہیں پھر اپنی تنگ نظری سے جزبز ہونے لگتا کہ نبوت تو ہمارے خاندانوں کا حصہ ہے۔ قریش میں یہ بچہ کیوں پیدا ہوگیا۔ اس طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ سیدہ آمنہ کو حلیمہ کی بات یاد آگئی کہ وہ ایک یہودی کے پاس اس نونہال کو لے گئی تھیں تو اس نے شور مچا دیا تھا کہ اس بچہ کو ختم کر دو ورنہ انقلاب برپا کردے گا تمہارے مذہب بدل دے گا سیدہ آمنہ کو فکر ہوئی۔ انھوں نے مدینہ کا قیام مختصر کیا۔ صرف ایک مہینہ ٹھہریں۔ پھر اپنے آنکھوں کے نور، دل کے سرور کو لے کر مکہ روانہ ہوگئیں۔ لیکن اس یتیم بچہ کی انوکھی بات یہ بھی تھی کہ قدرت نے ابھی سے اس کو آزمانا شروع کردیا تھا۔ سیدہ آمنہ مدینہ سے چلیں تو طبیعت خراب ہوگئی۔ اب جیسے جیسے قافلہ چل رہا تھا، ان کا مرض بڑھ رہا تھا۔ ایک مقام کا نام ابوار تھا۔ وہاں قافلے پڑاؤ کیا کرتے تھے۔ جب سیدہ آمنہ یہاں پہونچیں تو مرض اور بڑھ گیا۔ آگے چلنے کی ہمت نہیں رہی، مکہ کے بجائے آخرت کے لئے رخت سفر باندھ لیا اور دنیا سے رخصت ہوگئیں یہیں ان کو سپرد خاک کردیا گیا۔ "ام ایمن" ساتھ تھیں۔ وہ اس یتیم کو جو اب یسیر بھی ہوگیا تھا، لے کر مکہ معظمہ آئیں۔ دادا کو خبر ہوئی تو بہت صدمہ ہوا۔

اس واقعہ سے تقریباً پچاس سال بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ

پہونچے تو آپؐ کو بچپن کی باتیں یاد تھیں۔ آپ بتایا کرتے تھے کہ یہاں ہم ٹھیرے تھے۔ یہاں والدہ کا قیام ہوا تھا۔ یہودی مجھے آ آکر دیکھا کرتے تھے۔ آپ نے یہ بھی بتایا کہ "بنی عدی بن نجار" کے محلہ میں ایک باولی تھی، میں اُس میں تیراکی کی مشق کیا کرتا تھا۔ ام ایمن بیان کیا کرتی تھیں کہ مجھے خوب یاد ہے۔ یہودی کہا کرتے تھے کہ یہ بچہ اس امت کا نبی ہوگا، مکہ سے ہجرت کر کے آئے گا، یہ اس کا دارالہجرت[1] ہے۔

اس ننھے معصوم کو غریب الوطنی اور سفر میں ماں کی جدائی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ صدمہ بہت سخت تھا۔ مگر قدرت چپکے چپکے تسلّی دے رہی تھی کہ

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

دادا عبدالمطلب کی سرپرستی اور وفات

اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۝[2] (سورہ والضحیٰ)

یہ غم زدہ معصوم مکہ معظمہ پہنچا تو عبدالمطلب نے اپنے یتیم و اسیر پوتے کو چھاتی سے لگایا اور اپنے ساتھ رکھنے لگے۔ یہ معصوم بھی دادا سے لگ گیا اور اتنا کھل گیا کہ اُن کے پاس جاتا تو بلا تکلف اُن کی گدی پر بیٹھ جاتا تھا۔ خانہ کعبہ کی دیوار کے نیچے اُن کے لئے فرش بچھایا جاتا تھا۔ فرش پر عبدالمطلب بیٹھتے اور کنارے پر لڑکے بیٹھا کرتے تھے۔ مگر یہ معصوم "محمدؐ" آگے پہنچ جاتے تھے۔ چچا تائے منع کرتے تھے۔ لیکن عبدالمطلب خوش ہوتے اپنے پاس بٹھا لیتے۔ کمر پر ہاتھ پھیرتے اور فرمایا کرتے تھے۔ یہ میرا بیٹا بہت بڑا آدمی ہوگا۔ اس کی خاص شان[3] ہوگی۔ یہودی کہتے ہیں کہ یہ نبی[4] ہوگا۔ اُم ایمن جن کو برکت کہتے تھے ان کو تاکید کیا کرتے کہ دیکھو برکت میرے محمد کا ہر وقت خیال رکھا کرو۔ کہیں باہر نہ جانے دیا کرو[5]۔

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۷۳ [2] کیا ایسا نہیں ہوا کہ اللہ نے آپ کو یتیم دیکھا تو ٹھکانا دے دیا۔ مربی اور سرپرست کھڑے کر دیئے۔) [3] سیرۃ ابن ہشام ص ۵۸ [4] طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۷۵ [5] ایضاً ص ۷۵

لیکن عبد المطلب چراغ سحری تھے سو[1] سال سے بھی زیادہ عمر ہو چکی تھی۔ صرف دو سال پوتے کی دیکھ بھال کر سکے۔ پھر اُن کی وفات ہو گئی۔ ام ایمن کہا کرتی تھیں کہ اُس روز میں نے دیکھا کہ جنازے کے پیچھے "محمد" روتے جا رہے تھے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: آپ کو دادا کی وفات یاد ہے؟ فرمایا خوب یاد ہے میری عمر اُس وقت آٹھ سال تھی[2]۔

خواجہ ابو طالب کی سرپرستی

انتقال کے وقت عبد المطلب کے نو لڑکے تھے اور چھ لڑکیاں[3]۔ پانچ لڑکیاں اور تین بھائی۔ ابو طالب، عبد اللہ اور زبیر ایک ماں سے تھے۔ عبد المطلب نے یتیم عبد اللہ کو "ابو طالب" کے سپرد کیا۔ ابو طالب کو پہلے سے بھی اس بھتیجے سے محبت تھی۔ اب یہ محبت

---

[1] ایک روایت ہے کہ ایک سو دس سال اور دوسری روایت میں ہے کہ ایک سو بیس سال عمر ہوئی۔ یہ بھی روایت ہے کہ بیاسی سال عمر ہوئی۔ حجون میں دفن کیا گیا۔ طبقات ص۴۵ ج۱ [2] ایضاً طبقات۔

[3] حارث جو سب سے بڑے اور جیٹھے تھے، ۲ حجل (یا حجل) لقب غیداق کیونکہ بہت سخی تھے، مقوم، ضرار، ابولہب، اصل نام عبد العزیٰ، ابو طالب، اصل نام عبد مناف، زبیر، حمزہ، عباس۔ لڑکیاں: صفیہ، ام حکیم البیضاء، عاتکہ، امیمہ، اروی، برہ (سیرۃ ابن ہشام ص۶۹ ج۱۔ اولاد عبد المطلب) صفیہ اور عاتکہ مسلمان ہوئیں۔ برہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ صفیہ کے علاوہ تمام لڑکیوں کی اور عبد اللہ ابو طالب اور زبیر کی والدہ ایک تھیں اُن کا نام فاطمہ تھا۔ حضرت صفیہ حضرت حمزہ مقوم اور حجل کی والدہ کا نام ہالہ۔ حارث کی والدہ کا نام سمراء اور ابولہب کی ماں کا نام لبنیٰ۔ ضرار اور حضرت عباس کی والدہ کا نام نتیلہ تھا۔ یہ سب خاندان قریش سے تھیں۔ سیرۃ ابن ہشام ص۶۸ ج۱ (اولاد عبد المطلب) ابن سعد نے بارہ لڑکے شمار کرائے ہیں ان دس کے علاوہ عبد الکعبہ اور قثم کا اضافہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ حارث کا انتقال بھی باپ کے سامنے ہی ہو گیا تھا۔ نیز یہ کہ آئندہ نسل صرف دو کی چلی ابو طالب اور عباس کی۔ ص۵۷

اور بڑھ گئی - بقول[1] ابن عباس (رضی اللہ عنہما) اپنی اولاد سے زیادہ اس بھتیجے سے محبت کرتے تھے - ابوطالب کو ایسی محبت کبھی کسی سے نہیں ہوئی تھی - ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے - کہیں جاتے تو ساتھ لے جاتے - رات کو اپنے پاس لٹاتے تھے - دسترخوان بچھ جاتا - سب بچے بیٹھ جاتے مگر ابوطالب اس وقت تک نوالہ نہ توڑتے جب تک اُن کا چہیتا محمدؐ نہ آجاتا تھا محمدؐ کی باتیں بھی ایسی تھیں کہ ابوطالب کے دل کو لبھاتی رہتیں - دسترخوان پر جب بچے اکٹھے ہوتے تو چیخ و پکار اور چھین جھپٹ کرتے ــــــــ مگر یہ بھولے صاحبزادے "محمدؐ" خاموش بیٹھے رہتے - کبھی ایسا ہوتا کہ انھیں کچھ بھی نہ ملتا - دوسرے بچے ہی جھپٹ لیتے تھے - ابوطالب نے "محمدؐ" کا کھانا الگ کردیا[2] - مگر یہ بات محمدؐ کی فطرت کے خلاف تھی کہ الگ کھائیں یا کوئی چیز ان کو مل جائے اور دوسروں کو نہ ملے اس لئے الگ کھانے پر "محمدؐ" راضی نہ ہوئے - سب کے ساتھ ہی کھاتے اور اپنے کھانے سے زیادہ دوسروں کے کھانے سے خوش ہوتے - کبھی خود اپنے پاس سے اٹھا کر دیدیتے تھے -

ابوطالب کو ایک اور تجربہ بھی ہوا تھا کہ جب "محمدؐ" ساتھ کھاتے تو کھانے میں برکت ہوتی - تھوڑے سے کھانے سے سب کے پیٹ بھر جاتے - اور اگر کبھی کسی وجہ سے "محمدؐ" شریک نہ ہو سکے تو زیادہ کھا کر بھی نیت نہیں بھرتی تھی[3] -

ایک عجیب بات یہ بھی تھی کہ محمدؐ ہر وقت صاف ستھرے رہتے - ابوطالب کے بچے صبح کو اُٹھتے تو کسی کی آنکھ چپکی ہوئی چیپڑے جمے ہوئے، کسی کی ناک گندی مگر محمدؐ کا مُنہ صاف جیسے کسی نے ابھی دھویا ہو - دانت موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے، چہرہ روشن، آنکھیں سرمگیں، ناک کھچی ہوئی، صاف، ناک کے بانسے پر نور چمکتا ہوا[4]

قصہ کہانی کی مجلسیں اُس زمانہ میں سینما تو نہیں تھے البتہ رات کو تفریحی مجلسیں ہوا کرتی تھیں جن میں کہانیاں کہی جاتی تھیں، ڈرامے کی طرح سانگ بھرے جاتے تھے - شادی بیاہ کے موقع پر ناچ گانے کی محفلوں کا خاص انتظام کیا جاتا تھا -

---

[1] بدایہ ونہایہ ص۲۸۲ ج۲ [2] ایضاً ص۲۸۳ ج۲ [3] ایضاً ص۲۸۲ ج۲ [4] ایضاً ص۲۸۲ ج۲۷۰ وابن سعد ص۴۶ ج۱۷۰ وص۱۱۱ ج۲۷۰

بچے ان محفلوں میں شوق سے شریک ہوتے اور رات رات بھر جاگتے رہتے تھے۔ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خود اپنا بیان ہے کہ جس زمانہ میں میں بکریاں چرایا کرتا تھا، تب دو مرتبہ مجھے بھی خیال آیا کہ کہیں چل کر کہانی سنوں۔ چنانچہ اپنے ساتھی کو میں نے تیار کیا کہ وہ میری بکریاں دیکھتے رہیں گے اور میں کہانی سننے چلا۔ راستہ میں گانے کی آواز کان میں پڑی۔ میں نے پوچھا یہ گانا اور باجا کیسا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ فلاں شخص کی شادی ہوئی ہے۔ اس لئے یہاں گانا بجانا ہو رہا ہے۔ میں کچھ ٹھٹکا اور وہیں بیٹھ گیا۔ لیکن بیٹھتے ہی ایسا سویا کہ جب منہ پر دھوپ آگئی تب آنکھ کھلی۔ میں گھبرا کر اپنے گلہ کے پاس گیا۔ ساتھی نے کہا، بتاؤ کیا دیکھا۔ میں نے کہا کچھ بھی نہیں اور سارا قصہ سنا دیا۔ اس کے بعد پھر ایک مرتبہ میں بکریوں کا انتظام کر کے اسی ارادہ سے چلا۔ لیکن ایسا ہی واقعہ پھر بھی ہوا۔ میں کچھ سننے نہ پایا تھا کہ سو گیا اور دھوپ لگنے پر آنکھ کھلی۔ تب بھی میں نے واپس ہو کر ساتھی کو یہی روداد سنائی اس کے بعد کبھی ارادہ تو کیا خیال بھی نہیں کیا۔[۱]

علماء سیرت و تاریخ کا ایک متفقہ بیان ہے اس موقع پر اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے:

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کردار کے ساتھ جوانی کی منزل پر پہنچے کہ زمانۂ جاہلیت کی باتوں سے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ آپ کو محفوظ رکھا۔ آپ ایسے نوجوان تھے کہ مروّت میں سب سے افضل، شرافت کی باتوں میں سب سے اعلیٰ، اخلاق میں سب سے بہتر، میل جول میں نہایت شریف، جواب دینے میں نہایت مہذب اور باسلیقہ، گفتگو نہایت شیریں، سمجھ بوجھ میں سب سے برتر، نہایت بردبار، نہایت امانت دار، بات کے سچے، زبان کے پکے، ہر ایک برائی

---

[۱] البدایہ والنہایہ ص۲۸۷ ج۱ بحوالہ بیہقی [۲] طبقات ابن سعد ص۱۲۱ ج۱ ابن ہشام ص۱۱۵ ج۱ ابن کثیر ص۲۸۷ ج۱

سے کوسوں دور، ہر ایک کے خیر خواہ، کبھی کسی کو آپ سے تکلیف نہیں پہونچی، کبھی کسی کو سخت بات نہیں کہی، نہ کسی سے لڑائی، نہ کسی سے جھگڑا۔ انھیں خوبیوں نے آپ کی قوم کو آپ کا گرویدہ بنا دیا۔ آپ کی سچائی اور امانتداری نے لوگوں میں جذبہ پیدا کیا کہ آپ کو "الامین" "الصادق" کہیں اور اسی نام سے آپ کو یاد کریں۔"

(۲)

اپنا تکفل خود اور دوسروں کی مدد

اپنی زندگی خود بناؤ، اپنا بوجھ خود سنبھالو، دوسروں کی مدد کرو۔

عبدالمطلب کی وفات کے بعد ابو طالب ان کے جانشین بنائے گئے۔ قبیلہ کے شیخ اور مکہ کے ایک سردار مانے گئے۔ اس لحاظ سے عزت تو کافی تھی مگر دولت ناکافی[1]۔ بڑا کنبہ، عیال کثیر[2] آمدنی کا ذریعہ محدود، یتیم عبداللہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے سپرد ہوئے تو

---

[1] عبدالمطلب کی وفات کے بعد آب زمزم کی تقسیم کرنے اور پلانے کی خدمت ابو طالب کے سپرد ہوئی تھی۔ اس خدمت کے انجام دینے میں رقم بھی خرچ کرنی پڑتی تھی ابو طالب خرچ کرتے رہے لیکن نبھا نہیں سکے۔ ایک مرتبہ مصارف کے لئے اپنے بھائی عباس سے ایک سال کے وعدہ پر دس ہزار قرض لئے۔ سال ختم ہو گیا یہ قرض ادا نہ ہو سکا تو اگلے سال پھر عباس سے قرض لینا پڑا۔ اس مرتبہ چودہ ہزار کا خرچ تھا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اس شرط پر قرض دیا کہ اگر ادا نہ سکے تو پھر یہ خدمت میں اپنے ذمہ لے لوں گا۔ ابو طالب نے یہ شرط منظور کر لی لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ پورا سال گذر گیا ادا قرض کی کوئی صورت نہیں بن پڑی اور یہ خدمت حسب قرارداد حضرت عباس کے حوالہ ہو گئی۔ البدایہ والنہایہ ص ۲۴۴

[2] پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں۔ سب سے بڑے لڑکے طالب تھے جو جنگ بدر کے بعد لاپتہ ہو گئے۔ اُن سے چھوٹے عقیل جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے۔ اُن سے چھوٹے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ جو غزوۂ موتہ (باقی ۱۸۴ پر)

اگرچہ یہ یتیم عمر عزیز کی ابھی آٹھویں منزل ہی طے کر رہا تھا۔ مگر چچا کی پریشان حالی کے احساس نے اس کو اس ننھی سی عمر میں ہی فکرمند بنا دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اپنے مربی چچا کی مدد وہ کس طرح کر سکتا ہے مگر مکہ میں نہ کوئی دستکاری تھی نہ کوئی سرکار جس کی نوکری کی جا سکے، اس زمانہ کی دنیا کارخانوں سے بھی آشنا نہ تھی۔ اور مکہ کی پتھریلی اور ریتلی زمین اور آس پاس کے جھلسے ہوئے کالے اور بھوسلے پہاڑوں کو کسی چشمہ یا دریا کی سیرابی بھی میسر نہ تھی کہ وہاں کھیتی باڑی ہو سکے۔ البتہ بھیڑ بکری اور اونٹ یہاں بکثرت تھے اور قدرت نے ان کا چارہ یعنی ببول کے درخت اور اذخر جیسی گھاس بھی وہاں پیدا کی تھی انھیں مویشی کے گلے اس زمانہ کی قیمتی دولت تھے۔ اور جن کے پاس یہ دولت ہوتی تھی وہ ان کے چرانے اور دیکھ بھال کے لیے مزدور اور اجیر بھی رکھا کرتے تھے۔ یہ گلہ بانی سوسائٹی کی نظر میں کچھ بھی حیثیت رکھتی ہو مگر آمدنی اور گذر کا ایک جائز ذریعہ بھی۔ سردار قریش عبدالمطلب کے یتیم پوتے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسی ذریعہ کو اختیار کیا اور اس کے ننھے سے وجود کے لیے اونٹوں کی گلہ بانی مشکل تھی تو بکریاں چرانے کی مزدوری کرنے لگے۔ اس طرح اپنی زندگی خود بنالی۔ اور نہ صرف یہ کہ اپنا بوجھ خود سنبھالا بلکہ پریشان حال چچا کی مدد بھی کرنے لگے۔

مکہ تجارتی نقطہ نظر سے

مکہ کی زمین اگرچہ پیداوار کے قابل نہیں تھی مگر تجارتی کاروبار کے لئے نہایت موزوں تھی۔ یہاں مشرق

(بقیہ صفحہ ۱۸۳) میں شہید ہوئے۔ اُن سے چھوٹے حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ چہارم ہر ایک بھائی دوسرے سے دس دس سال چھوٹا تھا۔ لڑکیوں کے نام یہ تھے: حضرت اُم ہانی جن کا اصل نام ہند تھا، جُمانہ، ریطہ اور اسماء، ان سب کی والدہ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم تھیں یعنی ابوطالب چچا کی لڑکی ایک دوسری بیوی علہ تھیں، پانچواں لڑکا طلیق نام اُن کے بطن سے تھا۔ ابن سعد جزء ۱ ص۷۵

ومغرب کے ڈانڈے ملتے تھے۔ ایران وعراق، یمن، شام اور افریقہ کے تجارتی تعلقات کی درمیانی کڑی بھی شہر تھا۔ قریش اس قدرتی نعمت کو پہچانتے تھے اور جہاں تک اُن کی گنجائش تھی وہ اس سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔

بعثت نبوی (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی بنائے جانے) سے تقریباً دو سو برس پہلے قریش کے مشہور اور ممتاز سردار ہاشم[1] نے رِحلت الشّتار والصّیف (سردی اور گرمی کے موسم کے دو کوچ) کا دستور ڈال دیا تھا۔ گرمیوں میں مکّہ والوں کے تجارتی قافلے شام اور انقرہ جاتے تھے جہاں اس زمانہ میں ٹھنڈ ہوتی تھی، خوشگوار موسم، صحت بخش آب وہوا

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے والد۔ دولت کے ساتھ خدا نے حوصلہ بھی بے پناہ دیا تھا۔ حج کے موقع پر آپ حاجیوں کو گوشت اور روٹی کھلایا کرتے تھے جو کھجور اور شکار پر زندگی بسر کرنے والے عربوں خصوصًا بدّوؤں کے لئے بہت بڑی نعمت ہوتی تھی۔ روٹیوں کے ٹکڑے شوربے میں ڈلوا دیا کرتے تھے اور وہ تقسیم کرایا کرتے تھے اسی وجہ سے ان کو لوگ ہاشم کہنے لگے تھے، کیونکہ ہشم کے معنے چورنے کے آتے ہیں (سُمِّیَ ھاشمًا لھشمہ الثرید مع لحمہ لقومہ فی سنی المحل) ایک مرتبہ عرب میں قحط تھا تو شام سے خبز (بسکٹ) بوروں میں بھروا کر لائے اور شوربے میں چور کر ثرید بنا کر حاجیوں کو کھلایا اور نہ صرف حاجی بلکہ سب مکہ والوں کو کھلایا۔ قحط کے زمانہ میں ایک عرصہ کے بعد اس وقت لوگوں نے سیر ہو کر کھایا (طبقات ابن سعد ص۴۵ ج۱ وابن ہشام وغیرہما) ہاشم ہی نے قریش کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ تمام حاجیوں کو وہ اپنا مہمان سمجھیں اور حج کے زمانہ میں اُن کے کھانے کا انتظام وہ اپنے چندہ سے کیا کریں قریش نے اس کو منظور کیا اور وہ جس طرح سال بھر کماتے تھے اس موقع پر دل کھول کر خرچ کرتے تھے۔ اس مشترک انتظام میں بھی ہاشم کا حصّہ سب سے ممتاز رہتا، ۸ ذی الحجہ سے ۱۲ تک تقریبًا ایک ہفتہ تک ان کی طرف سے دعوت ہوتی تھی جس میں کبھی گوشت روٹی اور کبھی گھی اور روٹی کھانے کے لئے اور ستو، کھجور ناشتہ میں پیش کیا کرتے تھے۔ چمڑے کے بڑے بڑے حوضوں میں پانی بھروا دیتے تھے۔

کا لطف بھی اُٹھاتے اور تجارت بھی کرتے اور سردیوں میں یہ قافلے حبشہ اور یمن جاتے تھے۔ ہاشم اور اُس کے بھائیوں نے مختلف[1] ممالک سے عربوں کے لئے آزاد تجارت کے سارٹیفکٹ (پروانے) بھی حاصل کرلئے تھے۔ عرب میں قریش کی عظمت کا ایک بڑا سبب یہ تجارتی اقتدار بھی تھا۔

(حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عمر نے ترقی کی اور اس قابل ہوئے کہ تجارتی قافلہ کے ساتھ سفر کرسکیں تو آپ نے اس شریف پیشہ کو اپنانا چاہا لیکن روپیہ آپ کے پاس نہیں تھا تو آپ نے دوسروں کے سرمایہ سے تجارت شروع کردی۔ بیرونی تجارت میں بھی حصہ لیا اور جیسا کہ (عبداللہ بن ابی الحمس) کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے آپ مکہ میں گھوم پھر کر بھی کاروبار کیا کرتے تھے تفصیل آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیے۔ یہی دَور تھا جب آپ نے چچا ابوطالب کی مستقل مدد یہ کی کہ نونہال "علی" کے مصارف سے ان کو سبکدوش کردیا اُن کو اپنے ساتھ رکھا اور جملہ مصارف کے ذمہ دار خود ہوگئے۔[2]

قومی خدمت کا جذبہ

بچپن کا یہی معصوم دور جس کی خودداری نے اس معصوم نونہال کو گلہ بانی پر آمادہ کیا تھا، فطری طور پر قومی خدمت کے جذبہ سے معمور تھا۔

کعبہ عربوں کا قومی اور مذہبی نشان تھا چونکہ وہ پہاڑوں کے نشیب میں واقع ہے

---

[1] ہاشم نے شام، روم، داتلی) اور غسان کے بادشاہوں سے عبد شمس نے شاہ حبشہ (نجاشی اکبر) سے نوفل نے (اکاسرہ) فارس کے بادشاہوں سے اور مطلب نے ملوک حمیر (شاہانِ یمن) سے امان اور تجارتی اجازہ (پروانہ) حاصل کرلیا تھا۔ اسی لئے ان بھائیوں کو "مجیرون" کہا جاتا تھا۔ (بدایہ ونہایۃ ص۲۵۳ ج ۲)

[2] اس سال قحط تھا۔ گرانی بہت تھی تو وقتاً فوقتاً ابو طالب کی جو کچھ امداد فرمائی ہوگی اس کے علاوہ مستقل امداد یہ تھی کہ حضرت علیؓ کے مصارف کے ذمہ دار ہوگئے (البدایہ والنہایہ ص۲۵ ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ نے حضرت علیؓ کی ذمہ داری لی اور آپ کے چھوٹے چچا عباس نے حضرت علی کے بڑے بھائی جعفر کی۔ (رضی اللہ عنہم) سیرت حلبیہ ج ۱ ص۲۸۵

توجب بھی زوردار بارش ہوتی تھی سیلاب کی دھاریں اس کو چھوتی رہتی تھیں اور کبھی کبھی اس کو نقصان پہنچا دیا کرتی تھیں۔

مکہ اگرچہ ساحل سمندر سے صرف چالیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ مگر مان سُون اُس طرف نہیں جاتا۔ برسات تو وہاں ہوتی ہی نہیں۔ بارش بھی کبھی کبھی ہوتی ہے۔ بسا اوقات کئی کئی سال گذر جاتے ہیں بارش کی ایک بوند نہیں برستی۔ اور کبھی ایسی زوردار برستی ہے کہ مکہ میں طوفان آجاتا ہے۔ اس وقت کا ایک واقعہ ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر تقریباً دس سال ہوگی کہ مکہ کی پہاڑیوں پر زوردار بارش ہوئی، پھر سیلاب بھی ایسے زور کا آیا کہ کعبہ کی عمارت کو نقصان پہونچ گیا۔ سیلاب اُترا تو کعبہ کی مرمت شروع کی گئی۔ سن رسیدہ اور نوجوان رضاکار اپنے اس قومی نشان کی مرمّت کر رہے تھے تو لوگوں نے دیکھا کہ ایک بچّہ بھی نوجوانوں کی طرح سرگرم ہے اور اگرچہ بساط کچھ بھی نہیں مگر جذبہ اور شوق کا یہ عالم ہے کہ بھاری بھاری پتّھر مونڈھے پر اُٹھا رہا ہے اور کعبہ کی دیوار تک پہنچا رہا ہے۔ مونڈھے پتھروں سے چھلے جا رہے ہیں، بوجھ اُٹھانے سے سانس چڑھ رہا ہے مگر اس کے ولولہ میں کوئی فرق نہیں آرہا۔

یہ بہادر بچّہ وہی ہے جسے "محمدؐ" کہا جاتا ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)

شرم وحیا

اس فلمی دَور میں شرم وحیا ایک مذاق کی چیز بن گئی ہے۔ مگر دنیائے اخلاق میں یہ بہت قیمتی چیز ہے۔ کیونکہ یہ درحقیقت اُس خصلت کا نام ہے جو انسان کو ایسی باتوں سے روکے جو انسانیت اور شرافت کی نظر میں معیوب مانی جاتی ہیں۔

سیدنا "محمّد" (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فطرت کو جو شرم وحیا کی جنس گرانمایہ عطا ہوئی تھی اس کا ایک نمونہ اس موقع پر دیکھنے میں آیا۔

کعبہ کی مرمّت کے سلسلہ میں جب آپ پتھر اُٹھا رہے تھے تو آپ کے چھوٹے چچا "عباس" جو آپ سے دو سال بڑے تھے وہاں موجود تھے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ بے ڈول اور نوکیلے پتھروں

سے اُن کے معصوم بھتیجے "محمدؐ" کے مونڈھے چھلے جارہے ہیں۔

نیم وحشی عربوں میں برہنگی زیادہ معیوب نہیں تھی۔ وہ بسا اوقات اپنے عقیدہ کے مطابق حج جیسے مقدس فرض کو ادا کرتے ہوئے خانہ کعبہ کے قریب (جو اُن کے نزدیک سب سے زیادہ واجب الاحترام مقام تھا) مادرزاد برہنہ ہوجاتے تھے۔ عقیدہ یہ تھا کہ جن کپڑوں میں سال بھر گناہ کرتے رہے ہیں انھیں کپڑوں میں یہ مقدس فرض انجام دینا صحیح نہیں ہے۔

بہرحال "عباس" کو بھولے بھالے معصوم بھتیجے پر ترس آیا اور یہ چاہا کہ کوئی کپڑا بھتیجے کے مونڈھے پر ڈالدیں۔ کوئی اور کپڑا انہیں ملا تو اپنے یہاں کے عام دستور کے مطابق انھوں نے ارادہ کیا کہ بھتیجے کی "لنگی" کھول کر مونڈھے پر رکھ دیں مگر اتنی سی برہنگی بھی اُس شرمیلی اور باحیا فطرت کے لئے ناقابل برداشت تھی جو حضرت "محمدؐ" (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عطا ہوئی تھی۔ چنانچہ ابھی لنگی کھلنے بھی نہیں پائی تھی کہ اس "برادر زادہ" سعید کی حالت غیر ہونے لگی۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں اور ایک ایسی اضطرابی صورت پیدا ہوگئی کہ عباس گھبرا گئے اور لنگی جوں کی توں باندھ دی۔[1]

اسی قسم کا ایک واقعہ اس سے پہلے کا ہے جو آپ نے خود بیان فرمایا کہ بچے کھیل رہے تھے۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ اسی کھیل میں بچے پتھر اُٹھا اُٹھا کر ایک جگہ لے جانے لگے۔ پتھر اُٹھاتے ہوئے اُنھوں نے لنگیاں کھول لیں اور برہنہ ہوگئے۔ اُن کی دیکھا دیکھی میں نے بھی لنگی کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا کہ کسی شخص نے زور سے ڈانٹا۔ لنگی باندھو۔ ایسی ڈانٹ میں نے کبھی نہیں سنی تھی۔ میں نے فوراً لنگی باندھ لی۔[2]

---

[1] ماخوذ از سیرۃ ابن ہشام وغیرہ [2] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۱۱ اس روایت میں لکمنی لکمۃ ہے جس کے معنی ہیں میرے "مکہ مارا"۔ واللہ اعلم۔ یہ بھی یاد رہے کہ بلا ضرورت لوگوں کے سامنے ننگا ہوجانا گناہ ہے اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو بچپن میں بھی گناہوں سے پاک وصاف رکھتا ہے۔ یہ اسی کی مثالیں ہیں واللہ اعلم۔ محمد میاں

غیر اللہ کی پرستش سے پرہیز

یہ عجیب بات ہے کہ مکہ کے باشندے بے دینی اور مذہب سے آوارہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مذہبی سمجھتے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی شخصیت عیسائیوں اور یہودیوں کے نزدیک مسلّم تھی۔ کیونکہ عیسائی اور یہودی جو عام طور پر بنی اسرائیل تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چھوٹے فرزند حضرت اسحاق علیہ السّلام کی اولاد میں تھے۔ وہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو نسلی اعتبار سے مورث اعلیٰ مانتے تھے ایسے ہی مذہبی اعتبار سے بھی اُن کو اپنی مِلّت کا بانی مانتے تھے۔ یہی حال اس زمانہ میں عربوں کا بھی تھا کیونکہ عرب عموماً اور قریش خصوصاً حضرت ابراہیمؑ کے بڑے فرزند یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد تھے۔ اس نسلی رشتے کے علاوہ خانہ کعبہ اور خود مکہ شہر حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی تاریخی یادگار تھے۔ قریش خانہ کعبہ کے محافظ اور متولّی بھی تھے جس کی بنا پر تمام عرب اُن کی تعظیم کرتے تھے۔ اس لحاظ سے مکّہ والوں کے لئے مذہبیت ایک لازمی چیز تھی۔ مگر اُن کی یہ مذہبیت شرک اور اوہام پرستی کا جال بن کر رہ گئی تھی۔ ایک طرف حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا نام زبان پر تھا، جنھوں نے شرک کے خلاف توحید کا جھنڈا بلند کیا تھا، اور دوسری طرف حالت یہ تھی کہ حرم کعبہ میں تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے اور اُن کے علاوہ ہر ایک قبیلہ کا دیوتا اور اس کا بُت الگ الگ تھا۔

شرک کی اس گرم بازاری میں کسی بچّہ کا غیر اللہ کی پرستش سے بچنا ناممکن تھا۔ مگر جس کو قدرت نے وہ سنجیدگی عطا فرمائی تھی جس نے اس کو کھیل، تماشے اور قصّہ گوئی کی محفلوں سے الگ رکھا جو برہنگی کے تصوّر سے بھی لرز جاتا تھا۔ وہ عبادت کے معاملہ میں یہ بے جوڑ بات اور یہ مذاق گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ ایک طرف حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی توحید پرستی کے قصّے سُنے اور دوسری طرف اپنی پیشانی غیر اللہ کے سامنے جُھکا دے۔

ایک وقت اپنے ہاتھ سے مورتی بنائے اور دوسرے وقت اسی مورتی کے سامنے ماتھا ٹیک دے۔ چنانچہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ کبھی آپ کی گردن

غیر اللہ کی عبادت کے لئے نہیں جھکی۔

جس فطرتِ سلیم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سمجھا دیا تھا کہ چاند سورج اور آسمان کے چمکدار تارے جن کو اُن کی قوم معبود مانتی ہے، ہرگز قابلِ پرستش نہیں ہیں، کیونکہ انسان کی طرح رات دن کی تبدیلیوں کا اُن پر بھی اثر ہوتا ہے بلکہ وہ انسان سے زیادہ پابند اور بے بس نظر آتے ہیں جو پابند ہو۔ جس پر رات دن کی تبدیلیوں کا اثر ہوتا رہتا ہو۔ وہ معبود نہیں ہو سکتا۔

اسی فطرتِ سلیم نے پاک طینت "محمد" صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوش سنبھالتے ہی بتا دیا تھا کہ جس کو انسان خود بنائے وہ معبود نہیں ہو سکتا، نہ اس قابل ہو سکتا ہے کہ انسان اس کے سامنے گردن جھکائے یا ماتھا رگڑے۔

بُتوں کو چھونے سے پرہیز

لوگ خانہ کعبہ کا طواف جب بھی کیا کرتے تھے، وہاں پیتل کے دو بُت[1] اساف اور نائلہ تھے، طواف کرنے والے اُن کو بوسہ دیا کرتے تھے اور اُن پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے غلام زید بن حارثہ نے اپنے بیٹے (حضرت حارثہ) کو واقعہ سُنایا کہ ایک مرتبہ بچپن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طواف کر رہا تھا۔ چکر لگاتے ہوئے جب ہم اساف اور نائلہ کے پاس پہونچے تو میں نے چاہا کہ میں بھی انھیں چھولوں۔ حضرت "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) نے منع فرما دیا۔ اگلے چکر میں میں نے نظر بچا کر چھو لینا چاہا۔ اور چھو بھی لیا۔ مگر آپ کی جیسے ہی نظر پڑی آپ نے سختی سے ڈانٹا، میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا۔[2]

---

[1] یہ مرد اور عورت کے دو مجسمے ساتھ ساتھ تھے جن کو پُوجا کرتے تھے اور اُن پر بھینٹ چڑھایا کرتے تھے۔ روایت ہے کہ خاص کعبہ مکرمہ میں فحش حرکت کرتے ہوئے مسخ کر دیئے گئے تھے۔ عجائب پرستی کی انتہا تھی کہ جب پتھر بن گئے تو انکی پوجا شروع کر دی گئی (اخبار مکہ۔ ازرقی صفحہ ۱۲۱ ج ۱) [2] ہدایہ ونہایہ صفحہ ۲۸۸ ج ۲ بروایت بیہقی)

دورِ شباب اور جوہری کردار

تجارت، نکاح، ہمدردی خلق، قومی لقب، امانت، سچائی، معاملہ کی صفائی، وعدہ کی پختگی، نرم بات چیت، احترام انسانیت۔

تجارت

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ـــــ (سورۃ الضحیٰ)[1]

"اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو پایا نادار پس مالدار بنا دیا۔"

نوخیز نوجوان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) گلہ بانی سے آگے بڑھ کر میدان تجارت میں آئے تو آپ کے تعلقات وسیع ہوئے۔ لوگوں کو آپ کے آزمانے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے آپ کو زیادہ قریب سے دیکھا وہی آپ کے سب سے زیادہ گرویدہ ہو گئے۔ اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ صرف دس بارہ سال کے عرصہ میں آپ کی غیر معمولی امانت داری، راستبازی اور سچائی نے سب ہی مکہ والوں کے دلوں کو یہاں تک موہ لیا کہ وہ آپ کا نام لینا بے ادبی سمجھنے لگے۔ یہی مکہ کے بڑے بڑے تاجر اور سیٹھ جن کو اپنی دولت پر ناز تھا جن کو اپنے بین الاقوامی تعلقات پر فخر تھا کہ اُن کے تجارتی قافلے شام، یمن، فارس وغیرہ جاتے رہتے ہیں۔ افریقہ کے بازاروں میں اُن کا لین دین رہتا ہے۔ ان ملکوں کے امیروں اور بادشاہوں سے اُن کی راہ و رسم ہے، ان سے اپنی بات منوا سکتے ہیں۔ یہی رؤسائے قریش جو اپنے سوا کسی کو نظر میں نہیں لاتے تھے جو دوسروں کی گردنیں اپنے سامنے جھکوانا چاہتے تھے، جن

---

[1] "اور پایا تجھ کو مفلس پھر محظوظ کر دیا۔" (حضرت شاہ عبدالقادر صاحب)

کے مشاعروں کی جان اُن کے وہ فخریہ قصیدے ہوا کرتے تھے، جن میں وہ اپنی عظمت اور بڑائی کے ترانے گاتے اور کوئی ان کی توڑ کرتا تھا تو لڑ پڑتے تھے۔ یہاں تک کہ خونریز جنگ کی نوبت آجاتی تھی۔ دنیا جانتی ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ "یتیم عبداللہ" کی غیر معمولی سچائی اور امانت واری نے ان سیٹھوں اور رئیسوں کو یہاں تک متاثر اور گرویدہ بنا دیا تھا کہ وہ آپ کو "الصّادق" یا "الامین" ہی کہتے تھے۔ نام لینا بے ادبی سمجھتے تھے۔ یہ دو لفظ یہاں تک زبانوں پر چڑھ گئے کہ انھوں نے قومی لقب کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔

مورّخ حیران رہ جاتا ہے کہ وہ کردار اور وہ کیرکٹر کس درجہ بلند ہوگا جس نے تیس بتیس سال کی عمر کے نوجوان کو اتنا اونچا اُٹھا دیا کہ بڑے بڑے لوگوں کی گردنیں اس کی صداقت و امانت کے سامنے جھک گئیں۔ ممکن ہے خاندانی رقابت کے سبب سے کچھ لوگ اس خطاب کو پسند نہ کرتے ہوں لیکن وہ مجبور تھے کہ آپ کو اس خطاب سے یاد کریں کیونکہ کوئی ایسی بات یا کوئی ایسا بہانہ[1] اُن کو نہیں ملتا تھا کہ وہ تردید کرسکیں اور عوام کے جذبات کا مقابلہ کرسکیں۔

تاریخ کی یہ پُرانی عادت بہت ہی تکلیف دہ اور مایوس کن ہے کہ کسی شخص کے واقعات قلمبند کرنے کے لئے وہ اسی وقت قلم اُٹھاتی ہے جب وہ شخص تاریخی انسان بن چکتا ہے۔ اس سے پہلے اُس کے قلم کو جنبش نہیں ہوتی۔ اُس نے محمد رسول اللہؐ کے بارے میں بھی اسی بخل سے کام لیا اور ان تمام واقعات سے دامن سمیٹے رکھا جو نبوت سے پہلے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے رہے، جو قریش کے گردن درازوں کو متاثر کرتے رہے۔ تب بھی چند واقعات ایسے ہیں جو کسی طرح تاریخ کے سکڑے ہوئے دامن میں پڑ گئے اور تاریخ نے ان کو صحیح سندوں کے ساتھ محفوظ رکھا۔ قیاس کرنے کے لئے یہ واقعات ہی کافی ہیں اور ان سے

---

[1] ان رقیبوں کے لئے دعوائے نبوت بہانہ تھا۔ جیسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان کیا ان لوگوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا اور آپ کے خلاف اتنی فضا گرم کردی کہ اپنے بھی پرائے بن گئے اور سرگرم حامی بھی جھجکنے لگے۔ تفصیل آگے آئے گی (انشاء اللہ)۔

قبل نبوت کی زندگی روشنی میں آجاتی ہے۔

عبداللہ بن ابی الحمسار، عام سی ایک معمولی آدمی تھا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس کا یہ معاملہ نہ ہوا ہوتا جو یہاں ذکر کیا جا رہا ہے تو دنیا نہ اس کو پہچانتی اور نہ پہچاننے کی ضرورت محسوس کرتی۔

یہ عبداللہ حضرت محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی سودا کر رہا تھا، بات چیت کرتے ہوئے اُسے کوئی کام یاد آگیا۔ اُس نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہا: آپ ٹھہریئے، میں ابھی آتا ہوں۔ تب بات کروں گا۔ آپ کی زبان سے نکل گیا: "اچھا"۔

اب بات کی پختگی اور زبان کی پابندی ملاحظہ فرمائیے۔

عبداللہ بن ابی الحمسار، یہاں سے چلا تو اُس کو کوئی اور ضرورت پیش آگئی وہ اس میں ایسا لگا کہ اس کو اپنے وعدہ کا خیال بھی نہیں رہا۔ یہ دن یونہی گذر گیا۔ پھر اگلا دن بھی گذر گیا ـــــ تیسرے دن اُسے خیال آیا کہ میں" محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے معاملہ کر رہا تھا۔ بات یہاں تک پہنچ چکی تھی۔ میں اُن کو ٹھیرا کر آیا تھا۔ اب چل کر بات پوری کر لینی چاہیئے۔ چنانچہ "عبداللہ بن ابی الحمسار" آپ کے مکان پر پہونچا۔ معلوم ہوا کہ دو روز گذر گئے آج تیسرا دن ہے وہ مکان پر نہیں آئے۔ گھر والے خود پریشان ہیں" عبداللہ بن ابی الحمسار یہاں سے روانہ ہوا۔ جہاں جہاں خیال تھا سب جگہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تلاش کیا، کہیں نہ ملے تو احتیاطاً اُس جگہ بھی پہونچا جہاں بات چیت ہو رہی تھی اور وہ آپ کو وہاں ٹھیرا کر آیا تھا۔

عبداللہ بن ابی الحمسا' اُس مقام پر پہونچا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ" محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہیں موجود ہیں اور" عبداللہ بن ابی الحمسار" کا انتظار کر رہے ہیں اور زیادہ حیرت اس کو اس بات پر ہوئی کہ مسلسل تین دن تک انتظار کی زحمت اٹھانے کے بعد بھی جب عبداللہ بن ابی الحمسار سامنے آئے تو نہ لڑائی جھگڑا تھا نہ ڈانٹ ڈپٹ۔

کہا تو صرف اتنا کہا[1] اور وہ بھی دھیمی آواز سے یافتی لقد شققت علیّ۔ انا ھھنامنذ ثلاث انتظرك۔[2] ("اے صاحب! آپ نے پریشان کردیا۔ تین دن ہوگئے یہاں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔")

قیس[3] بن سائب بن عویمر۔ ایک صحابی تھے۔ اسی زمانہ میں جب آپ کاروبار کیا کرتے تھے وہ آپ کے شریک اور ساجھی رہے تھے وہ ہمیشہ تعریف کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریکی فی الجاھلیۃ فکان خیر شریك لا یداری ولا یماری۔ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب نبی نہیں بنائے گئے تھے (زمانہ جاہلیت میں) میرے ساجھی تھے۔ بس بہت ہی اچھے ساتھی تھے۔ نہ کبھی سخت بات کہتے تھے، نہ جھگڑتے اور بحث کرتے تھے۔"

---

[1] کہہ سکتے ہیں کہ وعدہ کی یہ صداقت اور پختگی وہ متبرک ترکہ تھا جو آپ کو اپنے جدِ اعلیٰ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے ملا تھا۔ سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام سے بھی ایک شخص نے کہا تھا کہ آپ یہاں ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں وہ اپنے کام میں لگ کر بھول گیا اور حضرت اسمٰعیل وعدہ کی پابندی کی بنا پر وہیں ٹھیرے رہے۔ دوسرے تیسرے دن جب اس کو یاد آیا اور وہاں پہونچا تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اسی جگہ انتظار کر رہے تھے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا یہ وصف یہاں تک مقبول ہوا کہ وحی الٰہی نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی خصوصیات میں اس کو شمار کرایا ہے: اِنَّہٗ کَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ (سورہ مریم؛ درمنثور) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف الگ الگ وحی الٰہی نے شمار نہیں کرائے بلکہ ایک جامع اور مکمل سند یہ دیدی: اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۝ یعنی اخلاق کی مثالیں جو انبیاء علیہم السلام کے تذکرہ میں الگ الگ بیان کی گئیں آپ اُن سب کا مکمل مجموعہ ہیں۔

[2] ابوداؤد شریف باب فی العدۃ کتاب الادب

[3] علماء حضرت مجاہد کے نام سے واقف ہیں۔ یہ تفسیر کے امام ہیں۔ تفسیر کلام اللہ کے (باقی بر صفحہ آئندہ)

یہ کاروباری سلسلہ کی باتیں تھیں۔ اب ہمدردی نوعِ انسان اور احترامِ انسانیت کی ایک مثال مطالعہ فرمایئے جو اس زمانہ میں بھی اپنی نظیر آپ تھی اور تہذیب کی دعوے دار موجودہ دنیا بھی اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔

بردہ فروشی عرب میں عام تھی اور بسا اوقات شریف گھرانوں کے بچے بھی اس شکنجہ میں کس لئے جاتے تھے۔ چنانچہ قبیلہ بنی القین بن جسر کے آدمی ایک لڑکے کو پکڑ لائے، اور حضرت خدیجہؓ کے برادر زادے "حکیم بن حزام بن خویلد" کے ہاتھ بیچ دیا۔

حضرت خدیجہؓ اپنے بھتیجے کے یہاں گئیں تو یہ غلام اُن کو پسند آ گیا۔ اُنھوں نے فرمائش کی اور بھتیجے نے یہ غلام پھوپی کی نذر کر دیا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نظر اُس پر پڑی تو اُس کی معصوم زندگی اور اس کی مظلومیت سے دل بے چین ہو گیا۔ آپ نے حضرت خدیجہؓ سے اس کو خرید لیا۔ پھر بچّہ سے اُس کے ماں باپ کا نام اور خاندان و قبیلہ کا پتہ دریافت کیا۔ بچّہ ذہین تھا۔ اُس نے برجستہ جواب دیا: میرا نام زید، میرے والد حارثہ بن شرجیل بن کعب اور والدہ سعدی بنت ثعلبہ ہیں اور قبیلہ طے کے خاندان بنی معن سے ہمارا تعلق ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس کے باپ کا نام اور پتہ معلوم ہو گیا تو اُس کے والد کو خبر پہونچائی۔ والد (حارثہ) خبر پاتے ہی اپنے بھائی کو ساتھ لے کر مکہ آ گیا اور دریافت کرتا ہوا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس پہونچا۔ بچّہ کو دیکھا، چوما، پیار کیا، گلے لگایا اور شفقت پدری کے بموجب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یہ جلیل القدر امام انھیں حضرت قیس بن سائب رضی اللہ عنہ کے غلام تھے۔ حضرت قیس رضی اللہ عنہ نے اُن کو آزاد کر دیا تھا۔ اُنھوں نے حضرت قیس کی عنایتوں اور اپنی آزادی سے یہ فائدہ اُٹھایا کہ فن تفسیر کے امام بنے۔ یہ حضرت مجاہد فرمایا کرتے تھے کہ میرے آقا قیس ہی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ یعنی جو ایسے کمزور ہیں کہ روزہ ان کو تھکا ڈالتا ہے اُن پر فدیہ ادا کرنا لازم ہے" (استیعاب) ذکر قیس۔ یہ حکم اس وقت تھا جب ابتداءً ایام بیض فرض تھے۔ یہ آیت انھیں ایام معدودات کے بارہ میں ہے (واللہ اعلم)۔

یہ چاہا کہ اپنے لخت جگر، نور چشم کو ساتھ لے جائے اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں کچھ رقم بطور فدیہ پیش کردے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رقم لینے سے تو انکار کردیا اور اس کی اجازت دیدی کہ بچہ کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ البتہ یہ فرمادیا کہ خود بچہ سے بھی دریافت کرلیں کہ وہ آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہے یا یہاں رہنا چاہتا ہے۔

بچہ آپ کے یہاں آیا۔ اُس کے والد کو اُس زمانہ کے ذرائع اور وسائل کے بموجب خبر دی گئی وہ علاقہ طے سے سفر کرکے یہاں آیا۔ اس میں کچھ دن لگ گئے۔ بچہ اس عرصہ میں حضرت محمدؐ کی شفقتوں سے اتنا مانوس ہوگیا تھا کہ اُس کو آپ سے جُدا ہونا گوارا نہ ہوا۔ اُس نے باپ کے ساتھ جانے سے انکار کردیا۔ باپ نے بہت سمجھایا۔ مگر بچہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔ آخر میں باپ اور چچا نے چبھتی ہوئی بات کہی: بیٹا تم یہاں غلام ہو، غلام رہنا پسند کرتے ہو۔ باپ کے ساتھ آزاد رہنا پسند نہیں کرتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اب تک باپ بیٹے کی گفتگو میں دخل نہیں دیا تھا۔ مگر یہ بات ایسی تھی جس کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سلوک اور آپ کے اندازِ فکر سے تھا۔ کیا واقعی زید کو آپ غلام سمجھتے ہیں۔ زید کو غلام کی حیثیت سے رکھنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کسی آزاد بچہ کے لئے غلامی پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے فوراً باپ بیٹے کی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے فرمایا: غلام نہیں، بیٹا۔ زید میرے پاس رہے گا تو بیٹا بن کر۔ میں تمہارے سامنے یہ کہتا ہوں اور تمہیں اس سے اطمینان نہ ہو تو چلو، مجمع میں یہ اعلان کئے دیتا ہوں۔ چنانچہ آپ باپ چچا اور زید کو لے کر ایک چوپال[1] میں پہنچے جہاں

---

[1] ایک روایت میں یہ ہے کہ کئی جگہ لے گئے جہاں جہاں لوگوں کی نشست ہوا کرتی تھی، پھر حرم میں بھی لے گئے جہاں لوگوں کا اجتماع رہتا تھا اور سب جگہ یہ اعلان فرمایا۔

(الاستیعاب)

قریش کے سردار اور چودھری موجود تھے اور آپؐ نے اعلان فرمادیا کہ "زید میرا بیٹا ہے ۔ میں اعلان کرتا ہوں آپ لوگ گواہ رہیں[۱]"

حارثہ (زید کے باپ) کی یہ آخری تدبیر تھی زید کو پھسلانے کی جو قطعًا ناکام رہی ۔ اب حارثہ کو کہنا پڑا: اچھا آپ بیٹا بنا کر رکھتے ہیں تو مجھے بھی عذر نہیں[۲]

فطرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ بلندی بھی نظرانداز نہ ہونی چاہیئے کہ آپ نے عبدِ محمدؐ (محمد کا غلام) کہلانا پسند نہیں کیا ۔ آپ نے "ابن محمدؐ" کہلایا اور اسی نسبت سے ان کی شہرت ہوتی رہی[۳] جب خود آپ کے دادا عبدالمطلب کا واقعہ سامنے آتا ہے تو اس فطرت بلند کا حُسن اور بھی زیادہ نکھر جاتا ہے ۔

آپؐ کے دادا کا اصل نام شیبہ[۴] تھا ۔ مطلب ان کے چچا کا نام تھا ۔ چونکہ شیبہ بچپن میں

---

[۱] یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا ہے ۔ دعویٰ نبوت کے بعد جو لوگ بغیر کہے ہوئے صرف یہ سن کر کہ آپؐ پر وحی نازل ہوتی ہے اور آپ نبی بنائے گئے ہیں آپ کی نبوت پر ایمان لے آئے اُن میں یہ زید بھی ہیں ۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو شفقت زید پر رہی وہ تاریخ کی کھلی ہوئی حقیقت ہے ۔ انتہا یہ کہ آپ نے اپنی پھوپی زاد بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے اُن کا نکاح کر دیا ۔ پھر انھیں زید کے لڑکے "اُسامہؓ" تھے جن پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ لوگ ان کو "حِبّ رسول اللہ" (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے) کہا کرتے تھے ۔ اپنے کاموں کے لئے ان سے سفارش کرایا کرتے تھے ۔ فتح مکہ اور حجۃ الوداع جیسے اہم ترین موقع پر کبھی حضرت فضیل بن عباسؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد چھوٹے بھائی) آپؐ کی سواری پر آپ کے ساتھ سوار ہوتے تو کبھی یہ اسامہ (رضی اللہ عنہ) اسی انداز کے ساتھ سوار ہوا کرتے تھے ۔

[۲] الاستیعاب ذکر زید بن حارثہ [۳] یہاں تک کہ اس واقعہ سے تقریبًا ۲۰ سال بعد آیت نازل ہوئی " اُدْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ " (سورہ احزاب) تب زید ابن محمد کے بجائے دوبارہ زید بن حارثہ کہا گیا ۔ [۴] جب پیدا ہوئے تو سر کے بال سپید تھے اس لئے ان کی والدہ نے اُن کا نام شیبہ رکھا ۔

یتیم[1] ہوگئے تھے اور اُن کی پرورش مطلب نے کی تھی تو اس شکر گذاری میں تمام عمر "عبدالمطلب" کہلائے۔

ایک طرف حقیقی چچا۔ اپنے حقیقی بھتیجے کے لئے جو اسی کی طرح آزاد ہے۔ لفظ عبد (غلام) استعمال کرتا ہے اور استعمال کراتا ہے۔ یہاں تک کہ یہی اضافی نام اصل نام کی جگہ لے لیتا ہے۔ دوسری جانب ایک آقا اپنے زرخرید غلام کے لئے بھی "عبدمحمدؐ" کہلانا پسند نہیں کرتا بلکہ "ابن محمدؐ" کہلاتا ہے، اسی کو مشہور کراتا ہے اور بیٹے جیسا ہی اُس سے معاملہ رکھتا ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہی کردار تھا جس نے سرداران قریش کی گردنیں اس کی تعظیم کے لئے خم کیں۔ یہاں تک کہ نام لینا بے ادبی سمجھنے لگے اور "الصادق" اور "الامین" کے خطاب آپؐ کے لئے عام ہوگئے۔

آپ کے مربی چچا "ابوطالب" آخر تک مسلمان نہیں ہوئے، اپنے باپ دادا کے مذہب

---

[1] والد ہاشم تھے۔ مکہ کے سب سے بڑے سردار نہایت سخی اور دل گردہ کے آدمی تھے۔ والدہ مدینہ کی ایک دولت مند صاحب جائداد باحوصلہ خاتون تھی۔ ہمت مردانہ رکھتی تھی، اپنے تمام کاروبار کی نگرانی خود کیا کرتی تھی۔ بیوہ ہوگئیں تو بہت سے بڑے بڑے آدمیوں نے پیغام بھیجا مگر یہ کسی کو نظر میں نہیں لائیں، سب کو رد کرتی رہیں۔ ایک مرتبہ "ہاشم" تجارتی قافلہ لئے ہوئے شام سے آرہے تھے۔ مدینہ میں قیام ہوا تو اس عورت کی چستی، دلیری اور ہمت مردانہ کے قصے سنے اور اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اپنے تجارتی کام کی نگرانی بڑی ہوش مندی سے وہ خود کر رہی ہے انھوں نے بھی پیغام بھیجدیا۔ اس خاتون نے یہ رشتہ منظور کرلیا۔ نکاح ہوگیا۔ نکاح کے بعد یہ خاتون مکہ میں آئیں، ہاشم کے یہاں رہیں۔ پھر یہ اپنے وطن مدینہ گئی ہوئی تھیں، وہیں ولادت ہوئی اور شیبہ پیدا ہوگئے لیکن انہیں ایام میں ہاشم کا مکہ میں انتقال ہوگیا تو بیوہ مدینہ ہی میں رہنے لگیں۔ شیبہ مدینہ میں ماں کے پاس یتیمی کی زندگی گذار رہے تھے کہ کچھ عرصہ کے بعد ہاشم کے چھوٹے بھائی مطلب کا مدینہ جانا ہوا اور بھتیجے (شیبہ) کو اپنے ساتھ مکہ لے آئے۔ جوان ہوگئے تو قریش کے ارباب وحل وعقد نے ان کو سردار بنادیا۔ (طبقات ابن سعد وغیرہ)

پر رہے، اسی مذہب پر جان دی مگر بھتیجے کے اخلاق وکمالات اور ہمدردیٔ خلق کا جو جذبہ بھتیجے کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اس کے یہاں تک گرویدہ تھے کہ بھتیجے کی تعریف میں قصیدے کہا کرتے تھے۔

ایک قصیدہ جس میں تقریباً سو شعر ہیں۔ اس کو ابن ہشام نقل کیا ہے جس کا مشہور شعر یہ ہے جس سے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فیض بے پناہ کا اندازہ ہوتا ہے:

وابیض یستسقی الغمام بوجھہ   ثمال الیتامی عصمۃ للارامل

"وہ نورانی چہرے والا جس کی ذات اور جس کے چہرے کی برکت سے بادل بھی سیرابی حاصل کرتا ہے۔ یتیموں کا مربی، بیواؤں کی عزت وآبرو کا محافظ۔"

وان فخرت یوماً فان محمدًا   ھو المصطفٰی من سرھا وکریمھا

"اور اگر کسی دن (کسی موقع پر) فخر کرنا چاہو تو محمد وہ منتخب شخصیت ہے جس سے کمالات قریش کے مخفی خزانے نمایاں ہوتے ہیں جو پورے قریش میں صاحب کرم اور صاحب شرف ہے۔"

---

۱ الثمال کالغیاث الذی یقوم بامر قومہ۔

۲ البدایہ والنہایہ ص۲۵۴ ج۲ وسیرۃ ابن ہشام ص۲۷۴ ج۱

۳ چونکہ پہلے اشعار میں قریش کا ذکر ہے۔ اس لئے یہاں یہ مفہوم لیا گیا۔ اس سیاق کا لحاظ نہ کیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ شخصیت ہے جس سے کمالات انسانیت کے مخفی خزانے نمایاں ہوتے ہیں۔ جو پوری نوع انسان میں صاحب کرم اور صاحب شرف ہے۔

نکاح

وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ ——— (سورہ نور ۲۶ ؍ ۱)

نکاح مکہ کی رہنے والی ایک ادھیڑ عمر کی خاتون (خدیجہ[1]) جس کی عمر چالیس سال سے کم نہیں ہے جو کئی بچوں کی ماں ہے، دو مرتبہ[2] بیوہ ہو چکی ہے۔ تیسری مرتبہ شادی کے لئے ایک پچیس[25] سالہ نوجوان سے سلسلہ جنبانی کرتی ہے۔ یہ نوجوان حسب نسب کے لحاظ سے مکہ کے تمام شریف اور باعزت خاندانوں میں "نگینہ" ہے جسمانی صحت بہت عمدہ، شکل وصورت بے مثال، اخلاق وعادات میں پورے مکہ کا قیمتی ہیرا۔ اس کے یہاں دولت کے انبار نہیں ہیں مگر کامیاب تجارت میں وہ نام پیدا کر چکا ہے کہ اس کے مقابلہ میں

---

[1] خدیجہ نام تھا، طاہرہ لقب۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم جد تھیں۔ قصی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا تھے، حضرت خدیجہؓ کے بھی پردادا تھے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر قصی تک چار پشتیں تھیں۔ عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدالمناف بن قصی اور حضرت خدیجہؓ سے قصی تک صرف تین پشتیں تھیں خویلد یعنی حضرت خدیجہ کے والد، پھر اسد، پھر عبدالعزیٰ بن قصی۔

[2] حضرت خدیجہؓ پہلے ورقہ بن نوفل سے منسوب تھیں مگر کسی وجہ سے نکاح نہیں ہوا۔ اس کے بعد ابوہالہ سے نکاح ہوا جن کا نام ہند تھا۔ ابوہالہ کے مرنے کے بعد عتیق بن عائذ سے نکاح کیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد وہ بھی انتقال کر گئے (استیعاب واصابہ) ان شوہروں سے اولاد بھی ہوئی۔ ابوہالہ سے جو لڑکا ہوا اس کا نام ہندؓ تھا۔ یہ اپنے سوتیلے باپ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) سے صرف محبت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ روئے انور کے عاشق زار تھے ان کے سوتیلے بھانجے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما ان سے اپنے نانا (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی باتیں پوچھا کرتے تھے اور یہ بڑے شوق سے مزے لے لے کر بیان کیا کرتے تھے۔ سراپا مقدس حلیہ اور شمائل وعادات کا بڑا حصہ بروایت حضرت حسنؓ وحضرت حسینؓ انہیں ابوہالہ سے نقل کیا گیا ہے۔

دولت و ثروت ایک "پرچھائیں" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ بیشک اس بیوہ کے لئے اس رشتہ میں بہت سی دلچسپیاں ہوسکتی ہیں، مگر ان پچیس سالہ نوجوان کے لئے دلچسپی کی ایک ایک چیز ختم ہے۔ یہ خاتون دولت مند ضرور ہے۔ لیکن جس خوددار نوجوان نے اپنی زندگی خود بنائی جس نے بچپن میں بھی گوارا نہ کیا کہ اپنا بار دوسروں پر ڈالے۔ کسی خاتون کی دولت و ثروت اس کی خودداری اور غیرت کے لئے چیلنج تو ہوسکتی ہے، دلچسپی اور کشش کا باعث نہیں بن سکتی۔ ہاں ایک بہت بڑی دولت اور ہے۔ نیک نفسی، راست بازی، امانتداری سچائی اور خلقِ خدا سے ہمدردی "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات ستودہ صفات ان اوصاف کا خزانہ تھی اور یہ نیک نفس خاتون جو دنیا کی تمام بہاروں سے آسودہ ہوچکی تھی ان اوصاف کی قدردان تھی یعنی ایک طرف جوہر تھا تو دوسری جانب جوہری۔

قدرِ جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

یہی سبب تھا کہ یہ رشتہ جو بظاہر اَن مِل بے جوڑ تھا ایسا مبارک ثابت ہوا کہ خاندان اور کنبہ والے اس پر رشک کیا کرتے تھے۔ خود آپ کی وہ بیویاں جو بعد میں آپ کی حرم بنیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی حضرت خدیجہؓ کی تعریفیں سنتی تھیں تو رشک کیا کرتی تھیں۔

رشتہ کا سبب واقعہ اس طرح پیش آیا کہ "خدیجہؓ" جب دوسری مرتبہ بیوہ ہوچکیں تو اپنی تجارت کو باقی رکھنے کے لئے انھیں کسی ایسے امانتدار شخص کی ضرورت تھی جو کاروباری سلیقہ اور تجارتی تجربہ بھی رکھتا ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اگرچہ تقریباً ۲۴ سال تھی مگر آپ کے اوصاف حمیدہ کے چرچے شروع ہوگئے تھے۔ کاروباری سلیقہ کی بھی شہرت ہوچکی تھی اور تجارتی قافلہ کے ساتھ شام جاکر بیرونی تجارت کا بھی آپ کو تجربہ ہوچکا تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کی یہ شہرتیں سنیں پھر ذاتی طور پر بھی واقفیت حاصل کی تو اپنے وسیع کاروبار کے لئے آپ کو زیادہ سے زیادہ موزوں

پایا۔ چنانچہ آپ نے جوان صالح حضرت محمد عبداللہ القریشی المکی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیشکش کی کہ وہ کاروبار کی ذمّہ داری سنبھال لیں۔ نفع میں ایک حصہ اُن کا ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیشکش منظور فرمائی اور مال لے کر شام تشریف لے گئے۔ واپسی کے وقت آپ نے ایسا مال تلاش کیا جس کا مکہ میں فوراً نکاس ہوجائے۔ آپ نے شام سے یہ مال لاکر "مکہ معظمہ" میں فروخت کیا تو نفع بدرجہا زائد ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کاروباری دانشمندی ہوشیاری اور مستعدی نے حضرت خدیجہؓ کی اُس رائے کی تصدیق کردی جو وہ اس "ترقی پسند" نوجوان کے متعلق پہلے قائم کرچکی تھیں۔

حضرت خدیجہؓ نے شام جاتے وقت جب مال سپرد کیا تو خاص اپنے بھروسے کے غلام "میسرہ" کو بھی ساتھ کردیا تھا۔ بہانہ یہ تھا کہ وہ خدمت کرتے رہیں گے اور مقصد یہ تھا کہ مال کی نگرانی بھی رکھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طور واطوار کا بھی گہرا مطالعہ کرتے رہیں۔

سفرِ شام سے واپسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منافع کا مال حضرت خدیجہؓ کے سپرد کیا۔ اور "میسرہ" نے نہ صرف امانتداری بلکہ آپ کے عام اخلاق کی بھی ایسی تعریف کی کہ خدیجہ جو اپنی زندگی کا یہ آخری دور کسی راست باز کے حوالہ کرنا چاہتی تھیں" دامانِ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اُن کو گوہرِ مراد نظر آنے لگا۔ اُنھوں آپ کے خاص احباب اور بزرگوں کے ذریعہ رشتہ کی سلسلہ جنبانی کی جس نے منظوری کا شرفِ عظیم حاصل کیا اور نکاح ہوگیا۔ نکاح کے بعد۔ تجارت اور کاروبار کی طرف خاص توجہ کا تذکرہ تو نہیں آتا۔ البتہ خدمتِ قوم، ہمدردیٔ خلق، خدا پرستی اور خدا ترسی کے اوصاف روز افزوں نظر آتے ہیں۔ ادھر خدیجہ" جن کے لئے یہی اوصاف باعثِ کشش تھے اُن کی گرویدگی دن بدن بڑھ رہی ہے، یہاں تک کہ حضرت خدیجہؓ محض خانگی زندگی ہی میں رفیقۂ حیات نہیں رہیں بلکہ قومی اور ملّی خدمات میں بھی دہنا ہاتھ بنی رہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر تواُن کا ایک حبّہ بھی کبھی صرف نہیں ہوا۔ البتہ

قومی اور ملی کاموں میں ان کی پوری دولت صرف ہوگئی یہاں تک کہ وفات کے وقت وہ اس گھرانہ کی صاحب خانہ (گھرستن) تھیں جس کا فخر اور امتیازی نشان فقر و فاقہ تھا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے لوگوں نے مجھے امداد سے محروم رکھا۔ خدیجہؓ نے میری مدد کی۔ لوگوں نے مجھے جھٹلایا۔ مگر خدیجہ نے ہر موقعہ پر میری تصدیق کی اور ہمت بڑھائی[1]

پچیس برس تک حضرت خدیجہ زندہ رہیں۔ چھ بچے ہوئے دو لڑکے جو بچپن ہی میں وفات پا گئے۔ چار لڑکیاں جو زندہ رہیں۔ اُن کے نکاح بیاہ بھی ہوئے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے یہ لڑکیاں بھی وفات پا چکی تھیں۔ صرف ایک صاحبزادی "حضرت فاطمہؓ" زندہ رہیں جن کے دو لڑکوں (سیدنا حضرت حسن اور سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہما) کی اولاد کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان کو سادات کہا جاتا ہے۔

---

[1] البدایۃ والنہایہ ص۱۲۹ ج ۲ و الاستیعاب وغیرہ

دور شباب اور دور شباب سے کچھ آگے

اخلاقی بدحالی، جذبۂ اصلاح ـــــ امن پسندی اور صلح جوئی

چھٹی صدی عیسوی جس کے آخری حصہ میں یہ آفتاب طلوع ہوا۔ ایک اندھیری رات تھی جس پر گمراہیوں اور ظلم و ستم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔

دولت پر غرور، جاگیر و جائداد پر گھمنڈ، نسلی اور خاندانی اونچ نیچ، اپنے آپ کو اونچا، دوسروں کو نیچا سمجھنا، یہاں تک کہ اُن سے چھوت چھات کرنا، غریبوں کو دبانا، کمزوروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا، عورتوں کو ایک خدمت گذار جاننا، شوہروں کے مرنے کے بعد ان کی زندگی کو اکارت ماننا، یہاں تک کہ ان کی خودکشی کو اُن کے لئے ذریعہ نجات سمجھنا، خدا سے انکار کرنا، یا سیکڑوں ہزاروں دیوی دیوتاؤں کے سامنے ماتھا رگڑنا، من مانی باتوں کو مذہب اور دھرم سمجھ لینا، خود غرضی، بے رحمی، سود، زنا، شراب، رشوت، جوا وغیرہ ایسی بیماریاں تھیں جن کی وبا پوری دنیا[1] میں پھیلی ہوئی تھی۔ عرب میں ان عام بیماریوں کے علاوہ:

۱۔ ایک بیماری یہ تھی کہ پورے ملک کی کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی۔ ہر ایک قبیلہ اپنی جگہ آزاد تھا۔

---

[1] یعنی وہ دنیا جو اس زمانہ میں مہذب دنیا کہلاتی تھی مثلاً وسط ایشیا، ایران، ہندوستان یا مشرقی یورپ باقی مغربی یورپ اس زمانہ میں تہذیب و تمدن سے اتنا بعید تھا کہ شہروں اور قصبوں کی باقاعدہ آبادیاں بھی نہیں تھیں۔ ایک ہی جیسی جھونپڑیوں یا پہاڑی گھاٹیوں میں انسان اور ان کے مویشی ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ فرق بہت معمولی ہوتا تھا۔ افریقہ اور چین کو ہم آج بھی غیر مہذب سمجھتے ہیں اور امریکہ تو صرف چار صدی سے انسانی ممالک کے زمرہ میں داخل ہوا ہے۔

(۲) کچھ انسانوں کو ناپاک سمجھنے کا عقیدہ تو نہیں تھا۔ مگر انسانی خون کو سستا اور مہنگا سمجھنا اُن کا قومی مزاج بن چکا تھا یعنی کسی معمولی قبیلہ کا کوئی آدمی اگر مارا جاتا۔ خواہ وہ اس قبیلہ کا سردار ہی ہوتا تو اس کے خون کے عوض میں چند اونٹ دینے کافی سمجھے جاتے تھے جس کو وہ دِیَت کہا کرتے تھے لیکن اگر کسی بڑے قبیلہ کا کوئی معمولی آدمی بھی مارا جاتا تو اس کے عوض میں قاتل کے ایک سے زائد اور انتہا یہ کہ کبھی پورے قبیلہ کو تباہ کر دینا بھی اپنا حق سمجھتے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔

(۳) فطرت جنگجو تھی اس بنا پر معمولی بات پر بھی بڑی سے بڑی جنگ کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو سالہا سال جاری رہتا۔ مثلاً

ایک شخص کا اونٹ کھیت میں چلا گیا۔ کھیت والی عورت نے اسے مارا۔ اونٹ والے نے عورت کی چھاتی کاٹ ڈالی۔ اس بات پر ۴۹۴ء سے ۵۳۴ء تک برابر لڑائی رہی۔ یعنی اکتالیس سال برابر۔ کہتے ہیں ستر ہزار آدمی اس میں مارے گئے۔

داحس ایک گھوڑا تھا۔ گھوڑ دوڑ میں وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر اسے بدکا دیا۔ اتنی بات پر ایسا رن پڑا کہ قبیلے کے قبیلے کٹ مرے۔ اس لڑائی کا خاتمہ اس وقت ہوا جب اسلام کی امن پسندی نے محارب قبیلوں کے مزاج بدل دیئے۔

حالیؔ مرحوم کے اشعار جو ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ اس زمانہ کے واقعات کا ایک مختصر خاکہ ہیں جو اس سلسلہ کلام کے لئے نہایت موزوں ہیں۔ اشعار یہ ہیں:

نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اڑ بیٹھتے تھے ۔۔۔ سُلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے
جو دو شخص[1] آپس میں لڑ بیٹھتے تھے ۔۔۔ تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے

---

[1] شخصی لڑائی کو قومی اور فرقہ وارانہ لڑائی بنا لینے کا بدترین مرض ہمارے زمانہ میں خود ہمارے ملک میں موجود ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہاں مذہب کا نام دیدیا جاتا ہے اور وہاں قبائلی عصبیت کام کیا کرتی تھی جس کو اسلام نے عصبیت جاہلیت کہا تھا۔ ہمارے یہاں یہ عصبیت جاہلیت مذہب کے مقدس نام پر ہے۔

بلند ایک ہوتا تھا گرداں شرارہ
تو اس سے بھڑک اُٹھتا تھا ملک سارا

وہ بکرا اور تغلب کی باہم لڑائی صدی جس میں آدھی انھوں نے گنوائی
قبیلوں کی کردی تھی جس نے صفائی تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی

نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ
کرشمہ اک ان کی جہالت کا تھا وہ

اسی طرح اک اور خوں ریز بیدا عرب میں لقب حرب داحس ہے جس کا
رہا ایک مُدّت تک آپس میں برپا بہا خون کا ہر طرف جس میں دریا

سبب اس کا لکھا ہے یہ اصمعی نے
کہ گھوڑ دوڑ میں چینڈ[ع] کی تھی کسی نے

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا

یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں
یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

مختصر یہ کہ ان قومی اور بین الاقوامی بیماریوں اور علتوں نے نہ صرف یہ کہ امن و امان کی زندگی کو ناممکن بنا دیا تھا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ رحم، رواداری، بھائی چارگی، عدل و انصاف مروت و شرافت مختصر یہ کہ انسانیت کی تمام شریف خصلتوں کے چراغ گل تھے۔ قریش جیسے قبائل اگرچہ تمدن میں اپنا ممتاز مقام رکھتے تھے مگر روح تمدن سے وہ بھی محروم تھے۔ ان کی کاروباری منڈیاں بڑھ رہی تھیں مگر اخلاق کی جنس ان میں ناپید تھی۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جیسے ہی بیدار مغز جوان صالح کی حیثیت سے شہری زندگی میں قدم جمایا جس طرح آپ کو اپنے خالق اور پروردگار کی عبادت و

[ع] چینڈ بمعنی بدمعاملگی، ہٹ دھرمی، بے ایمانی

پرستش کا شوق بڑھا۔ قوم کی یہ ابتر حالت بھی آپ کے دل کا درد اور جگر کا سوز بن گئی۔ یہ سوزش آپ کو ہر وقت بے چین اور مضطرب رکھتی۔ مگر کوئی معمولی نسخہ شفاء اس درد کے لئے کارگر نہیں تھا۔

اس درد کے علاج کیلئے ایک بہت بڑے سماجی انقلاب کی ضرورت تھی۔ لیکن وقتی طور پر ایک واقعہ نے موقع دیا کہ آپ اس میدان میں آگے بڑھیں اور پورے نہیں تو ادھورے علاج ہی میں حصہ لیں۔

واقعہ یہ تھا کہ یمن کا ایک سوداگر کچھ مال مکہ معظمہ میں لایا۔ مکہ کے ایک بیوپاری "عاص بن وائل سہمی"[1] نے اس کا مال خرید لیا۔ اور جب قیمت ادا کرنے کا وقت آیا تو اس کو مار پیٹ کر بھگا دیا۔ وہ مکہ والوں کے سامنے رویا دھویا۔ مگر کسی نے پرواہ[2] نہیں کی۔ مجبور ہو کر واپس ہوا۔ مگر اب اُس نے مکہ والوں کی ہجو میں اشعار کہنے شروع کئے اور اس طرح پورے عرب میں قریش کی بدنامی[3] ہونے لگی۔ ظاہر ہے مکہ جیسے تجارتی شہر کے لئے یہ بدنامی بہت خطرناک تھی۔ اُس نے قریش کے سرداروں کو چونکا دیا اور اب وہ صورت حال پر غور کرنے کے لئے مکہ کے ایک رئیس "عبداللہ بن جدعان" کے یہاں جمع ہوئے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اگرچہ ابھی بیس[4] سالہ نوجوان تھے مگر امن و آشتی اور صلح و مصالحت جو آپکا فطری جذبہ تھا اس کا یہ اثر تھا کہ جیسے ہی آپ کو خبر ہوئی آپ بھی مجمع میں پہنچ گئے۔ آپ کی شرکت کی یہ برکت تھی کہ واقعہ کا تعلق اگرچہ تجارت اور کاروباری سلسلہ سے تھا۔ مگر غور و فکر کے دائرہ کو وسیع کیا گیا اور ایک ایسی سوسائٹی (انجمن) بنائی گئی جس کے ارکان کا یہ عہد ہوتا تھا: (۱) ہم اپنے وطن سے بے امنی دور کریں گے (۲) مسافروں کی حفاظت کیا کریں گے (۳) غریبوں کی امداد کرتے رہیں گے (۴) طاقتور کو کمزور پر، بڑوں کو چھوٹوں پر ظلم کرنے اور ناانصافی سے روکا کریں[5] گے۔

---

[1] اپنے قبیلہ کا بارعب سردار بھی تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حلیف تھا۔ جب حضرت عمر رضی
(باقی حاشیہ ۲۰۹)

مگر جب تک دلوں کی سطح ہموار نہ ہو اس طرح کے معاہدے پائیدار نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان کا منشا علاج نہیں ہوتا، بلکہ دفع الوقتی ہوتا ہے۔ وقت گذر جاتا ہے تو یہ معاہدے بھی فراموش ہو جاتے ہیں چنانچہ اسی طرح کا ایک معاہدہ پہلے بھی ہو چکا تھا جب مکہ پر قبیلہ جرہم کا قبضہ تھا۔ مگر اب اس معاہدہ کا صرف نام یاد رہ گیا تھا۔ یعنی "حلف الفضول" وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ قبیلہ جرہم کے یہ تین سردار جنھوں نے یہ معاہدہ ایجاد کیا تھا۔ تینوں کے نام "فضل" تھے[۱]۔ اس وقت جو معاہدہ ہوا وہ ایک طرح سابق انجمن کا احیا تھا۔ لہٰذا اس کو بھی وہی نام دیا گیا۔

بہرحال وقتی طور پر یہ امن اور حفاظت جان و مال کے لئے ایک اچھا اقدام تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ اس میں حصہ لیا کہ نبوت کے بعد جب ایک مضبوط نظام مسلمانوں کا قائم ہو گیا تھا تب بھی آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ قریش اگر حلف الفضول کو زندہ کریں تو میں سب سے پہلا شخص ہوں گا جو اس میں حصہ لوں گا[۲]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اسلام لائے تھے تو اس نے ان کو پناہ دی تھی۔ دیباچہ میں اس کا کچھ تذکرہ گذر چکا ہے۔ حضرت عمرو بن العاص انھیں کے فرزند تھے۔ [۲] یعنی عاص بن وائل کا مقابلہ کرنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوئی [۳] حاشیہ ابن ہشام ص۸۳ ج ۱ الشیخ محمود سید الطہطاوی [۴] اسی سال جنگ فجار ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر بیس[۲] سال تھی۔ البدایہ والنہایہ ص۳۰ ج ۲ [۵] ابن ہشام ص۸۳ و ص۸۵ ج ۱

(حاشیہ صفحہ ۲۰۸)

[۱] سیرۃ ابن ہشام ص۸۳ و ص۸۴ ج ۱، و حاشیہ من الشیخ محمود سید الطہطاوی

[۲] سیرۃ ابن ہشام ص۸۵ ج ۱

کام کرنے کا ڈھنگ

تعمیر خانہ کعبہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ثالثی

سب کو ساتھ ملا کر، ہر ایک کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے قوم میں اتفاق اور یک جہتی پیدا کرتے ہوئے کام کرنے کا جو عجیب و غریب ڈھنگ آپ کا تھا۔ اس کی مثال آپ کا وہ طرز عمل ہے جو حجرِ اسود کے سلسلہ میں آپ نے اختیار فرمایا جس کی تفصیل یہ ہے:

عمارت کعبہ اور تعمیر جدید

واقعہ یہ ہے کہ "کعبہ" باوجودیکہ پورے عرب کی عقیدتوں کا مرکز تھا مگر اس کی عمارت ایک عجیب سی چار دیواری تھی جس کا ایک[1] کونہ ایک طرف کسی قدر باہر نکلا ہوا، دوسری طرف کونے ہی نہیں تھے۔ بلکہ اِدھر اُدھر کا حصہ گولائی لئے ہوئے تھا۔
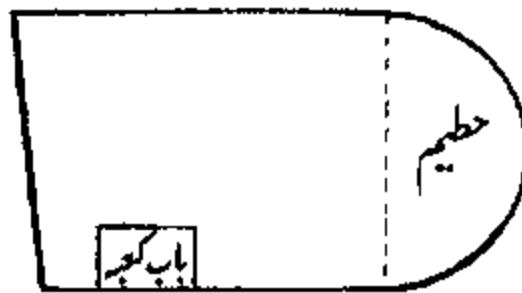
چار دیواری کے اندر دروازہ سے ملا ہوا خزانہ کعبہ تھا، جو کنوئیں کی طرح پختہ گڑھا سا تھا۔ قیمتی نذرانے اسی میں ڈالدیئے جاتے تھے۔ اس میں سونے کے زیورات کے علاوہ ایک سونے کا ہرن تھا جس میں موتی اور جواہرات جڑے ہوئے تھے[2]

اس چہار دیواری پر چھت نہیں تھی۔ دیواریں نو ہاتھ[3] (تقریباً ۵ افٹ) اونچی تھیں۔ چھت

---

[1] اس کو رکن یمانی کہتے ہیں۔ [2] ابن سعد ص ۹۳ ج ۱

[3] السیرۃ الحلبیہ ص ۱۵۲ ج ۱

نہ ہونے کے باعث قیمتی چیزیں چوری ہوجاتی تھیں[1]۔ اس لئے قریش کا منصوبہ تھا کہ عمارت پر چھت ڈال دی جائے۔

ایک واقعہ یہ پیش آگیا کہ کوئی عورت دھونی سلگا رہی تھی کہ اس کی چلمچی میں سے آگ کا پتنگا خانہ کعبہ کے پردہ پر پڑ گیا جس سے تمام پردے جل گئے اور دیواروں میں دراڑیں پڑ گئیں[2]۔

ان کمزور دیواروں پر تازہ حادثہ یہ پیش آیا کہ زور کا سیلاب[3] ان سے ٹکرایا جس نے ان کی جڑیں ہلادیں۔ اب لامحالہ طے کیا گیا کہ اس چاردیواری کو توڑ کر ازسرنو تعمیر کردیں۔ اس منصوبہ کو پورا کرنے کے لئے رقم کی ضرورت تھی، سامانِ عمارت درکار تھا اور کوئی انجینیر بھی ہونا چاہیے تھا۔

عجیب اتفاق ہوا کہ اہل روم کا ایک جہاز[4] جس پر عمارتی سامان لدا ہوا تھا، طوفانی ہواؤں نے اس کو توڑ پھوڑ کر شعیبہ پہونچا دیا۔ جو جدہ سے پہلے مکہ کا بندرگاہ تھا۔ ولید[5] بن مغیرہ (مکہ کا رئیس اعظم) شعیبہ پہونچا اور اس جہاز سے حسب ضرورت تعمیری سامان خرید لیا ان رومیوں کا سردار (جہاز کا کپتان) "باقوم" تھا وہ فن تعمیر سے بھی واقف تھا۔

---

[1] حال میں ابولہب نے سونے کا ہرن چرالیا تھا۔ کتاب المعارف لابن قتیبۃ [2] سیرۃ حلبیہ ص ۱۶۲ ج ۱

[3] سیلاب کو روکنے کے لئے پہاڑوں کے بیچ میں ایک بند زمانہ قدیم سے بنا ہوا تھا۔ یہ سیلاب بند کے اوپر سے دونوں طرف پہاڑوں کو چھوتے ہوئے مکہ میں پہنچا۔ سیرۃ حلبیہ ص ۱۵۲ ج ۱ و بخاری شریف ص ۲۱۵

[4] ایک روایت یہ ہے کہ یہ قیصر یعنی شہنشاہ روم کا جہاز تھا اور اس پر تعمیر میں کام آنے والے قیمتی پتھر رخام اور ساگون وغیرہ کی لکڑی اور لوہا لدا ہوا تھا ص ۳۰۱ ج ۲ البدایہ والنہایہ بحوالہ الاموی [5] ابن سعد ص ۹۳ ج ۱ حضرت خالد انھیں کے نامور فرزند تھے ۱۲

[6] روایت ہے کہ جب دعوتِ اسلام اس کو پہونچی تو وہ مسلمان ہوگیا۔ لاولد تھا۔ انتقال ہوا تو ان کا ترکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سہیل بن عمرو کو دلوایا۔ الاصابہ ص ۱۴۱ ج ۱ و سیرۃ حلبیہ ص ۱۵۶ ج ۱

ولید نے اس سے طے کرلیا کہ وہ اپنی نگرانی میں مناسب نقشہ کے بموجب خانہ کعبہ کی عمارت مکمل کرا دے۔

فراہمی سرمایہ کے متعلق یہ طے کرلیا گیا کہ مقدس عمارت میں مقدس سرمایہ ہی صرف کیا جائے، چندہ ہر ایک سے لیا جائے۔ مگر وہ پاک ہونا چاہیئے۔ چوری، ڈکیتی، غبن، غصب یا حرام فعل (گانے بجانے اور رقص وغیرہ) کی اجرت کا کوئی حبہ بھی اس میں نہ ہونا چاہیئے۔[1]

تقدس اور پاکیزگی کی ان شرطوں کے ساتھ جو رقم فراہم کی گئی وہ اتنی نہیں تھی کہ بنائے ابراہیمی کے بموجب دیواریں کھڑی کر کے اُن پر چھت بھی ڈال دی جائے۔ لہٰذا بجائے مدور و مستطیل عمارت کے مربع عمارت کا نقشہ منظور کیا گیا۔ ایک جانب تقریباً سات[2] ہاتھ کا حصہ جو گولائی لئے ہوئے تھا وہ "کعبہ" سے خارج کیا گیا۔ جنوبی جانب کا ایک کونہ جو کچھ نکلا ہوا تھا اس کو سیدھ میں رکھا گیا۔ دیواریں پہلے نو ہاتھ بلند تھیں اب اٹھارہ[3] ہاتھ (۹ گز) بلند کی گئیں۔ یہ تقریباً ۱۵×۱۵ گز کا طویل وعریض احاطہ۔ اس پر چھت ڈالنے کے لئے دو لینوں میں تین تین ستون کی کھڑی کی گئیں۔ یعنی چھ کھمبوں پر چھت ڈالی گئی[4] چوکھٹ کو زمین سے کافی اونچا رکھا گیا تاکہ لوگ بے دھڑک آسانی سے داخل نہ ہوسکیں جس کو وہ روکنا چاہیں روک سکیں[5]۔

تعمیر سے پہلے تخریب یعنی بوسیدہ دیواروں کو گرانا ضروری تھا۔ لیکن کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ کعبہ کی مقدس دیوار پر کدال چلائے۔ مگر ولید بن مغیرہ نے ہمت کی کہ ہم تخریب اور توہین کی غرض سے نہیں بلکہ تعمیر اور تعظیم کے لئے یہ تخریب کر رہے ہیں۔ لہٰذا خدا کے

---

[1] ابن سعد ص ۹۳ ج ۱ [2] ابن سعد ص ۹۵ ج ۱ بخاری شریف ص ۲۱۵ [3] سیرۃ حلبیہ ص ۱۵۶ ج ۱ پندرہ ہاتھ ابن سعد ص ۹۴ ج ۱ [4] ابن سعد ص ۹۴ ج ۱ بخاری ص ۹۳ سرسید مرحوم نے خطبات احمدیہ میں تین کھمبے غلط لکھے ہیں اور کعبہ کا نقشہ بھی صحیح نہیں دیا [5] ابن سعد ص ۹۵ ج ۱ صرف پیر اور جمعرات کے روز دروازہ کھولا جاتا تھا۔ دربانوں کی کڑی نگرانی رہتی۔ جس کو چاہتے نیچے دھکیل دیتے تھے۔ اس میں لوگ ہلاک بھی ہو جاتے تھے۔ جوتوں سمیت نہیں جاسکتے تھے جوتے سیڑھی کے نیچے رکھ دیتے تھے۔ ابن سعد ص ۹۵ ج ۱

غضب یا کسی دیوتا کی ناراضی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔[۱]

مکہ والوں نے ایک رات انتظار کیا کہ شاید ولید پر کوئی بلا نازل ہو جائے۔ مگر جب ولید بخیریت رہا تو اگلے روز سب شریک ہو گئے۔

بہرحال سابق تعمیر منہدم کی گئی۔ بڑے جوش[۲] سے دوبارہ تعمیر شروع کی گئی۔ عمارت کے چند حصے مقرر کر کے ایک ایک حصہ ایک ایک قبیلہ کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ اس کے لئے پتھر لائیں اور تعمیر کریں اس طرح دیواروں کی تعمیر کے سلسلہ میں تو بحث نہیں ہوئی مگر جب دیوار کعبہ میں "حجر اسود" نصب کرنے کا وقت آیا تو ہر ایک قبیلے کو اپنے مفاخر یاد آئے۔ "ہمارے کارنامے یہ ہیں، لہٰذا ہمیں ہی حق ہے کہ "حجر اسود" نصب کرنے کی تاریخی عظمت حاصل کریں۔

اس پر بحث شروع ہوئی۔ تین چار روز بحث مباحثہ اور پر جوش تقریروں میں صرف ہو گئے مگر گرمی بڑھتی ہی رہی۔ یہاں تک کہ دھمکیوں کی نوبت آ گئی۔ ساتھ ساتھ دھمکیوں کو پورا کرنے کی تیاری بھی ہونے لگی۔ اسلحہ صاف کئے جانے لگے۔ کچھ سمجھ دار لوگ سنبھلے۔ غصہ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو ٹھنڈا کیا۔ اور سنجیدگی سے بات چیت کر کے یہ طے کر دیا کہ معاملہ کسی پنچ کے حوالے کیا جائے۔ مگر لوگوں کے دماغ اس درجہ برافروختہ تھے کہ کسی کے نام پر اتفاق کر لینا ناممکن تھا تو ایک سردار کی یہ تجویز منظور کر لی گئی کہ نام کسی کا نہ لیا جائے بلکہ جو شخص سب سے پہلے "باب بنی شیبہ"[۳] سے آئے وہ ثالث تسلیم کر لیا جائے۔

---

[۱] ابن سعد ص۹۲ و حلبیہ ص۱۵۳ ج۱ [۲] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ابن سعد ص۹۳ ج۱

[۳] اس کو پہلے باب بنی عبد شمس کہا جاتا تھا اور اب اس کو باب السلام کہتے ہیں سیرۃ حلبیہ ص۱۵۶ ج۱ اس زمانہ میں خانہ کعبہ کے گرد میدان تھا۔ پھر مکانات تھے۔ چار دیواری نہیں تھی۔ بخاری شریف ص۵۴۰۔ شہر کی سڑکیں اس میدان پر ختم ہوتی تھیں۔ ان سڑکوں پر پھاٹک بنے ہوئے تھے ان پھاٹکوں کو مسجد حرام کا پھاٹک بھی کہہ دیا جاتا تھا۔ چنانچہ روایتوں میں مختلف الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ کسی روایت میں اسی باب ابی شیبہ کو مسجد کا پھاٹک کہا گیا ہے کسی روایت میں سکّہ کا لفظ آیا ہے (البدایہ والنہایہ) کسی میں فج کا۔ سکہ اور فج کے معنی ہیں راستہ، سڑک۔

ممکن تھا اس آنے والے پر بھی اختلاف ہو جاتا۔ مگر یہ قریش کی خوش نصیبی تھی کہ سب سے پہلے وہ آیا جس کی خوبیوں پر سب کو اتفاق تھا، جس کو سب ہی "الصادق الامین" کہا کرتے تھے۔ چنانچہ جیسے ہی نظریں رُخِ انور پر پڑیں، بے اختیار زبانوں پر آگیا۔

هٰذَا مُحَمَّدٌ هٰذَا اَمِيْنٌ رضينا به

"یہ محمد ہیں ——— یہ صاحبِ امانت ہیں ——— ہم ان کی ثالثی پسند کرتے ہیں اس پر خوش ہیں"۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آگے بڑھے۔ مجمع تک پہنچے۔ پورا ماجرا آپ کو سُنایا گیا اور آپ سے فیصلہ صادر کرنے کی درخواست کی گئی۔ آپ نے واقعہ سُن کر تھوڑی دیر تامل کیا اور پھر ایک چادر منگوائی۔ چادر بچھا کر حجرِ اسود کو اس کے اوپر رکھ دیا اور تمام قبیلوں کے سرپنچ اور شیوخ جو یہاں موجود تھے ان کو بُلا کر ہدایت کی کہ سب مل کر چادر پکڑیں اور حجرِ اسود کو اُٹھا کر دیوارِ کعبہ تک لے چلیں۔ اس صورت میں مساوات اور یکسانیت پائی جا رہی تھی۔ تمام شیوخ راضی ہوگئے۔ پھر جب حجرِ اسود دیوار کے قریب پہنچ گیا تو آپ نے خود اپنے دستِ مبارک سے اُس کو اٹھا کر دیوار میں نصب کر دیا۔

اس طرح ایک نہایت خوفناک جنگ ٹل گئی اور آپس میں غصّہ اور نفرت کے بجائے اتحاد اتفاق اور یک جہتی کے جذبات اُبھر آئے جن کی ہما ہمی میں کعبہ کی باقیماندہ تعمیر مکمل کی گئی ——— ساتھ ساتھ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عزّت و عظمت بدرجہا بڑھ گئی۔

خداپرستی اور معرفتِ حق

خدا کو ایک ماننا اور اس کی عبادت کرنا، عقل سلیم کا تقاضا ہے۔ مگر خداپرستی کے وہ طریقے جن سے انسان روحانی ترقی اور ابدی سکون حاصل کرسکے، انسان اپنی عقل سے نہیں معلوم کرسکتا۔

عقل اُن فیصلوں میں بھی بسا اوقات غلطی کرجاتی ہے جن کا تعلق مشاہدہ سے ہے، انتہا یہ کہ وہ طاقتیں جو انسان کے اندر موجود ہیں اور تندرستی یا بیماری کی وہ کیفیتیں جو جسم انسان میں پائی جاتی ہیں چونکہ اُن کا مشاہدہ نہیں ہوسکتا تو عقل ان کو پوری طرح پہچاننے سے بھی قاصر رہتی ہے اور پہچانتی ہے تو بسا اوقات غلطی کرجاتی ہے۔ انتہا یہ کہ ایکسرے جیسی نظر آنے والی چیز کے بعد بھی ڈاکٹروں کی تشخیص مختلف رہتی ہے جن میں کوئی ایک صحیح ہوتی ہے اور کبھی ایک بھی صحیح نہیں ہوتی۔ پس وہ معاملات جن کا تعلق ان حقیقتوں سے ہے جن تک مشاہدہ کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ نہ اُن کے تجربہ کی کوئی صورت ممکن ہے۔ اُن کے بارہ میں عقل کے فیصلوں پر وہی شخص اعتماد کرسکتا ہے جو انصاف جیسی نعمت سے محروم ہو یا موجودہ زندگی کے فلسفہ اور فکر مستقبل سے غافل اور لاپرواہ ہو۔ مگر وہ صاحب فہم و فراست جو دیکھتا ہے کہ ہر ایک فعل کی ایک تاثیر ہے اور یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ معمولی کمی بیشی سے تاثیروں میں بے انتہا فرق آجاتا ہے۔ اگر صحیح توازن قائم رہے تو انسان ایٹم بم اور راکٹ تک بناسکتا ہے اور چاند تاروں تک پہنچ سکتا ہے لیکن توازن میں کچھ بھی فرق آجائے تو ساری محنت رائیگاں اور دولت برباد ہوتی ہے۔ وہ ہرگز جرأت نہیں کرسکتا کہ مشاہدہ سے بالا چیزوں کے بارہ میں عقلی فیصلوں پر اعتماد کرلے۔ وہ لامحالہ کسی ایسے مخبر اور ایسے رہنما کی تلاش کرے گا اور اس کی جستجو میں بے چین اور مضطرب رہیگا جو انسانی زندگی کے منتہا اور انجام کی صحیح خبر دے سکے۔ اور وہ متوازن چیزیں بتاسکے جن سے روحانی صحت اور ترقی حاصل ہو اور ابدی

سکون میسّر آئے ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت سلیم نے آپ کو ایک خدا کی یاد پر آمادہ کیا ۔ اس کا شوق پیدا ہوا ۔ ایک طرف قومی زندگی میں آپ وہ اعتماد حاصل کرتے رہے کہ آپ کو "الصادق الامین" کا خطاب دیا گیا ۔ دوسری جانب یادِ خدا کا شوق اتنا ہی بڑھتا رہا۔ یادِ خدا کے شوق کے ساتھ لامحالہ نوع انسان کی اصلاح و ترقی کے سوالات بھی آپ کے سامنے آتے رہے ۔

★ یہ اصلاح و ترقی صرف مادیات تک ہو یا اس کا تعلق روحانیت سے بھی ہو ؟

★ انسانی زندگی . صرف اسی ظاہری زندگی تک ہے یا اس کے بعد بھی اس کا تعلق ہے ؟

★ اگر انسان مرنے کے بعد بھی ایک وجود رکھتا ہے تو اس کی فلاح و بہبود کس طرح ہو سکتی ہے ؟

★ اصلاح کا وہ طریقہ کیا ہو کہ انسان اس زندگی میں بھی امن و سکون اور ترقی سے ہمکنار ہو اور اس کے بعد کی زندگی بھی ایک خوشگوار زندگی ہو اور اس طرح یہ اصلاح مکمل اصلاح ہو ۔

یہ وہ سوالات[1] تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب حساس میں خلش پیدا کرنے

---

[1] نبی اور ولی صوفی یا راہب اور سادھو میں یہ فرق ہے کہ ولی یا صوفی کے غور و فکر کا دائرہ یادِ خدا کی حد تک محدود رہتا ہے وہ نوع انسان کی فکر میں پڑے تو یادِ خدا کے شغل میں کمی آجائے ۔ اس کا ظرف تنگ ہوتا ہے۔ اس میں یادِ خدا اور فکر نوع انسان دونوں کی یکساں گنجائش نہیں ہوتی ۔ مگر نبی اور رسول کا ظرف اتنا وسیع ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت دونوں کی یکساں گنجائش رکھتا ہے نبی جیسی وسعت ظرف تو نبی کی خصوصیت ہے البتہ اگر کسی ولی کو کسی درجہ پر یہ وسعتِ ظرف حاصل ہو جائے کہ وہ یادِ خدا کے ساتھ نوع انسان کے مسائل پر غور کر سکے اور ان میں عملاً دلچسپی لے سکے تو ایسی ولایت کو ولایت نبوت کہا جاتا ہے اور ایسے علماء کو جو اس وسعت ظرف کے مالک ہوں' وارث انبیاء قرار دیا جاتا ہے ۔ یہ خصوصیت (باقی صفحہ پر)

کرنے لگے اور اُن کی خلش یہاں تک بڑھی کہ آپ کو اس غور و فکر میں لطف آنے لگا۔ گویا یہی غور و خوض، فکر و مراقبہ، آپ کی حیات مقدسہ کا جوہر بن گیا اور چونکہ شہری زندگی اس میں بارج تھی تو آپ کو تنہائی پسند آنے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ دلبستگی یہاں تک بڑھی کہ آپ شہر سے باہر پہاڑ کی ایک کھو میں رہنے لگے۔

حرا پہاڑ کا چار گز لانبا اور پونے دو گز چوڑا غار جہاں سے "کعبہ مکرمہ" بھی نظر آتا رہتا ہے اب بھی موجود ہے۔ یہ مکہ شہر سے تقریباً تین میل ہے۔ راستہ اتنا دشوار کہ یہ تین میل تیس میل سے بھی زیادہ کٹھن پڑتے ہیں۔ طاقتور نوجوان بھی وہاں پہونچتے پہونچتے تھک جاتے ہیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عادت بنالی تھی کہ پانی اور ستّو ساتھ لیتے اور اس غار میں پہونچ جاتے اور جب تک پھر ضرورت نہ ہوتی آپ وہیں یادِ خدا، غور و فکر اور مراقبہ میں مشغول رہتے۔

رفیقہ حیات حضرت خدیجہ (رضی اللہ عنہا) بھی پوری وفاداری اور دل سوزی سے حق رفاقت ادا کرتی رہیں وہ پانی اور ستّو کا ایک اندازہ رکھتیں اور جب اُن کے اندازہ سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی واپسی میں تاخیر ہوتی تو وہ خود پانی اور ستّو لیکر اس غار پر پہونچ جاتیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) صرف نبی کو حاصل ہوتی ہے کہ ایک طرف اس کی شان یہ ہو کہ تنام عینی ولا ینام قلبی۔ نیند کے وقت میری آنکھیں ضرور بند ہو جاتی ہیں مگر قلب کی بیداری میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اور دوسری جانب اُس کی یہ شان ہو کہ ہر لاچار و بے بس کا پدر مشفق، ہر بے پناہ کا پشت پناہ، مظلوموں کا زیادرس حقوق انسانی کا محافظ، دستور و آئین مملکت کے لئے بہترین مقنن، قومی اور بین الاقوامی سیاست کا مفکر اعظم اور اس دریا کا بہترین تیراک، میدان جنگ کا فیلڈ مارشل اور فوجی قوانین کا اعلیٰ ترین مصلح۔ یہ وسعت ظرف صرف رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھی اور نبی کی پرچھائیں صحابۂ کرام پر پڑی تھی کہ وہ بھی ان اوصاف کے جامع ہو گئے تھے (رضی اللہ عنہم اجمعین) انبیاء علیہم السّلام کے آپس میں معیارِ فضیلت یہی خصوصیتیں ہیں جو ان خصوصیات میں سب سے ممتاز ہوگا اس کا درجہ بھی سب سے بلند ہوگا۔ صَلَوٰاتُ اللّٰہِ عَلَیْہِمْ اَجْمَعِیْنَ۔

آخر میں چھ[1] ماہ ایسے گذرے کہ آپ کو عجیب وغریب خوابیں آتی تھیں اور وہ اپنی تعبیر میں ایسی ہی سچی ہوتی تھیں جیسے سپیدۂ صبح طلوع آفتاب کی پیشین گوئی میں صادق ہوتا ہے۔ پھر آفتاب طلوع ہوتا ہے تو آفتاب آمد دلیل آفتاب، بقول سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب بھی گویا سپیدۂ صبح ہوتا تھا جس کے بعد آفتاب تعبیر کی درخشانی لازمی[2] ہوتی تھی۔

---

[1] یعنی نبوت سے چھ ماہ پہلے

[2] بخاری شریف والبدایۃ والنہایۃ وغیرہما

نبوّت

آپ اسی غار میں تھے کہ ایک وجود نمودار ہوا۔ اس سے گھبراہٹ نہیں ہوئی۔ بلکہ دل کو سکون ہوا، جیسے سوکھے ہونٹوں کو ٹھنڈا پانی مل گیا۔

اُس نے فرمائش کی: اِقْرَأْ "پڑھو"۔

حضرت محمدؐ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ آپ نے عذر پیش کر دیا۔ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس وجود نے دوبارہ یہی کہا: اِقْرَأْ "پڑھو"۔ اس مرتبہ بھی حضرت محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وہی عذر تھا۔ اس وجود نے تیسری مرتبہ یہی کہا۔ اس مرتبہ جواب میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: کیا پڑھوں۔ اس وجود نے یہ آیتیں پڑھوائیں:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝
اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝

(العلق ۹۶)

ترجمہ: "پڑھ[1] اپنے رب کے نام سے، جس نے (ساری مخلوق کو) پیدا کیا۔ بنایا انسان کو لہو کی پھٹکی (جمے ہوئے خون) سے پڑھ اور تیرا رب بڑا

---

[1] یہ آیت ۶۱۲ء میں نازل ہوئی، یعنی ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں جو یورپ کے قرون وسطیٰ کا تاریک ترین زمانہ تھا جب مغربی یورپ پر جہالت کی گہری گھٹا چھائی ہوئی تھی، مشرقی یورپ میں کچھ تعلیم کا چرچا تھا تو اس کو کلیسا نے اپنی مخصوص جائداد سمجھ رکھا تھا کسی کی کیا مجال تھی کہ دست درازی کر سکے۔ ہندوستان میں جو کچھ علم تھا وہ چند گھرانوں کی ملک تھا۔ کسی غیر تک اگر بھنک پہونچ جاتی تو اس کے کان میں سیسہ پلا دیا جاتا تھا۔ انصاف پسندوں کو اس سے سبق لینا اور مسلمانوں کو گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہیے کیا واقعی ہم علم کے دلدادہ ہیں۔

کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے ۔ سکھایا آدمی کو جو نہ جانتا تھا۔"

آپ نے یہ آیتیں پڑھیں۔ آیتیں ذہن نشین ہوگئیں۔ مگر ساتھ ساتھ ذمہ داری کا احساس بھی ہوا۔ ایک طرف اپنی عاجزی کا غیر معمولی احساس تھا۔ آپ کی خصوصیت[1] یہ تھی کہ اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتے تھے ہیچ در ہیچ سمجھتے تھے۔ دوسری طرف اتنی بڑی ذمہ داری، اور ایسی ذمہ داری جس کا

---

[1] انسان کا دوسرا نام ہے "عبد" (بندہ) چونکہ انسان اپنے خالق کا مخلوق اور بندہ ہے اور یہی اُس کی حقیقت ہے تو جو نام اُس کی فطرت کے مطابق ہے وہ "عبد" ہے اور فطرت عبد کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے جذبات اور اُس کا ہر ایک عمل اور کردار عبدیت اور نیاز مندی کے سانچہ میں ڈھلا ہوا ہو۔ اس بنا پر عبدیت (بندگی اور نیازمندی کو عبد (بندہ) کا سب سے اعلیٰ کمال سمجھا جاتا ہے، کیونکہ جس درجہ معبود کی عظمت کا احساس ہوگا، اتنا ہی اپنی عبدیت اور نیازمندی کا احساس ہوگا اور جو معرفت الٰہی اور خدا شناسی میں کامل و مکمل ہوگا وہ اپنی بندگی نیازمندی، ہیچ در ہیچ اور بے حقیقت ہونے کے احساس میں بھی سب سے بڑھا ہوا اور کامل و مکمل ہوگا۔ یہ عبدیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص صفت اور ایسی محبوب و مقبول خصلت ہے کہ حیات مبارکہ کے وہ تمام واقعات جو روحانیت، روحانی عروج یا وحی اور تنزیل کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں ان میں آپ کے لئے (صلی اللہ علیہ وسلم لفظ عبد ہی لایا گیا ہے اور آپ کو "عبدؐ" ہی سے تعبیر کیا گیا ہے مثلاً سورہ اقرأ جس سے وحی کا آغاز ہوا، اس میں ہے اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی ۙ عَبْدًا اِذَا صَلّٰی ؕ نزول قرآن کے سلسلہ میں ہے تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ (الفرقان) سورۂ کہف میں ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتٰبَ ۔ اعجاز قرآن کے سلسلہ میں ارشادِ ربانی ہے وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا جنات نے قرآن شریف سنا وہ ایمان لائے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ربانی ہے وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ ۔ الآیۃ (سورہ جن) اسراء جو حیات مقدسہ کی سب سے زیادہ ممتاز مخصوص شان ہے، وہاں ارشاد ہوا اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا ۔ معراج میں دیدار باری اور مکالمہ ربانی کا شرف حاصل ہوا تو اسکا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہے فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰی ؕ (نجم) جو کلمہ مدار ایمان قرار دیا گیا ہے اس میں ہے: (باقی صفحہ ۵۹ پر

کوئی تجربہ اب تک نہیں تھا۔ یعنی بھٹکی ہوئی مخلوق کو پڑھنے پڑھانے، تعلیم دینے[1] اور سدھانے کی ذمہ داری۔ اور ایسی صورت سے جو بالکل اجنبی صورت تھی، جس کا کبھی وہم وگمان بھی نہیں آیا تھا۔ نہ کسی سے ایسی باتیں سنی تھیں۔ اس طرح کے خیالات اور غیر معمولی احساس کا اثر یہ ہوا کہ دل کانپنے لگا۔ آپ مکان پر پہنچے تو لرزہ جیسی کیفیت تھی۔ آپ نے رفیقۂ حیات (حضرت خدیجہؓ) سے کہا:

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔

بس یہ عبدیت ہی کا ظہور تھا کہ سب کچھ اور سب سے افضل ہونے کے باوجود آپ اپنے آپ کو ہیچ در ہیچ اور ایسا بے حقیقت سمجھ رہے تھے کہ بارِ امانت کے تصوّر سے بھی قلب مبارک لرز گیا اور ایسا لرزا کہ پورے جسم مبارک کو لرزا دیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت ملائکہ کے مقابلہ میں علم سے ہوئی اور شیطان کے مقابلہ میں عبدیت سے۔ شیطان سے باز پرس ہوئی کہ سجدہ کیوں نہیں کیا۔ تو یہ اس کی خود بینی اور خود پرستی تھی کہ اس نے دعویٰ کیا اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ۔ حضرت آدم علیہ السلام بھی اپنے فعل کی توجیہ کر سکتے تھے مگر حضرت آدم علیہ السلام نے عجز و تواضع اور نیازمندی پیش کرتے ہوئے اعتراف کر لیا رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا "اے ہمارے رب بلاشبہ ہم نے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے" یعنی اپنے قصور اور ظلم کا اعتراف بھی ہے اور یہ بھی اعتراف ہے کہ اس ظلم پر پردہ ڈالنے والا تیرے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ بس یہ نیازمندی اور عبدیت تھی جس نے شیطان کے مقابلہ میں حضرت آدمؑ کو مقبول بارگاہ حضرت حق بنایا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[1] اور اس امانت کی ذمہ داری جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ (سورہ احزاب آخری رکوع) ترجمہ:

"ہم نے پیش کی امانت آسمانوں کے سامنے، زمین کے سامنے، پہاڑوں کے سامنے۔ ان سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے خوف کھا گئے اور اٹھا لیا اس کو انسان نے۔"

میرے اوپر کپڑا ڈال دو۔[1]

حضرت خدیجہؓ نے بلائیں لیں، پوچھا کیا بات ہے؟ طبیعت کو سکون ہوا تو آپؐ نے پورا قصہ سنایا۔ اور یہ بھی فرمایا۔ مجھے اپنی جان کا ڈر ہے (ایسی بڑی ذمہ داری کس طرح اٹھا سکوں گا)۔

حضرت خدیجہؓ سمجھدار خاتون تھیں۔ حضرت محمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جس طرح پندرہ سال سے دیکھ رہی تھیں۔ اُن کو یقین تھا کہ اس غیر معمولی شخص کے لئے کوئی غیر معمولی صورت نمودار ہوگی جس کی شان نرالی ہوگی۔

حضرت خدیجہؓ نے پورا واقعہ سنا، پھر وہ آیتیں سنیں جن میں اس طرف اشارہ تھا کہ خدا رقادر جو خون کے لوتھڑے سے جیتا جاگتا انسان بناتا ہے۔ قلم کے ذریعہ لکھنا پڑھنا سکھاتا ہے۔ انسان کو وہ باتیں بتاتا ہے جن کو وہ خود اپنے ذہن سے نہیں معلوم کر سکتا تھا، وہ خدا رقادر کسی اُستاد یا قلم کی مدد کے بغیر محض اپنی قدرت سے علم کے دروازے آپؐ پر کھول دیگا۔

یہ آیتیں سُن کر حضرت خدیجہ (رضؓ) کو یقین ہو گیا کہ جس غیر معمولی صورت کی توقع تھی وہ سامنے آگئی ہے۔

وہ اس واقعہ کے متعلق کوئی فیصلہ تو نہیں کر سکیں۔ البتہ حضرت محمدؐ نے جو خطرہ ظاہر کیا تھا کہ ان ذمہ داریوں کے بوجھ سے میری جان جاتی رہے گی حضرت خدیجہؓ نے اس کا اطمینان دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ کی زندگی کا مرقع پیش کر کے بہت لطیف پیرایہ میں اطمینان دلایا کہ آپ یہ بار اُٹھا سکیں گے، کیونکہ اب تک کی زندگی میں

---

[1] خود قرآن پاک کی عظمت اور اس کا وقار ایک با احساس کو لرزہ براندام کرنے کے لئے کافی ہے۔ ارشاد ربّانی ہے لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ الخ۔ "اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تو دیکھتا کہ وہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا۔" (سورۂ حشر آخری رکوع پ۲۸)

جو بوجھ اٹھاتے رہے ہیں وہ کم نہیں ہیں، وہ بھی غیر معمولی ہیں۔ پس اگر کوئی اس سے بھی بڑی ذمہ داری آپ پر پڑے گی آپ اُس کو بھی اُٹھا سکیں گے۔

حضرت خدیجہؓ نے اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا: کَلَّا وَاللّٰہِ لَا یُخْزِیْكَ اللّٰہُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْکَلَّ وَتَکْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِی الضَّیْفَ وَتُعِیْنُ عَلٰی نَوَائِبِ الْحَقِّ۔ (بخاری شریف صفحہ ۳)

ترجمہ:۔ "خدا شاہد ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ناکام کر دے۔ آپ کی مدد نہ کرے۔ آپ رشتہ داروں کا خیال رکھتے ہیں اُن کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ ہارے، تھکے، درماندہ مسافروں کے لئے سواری کا انتظام کرتے ہیں، اُن کو منزل تک پہنچاتے ہیں۔ آپ ایسے احسانات کرتے ہیں اور ایسی خدمات انجام دیتے ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی، جو دوسری جگہ قطعاً نایاب ہیں۔ باہر کے مسافر جو بے ٹھکانا ہوتے ہیں آپ ان کو اپنا مہمان بناتے ہیں۔ برپا ہونے والے ہنگاموں اور ناگہانی حوادث میں آپ حق کی حمایت کرتے ہیں۔"

حضرت خدیجہؓ نے اس طرح تسلّی دی۔ لیکن یہ اُن کی رائے اور اُن کا اپنا اعتقاد تھا کہ جو اس طرح صاحب خیر ہو، خدا کی طرف سے اس کی مدد ہوگی۔ اس کو ذلیل و رسوا اور ناکام نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اس طرح کے معاملہ کی حقیقت وہ بھی نہیں جانتی تھیں کیونکہ نبوت اور الہام کی باتوں سے وہ بھی واقف نہیں تھیں۔ اُن کو ایک شخص کا خیال آیا۔ یہ حضرت خدیجہؓ کے ہم جد تھے، رشتہ کے بھائی ہوتے تھے، عیسائی مذہب اختیار کئے ہوئے تھے۔ عالم فاضل تھے، نبوت اور الہام کی باتیں جانتے تھے، عبرانی زبان پر اُن کو عبور تھا، عبرانی کی اصل انجیل کا مطالعہ کیا کرتے تھے، عربی میں اس کا ترجمہ بھی کیا کرتے تھے۔ اب بہت بوڑھے تھے۔ بصارت سے بھی معذور ہو چکے تھے۔ مگر لوگ اُن کی قدر کرتے تھے۔ اُن کا نام ورقہ تھا۔

ولدیت نوفل۔

حضرت خدیجہؓ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ساتھ لے کر اُن کے یہاں پہونچیں اور کہا: آپ کے برادرزادے (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو عجیب صورت پیش آئی ہے۔ یہ خود ہی بیان کریں گے۔ آپ غور سے سنئے اور رائے دیجئے۔

حضرت محمدؐ (صلّی اللہ علیہ وسلم) نے پُورا واقعہ بیان کیا۔

ورقہ نے جیسے ہی سُنا برجستہ جواب دیا:

یہ تو وہی ناموس[۱] (فرشتہ) ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام پر نازل فرمایا تھا۔

ورقہ نے کہا: میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ کاش میں جوان ہوتا، کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپؐ کی قوم آپ کو نکالے گی۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سنا کہ قوم اُن کو نکالے گی تو بہت تعجب ہوا۔ یہ قوم جو یہاں تک گرویدہ ہے کہ عقیدت اور احترام میں نام لینا بے ادبی سمجھتی ہے، مجھ سے دعائیں کراتی ہے اور بڑے معاملات کا فیصلہ کرنا میرے حوالے کردیتی ہے، کیا وہ ایسی آنکھیں پھیر لے گی کہ مجھے مکہ سے نکال دے گی۔

حضرت محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے محبوب رہنما کے لئے یہ بہت ہی عجیب بات تھی۔ آپؐ نے تعجب سے دریافت کیا: کیا میری قوم مجھے نکالے گی؟

ورقہ! بیشک آپ کو نکالے گی اور یہ انوکھی بات نہیں ہے جو شخص بھی ایسی بات پیش کرتا ہے جو آپ پیش کرنے والے ہیں، اُس کے ساتھ قوم کا برتاؤ یہی ہوا کرتا ہے کاش میرے سامنے وہ دن آئے تو میں آپ کی پُوری پُوری مدد کروں۔

ورقہ تو زندہ نہیں رہے۔ کچھ دنوں بعد اُن کی وفات ہوگئی، مگر جو بات انھوں نے کہی تھی، وہ پُوری ہوئی۔ (تفصیل آگے آئے گی۔)

---

[۱] رازدار فرشتہ فتح الباری

یہ تھا نبوت کا آغاز۔ اور یہ تھی وحی کی ابتدا جس میں پڑھنے پڑھانے، علم اور قلم کا تذکرہ اور عالمانہ زندگی کی ترغیب ہے۔ (واللہ اعلم) ابتدائی ظہور کے بعد یہ سلسلہ کچھ عرصہ کیلئے بند ہو گیا۔

ذوق وشوق

کہتے ہیں عشق برق خرمن سوز ہوتا ہے جو اپنے سوا رستاع ہستی کی ہر ایک نمود کو ختم کر دیتا ہے۔ رہتا ہے تو صرف عشق ۔ مگر محبوب کی طرح محبوب۔ درد ہے مگر رگِ جاں سے زیادہ عزیز۔ عاشق کی تمنا یہی رہتی ہے کہ یہ درد بڑھے، وہ اپنے خاتمہ کی تمنا کر سکتا ہے مگر خاتمہ عشق کا نام بھی زبان پر نہیں لاسکتا۔ کچھ ایسی ہی صورت یہاں بھی ہوئی۔ جس کیفیت کا ایک اثر یہ تھا کہ قلبِ مبارک لرزنے لگا۔ اُسی کا دوسرا اثر یہ تھا کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تمنا یہ ہوگئی کہ وہ کیفیت پھر میسّر آئے۔ اس کا شوق یہاں تک بڑھا کہ آپ اس کے بغیر اپنی زندگی بیکار سمجھنے لگے۔ جب اس شوق کا غلبہ ہوتا تو آپ چاہتے کہ کسی پہاڑ کی چوٹی سے اپنے آپ کو گرا کر ختم کر دیں[1]۔ لیکن رحمتِ حق دستگیری کرتی۔ بہرحال جس قدرت نے آپ کو خاص مقصد کے لئے پیدا کیا تھا وہی رہنما بنی۔ اور کچھ عرصہ توقف کے بعد سلسلۂ وحی شروع ہو گیا۔ یعنی ذوق وشوق، ذکر و فکر اور مراقبہ کا ضروری کورس پورا ہو گیا تو وحیٔ الٰہی کی بارش ہونے لگی جو مسلسل اکیس[2] برس تک ہوتی رہی۔

---

[1] بخاری شریف صفحہ ۱۰۳۴

تبلیغ اور دعوتِ عام سے پہلے تربیت

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چالیس سالہ مثالی زندگی نے آپ کو الصادق اور الامین اور ایسا محبوب رہنما بنا دیا تھا جس کے اعلیٰ اخلاق اور بہترین کردار پر مکہ کے ہر ایک چھوٹے بڑے کو پورا اعتماد تھا۔ مگر ان اعلیٰ اخلاق کے باوجود منصب نبوت کے فرائض اور اداء فرائض کے طریقوں سے آپ قطعًا ناواقف تھے۔ قرآن مجید نے آپ کی شان یہ بیان کی ہے۔

(الف) نہ آپ لکھ سکتے تھے، نہ لکھا ہوا پڑھ سکتے تھے، نہ آپ نے کہیں تعلیم پائی تھی[1]

نہ آپ شاعر تھے، نہ ادیب کی حیثیت سے آپ کی شہرت تھی[2] نہ آپ کاہن یا نجوم داں تھے[3] نہ سابق مذہبوں سے آپ کو واقفیت تھی[4] نہ آپ یہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے، آسمانی کتاب کیا ہوتی ہے[5] نہ آپ کو کبھی یہ خیال آیا تھا کہ آپ پر کوئی کتاب نازل ہوگی[6] نہ اس شہر میں جہاں آپ پلے تھے، بڑھے تھے، نبوت یا رسالت کا چرچا تھا انتہا یہ کہ وہ قوم جس کے آپ فرد تھے اُمی تھی، یعنی نبوت سے نا آشنا کیونکہ اس میں کوئی نبی نہیں ہوا تھا حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا نام سُنا تھا مگر ان کی تعلیمات فراموش ہو چکی تھیں صرف دھندلے سے نشان باقی تھے۔ لیکن اب آپ پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ ایسی قوم میں مکمل انقلاب برپا کریں جو اگرچہ گمراہ ہے مگر اپنے آپ کو تمام دنیا کی قوموں میں سب سے بہتر اور برتر سمجھتی ہے اور یقین رکھتی ہے کہ حق وہی ہے جس پر وہ قائم ہے[7]۔ اور اس انقلاب کا آغاز خاص اس گروہ سے کریں جس کو صرف اس کا یقین ہے کہ وہ حق پر ہے بلکہ یہ فخر بھی ہے

---

[1] سورہ عنکبوت ۲۹ آیت ۴۸ [2] سورہ یٰسین ۳۶ آیت ۶۹ [3] سورہ الحاقہ ۶۹ آیت ۴۱ و ۴۲

[4] سورہ قصص ۲۸ آیت ۴۴ تا ۴۶ [5] سورہ شوریٰ ۴۲ آیت ۵۲ [6] سورہ قصص ۲۸ آیت ۸۶

[7] سورہ ۸ الانفال آیت ۳۲ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ

کہ وہ اپنے مذہب میں نہایت پختہ اور کٹر ہیں[1]۔ اس قوم (عرب) سے متصل ایک طرف ایران، عراق، فارس اور ان سے متصل ہندوستان ہے۔ ان کے مذہب اگرچہ مختلف ہیں مگر پرستش غیر اللہ (شرک) میں سب شریک ہیں۔ کوئی بت پرست ہے، کوئی کواکب پرست، کوئی عجائب پرست، ہر ایک کے پاس ایک فلسفہ ہے اور ہر ایک کو اپنی روایات، اپنے تمدن، اپنی عقل و دانش اور اپنے فلسفہ پر ناز ہے۔

دوسری طرف شام، مصر، افریقہ، اور یورپ کے علاقوں میں بازنطینی شہنشاہیت کے پرچم لہرا رہے ہیں۔ اور اگرچہ آج (بیسویں صدی عیسوی میں) چھٹی ساتویں صدی عیسوی کے دور کو قرونِ وسطیٰ کا پس ماندہ غیر مہذب اور غیر ترقی یافتہ۔ تاریک ترین دور کہا جاتا ہے، مگر یہی علاقے ہیں جہاں رومۃ الکبریٰ کا مشہور قانون (رومن لا) جاری ہے اور اسی علاقہ میں سقراط، بقراط، ارسطو، افلاطون، فیثاغورث جیسے باکمال فلاسفہ اور موجد گذر چکے ہیں جن کے فلسفہ کو آج بیسویں صدی میں بھی زندہ فلسفہ کہا جاتا ہے۔

پچھڑے ہوئے[2] اور پس ماندہ عرب کا ایک "اُمی" ان تمام علاقوں اور ان میں بسنے والے انسانوں یعنی پورے نوع بشر کے لئے ہادی اور رہنما بنایا جا رہا ہے۔ منصب رسالت اس کے سپرد ہونے والا ہے تو اس سے پہلے کہ وہ دوسروں کو دعوت دے ضروری ہے کہ جن باتوں کی وہ دعوت دے ان کا نمونہ وہ خود بن جائے[3]۔ چنانچہ نبوت کے بعد کم و بیش تین سال ایسے گذرے جن میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عام دعوت و تبلیغ کا حکم نہیں تھا، ہاں کچھ سعادت مند

---

[1] اپنے آپ کو وہ احمس یا حمس کہتے تھے یعنی اپنے مذہب میں کٹر اور نہایت پختہ [2] قبیلۂ قریش اور ثقیف وغیرہ چند قبائل اگرچہ متمدن تھے مگر عرب قوم متمدن نہیں تھی، اس کی بڑی تعداد بادیہ نشین صحرا نورد تھی۔ محمد میاں [3] تاکہ مقصد رسالت پورا ہو، کیونکہ نبوت اور رسالت اس لئے نہیں کہ پیغام پہنچا دیا جائے بلکہ بشر کو نبی یا رسول بنانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ نوع بشر کے سامنے عملی نمونہ بھی پیش کیا جائے (دیکھو سورۂ الانعام آیت ۷ تا ۱۰)

وہ تھے جنھوں نے مُشک کی خوشبو خود سونگھ لی اور وہ خود ہی اس شمع کے پروانے بن گئے۔ ان میں سب سے پہلے یہ حضرات ہیں: ابوبکر، خدیجہ، علی، زید بن حارثہ اور اُم ایمن (رضی اللہ عنہم اجمعین) یہ تعداد میں صرف پانچ ہیں۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ ان کا تعلق آزاد، غلام، مرد، عورت بچے۔ یعنی نوع انسان کے ہر طبقہ سے ہے۔

آزاد مردوں میں ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ)

آزاد عورتوں میں خدیجہ (رضی اللہ عنہا)

بچوں میں (حضرت علی (رضی اللہ عنہ وکرم وجہہٗ)

آزاد کردہ غلاموں میں زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) (جو اس وقت زید بن محمد کہلاتے تھے)

آزاد کردہ باندیوں میں ام ایمن (رضی اللہ عنہا) جو بچپن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ماما (خادمہ) تھیں۔

ان حضرات نے کبھی ابھی تبلیغ شروع نہیں کی۔ لیکن اچھا خربوزہ اگر اس کی پود ٹھیک ہو تو وہ دوسرے خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑ لیتا ہے۔ پس کچھ اور افراد جن کے کردار نے مستقبل میں ثابت کر دیا کہ وہ بہترین انسان اور پورے سماج کے قیمتی جواہر تھے، وہ خود متاثر ہوئے اور دعوتِ عام سے پہلے آغوشِ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اُن کے اسماء گرامی یہ ہیں (اُن کے پُر تقدس کارنامے تاریخ عالم کے سینے پر نقش ہیں جو شہادت دے رہے ہیں کہ یہ حضرات کس درجہ صداقت پسند، حق گو، دلیر اور بہادر تھے اور اسی لئے وہ سب سے پہلے الصادق الامین اور اس کے پیغام کے گرویدہ ہو گئے تھے):

عثمان بن عفان، طلحہ بن عبید اللہ، زبیر بن عوام، سعد بن ابی وقاص، عثمان بن مظعون، ابو عبیدہ بن الجراح، عبدالرحمن بن عوف، ابو سلمہ بن عبد الاسد، ارقم بن ابی ارقم[1] (رضی اللہ عنہم اجمعین) تعلیم و تربیت کے اس بنیادی دور میں ان کی تربیت بھی ہوتی رہی۔

---

[1] البدایہ والنہایہ صفحہ ۳

نصاب اور طریقہ تربیت

قرآن پاک کی وہ سورتیں جو ''ابتداء'' میں نازل ہوئیں انہیں کو نصاب کہا جاسکتا ہے ان سورتوں میں عقائد و نظریات کی بھی تعلیم دی گئی ہے اور طریقہ تربیت بھی بتایا گیا ہے۔ عجیب بات جو ایک طالبِ حق کو مطمئن اور گرویدہ بنا دیتی ہے یہ ہے کہ جن عقائد و نظریات کی تعلیم ابتداء میں دی گئی، باقی ۲۲ سالہ زندگی میں ان کی ہی تشریح اور توضیح ہوتی رہی۔ ترمیم کسی ایک میں بھی نہیں ہوئی۔ بنیادی تعلیمات درج ذیل ہیں۔ آیتوں اور سورتوں کے نمبر حاشیہ میں لکھ دیئے گئے ہیں۔

★ پوری کائنات کا ایک خالق ہے جسکی سب سے نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ رب العالمین اور ارحم الراحمین ہے (یعنی مخلوقات کے جس قدر طبقات اور درجات کائنات عالم میں ہیں، وہ اُن کا پیدا کرنے والا اور پالنے والا ہے۔ اس نے ہر مخلوق کی ایک فطرت بنائی اور اس فطرت کے بموجب نشوونما، بقاو تحفظ، تدریجی ترقی اور درجۂ کمال تک پہونچنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت تھی اس کی رحمت نے اُن کو مہیا کیا اور برابر مہیا کرتی رہتی ہے) تمام جہانوں کا رب اور سب پر رحم کرنے والا وہی ہے۔ تمام کمالات اسی کو حاصل ہیں۔ تمام تعریفوں کا وہی مستحق ہے۔[1]

★ مشرق و مغرب کا رب وہی ہے۔ وہی معبود ہے۔ اس کے سوا، اور کوئی پرستش کے قابل نہیں ہے۔[2]

★ اُس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ اس کو دولتِ علم سے نوازا اور ترقی کے راستہ پر لگایا۔[3]

---

[1] اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ سورہ ۱ آیت ۱ و ۲ [2] سورہ مزمل ۷۳ آیت ۹

[3] سورۂ علق ۹۶ آیت ۲ و ۴

★ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ قلم اور لکھنے پڑھنے کے ذریعہ تعلیم کا طریقہ اسی نے بتایا[1] وہ اس ذریعہ کے بغیر بھی جس کو چاہے عالم و فاضل اور سرتاج فضلاء بنا سکتا ہے۔

★ وہ ایک ہے، یکتا ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں، سب اُس کے محتاج ہیں۔ نہ اُس کے اولاد ہے، نہ وہ کسی کی اولاد ہے، اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے[2]

★ انسان کا ہر ایک عمل اچھا ہو یا بُرا ایک حقیقت ہے۔ ہر ایک عمل اپنا اثر رکھتا ہے۔ انسان اپنے اعمال کے جال میں اس طرح پھنس جاتا ہے جیسے کوئی قیدی[3]

★ کوئی شخص کسی کا گناہ اپنے اوپر نہیں لے سکتا، کسی پر دوسرے کا گناہ نہیں ڈالا جا سکتا، ہر شخص اپنا اور اپنے فعل کا ذمہ دار ہے۔ انسان کو صرف وہی ملتا ہے جو اُس نے کمایا۔ انسان جو کچھ کماتا ہے وہ اُس کے سامنے آئے گا[4]

★ ایک خاص دن ہوگا جس میں انسان کے تمام اعمال کا حساب اور ہر معاملہ کا انصاف ہوگا[5]

★ خدا کی مخلوق صرف وہی نہیں ہے جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مخلوق ہے۔ ایک خاص مخلوق وہ ہے جس کو فرشتہ کہا جاتا ہے۔ اُن کی تعداد کا علم صرف اُن کے خالق "اللہ رب العالمین ہی کو ہے[6] وہ خدا کے حکم کے سوا کچھ نہیں کر سکتے[7] ان کی زندگی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل اور خدا کی حمد و ثنا کرتے رہتے ہیں۔ وہ خدا کے حکم سے انسانوں پر خدا کی نعمتیں بھی نازل کرتے ہیں۔ اور خدا کے حکم سے خدا کا قہر بھی بندوں پر اتارتے ہیں[8]

★ اللہ تعالیٰ انسانوں کی صحیح رہنمائی کے لئے نبی اور رسول بھیجتا ہے[9] نبی اپنی طرف

---

[1] سورہ علق ۹۶ آیت ۴ [2] سورہ اخلاص ۱۱۲ [3] سورہ مدثر ۷۴ آیت ۳۸ [4] سورہ والنجم ۵۳ آیت ۳۸، ۳۹، ۴۰ [5] سورۃ الفاتحہ ۱ آیت ۳ [6] سورہ مدثر ۷۴ آیت ۳۱ [7] سورہ والنجم ۵۳ آیت ۲۵ [8] سورہ مدثر ۷۴ آیت ۳۱ [9] سورہ مزمل ۷۳ آیت ۱۵

سے کچھ نہیں کہتا، صرف وہ کہتا ہے جو خدا اس کو بتاتا ہے[1]

★ علم اور یقینی بات وہی ہے، جو اللہ کے بتانے سے رسول بتاتا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ انسان کے پاس ہے۔ وہ ظن ہے (تخمینی اور اٹکل کی باتیں ہیں) جو علم و یقین کا مقابلہ نہیں کر سکتیں[2]

★ تزکیہ نفس اور دل کو پاک کرنے اور روحانیت کو ترقی دینے کی صورتیں یہ ہیں۔
اللہ کو یاد کرو۔ دن کو یاد کرو۔ رات کو جاگ کر خدا کی یاد کرو[3] نمازیں پڑھو۔ زکوٰۃ ادا کرو (جو ایک لازمی فریضہ ہے اور زکوٰۃ کے علاوہ)۔ اللہ کو قرض دو (ملی اور قومی کاموں میں خرچ کرو وہ اللہ تعالیٰ پر قرض ہوگا) کوئی نیک عمل ضائع نہیں کیا جائے گا۔ جو نیکی کرو گے خدا کے یہاں اس سے بہتر اور بہت بڑھا ہوا پاؤ گے۔ جو غلطیاں اور کوتاہیاں ہوتی رہیں اللہ تعالیٰ سے اُن کی معافی اور مغفرت چاہتے رہو۔[4]

★ دولت کو اللہ کا انعام سمجھو۔ ہر ایک غرض سے بلند ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کے فرمان کی تعمیل اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہر ایک ضرورت مند کی مدد کرو اور اُس سے کہدو کہ ہم کوئی بدلہ نہیں چاہتے۔ صرف اللہ کی رضا چاہتے ہیں[5]

★ روحانیت کی پاکی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جسم کو پاک رکھو۔ لباس پاک رکھو ہر ایک پلیدی کو (ظاہری ہو یا باطنی) دور کرو[6]

★ عذاب کے کام (جن سے انسان کی ابدی زندگی برباد ہوتی ہے اور دوزخ کا مستحق ہو جاتا ہے) یہ ہیں:

---

[1] والنجم ۵۳ آیت ۳-۴ [2] والنجم ۵۳ آیت ۲۸ [3] سورۂ مزمل ۷۳ آیت ۲،۳،۴
[4] سورۂ مزمل ۷۳ آیت ۲۰ [5] سورۂ دہر ۷۶ آیت ۸، ۹ و سورۂ مدثر ۷۴ آیت ۶
[6] سورۂ مدثر ۷۴ آیت ۴و۵

نماز نہ پڑھنا، غریبوں کی امداد نہ کرنا، بیکار باتوں (اور خدا سے غافل کرنے والے کاموں) میں منہمک رہنا، عذاب و ثواب یعنی پاداش عمل پر یقین نہ رکھنا[۱]، کسی کے ساتھ اچھا سلوک کر کے اس پر احسان جتانا۔[۲]

ایسی صورتیں اختیار کرنا کہ دولت اپنے پاس جمع رہے اور غریبوں اور ضرورتمندوں کی امداد نہ ہو۔[۳]

★ اچھے آدمی جن کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام سے نوازا[۴]

یعنی[۵] (الف) خدا کے برگزیدہ نبی: جو ایسے پاک فطرت ہوتے ہیں کہ ہمیشہ گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

(ب) صدیق: جو اپنے قول و فعل میں نہایت سچے، جن کا ضمیر سچا، جن کے ہر فعل میں سچائی اور صداقت، یہاں تک کہ وہ سچائی کا پیکر اور صداقت کی تصویر ہوتے ہیں۔

(ج) شہید: جو حق و صداقت کے راستہ میں ہر ایک قربانی کے لئے تیار رہتے ہیں، جن کا جذبہ یہی ہوتا ہے کہ راہِ حق میں قربان ہوں اس کے علاوہ وہ اور اپنے تمام جذبات قربان کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی قربان کر دیتے ہیں۔

---

[۱] سورۂ مدثر ۷۴ آیت ۴۳ تا ۴۶ [۲] ایضاً آیت ۶ [۳] سورہ القلم ۶۸ آیت ۱۷ تا ۳۰ [۴] سورہ فاتحہ ۱ آیت ۵ [۵] یہ تشریح قرآن پاک میں بعد میں نازل ہوئی (سورۂ نساء ۴ آیت ۶۹) لیکن عمل پہلے دن سے اسی پر تھا۔

(د) صالح: | نیک کردار، پاکباز، پاک طینت، جو اچھے کاموں کی بہترین صلاحیت رکھتے ہیں اور اس صلاحیت کو عمل میں لاتے رہتے ہیں۔

★ مومن صالح اور سچا مسلمان وہ ہے جو راتوں کو جاگ جاگ کر خدا کو یاد کرے۔ دن کے کاموں کو خوبی سے انجام دے اور دل میں یادِ خدا رکھے۔ اُسی سے اس کا دل لگا رہے۔ اُسی پر بھروسہ رکھے، نمازیں پڑھے، زکوٰۃ ادا کرے قومی اور ملّی کاموں کے لئے دولت خرچ کرتا رہے، اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگتا رہے۔ مخالفین کی باتوں کو ضبط و تحمل سے برداشت کرے۔ برداشت سے باہر ہو جائیں تو خوش اسلوبی، سنجیدگی اور نرمی کے ساتھ اُن سے الگ ہو جائے[1] جو قول و قرار کے پکّے ہوں، جو منّت مان لیں یا عہد کر لیں اس کو پورا کریں۔ جو بلالحاظ مذہب و فرقہ مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کی امداد کو اپنا فرض سمجھیں۔ اپنی ضرورتیں پیچھے ڈالیں اُن کی ضرورتیں پوری کریں۔ خدا کی خوشنودی ان کا نصب العین ہو۔ جو کچھ کریں خدا کے لئے ہی کریں۔ کسی انسان سے کوئی معاوضہ گوارا نہ کریں یہاں تک کہ یہ بھی نہ چاہیں کہ کوئی انسان اُن کا کسی طرح شکریہ ادا کرے۔ خوفِ خدا، خدا کی عظمت اور اپنے انجام کی فکر اُن کے دل و دماغ پر چھائی رہے۔ جو کچھ کریں اسی لئے کریں[2]۔

بدترین انسان وہ ہیں

جو حکومت اور اپنے اقتدار پر گھمنڈ کریں، جن کو اپنی شاہنشاہیت پر ناز ہو (جیسے فرعون) جو اپنی دولت کے نشہ میں صداقت سے موںھ موڑیں، حقائق

---

[1] سورۂ مزمل ۷۳ آیت ۱، ۷، ۸، ۹، ۱۰ و ۲۰

[2] سورۂ دہر آیت ۷، ۸، ۹ و ۱۰

کو جھٹلائیں [1]

جن کو اپنی دولت پر، اپنی اولاد پر، اپنے مادی ذرائع ووسائل پر ناز ہو، انہیں کی بڑھوتی کی اُدھیڑبن میں رات دن لگے رہیں، ذخیرہ اندوزی کے حریص ہوں، حق کے مقابلہ میں اکڑجائیں، سچائی کی توہین کریں، عبرت کی آنکھیں بند رکھیں [2]

جو خدا کو بھول جائیں، خدا کی مخلوق کو بھول جائیں، جھوٹ بولنے اور جھوٹی قسمیں کھانے سے نہ شرمائیں، بلکہ اس کو ہوشیاری اور فن کاری سمجھیں، کسی کو چڑھائیں کسی کو اتاریں۔ لگی بجھی کرتے رہیں، چغلیاں کریں، نہ ان کی نظر میں شرافت اور اخلاق کی قدر ہو، نہ عصمت اور پاکدامنی کی، جن کی کوشش یہ ہو کہ غریبوں کا حق دبائیں اور اپنا سرمایہ بڑھائیں [3]

آپ کسی بہترین شاعر کا تصور کیجئے جس کے اشعار میں فصاحت و بلاغت کی تمام خوبیوں کے ساتھ ایسا درد بھی ہو جو سننے والوں کو خواہ مخواہ متاثر کردے۔ مذکورہ بالا مضامین اگر ایسے شیریں اور رقت انگیز کلام میں سمو دیئے جائیں اور وہ لوگ جو اپنی زندگی خاص سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں دن رات اس کلام کا ورد رکھیں تو خود اُن کی زندگی کیسی ہوجائے گی۔ اور اس کا ردعمل اُن پر کیا ہوگا جن پر اس کلام کی زد پڑتی ہے یعنی جن کے مفادات کو ٹھیس پہونچتی ہے یا اندیشہ ہے کہ ٹھیس پہونچے گی۔

قرآن حکیم منظوم نہیں ہے، نہ اُس میں اوّل سے آخر تک کوئی شعر ہے۔ مگر یہ اس کا تسلیم شدہ معجزہ ہے کہ اس کی شیرینی، لطافت، فصاحت و بلاغت، شعر سے کہیں زیادہ رقّت انگیز اور انقلاب آفریں ہے۔ عرب خصوصاً قریش اپنی زبان کے عاشق تھے۔ جتنا بڑا ادیب ہوتا تھا اتنا ہی زیادہ ادیبانہ کلام سے متاثر ہوا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض شعراء

---

[1] سورۂ مزمل ۷۳ آیت ۱۵، ۱۶ و آیت ۱۱ [2] سورۂ مدثر ۷۴ آیت ۱۱ تا ۱۶

[3] سورۂ قلم ۶۸ آیت ۸-۱۰ تا ۲۴

کے منتخب اشعار کو دیوتا کا درجہ دیا جاتا تھا اور ان کے سامنے سجدہ کیا جاتا تھا۔ یہ ادیب قرآن پاک سے بھی اتنے ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ متاثر ہوا کرتے تھے (اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ انشاء اللہ) یہاں تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جو سورتیں نبوت کے آغاز میں نازل ہوئیں اُن میں ان مضامین کو ایسے انداز سے مرصع کیا گیا ہے کہ سننے والے اگر اپنی ضمیر کی آواز پر عمل کرتے تو ان مقاصد کے لئے اپنی زندگی تج دینے کے لئے بے تاب ہو جاتے تھے۔ یہ سورتیں اس دور کا تعلیمی نصاب تھیں۔ نمازوں میں پڑھی جاتی تھیں۔ ان کے ایک ایک اشارہ پر عمل کیا جاتا اور ایک ایک لفظ کو بحث اور غور و فکر کا موضوع بنایا جاتا تھا۔

طریقۂ تربیت

★ رات کو اٹھو، جاگو، آدھی رات یا آدھی رات کے قریب یادِ خدا میں کھڑے ہو کر گذارو[1]

★ قرآن کو ٹھیر ٹھیر کر اطمینان سے پڑھو[2]

(تبلیغ خصوصاً فرائض نبوت کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ ریاضت و مجاہدہ یعنی محنت کرنے اور مشکلات کو برداشت کرنے کی عادت ہو، ضمیر پاک ہو، اس کی تمام صلاحیتیں بیدار رہیں۔ جو بات نکلے دل سے نکلے، ہر ایک بات نہایت ٹھیک اور سنجیدہ ہو۔ شب بیداری سے یہ خصلتیں پیدا ہوتی ہیں اور ترقی کرتی ہیں کیونکہ) یہ حقیقت ہے کہ رات کے اُٹھنے میں دل اور زبان کا خوب میل ہوتا ہے اور ہر بات خوب ٹھیک نکلتی ہے[3] (لہٰذا شب بیداری کرو تاکہ یہ خصلتیں پیدا ہوں کیونکہ) ہم عنقریب ڈالیں گے تم پر بھاری کلام[4]

---

[1] سورۂ مزمل ۷۳ آیت ۲، ۳ [2] ایضاً آیت ۴ [3] ایضاً آیت ۶ [4] ایضاً آیت ۵

★ پورے دن کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھو[1]
★ اپنے رب کے نام کا ذکر جاری رکھو[2]
★ اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو جاؤ۔[3]
★ خدا کو اپنا وکیل اور ذمہ دار بنا لو[4]، اسی پر بھروسہ رکھو۔
★ اس عقیدہ کو اپنے اوپر حاوی کر لو کہ مشرق و مغرب (اور تمام عالم) کا رب وہی ہے، اُس کے سوا اور کوئی نہیں جو معبود اور الٰہ ہو[5]
★ جو کچھ وہ (مخالفین) کہتے ہیں اس پر ضبط و تحمل سے کام لو[6] زیادہ سے زیادہ برداشت کی عادت ڈالو۔
★ دنیا داروں سے کنارہ کرو (مگر خوبصورتی کے ساتھ[7] (یہ کنارہ کشی ایسی ہو کہ اپنے اندر جمال رکھتی ہو۔ نفرت نہ ہو بلکہ ایسی ہو جیسے طبیب بیمار کی بیماری سے اپنا بچاؤ کرتا ہے۔ مگر اس طرح کہ اس بچاؤ میں بھی دلداری ہوتی ہے) مرض کا علاج کرتا ہے، مریض کا دل نہیں توڑتا۔

---

[1] سورۂ مزمل ۷۳؁ آیت ۷ [2] ایضاً آیت ۸ [3] ایضاً آیت ۸ [4] ایضاً آیت ۹
[5] ایضاً آیت ۹ [6] ایضاً آیت ۱۰ [7] ایضاً آیت ۱۰

داعی اِلیٰ اللہ کے اوصاف اور اُن کی تربیت و تکمیل

جس ذات کو اس لئے اُٹھایا جارہا ہو کہ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بُلائے بھٹکی ہوئی مخلوق کو حق و صداقت کے صراطِ مستقیم اور نیکی اور سچائی کے شاہراہِ اعظم پر چلائے ۔ اُس کے کچھ اوصاف ہونے چاہئیں ۔ قرآن حکیم میں جا بجا ان اوصاف کی طرف اشارے اور کہیں تصریح پائی جاتی ہے ۔

محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شخصیت ایک بہترین مثال ہے اور ان اشاروں اور تصریحات کی شہادت یہ ہے کہ محمدؐ رسول اللہ کی ذاتِ اقدس بہترین مثال اور نمونہ اس لئے تھی کہ مقاصد دعوت و ہدایت کے لئے آپ کی تربیت خاص طور پر کی گئی تھی۔ داعی حق کے تمام اوصاف اس مختصر کتابچہ میں بیان نہیں کئے جا سکتے یہاں صرف چند اوصاف بیان کئے جارہے ہیں۔

(۱) ہمدردی

کامیاب داعی اور ہادی کو شمع اور چراغ ہونا چاہیے ۔ شمع پوری محفل کو فیض پہونچاتی ہے ، تاریک مجلس کو روشنی سے بھر دیتی ہے مگر اس طرح کہ اہل محفل کے لئے خود فنا ہوتی رہتی ہے ۔ ایک سوز ہوتا ہے جو اُس کے تن من کو تحلیل کرتا رہتا ہے ۔ داعی حق بھی اسی طرح سوز و گداز کا پیکر ہوتا ہے ۔ وہ اپنی بقا اسی میں سمجھتا ہے کہ راہِ حق میں خود کو فنا کردے ۔ قرآن حکیم کی شہادت یہ ہے کہ محمد رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلم) سراج مُنیر (شمع سوزاں) تھے [۱] اور دردِ دل کا عالم یہ تھا کہ جانِ عزیز اسی میں گھلا رہے تھے [۲] کہ بھٹکے ہوئے انسان سیدھے راستہ پر آجائیں۔

---

[۱] یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ تا وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا۝ سورہ احزاب ۳۳ آیت ۴۶

[۲] لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ الآیۃ سورہ ۲۶ شعراء آیت ۳ ۔ نیز سورہ ۱۸ کہف آیت ۶

(۲) اذعان اور یقین

(الف) ایک شخص اونچے پہاڑ پر کھڑا ہوا، دشمن کے لشکر کو دیکھ رہا ہے۔ جو تیزی سے حملہ کرنے کے لئے آرہا ہے۔ اس کی بستی کے آدمی، پہاڑ کے پیچھے ہیں، وہ نہیں دیکھ رہے۔ یہ دیکھنے والا شخص جس خطرہ سے اپنی قوم کو آگاہ کر رہا ہے، وہ اس کا مشاہدہ کر رہا ہے اس لئے وہ اپنی پوری طاقت صرف کر رہا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ بستی کے غافل لوگوں کو جگا دے اور اپنے مشاہدہ کا یقین اُن کو دلا دے۔ داعی حق کو اپنی دعوت پر ایسا ہی یقین ہونا چاہیئے [۱] گویا قبول حق اور کفر و انکار کے نتائج کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

(ب) ایک نہایت شاداب باغیچہ میں ایک گہری خندق ہے جس میں آگ کے بڑے بڑے انگارے دہک رہے ہیں۔ خندق کے کنارے پھسلواں ہیں۔ سیر کرنے والوں کو اس کی خبر نہیں ہے۔ جس کو خبر ہے وہ سیر کرنے والوں کو پورے یقین کے ساتھ خطرہ سے آگاہ کرتا ہے اور اگر باغ کی سیر کرنے والے اس کے دوست اور عزیز قریب ہوتے ہیں تو وہ اپنی پوری طاقت صرف کر دیتا ہے کہ ان کو اس خندق کی طرف نہ جانے دے۔

داعی حق باخبر باغبان ہوتا ہے جس کو مخلوق خدا سے ایسی ہی محبت ہوتی ہے، جیسی اپنے اہل و عیال سے۔ وہ خندق کی طرف جانے والوں کو منع کرتا ہے۔ کوئی آگے بڑھ جاتا ہے تو اس کو کمر پکڑ کر کھینچتا ہے۔ اس وقت اس کی ہمدردی سراسر اضطراب بن جاتی ہے [۲] اس کا سوز و اضطراب ناقابل بیان ہوتا ہے۔

شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے — ہڈی ہڈی مری اے سوزِ نہاں جلتی ہے

(۳) داعی حق کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ اُس کی شوکت و حشمت کے سامنے لوگوں کی

---

[۱] بخاری شریف صفحہ ۹۶۱ حدیث ابی موسیٰ فیہ انا النذیر العریان [۲] بخاری صفحہ ۹۶۱ حدیث ابی ہریرہ۔

گردنیں جھک جائیں۔ بلکہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ اس کی دعوت کی معقولیت، دلائل کی مضبوطی، اس کے اخلاص، قول اور فعل کی صداقت اور اس کی سچی خیر خواہی اور ہمدردی، بے لوث زندگی اور بلندی اخلاق کے سامنے لوگوں کے دل جھک جائیں۔ ان میں گرویدگی اور عقیدت پیدا ہو جائے۔ لہٰذا سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ:

(الف) کوئی جور اور جبر نہ ہونا چاہیئے، ہر صاحبِ فکر کی رائے کو آزادی حاصل ہو وہ خود اچھے برے اور اپنے مذہب اور راجانے کو پہچاننے اور اپنے ضمیر کی شہادت پر عمل کرے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ (سورہ بقرہ ع۲، آیت ۲۵۶)

(ب) بیشک داعی حق اصلاحی مسائل پیش کرے گا، لوگوں سے مطالبہ کرے گا کہ وہ اس کے اصول تسلیم کریں اور ان پر عمل کریں لیکن ضروری ہے کہ انداز نہایت سنجیدہ، دانشمندانہ، نصیحت آمیز اور خیر خواہانہ ہو۔ تبادلہ خیالات اور بحث و مباحثہ کی نوبت آئے تو اس کا انداز اور طرز بھی ایسا حسین ہو کہ اس سے زیادہ نرم، دل کش اور پیار بھرا انداز نہ ہو سکے۔

(اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ[1] (الآیۃ سورہ نحل ع۱۶، آیت ۱۲۵)

(ج) گمراہ، سرکش، شورہ پشت، شرارت پسند، بدکردار جن کو سیدھے راستہ پر لانا مقصود ہے ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ داعی حق کی بات سنجیدگی سے سنیں گے اور شرافت کا جواب شرافت سے دیں گے، بالخصوص ایسی صورت میں کہ ان کی عزت و عظمت، شہرت یا ان کے کسی مفاد کو نقصان پہنچ رہا ہو تو وہ لامحالہ حق کے مقابلہ میں

---

[1] پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے "(اے نبی) اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ۔ اس طرح کہ حکمت (دانشمندی) کی باتیں بیان کرو۔ اور اچھے طریقہ پر پند نصیحت کرو اور مخالفوں سے بحث و نزاع کرو تو (وہ بھی) ایسے طریقہ پر کہ حسن و خوبی کا طریقہ وہی ہو (اس سے اچھا نہ ہو سکے) تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا اور کون راہ راست پر ہے۔

اپنی ہرایک شرارت کو کام میں لائیں گے اور پوری قوت سے سرکشی اور بغاوت کا مظاہرہ کریں گے۔ اس صورت میں داعی حق کا فرض کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: معافی اور درگذر کو اپنا اصول بنالو، نیکی کی ہدایت کرتے رہو اور جاہلوں (نادانوں) سے کنارہ کرتے رہو۔ (سورۂ اعراف، آیت ۱۹۸؛ سورہ نحل آیت ۱۲۷، سورۂ مزمل و سورۂ مدثر و سورۂ دہر وغیرہ)

(۴) اگرچہ قانون یہ ہے کہ

برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہوتی ہے وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (سورۂ شوریٰ آیت ۴۰)

مگر داعی حق اس قانون پر عمل نہیں کرتا، بلکہ اس کا اصول یہ ہوتا ہے:

بدی کا جواب نیکی سے دیتے ہیں، بھلائی کرکے برائی کو دفع کرتے ہیں۔

يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (سورہ الرعد، آیت ۲۲)

(۵) عدل کے معنے برابری پیدا کرنے کے ہیں —— اسی کو انصاف کہا جاتا ہے، اس سے مساوات تو قائم ہوجاتی ہے مگر بدی ختم نہیں ہوتی، بلکہ بسا اوقات جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ بدی کو بڑھاتا اور اس کے دائرہ کو وسیع کردیتا ہے۔ داعی حق کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ بدی اور برائی دنیا سے ختم ہو۔ لہٰذا اس کا اصول یہ ہوگا کہ جب کوئی بدی پیش آئے گی تو اس کے اسباب تلاش کرکے ایسا راستہ اختیار کرے گا کہ بدی اور برائی کی جڑ کٹے، دوست دشمن بن جائیں، جو برے ہیں وہ اچھے ہوجائیں۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (سورہ حٰم سجدہ آیت ۳۴)

مگر یہ آسان بات نہیں ہے۔ اس کو وہی کرسکتے ہیں جو ضبط و تحمل کے عادی ہوں۔ جو مکارم اخلاق کے خوگر ہوں۔ (ایضاً آیت ۳۵)

لیکن عالم اسباب میں کسی چیز کی عادت جب ہی ہوتی ہے جب پہلے اس کی تربیت

ہو چکی ہو۔ مختصر یہ کہ اس دور میں تربیت کا ایک مکمل باب یہ بھی تھا کہ ان کمالات و اوصاف کا عادی بنایا گیا جو سب سے افضل اور آخری پیغمبر اور سب سے زیادہ جلیل القدر داعی کے لئے ضروری تھے۔

ثمرۂ تربیت

جن کی فطرت سلیم نے بِلا دعوت اور بِلا فرمائش خود بخود محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کو پوری زندگی کا نصب العین بنایا تھا۔ اس زمانۂ تربیت میں جو رنگ محمد نبی اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر غالب آتا رہا، اُسی رنگ میں یہ بھی رنگے جاتے رہے۔ ثمرہ یہ ہوا کہ ایک جماعت ایسی تیار ہو گئی:

۱۔ جو خدا شناس اور سچی خدا پرست تھی۔

۲۔ جو سب کو چھوڑ کر اپنا رشتہ خدا سے جوڑ چکی تھی۔

۳۔ جس کا پورا بھروسہ اپنے خالق اور مالک پر تھا۔

۴۔ جس کا دل ہر ایک طمع سے پاک اور صرف اپنے خالق کی محبت سے لبریز تھا۔

۵۔ جس کے دل پر صرف خالقِ کائنات کی عظمت کا سکّہ تھا اسی کا خوف اس کے قلب و جگر کا داغ تھا، جس نے خوفِ خدا کے سوا، ہر ایک خوف و خطر کے دھبّے کو مٹا دیا تھا۔

۶۔ جس کو خالق کی ہر ایک مخلوق سے محبت تھی، کیونکہ وہ اس کے رب کی پالی ہوئی مخلوق ہے۔ ہر ایک انسان کا درد اس کے دل میں تھا، کیونکہ یہ انسان اُس خدا کی قدرت کا شاہکار تھا جس سے اس کو عشق ہو گیا تھا اور جس کے لئے یہ سب کچھ قربان کر دینے کو زندگی کا نصب العین اور دل کی آخری آرزو بنا چکا تھا۔

۷۔ اس جماعت کو اُن سے نفرت ہو گئی:

(الف) جن کے دل اپنے خالق اور رب کی عظمت اور اس کی مخلوق کے درد سے

ناآشنا تھے۔

(ب) جو خدا کو چھوڑ کر اپنی اغراض کی پوجا میں لگے ہوئے تھے۔

(ج) جن کو مال اور اولاد پر ناز تھا اور انہی کی ترقی اُن کی زندگی کا محبوب نصب العین تھا۔

(د) جن کو غریبوں سے نفرت تھی کیونکہ وہ دولت سے محروم ہوتے تھے۔

(ہ) جو یتیموں اور بیواؤں کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے تھے کہ اُن کی امداد کرنے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی اُن سے کہیں زیادہ انھیں اپنی تجوریوں سے محبت تھی۔

(و) کمزوروں کی کمزوری سے فائدہ اُٹھانا' مخلوقِ خدا کو غلام اور غلاموں کی زندگی کو اپنی خواہشات کا کھلونا بنانا' اُن کی عظمت و برتری کا نشان تھا جس کو وہ کسی وقت بھی مٹانا یا نیچا کرنا نہیں چاہتے تھے' خواہ ان کی جان جاتی رہے۔

مقامی اور سماجی حالات اور ردّعمل

۱۔ عرب میں بادشاہت نہیں تھی۔ ہر ایک قبیلہ آزاد ہوتا تھا۔ شیخ قبیلہ اندرونی نظام کا نگراں ہوتا تھا۔ مکہ میں اس نظام نے چھوٹے سے جمہوریہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ صدر جمہوریہ تو پھر بھی کوئی نہیں تھا، البتہ قبائل کی ایک مشترک جماعت (کونسل) تھی۔ اُس نے شہری' سماجی اور انتظامی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر تقریباً ایک درجن شعبے (پورٹ فولیو) بنائے تھے اور ہر شعبہ کا سربراہ منتخب کر دیا تھا۔ مثلاً مقدمات قتل کا ایک خاص شعبہ تھا۔ اس کے سربراہ ابوبکر صدیق تھے۔ شعبہ سفارت کے ذمّہ دار حضرت عمر فاروقؓ تھے۔ اسی طرح باقی شعبوں کے ذمّہ دار علیحدہ علیحدہ تھے۔ ان میں سے صرف ابوبکر صدیقؓ وہ تھے جو سب سے پہلے اسلام لا چکے تھے۔ عمر فاروقؓ کئی سال بعد مسلمان ہوئے۔ باقی شعبوں کے ذمّہ دار یا مسلمان ہی نہیں ہوئے یا اگر مسلمان ہوئے تو بہت آخر میں۔ اس مشترک جماعت کے اجلاس ہوا کرتے تھے۔ اس مقام کا نام "دارالندوہ" تھا۔

جہاں یہ اجلاس ہوا کرتے تھے، کوئی غیر معمولی معاملہ ہوتا تو اراکین کے علاوہ بھی نمایاں افراد کو خاص طور پر مدعو کر لیا جاتا تھا۔

(۲) حرب بن اُمیہ، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، عتبہ بن ربیعہ، ابولہب، ابوجہل، اُمیّہ بن خلف، ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط، نضر بن حارث، اسود بن عبد یغوث۔ بڑے بڑے دولتمند تھے۔ یہ تاجر بھی تھے، صاحب جائداد بھی، سودی کاروبار بھی بڑے پیمانہ پر کرتے تھے اور ان تمام خصوصیتوں کے مالک تھے جو سرمایہ داروں میں ہوا کرتی ہیں مثلاً ابولہب جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا بھی تھا اور ہمیشہ مخالفت میں پیش پیش رہا، اس کا سودی لین دین وسیع پیمانے پر تھا اور اس کے حرص و طمع کی یہ حالت تھی کہ اُس نے خانہ کعبہ کے خزانہ سے سونے کا ہرن چوری کر کے بیچ ڈالا تھا۔ یہ ہرن بہت عرصہ سے محفوظ چلا آتا تھا[۱]

عاص بن وائل بہت بڑا دولتمند قبیلہ کا مشہور سردار تھا، مگر حضرت خبابؓ سے اس پر جھگڑا ہوا کہ انھوں نے لوہے کی کوئی چیز بنا کر اس کو دی تھی، وہ اس کی اُجرت مانگتے تھے اور یہ جان چُراتا تھا[۲] اور یاد ہوگا یہی عاص بن وائل تھا جس نے یمن کے ایک تاجر کو مار پیٹ کر بھگا دیا تھا جب اُس نے اپنے دام مانگے جس سے تمام مکہ والوں کی بدنامی ہوئی اور جس کی بنا پر وہ انجمن بنائی گئی تھی جس کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے[۳]

قرآن شریف نے کسی کا نام نہیں لیا مگر اس کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج اور معاشرہ کا اونچا طبقہ جو مکہ پر چھایا ہوا تھا جو اس لحاظ سے خوش نصیب مانا جاتا تھا کہ اُن کے یہاں دولت کے انبار بھی ہوتے تھے اور فرماں بردار اولاد کی بھی کمی نہیں ہوتی تھی، اس کے اخلاق اور اوصاف یہ تھے:

---

[۱] معارف ابن قتیبہ [۲] بخاری شریف ص۲۸۰ [۳] زیر عنوان کمزوروں کی امداد عدل و انصاف اور جذبۂ اصلاح۔

(الف) اپنی اس خوش نصیبی پر کہ وہ صاحب مال اور صاحب اولاد ہیں اُن کو گھمنڈ اور غرور ہوتا تھا۔

(ب) جو اُن سے کم ہوتے تھے ان کو حقیر سمجھتے اور طرح طرح کے طعنے دیتے تھے۔

(ج) اپنے اثر و رسوخ اور اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے جھوٹی قسم کھانے سے اُن کو عار نہ آتی تھی بلکہ بڑھ بڑھ کر قسمیں کھاتے، دوسروں کو لڑانے اور اپنے مخالفوں کو زک پہنچانے کے لئے بے دھڑک چغلیاں اور طرح طرح کا شرارت آمیز پروپیگنڈہ کرتے تھے[1]

(د) کمزوروں پر ظلم کرنا، اُن کی عادت تھی۔

(ھ) نرم مزاجی اور اخلاق سے ناآشنا تھے۔ نیک کام نہ خود کرتے نہ دوسروں کو کرنے دیتے۔

(و) غریبوں کی امداد کا کوئی موقع ہوتا تو اس میں روڑے اٹکاتے نہ خود خرچ کرتے نہ دوسروں کو خرچ کرنے دیتے۔

(ز) اخلاق سے ناآشنا، سخت دل، خشک مزاج طبیعت کے روکھے[2]

(ح) رات دن تجوری بھرنے کی کوشش میں مصروف رہتے۔ اس تصور سے ناآشنا تھے کہ یہ دولت ختم ہونے والی بھی ہے[3]۔

(ط) خدا سے بے تعلق، خدا پرستی سے بیگانہ، کج بحث، زبان زوری سے اپنے عیبوں کو چھپانے والے[4]

یہی لوگ تھے جو پورے مکّہ پر چھائے ہوئے تھے اور چونکہ مکّہ ہر لحاظ سے پورے عرب کا مرکز تھا تو اُن کے اثرات پورے عرب پر غالب تھے۔

ایک شخص جس نے بچپن، جوانی اور ادھیڑ عمر کا ایک حصہ شہر کی کھلی ملی زندگی میں اس

---

[1] سورہ ۶۸ القلم آیت ۸ تا ۱۵ [2] ایضاً [3] سورہ ۱۰۴ ہمزہ آیت ۲ [4] سورہ ۷۴ مدثر آیت ۱۶ تا ۲۵ و آیت ۴۵ و ۴۶ و سورہ ۸۳ المطففین آیت ۲ و ۳ و آیت ۱۲ و ۱۳ سورہ ۹۶ العلق آیت ۶ و ۷۔

طرح گذارا ہو کہ وہ لوگوں کی آنکھ کا تارا بنا رہا ہو۔ اس کی زندگی میں خاص طرح کی تبدیلی آئے، اُس کے کچھ ساتھی ہو جائیں، اُن میں وہ بھی ہوں جو شہری زندگی میں اونچا درجہ[1] رکھتے ہوں، کچھ مالدار گھرانوں کے نوجوان[2] ہوں اور یہ سب ایک خاص قسم کی انقلاب انگیز زندگی بنانے لگیں۔ مان لیجئے یہ کسی کو اپنی طرف نہیں بلاتے مگر کیا خود ان کا عمل اور غیر معمولی انداز لوگوں کو متوجہ نہیں کرے گا۔ خصوصًا وہ بڑے لوگ جو اپنے اقتدار کو سنبھالنے کے لئے ہر خطرہ کے موقع پر خورد بین سے کام لیتے ہیں کیا وہ ان کے طرزِ زندگی سے ہراساں اور چوکنے نہیں ہوں گے اور کیا یہ بات اُن کو سراسیمہ اور پریشان نہ کردے گی کہ یہ جماعت جس طرح شرک اور بُت پرستی کے خلاف توحید کی قائل اور خدا پرستی کی عاشق ہے وہ سرمایہ دارانہ نظامِ حیات سے بھی اتنی ہی متنفر ہے اور جذباتِ نفرت کی پرورش کر رہی ہے۔

۵۔ سدِّ عمل

یہ قدرتی بات تھی کہ سردارانِ قریش نے جیسے ہی اس چھوٹی سی جماعت کے انداز سے خطرات کو بھانپا، مخالفت شروع کردی۔ مگر جس طرح دعوت عام نہیں تھی، مخالفت بھی عام نہیں تھی۔ نجی مجلسوں میں تبصرے ہوتے بیشک پھیلنے والے اثرات کو زائل کیا جاتا اور مخالفانہ رائے پختہ کی جاتی تھی مگر گفتگو اور تبادلۂ خیالات کے ذریعہ مثلاً: سب سے پہلے قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت و بلاغت تھی جو ہر ایک صاحب ذوق کو متاثر کر دیتی تھی اور جب کوئی صاحب فکر معنے اور مقصد پر غور کرتا تو حیران رہ جاتا اور بسا اوقات وارفتہ ہو جاتا تھا۔ یہ وارفتگی گرویدگی کی حد تک پہونچتی تھی جو اس کو سب سے چھڑا کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ کر دیتی تھی۔ جو حضرات اب تک مسلمان ہو چکے تھے اگرچہ اُن کی تعداد تھوڑی تھی۔ مگر وہ قرآن پاک کی اس تاثیر کی بہترین مثال اور نمونہ تھے۔ قرآن پاک کی اس تاثیر کو معاذ اللہ جادو کہا جاتا تھا کہ یہ منتر ہے جو کسی طرح "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہاتھ لگ گیا ہے وہ اس منتر سے متاثر کرتا رہتا ہے[3]

---

[1] جیسے صدیق اکبرؓ [2] جیسے حضرت عثمان بن عفان، عبدالرحمٰن بن عوف مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم
[3] سورہ ۷۴ مدثر آیت ۲۴۔ تنبیہ: سورہ مدثر اور سورہ قلم کی تمام آیتیں (باقی بر صفحہ ۲۴۵)

ان آیتوں اور سورتوں میں جن عقائد اور نظریات کی تلقین ہے جب ان پر بحث ہوتی تو بڑے لوگوں کا چلتا ہوا جواب یہ ہوتا تھا: پرانے زمانہ کی دقیانوسی باتیں ہیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب یہ باتیں نہیں چل سکتیں[1]

جب خدا پرستی اور توحید کا ذکر ہوتا تو جواب دیا جاتا۔ اپنے باپ دادوں کے مذہب سے ہٹ کر گمراہ ہو رہے ہیں[2]

جب ان کی شب و روز کی عبادت اور غیر معمولی شب بیداری کا تذکرہ ہوتا تو روسا قریش کی مجلسوں میں تبصرہ یہ کیا جاتا: دیوانے ہو گئے ہیں۔

لیکن ظاہر ہے اس طرح کے جوابات وقتی طور پر کام کر سکتے ہیں واقعی اور حقیقی اثرات کو زائل اور سوال کرنے والوں کو مطمئن نہیں کر سکتے۔ تو اب ان لوگوں نے یہ چاہا کہ اس سے پہلے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اثرات متعدی ہوں، ان سے کوئی سمجھوتہ ہو جائے چنانچہ سرداران قریش کا ایک وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔

ارکانِ وفد پر ایک نظر ڈال لیجیے:

(۱) ولید بن مغیرہ، مکہ کا رئیس اعظم جو دولت مندی اور خوش حالی کی تمام عظمتیں اپنے اندر رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کو "وحید"[3] کہا جاتا تھا۔

(۲) ابوجہل، سب سے زیادہ ہوشیار اور چالاک سردار۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اگرچہ ایک ہی دفعہ میں نازل نہیں ہوئیں، کچھ پہلے نازل ہوئیں کچھ تھوڑے وقفہ کے بعد مگر بہرحال تمام آیتیں نبوت کے ابتدائی دور میں ہی نازل ہوئیں۔

[1] سورہ ۶۸ قلم آیت ۱۵ [2] ایضاً آیت ۷ [3] ایضاً آیت ۶ [4] سورہ مدثر کی آیت ۱۱ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ۞ کے تحت حضرات مفسرین نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔

(۳) اسود بن عبدیغوث مکہ کا بہت بڑا تاجر اور رئیس۔
(۴) اخنس بن شریق، طائف کا سب سے بڑا سردار اور رئیس۔
وفد نے آپ کے سامنے تین صورتیں پیش کیں:
• اگر دماغی خلش ہے تو اجازت دیجئے ہم بہترین علاج کا انتظام کریں۔
• اگر عیش و عشرت مقصود ہے تو ہم دولت اور حسن دونوں فراہم کر سکتے ہیں۔
• اگر اقتدار مطلوب ہے تو مکہ کے اقتدار کی باگ ڈور آپ کے حوالے کرتے ہیں۔ مگر آپ اپنے انداز کو ہلکا کیجئے۔ آپ کے نظریات جو سننے میں آرہے ہیں نہایت سخت ہیں۔ وہ ہیجان برپا کر دیں گے۔ مگر وحی الٰہی نے اسی طرح کی پیش کشوں کی شدت سے تردید کر دی۔[۱]

تبلیغ کا آغاز

سب سے پہلے اپنا خاندان

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جب حکم ہوا " قُمْ فَاَنْذِرْ "[۲] اٹھو اور لوگوں کو آگاہ کرو (کہ ان کے موجودہ عمل اور کردار کا مستقبل کیا ہوگا) تو آپ نے انذار اور تبلیغ کا سلسلہ اپنے خاندان سے شروع کیا۔ خدا کا حکم بھی یہی تھا۔[۳]
آپ نے کھانے کا انتظام کیا اور ان رشتہ داروں کو دعوت دی جو آپ کے پردادا (دوسری پشت کے دادا) ہاشم کی اولاد تھے۔ ان میں وہ بھی تھا جس کا نام عبدالعزیٰ تھا

---

[۱] تفسیر عزیزی متعلق آیت ۹ سورہ قلم ۶۸
[۲] سورۂ مدثر ۷۴ آیت ۲
[۳] سورہ شعراء ۲۶ آیت ۲۱۴

اور ابولہب کی کنیت سے مشہور تھا[1]۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد کا سب سے بڑا بھائی تھا۔ عمر، سرمایہ اور دولت کے لحاظ سے خاندان میں سب سے اونچا تھا۔ عبدالعزیٰ سمیت تقریباً چالیس آدمی اس دعوت میں آئے۔ کھانا کھایا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ فرمانا شروع کیا۔ ابھی آپ نے بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ عبدالعزیٰ نے پکار کر کہا:

لَقَدْ مَا سَحَرَكُمْ صَاحِبُكُمْ[2]	یہ جادو بہت ہی عجیب ہے جو تمہارے دوست نے تم پر کیا ہے۔

جادو کا نام سن کر کون ٹھیر سکتا تھا، مجمع منتشر ہو گیا۔

ابولہب کی یہ حرکت بہت ہی ہمت شکن تھی۔ مگر اس کے مقابلہ پر تھی جس کی ہمت نے ٹوٹنا نہیں سیکھا تھا۔ وہ نئے حوصلہ سے اٹھا۔ کچھ وقفہ کے بعد دوبارہ دعوت کی اور اس مرتبہ حلقہ وسیع کر دیا۔ پہلے ہاشم کی اولاد کو دعوت دی تھی، اس مرتبہ ہاشم کے والد عبد مناف کی اولاد کو دعوت دی۔ اور ابولہب کی پہلی حرکت کا ردعمل یہ ہوا کہ سب ہی آگئے اور آخر تک جمے رہے۔ آپؐ نے بھی اپنی بات پوری فرما دی۔ آپ نے فرمایا:

"میں وہ پیغام پہونچا رہا ہوں کہ عرب کے کسی جواں ہمت نے یہ پیغام نہیں پہونچایا تھا۔ یہ دنیا اور آخرت کی کامیابی کا پیغام ہے۔ اُمّتِ عرب اس پیغام سے دنیا میں بھی سربلند ہوگی اور آخرت کی کامیابیاں بھی اس کو نصیب ہوں گی[3] یہ پیغام عمل کا پیغام ہے۔ انسان کا عمل ہی اس کو کامیاب کر سکتا ہے۔ ایک کا عمل دوسرے کو کامیاب نہیں کر سکتا۔

اے معشر قریش! اپنے آپ کو جس درجہ پر رکھنا چاہتے ہو تو اس کی قیمت

---

[1] لہب کے معنیٰ آگ کی لپٹ کے ہیں کہتے ہیں کہ اس کا رنگ سفید سرخ تھا، چہرہ انگارے کی طرح دہکتا رہتا تھا، اس لئے یہ کنیت دی گئی گویا وہ آگ کے انگارے اور لپٹ کی تصویر ہے [2] البدایہ والنہایہ ص۳۹ ج۳ [3] ایضاً ص۳۹ وص۴۰ ج۳ مجمع البحار لفظ ھدّ

خود ادا کرو۔ عذاب الٰہی سے بچنا چاہتے ہو تو نجات کا سودا تم خود کرو۔

اے آلِ عبد مناف! خدا کے مقابلہ پر میں تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا (جب تک تم خود عمل نہ کرو میں تمہیں قانون قدرت کی گرفت سے نجات نہیں دلا سکتا)۔

اے عباسؓ[1] بن عبدالمطلب! خدا کے مقابلہ پر میں تمہارے کام نہیں آسکتا۔ اے رسولِ خدا کی پھوپی "صفیہ"! میں اللہ کی گرفت سے تمہیں نہیں بچا سکتا۔ اے رسول کی بیٹی فاطمہ! میرے مال میں سے جو کچھ مانگنا چاہو مانگو میں دوں گا مگر خدا سے بے نیاز ہو کر میں تمہارے کچھ کام نہیں آسکتا۔ اللہ کے مقابلہ پر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا[2]"

تقریر بے حد موثر اور بلیغ تھی۔ سننے والوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ مگر دلوں کا پرانا مرض آسانی سے نکلنے والا نہیں تھا۔ یہاں بھی، عبدالعزیٰ ابولہب نے اپنی عمر کی بڑائی اور رشتہ کی برتری سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس مجمع میں سب سے زیادہ سن رسیدہ ابولہب تھا اور سب سے چھوٹے حضرت علی رضی اللہ عنہ جن کی عمر تقریباً بارہ سال تھی۔ بیمار اور کمزور بھی تھے، پیٹ بڑھا ہوا، آنکھیں آئی ہوئیں پنڈلیاں پتلی پتلی، کھڑا ہونا مشکل تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر کے بعد مجمع کی طرف سے جواب کا انتظار کیا تو صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ (طفل بیمار) نے آپؐ کی تصدیق کی اور حمایت کا وعدہ کیا۔ آپ نے اُن کی حوصلہ افزائی کے الفاظ کہے۔ ابولہب کو موقع مل گیا۔ اُس نے طنز کرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ مجمع کا رخ بدل گیا، پھر منتشر ہو گیا[3]

---

[1] عباس اگرچہ چچا تھے مگر ہم عمر اور ہم جولی تھے۔ تقریباً دو سال بڑے تھے۔ [2] بخاری شریف ص۴۰۲

[3] البدایہ والنہایہ ص۳۸ ج ۳

فاراں[1] کی ایک پہاڑی سے صدائے حق

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

حبقوق نبی کی کتاب باب ۳، ورس ۳ میں شہادت دی گئی تھی:

اللہ جنوب سے اور وہ جو قدوس ہے فاران
سے آیا۔ اس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا
اور زمین اس کی حمد سے معمور ہوئی[2]

اسی فاران کی ایک پہاڑی کا نام "صفا" ہے۔ اس پہاڑی کا وجود اب بھی باقی ہے۔ کعبہ شریف سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلہ پر ہے۔ اب یہ پہاڑی شہر مکہ کی سطح کے برابر ہو گئی ہے مگر اس زمانہ میں یہ بلند تھی۔ خانہ کعبہ کا حرم[3] (میدان) اس کے دامن میں تھا۔ عام طور پر قریش کی یہاں نشست رہتی تھی۔ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس پہاڑی پر چڑھے

---

[1] بائبل میں مکہ کو فاران کہا گیا ہے۔ کتاب پیدائش باب ۲۱ میں حضرت ہاجرہ کے بیٹے (اسمٰعیلؑ) کے متعلق کہا گیا ہے۔ اور وہ فاران کے بیابان میں رہا۔ (فقرہ ۲۱)

[2] رحمۃ للعالمین صفحہ ۱۴۹ میرے پاس جو اُردو کی بائیبل ہے اس میں یہ الفاظ ہیں: اے خدا تو برسوں کے درمیان اپنے نام کو نئے سرے سے رونق بخش، برسوں کے بیچ اُسے شہرت دے، قہر کے درمیان رحم کو یاد کر۔ خدا تیمان سے اور وہ جو مقدس ہے فاران سے آیا سلاہ اس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا، اور زمین اس کی حمد سے معمور ہو گئی۔ (حبقوق نبی کی کتاب صفحہ ۸۵۹)

[3] چہار دیواری اس زمانہ میں نہیں تھی بیچ میں خانہ کعبہ تھا۔ اس کے چاروں طرف میدان تھا۔ میدان کے کنارے پر رؤسا مکہ اور خدام کعبہ کے مکانات تھے۔ میدان میں ان رؤسا کی نشستیں رہتی تھیں۔

اور قبائل قریش کو نام بنام پکارا۔ یا بنی فہر! یا بنی عدی وغیرہ وغیرہ۔

محمّل: وہی محمدؐ جن کا اثر و احترام یہ تھا اور قریش کے عوام و خواص اس درجہ گرویدہ تھے کہ آپ کو الصّادق اور "الامین" کہہ کر خوش ہوا کرتے تھے۔ انھیں الصادق اور الامین کی آواز کانوں میں پڑی تو لوگ پہاڑی کے دامن میں آکر جمع ہوگئے اور جو نہیں آسکتے تھے، انھوں نے اپنا کوئی آدمی بھیجدیا۔

سب پہونچ گئے تو آپ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"اگر میں یہ بتاؤں کہ یہ وادی جو اس پہاڑ کی آڑ میں ہے یہاں دشمن کی فوج پہونچ گئی ہے اور وہ عنقریب تم پر حملہ کرنے والی ہے تو کیا آپ صاحبان میری بات سچ مانیں گے۔"

سب نے جواب دیا:

"بیشک آپ کے متعلق ہمارا تجربہ یہی ہے کہ آپ سچ ہی بولتے ہیں۔"[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"عذابِ خداوندی کا لشکر آنے والا ہے اس سے پہلے کہ عذاب کا یہ لشکر آئے میں تمہیں آگاہ کر رہا ہوں۔"

آپ نے اسی موضوع پر تقریر فرمائی۔ بہت ممکن تھا لوگ اثر لیتے۔ مگر خاندان ہاشم کا (وہی عمر رسیدہ عبدالعزیٰ ابولہب) بھڑکتا ہوا اٹھا اور یہ کہتا ہوا چل دیا:

"محمد تیرے ہاتھ ٹوٹیں۔ کیا اس لئے ہمیں یہاں جمع کیا ہے۔"[2]

خاندان کا بڑا پورے خاندان کا سرپرست اور مربّی مانا جاتا ہے اور قاعدہ عرب کے مطابق وہ وَلی یعنی جواب دہ اور ذمہ دار بھی ہوا کرتا تھا۔ چھوٹوں کے حق میں اس کی بات مانی جاتی تھی۔ ابولہب کو یہ ولایت اور سرپرستی حاصل تھی۔ کیونکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ما جربنا علیک الا صدقاً بخاری شریف ص۷۰۲ [2] بخاری شریف ص۷۰۲

کے والد ماجد کا بڑا بھائی تھا۔ اس کے علاوہ مکہ کا با اثر دولت مند تھا۔ مجمع نے جب اتنے بڑے آدمی کو خفا ہو کر جاتے ہوئے (واک آؤٹ کرتے ہوئے) دیکھا تو مجمع بھی چلدیا۔ لیکن ذہنوں میں ایک سوال گھر کر چکا تھا (داعی حق کی یہی کامیابی تھی)۔

اتنا اشتعال (بوکھلاہٹ) کیوں

(۱)

کوہ صفا سے جس نے پکارا وہ وہی "محمد" تھا جس کا نام لینا لوگ بے ادبی سمجھتے تھے جس کو "الصادق" "الامین" کہا کرتے تھے، جس سے دعائیں کرایا کرتے تھے، برکتیں حاصل کیا کرتے تھے، جس نے کچھ عرصہ پہلے اس خوفناک ہنگامہ کو نہایت خوبصورتی سے ختم کیا تھا جو تعمیر کعبہ کے وقت حجر اسود کے سلسلہ میں سر اٹھا چکا تھا۔

کوہ صفا کی مختصر تقریر میں جن خرابیوں کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا ان کا احساس خود قریش کو بھی تھا۔ انہی کمزوریوں اور خرابیوں کی اصلاح کے لئے چند سال پہلے وہ انجمن بنائی تھی اور وہ عہدنامہ طے کیا تھا جو حلف الفضول کے نام سے مشہور تھا۔

یہ "ابولہب" جو اس وقت سب سے پہلے مشتعل ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہی عم بزرگ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پر اتنا خوش ہوا تھا کہ اپنی باندی ثوبیہ کو فوراً آزاد کر دیا۔ اسی ثوبیہ نے سب سے پہلے اس نونہال محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دودھ پلایا تھا۔

پھر یہ خفگی اتنی برافروختگی اور بوکھلاہٹ کیوں؟

اس کا سبب وہ انقلاب تھا جس کی تصویر اس مختصر جماعت کے آئینہ کردار میں ان کو نظر آرہی تھی جو اس چند سال کے عرصہ میں (جو تربیت کیلئے مخصوص تھا) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن میں تربیت پا کر تاریخ عالم کے پلیٹ فارم پر جلوہ گر ہو چکی تھی جو ایک طرف شرک والحاد کے

مقابلہ میں توحید، فسق وفجور کے مقابلہ میں مکارم اخلاق، حیوانیت اور بہیمیت کے مقابلہ میں انسانیت اور شرافت کی علمبردار تھی تو دوسری جانب راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر کلام الٰہی کی وہ آیتیں بھی گنگنایا کرتی تھی، جو مفاد پرست، دولت وثروت اور ظالمانہ سرمایہ داری کے خلاف گرج رہی تھیں جس کا کردار یہ تھا کہ اپنی دولت کو راہ خدا میں لٹا کر ان آیتوں کے مفہوم ومقصود کا وہ نقشہ پیش کر رہی تھی، جو ان دولت پرستوں کے لئے بہت ہی وحشتناک تھا۔ جھنجھلاہٹ اور اشتعال کا باعث یہ بھی تھا کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سمجھانے کی جتنی کوششیں کیں وہ ناکام ہو چکی تھیں۔

ابولہب جیسا سرمایہ پرست جو خزانہ کعبہ کے غزالِ زریں پر بھی ہاتھ مار دے عاص بن وائل جیسا ذخیرہ اندوز جو مزدور کی مزدوری برسوں تک ٹلاتا رہے۔ ولید بن مغیرہ جیسا حریص جو سب سے بڑا دولتمند ہونے پر بھی صبر نہ کرے اور اُس کی طمع اور لالچ کا جہنم "هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ" پکارتا رہے۔ عتبہ بن ربیعہ اور مسعود ثقفی جیسے جاگیر دار جن کی زندگی کا نصب العین ہی جاگیرداری اور زر اندوزی ہو، ابوجہل اور عقبہ بن ابی معیط جیسے باغی اور طاغی بڑے بڑے کاروبار کے مالک جو مکہ اور مکہ سے گذر کر پورے عرب پر چھائے ہوئے ہوں، سورہ ھمزہ کا میں انہی جیسوں کے لئے فرمایا گیا ہے:

"جہنم کی ہلاکت اور بربادی ہر ایسے شخص کے لئے جو دوسروں کے عیب نکالے اور ان کو نظرِ حقارت سے دیکھتے ہوئے طعنے دے ۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے مال بٹور رکھا ہے اور اُس کو بار بار گنتا رہتا ہے، سمجھتا ہے کہ اُس کا مال ہمیشہ اُس کے پاس رہے گا (اس کی سرمایہ داری پائدار ہوگی) ہرگز نہیں، بلاشبہ ایسا ہوگا کہ اُس کو حُطَمَہ میں ڈال دیا جائے گا ۔ تم جانتے ہو حُطَمَہ کیا ہے وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں کو جھانک لیتی[1] ہے ۔ بلند اور دراز ستونوں کی طرح اس آگ کے شعلے ہوں گے ان لوگوں

---

[1] ایمان ہو تو نہیں جلاتی کفر ہو تو جلا ڈالتی ہے ۔ شاہ عبدالقادر صاحبؒ

کو ان آتشیں ستونوں میں گھیر کر بند کر دیا جائے گا"۔ (سورہ ھمزہ ع۱۰۴)

سورہ ھمزہ کو بار بار پڑھئے آپ کو سرمایہ داروں کے اس غیر معمولی اشتغال کا سبب معلوم ہو جائے گا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ابتدائی دور میں اسلام سے مشرف ہوگئے تھے۔ آپ کی مشہور روایت[1] ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیوار کعبہ کے سایہ میں تشریف فرما تھے۔ میں سامنے پہونچا تو آپؐ فرما رہے تھے " هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ"۔ رب کعبہ کی قسم قیامت کے روز یہی لوگ خسارہ میں ہوں گے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے یہ الفاظ سنے تو میں چونک گیا۔ مجھے خیال ہوا کہیں میرے بارہ میں بھی کوئی آیت نازل ہوئی ہے؟ میں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ آپ پر میرے ماں باپ قربان، یہ بدنصیب کون ہیں۔

فرمایا: جو سب سے زیادہ دولت مند ہیں۔ صرف وہ مستثنیٰ ہیں جو آگے پیچھے دائیں بائیں سب طرف خرچ کرتے رہیں۔

---

[1] ترمذی شریف صفحہ ج۱ ومسلم شریف صفحہ ۳۲۲ ج۱ وغیرہما

تعلیمات کا دوسرا رُخ

پڑھنا، لکھنا، تہذیب، تمدن

۱- تخلیق نواز اور انقلاب انگیز تعلیمات کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ مشہور مثل "کلام الملوک ملوک الکلام" کی وجد آفریں مثال بھی آپ کے سامنے آجائے گی۔

وحی کا آغاز لفظ "اِقْرَأْ" سے ہوا۔ اور اس اہمیت کے ساتھ کہ نام رب بھی بعد میں لایا گیا - اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ "پڑھو اپنے رب کے نام سے" پھر پروردگار (رب) کی تین صفتیں بیان کی گئیں خَلَقَ، اَلْاَكْرَم ۔ عَلَّمَ ۔ زیادہ زور عَلَّمَ پر دیا گیا (عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ) تعلیم دی قلم کے ذریعہ ۔ سکھایا انسان کو وہ جو نہیں جانتا تھا۔

کیا اس اسلوب کلام سے ہمیں یہ سبق نہیں ملتا کہ جو شخص اس وحی پر ایمان لائے اس

لہ جس طرح یہ سبق ملتا ہے کہ معلم حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ انسان کو وہ باتیں سکھاتا ہے جو وہ نہیں جانتا وہ جس طرح قلم کے ذریعہ سکھاتا ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ "امّی محض" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بلا کسی سکھے علم الاولین والآخرین سے نوازدے عَلَق (خون بستہ) یعنی لہو کی پھٹکی ۔ اس کو علم سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی ۔ خون کی پھٹک کے لئے علم کا تصور بھی بے محل ہے۔ لیکن خدا رقادر پروردگار عالم اس علق سے انسان کو پیدا کرتا ہے اور علم بے پایاں کی دولت سے نوازتا ہے۔ وہی رب ذوالجلال. محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے اُمّی کو جوہر علم سے آراستہ کر رہا ہے۔ بلا شبہ کسی اُمّی کو نہیں کہا جاسکتا کہ پڑھ ۔ پڑھنے کا حکم اس کے حق میں تکلیف مالا یطاق ہے مگر ربّ محمد کا حکم محمدؐ کے لئے تکلیف مالا یطاق نہیں ہے، کیونکہ جو حکم کر رہا ہے وہ پہلے ہی محمد کو (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ جوہر عطا کر چکا ہے جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب اقرأ کا اہل اور محل بنا دیا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

کا پہلا فرض قرأت اور تعلیم[1] ہے۔ اور تعلیم بھی وہ نہیں جو ماں باپ بچوں کو زبانی دیدیتے ہیں۔ بلکہ تعلیم ایسی جس میں پڑھنا بھی ہو اور قلم سے لکھنا بھی۔

۲۔ کچھ توقف کے بعد دوبارہ سلسلہ وحی شروع ہوا تو اس کا پہلا لفظ تھا: یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۝ ("اے لحاف میں لپٹنے والے")

اس المدثر کو چھ کاموں کی ہدایت کی گئی۔

(۱) دعوت و تبلیغ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ (۲) تعظیم رب (عبادت) وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ ۝ (۳) ظاہر کی پاکی اور صفائی وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ ۝ (۴) باطن کی پاکی و صفائی وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ ۝ (۵) بے لوث خدمت وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَکْثِرُ ۝ (۶) رضاء مولیٰ کو نصب العین

[1] تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے کے لئے یہ موضوع بہت دلچسپ ہے کہ وہ تحقیق کرے کہ اس وقت تعلیم کے بارے میں اقوام عالم کی حالت کیا تھی اور ان کا ذوقِ تعلیم کہاں تک سرد پڑ چکا تھا۔ مغربی یورپ، انگلینڈ، جرمنی وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ وہاں تو انسان ابھی پہاڑ کی گھاٹی اور پھونس کی جھونپڑی سے بھی نہیں نکلا تھا۔ رات کو ایک ہی جھونپڑی میں اپنے مویشی کے ساتھ بند ہوتا تھا۔ مشرقی یورپ جہاں "رومن لا" کا اقبال چمک رہا تھا، وہاں بھی علم اور تعلیم کی کچھ دولت تھی تو صرف کلیسا کے تاریک کناروں میں چھپی ہوئی۔ کلیسا سے باہر یا دولتِ علم سے آشنا ہی نہ تھے یا تعلیم اُن کے لئے ممنوع تھی اور کلیسا کے علماء بھی صرف نفع اندوزی کی کی حد تک علم کے قدر دان تھے۔ اگر نفع کسی کتاب کی فروخت سے ہوتا یا چمڑے پر لکھی ہوئی کتاب کے حروف مٹا کر چمڑہ فروخت کر دینے میں نفع ہوتا تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ (موسیو لیبان)

ہندوستان کا حال معلوم ہے کہ یہاں صرف براہمہ ہند علم کے مالک سمجھے جاتے تھے اور غیر برہمن میں سے آدھی سے زیادہ مخلوق شودر تھی، وہ علم حاصل تو کیا کر سکتی اگر علم کی بھنک بھی کان میں پڑ جاتی تو کان میں شیشہ پگھلا دیا جاتا۔ (منوسمرتی)

ایران اور فارس میں عیش پرستی علم پر غالب تھی اور چین وا فریقہ کا ماضی اُن کے موجودہ حال سے معلوم ہو رہا ہے۔ امریکہ و کناڈا، آسٹریلیا، ربع مسکون سے خارج تھا تو انسانی دنیا سے بھی خارج تھا۔

بنا کر اس پر جم جانا، صبر و استقامت سے کام لینا۔ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (المدثر)

لفظ الْمُدَّثِّرُ سے خطاب اور اس کے بعد یہ احکام کیا ان کا اشارہ یہ نہیں ہے کہ خدا پرستی اور تلاش حق، ہمدوش تہذیب و تمدن ہونی چاہیئے۔

له المدثر دثار سے ماخوذ ہے۔ دثار کا ترجمہ حضرت شاہ عبد القادر صاحبؒ نے لحاف فرمایا ہے کیونکہ دثار اس کپڑے کو بھی کہا جاتا ہے جس سے گرمائی حاصل کی جائے (مجمع البحار) لیکن عرف میں دثار اس کپڑے کو کہتے ہیں جو اس کپڑے کے اوپر پہنا جائے جو بدن سے متصل رہتا ہے۔ جو کپڑا بدن سے لگا رہتا ہے اس کو شعار کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات انصار کے متعلق فرمایا تھا "انتم الشعار والناس دثار" یعنی تم میرا وہ لباس ہو کہ اگر تم الگ ہو جاؤ تو بدن ننگا ہو جائے اور دوسرے لوگ اوپر کا آرائشی کپڑا ہیں وہ اگر الگ ہو جائیں تو بدن برہنہ نہیں ہوگا۔ مختصر یہ کہ دثار میں صرف ستر پوشی نہیں ہوتی بلکہ اس سے ایسی آرائش ہوتی ہے جو تہذیب کے تقاضے کو پورا کرے جیسے ہندوستان میں شیروانی یا اچکن اور عرب کے پرانے قاعدہ کے مطابق چادر اور دور حاضر میں عبا۔ پس لفظ المدثر اور اس کے بعد کے الفاظ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ یہ تصور پیدا کر رہے ہیں کہ داعی الی اللہ کو پورے لباس سے آراستہ ہونا چاہیئے اور لباس بھی ایسا جو پاک صاف ہو۔ یعنی اسلام جب رہبانیت یا سادھو پنے کو پسند نہیں کرتا تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ اس کا داعی برہنہ یا صرف ستر پوش (لنگوٹی کسنے والا) نیم برہنہ ہو۔ برہنگی یا نیم برہنگی دونوں حرام ہیں۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ پورا لباس اسی وقت ہو سکتا ہے جب تمدن اس حد تک پہونچا ہوا ہو کہ کپڑا تیار ہو سکے وہ سل سکے وغیرہ وغیرہ۔ پس اس بات سے انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ کلام اللہ شریف کے اس اسلوب خصوصاً ان الفاظ سے جیسے تہذیب و تمدن کی قدر افزائی ہوتی ہے۔ ایسے ہی صنعت و حرفت، تبادلہ، تجارت وغیرہ اُن تمام عوامل کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جو کسی انسان کے "المدثر" لحاف پوش، یا مہذب لباس پوش ہونے کے لئے ضروری ہوں اور جب ستر پوشی فرض ہے تو لباس و پوشاک کا تیار کرنا اور اس کی تیاری کے جملہ ذرائع مہیا کرنا بھی مسلمانوں کے حق میں اجتماعی فریضہ ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب

دلیلِ صداقت[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی بہت سی دلیلیں پیش کی گئی ہیں مستقل کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ احادیث اور تاریخی روایات کے علاوہ خود قرآن حکیم نے بہت سی دلیلوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہاں صرف دو دلیلیں پیش کی جارہی ہیں۔ ہر ایک انصاف پسند کے لئے یہ دو دلیلیں کافی ہیں۔

پہلی دلیل: خود آپ کی زندگی (صلوات اللہ علیہ وسلامہ ابداً دائماً) آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کے سامنے بھی آپ کی سابقہ زندگی تھی۔ اسی زندگی کے معیار پر حضرت خدیجہ نے غارحرا کے واقعہ کو پرکھا اور بغیر اختیاری طور پر آپ کی نبوت کی معترف ہوگئیں۔ اور جب آپ نے پوری قوم کے سامنے دعوت پیش کی تو وحی خداوندی نے ہدایت کی کہ آپ اپنی قوم سے یہ کہیں کہ یہ دعوت تو میں آپ کو پیش کر رہا ہوں۔ لیکن

"واقعہ یہ ہے کہ میں اس سے پہلے تم لوگوں کے بیچ میں اپنی پوری عمر بسر کرچکا ہوں۔ کیا تم سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے"

(سورہ یونس ۱۰، آیت ۱۶)

تشریح: وحی الٰہی کی تلقین یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اپنی صداقت کے ثبوت کے لئے لوگوں سے کہیں کہ ساری باتیں چھوڑ دو۔ صرف اسی بات پر غور کرو کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں ہوں جس کے حالات و کردار کی تمہیں خبر نہ ہو۔ میں تم ہی میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسر کرچکا ہوں۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہارے

---

[1] سیرۃ کی عام کتابوں میں یہ عنوان نہیں ہوتا مگر کتاب اللہ نے آغاز قرآن میں جب نوع انسان کو عبادت کا حکم دیا تو ساتھ ساتھ صداقت کتاب اللہ کی دلیل بھی ایسی پیش کی جس کے ساتھ رسول خدا کی صداقت بھی ضروری ہوجاتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے سورہ بقرہ، رکوع ۳

آنکھوں کے سامنے رہی ۔ بتلاؤ اس تمام عرصہ میں کوئی ایک بات بھی سچائی اور امانت کے خلاف مجھ میں دیکھی ۔ تم نے نہ صرف صادق اور امین کہا، بلکہ صادق اور امین میرا لقب کر دیا۔ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان[1] باندھنے کے لئے تیار ہوں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں کہ مجھ پر اس کا کلام[2] نازل ہوتا ہے کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم سمجھ نہیں سکتے ۔

دوسری دلیل خود قرآن شریف (کلام اللہ)

سچے آدمی کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل خود اس کی زندگی ہے اور اپنی زندگی کو دلیلِ صداقت کے طور پر وہی پیش کر سکتا ہے جو فی الواقع سچا ہو اور اپنی سچائی پر اس کو پورا یقین

---

[1] تمام علماء اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس سال کا زمانہ اس کے اخلاق اور خصائل کے ابھرنے اور پنپنے کا اصلی زمانہ ہوتا ہے ۔ پس اگر ایک شخص چالیس برس تک صادق و امین رہا ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذّاب اور مفتری بن جائے کہ انسانوں پر ہی نہیں بلکہ اُس خدا پر بہتان باندھنے لگے جس کو وہ اپنا خالق و مالک جانتا ہے ——— جس کی عظمت کا معترف ہے، جس کے قہر و غضب سے وہ خود بھی ڈرتا ہے اور لوگوں کو بھی ڈراتا رہا ہے، جس کی عبادت میں شب و روز مشغول رہتا ہے جس کا ذکر ہر وقت اس کی زبان پر رہتا ہے اور ہر وقت وہ اپنی کوتاہیوں کی معافی اسی رب سے مانگتا رہتا ہے جیسا کہ احادیث میں ہے کہ ایک ایک مجلس میں ستر ستر بار الفاظ استغفار زبانِ مبارک پر آجاتے تھے پھر یہی خدا پرستی اور خدا ترسی کی لگن ہے جس کی وجہ سے اس کی قوم اس سے ناراض ہو رہی ہے اور وہ قوم کی نگاہوں میں معتوب ہو رہا ہے ۔ کیا یہ شخص جھوٹا ہو سکتا ہے ۔

[2] جب کہ کلام بھی ایسا ہو کہ اس کا کوئی فقرہ بھی خدا کے ذکر سے خالی نہ ہو کہیں اس کے قہر و غضب کا ذکر ہو کہیں لطف و کرم کا، کہیں اس کے ہمہ گیر علم کو بیان کر کے بتایا گیا ہو کہ انسان جو بھی کرتا ہے اللہ اس کو دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے ۔ انسان کو اپنے ہر فعل اور ہر ایک قول کا جواب دینا ہوگا ۔ وغیرہ وغیرہ

ہو جس کے عمل نے کبھی ضمیر سے بغاوت نہ کی ہو اور جس کا ضمیر اپنے کردار و عمل سے ہمیشہ مطمئن رہا ہو۔ "آفتاب آمد دلیل آفتاب" لیکن آفتاب دلیل انھیں کے لیے بن سکتا ہے جو آفتاب کو دیکھ رہے ہیں۔ جنھوں نے آفتاب نہیں دیکھا انھیں تو کسی اور ہی شاہد کی ضرورت ہوگی۔

قرآن حکیم (کلام اللہ) کہتا ہے: وہ شاہد میں ہوں، خود اپنی صداقت کی بھی دلیل ہوں اور صداقت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دلیل بھی میں ہی ہوں۔

وہ عرب جن کو مطمئن کر کے تمام دنیا کے لئے داعی بنانا تھا۔ کلام الٰہی کا خطاب ان سے ہے:

"تم اہلِ لسان ہو، اپنی زبان کے عاشق ہو، ایسے عاشق کہ شعر و سخن ہر ایک کی گھٹی میں پڑا ہے۔ شعر و سخن کی یہی گرم بازاری ہے کہ قومی میلوں اور تہواروں کے موقع پر خصوصاً زمانۂ حج میں جب سارے عرب کے چیدہ دماغ منیٰ میں جمع ہوتے ہیں تو کئی کئی روز تک مشاعروں کی محفلیں گرم رکھتے ہو اُن میں بڑی شان سے مقابلہ کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں، پھر جو قصیدے سب سے اونچے مانے جاتے ہیں اُن کی یہاں تک قدر کرتے ہو کہ خانہ کعبہ میں جہاں تمہارے بہت سے معبود رہتے ہیں اس قصیدہ کو بھی ایک معبود بنا کر آویزاں کرتے ہو اور تمہارے ذوق و شوق کا عالم یہ ہوتا ہے کہ اُن کے سامنے ماتھا رگڑتے ہو، اُن کو سجدہ کرتے ہو اور صرف قصیدے ہی کو نہیں بلکہ شاعر کو بھی غیر معمولی طاقت کا انسان سمجھنے لگتے ہو کہ اس کے ساتھ جن رہتا ہے، جو ایسا غیر معمولی شعر اس کو سکھا دیتا ہے۔ اب دیکھو "محمد" صلی اللہ علیہ وسلم بھی تمہارے سامنے ہیں جنھوں نے کبھی کسی اُستاد کے سامنے زانوے تلمّذ طے نہیں کیا۔ کبھی کسی کی شاگردی نہیں کی، کبھی کسی مکتب میں نہیں پڑھا، کبھی کوئی شعر نہیں کہا، کبھی شعر و سخن کی مجلس میں شرکت نہیں کی۔ تم نے اُس کو صادق اور امین تو کہا مگر نہ کبھی شاعر کہا، نہ کبھی خطبا اور مقررین میں اُن کو شمار کیا۔ اس محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے ایک کلام تمہارے سامنے پیش کیا

جا رہا ہے۔ محمدؐ کہتے ہیں کہ یہ کلام میرا نہیں، یہ کلام خدا کا کلام ہے جو میرے اوپر نازل ہوتا ہے۔ جیسا نازل ہوتا ہے بجنسہ اور بعینہ آپ کو سنا دیتا ہوں۔ بس

"اگر تمہیں اس کلام کی سچائی میں شک ہے جو ہم نے (اللہ تعالیٰ) اپنے بندے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کیا ہے تو اس کا فیصلہ بہت آسان ہے۔ اگر یہ محض انسانی دماغ کی بناوٹ ہے تو تم بھی انسان ہو۔ زیادہ نہیں۔) اس جیسی صرف ایک ہی سورت بنا لاؤ (اگر تمہارا عقیدہ ہے کہ جنات شعراء کے مددگار رہا کرتے ہیں تو تم ایسا کرو کہ) اللہ کے سوا جن (طاقتوں) کو تم نے اپنا حمایتی سمجھ رکھا ہے اُن سب کو بھی اپنی مدد کے لئے بلا لو۔ اگر تم سچے ہو تو ایسا ضرور کر لو۔ اور اگر تم ایسا نہ کر سکو، اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ کے عذاب سے ڈرو جو (لکڑی کی جگہ) انسان اور پتھر کے ایندھن سے سلگتی ہے اور منکرینِ حق کے لئے تیار کی جا چکی ہے۔" (سورہ بقرہ ۲ آیت ۲۳)

کلام اللہ کی شوکت و قوت اور اپنی صداقت کا یقین حیرت انگیز ہے۔ ایک شخص جس کے ساتھ صرف چند افراد ہیں جن کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے وہ نہ صرف قریش کو نہ صرف اہلِ مکہ کو بلکہ ہر ایک عربی بولنے والے بلکہ پوری دنیا میں جو بھی شک و شبہ کرے خواہ وہ کوئی ہو، ان سب کو چیلنج کر رہا ہے۔ چیلنج معمولی نہیں ہے، ایسا سخت اور تلخ چیلنج جو معمولی سے معمولی انسان کی غیرت کو بھی اس درجہ مشتعل کر دے کہ وہ اپنے تمام ذرائع اور وسائل کو کام میں لاکر چیلنج کا جواب دینے کے لئے بوکھلا جائے۔ مضمون چیلنج دوبارہ ملاحظہ فرمائیے:

اگر تم اس چیلنج کو قبول نہیں کر سکتے اور اس جیسی کوئی ایک سورت نہیں لا سکتے تو یقین کر لو کہ تم باطل پر ہو۔ تم حق کا مقابلہ کر رہے ہو۔ تم عذابِ

الٰہی کے مستحق ہو تمہارا ٹھکانا دوزخ ہوگا، جس کا ایندھن تم جیسے انسان اور پتھر ہوں گے۔"

قرآن حکیم کی ایک سورت ۱۰۸ سورہ کوثر بھی ہے جس میں صرف تین آیتیں (جملے) ہیں جن کے کل الفاظ (کلمات) اٹھارہ ہیں۔

چیلنج کا خلاصہ یہ ہے کہ حق و باطل اور سچائی اور بناوٹ کا فیصلہ اس پر ہے کہ تم صرف ایسا کلام پیش کردو جو ۱۸ لفظوں پر مشتمل ہو۔ مگر وہ اپنے ظاہری اور معنوی کمالات میں اس جیسا ہو۔ تمام دنیا کے ادیبوں کی مجلسیں اور شعر و سخن کے کمالات کا فیصلہ کرنے والے جج موجود ہیں۔ کسی بھی عدالت، کسی بھی ادبی مجلس میں موازنہ کے لئے پیش کردو۔ اگر تمہارے حق میں فیصلہ ہو جائے تو مان لیا جائے گا کہ یہ کلام اللہ کا کلام نہیں ہے، محمدؐ کی من گھڑت ہے (معاذ اللہ)۔

پھر یہ چیلنج صرف ایک مرتبہ اتفاقی طور پر نہیں بلکہ مختلف عنوانوں سے بار بار دہرایا گیا اور اسی قوت کے ساتھ دہرایا گیا مثلاً:

(۱) سورہ ۱۱ ہود مکہ معظمہ میں نازل ہوئی۔ اس کی آیت ۱۳ جو اس سلسلہ کی سب سے پہلی آیت ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:

"کیا لوگ ایسا کہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ قرآن اپنے جی سے گھڑ کر خدا پر بہتان باندھا ہے۔ آپ کہہ دیجئے اگر تم اپنی اس بات میں سچے ہو تو اس طرح کی دس سورتیں گھڑی ہوئی بنا کر پیش کردو۔ اور اللہ کے سوا جس کسی کو اپنی مدد کے لئے پکار سکتے ہو اس کو پکار لو۔"

پھر دو آیتوں کے بعد آیت ۱۶ کا ترجمہ یہ ہے:

یہ لوگ (جو صرف دنیاوی مفاد اور آسائش کے لئے حق سے اعراض کرتے ہیں اور اس کلام کو اللہ کا کلام نہیں مانتے) یہی وہ ہیں جن کے لئے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔" (آیت ۱۶)

(۲) سورہ ۱۰ یونس بھی مکہ میں نازل ہوئی، اس کی آیت ۳۸ میں بھی اس چیلنج کو دہرایا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ کے نام پر یہ بہتان باندھا ہے
تم کہہ دو اگر تم اس قول میں سچے ہو تو قرآن کی مانند ایک سورت بنا کر
پیش کر دو۔ اور خدا کے سوا جن جن ہستیوں کو اپنی مدد کے لئے بلا سکتے
ہو (تمہیں پوری اجازت ہے) بلا لو" (آیت ۳۸)

(۳) پہلے دس سورتوں کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس مرتبہ صرف ایک سورت کا۔ پھر سورہ ۵۲ طور میں "سورہ" کا لفظ بھی نہیں بلکہ حدیث (کلام، بات) کا لفظ آیا ہے:

فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ الخ آیت ۳۴ (ترجمہ) "اس طرح کا کوئی کلام لے آئیں اگر سچے ہیں"۔

(۴) سورہ بنی اسرائیل میں اعلان کیا گیا:

"اگر تمام انسان اور جن اکٹھے ہو کر چاہیں کہ اس قرآن کے مانند کوئی کلام
پیش کر دیں تو کبھی بھی پیش نہیں کر سکیں گے۔ اگرچہ ان میں سے ایک دوسرے
کا مددگار ہی کیوں نہ ہو" (آیت ۸۸)

(۵) یہ آیتیں وہ ہیں جن میں چیلنج صراحت کے ساتھ کیا گیا ہے:

"اس جیسا قرآن پیش کر دیں" (۱۷/۸۸)
"دس سورتیں بنا لائیں" (۱۱/۱۳)
"ایک سورت بنا لائیں" (۱۰/۳۸)
"ایک سورت بنا لائیں" (۲/۲۳)
"اس طرح کا کوئی کلام لے آئیں" (۵۲/۳۴)

ان آیتوں کے علاوہ اور بہت سی آیتیں ہیں جن میں بطور اشارہ و کنایہ اس چیلنج کو

بار بار دہرایا گیا ہے۔ اس چیلنج کے مخاطب عرب کے وہی فصحاء اور بلغاء ہیں جن کو اپنی ادبیت اور فصاحت و بلاغت پر ناز تھا جو اپنے زمانہ میں بھی عربی ادب کے اُستاد مانے جاتے تھے اور آج بھی اُستاد مانے جاتے ہیں۔

کیا قرآن پاک اور قرآن پاک کے پیش کرنے والے "محمد" صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے لئے یہ آفتاب جیسی کھلی ہوئی دلیل کافی نہیں ہے کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا جس میں اکثریت قرآن اور اسلام کے مخالفین کی ہے چودہ سو برس سے اس چیلنج کو سُن رہی ہے مگر اس کو منظور کرنے سے آج بیسویں صدی عیسوی میں بھی اسی طرح عاجز ہے جیسے ساتویں صدی عیسوی میں عاجز تھی جب یہ قرآن نازل ہو رہا تھا۔

قریش جو اس کے مخاطب اوّل تھے اُن سے یہ نہ ہوسکا کہ ۸۱ لفظ کا کوئی مرتب کلام اس چیلنج کے جواب میں پیش کر سکیں۔ اس کے سوا جو کچھ تدبیریں وہ کر سکتے تھے وہ سب کر لیں۔ مثلاً منصوبہ بند طریقے سے ممانعت کردی کہ کوئی قرآن نہ سنے اور جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بازاروں، میلوں اور پبلک مقامات پر کھڑے ہو کر سنانا شروع کیا تو منصوبہ یہ تھا کہ اتنا شور مچایا جائے کہ "محمد" صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کسی کے کان میں نہ پڑ سکے[1]

اگر کوئی اجنبی شخص اس شور و غل پر اعتراض کرنے لگے تو کبھی کہہ دیا جائے معاذ اللہ مجنون ہوگیا ہے۔ کبھی یہ کہہ دیا جائے کہ یہ جادوگر ہے۔ یہ منتر پڑھتا ہے تو ماں بیٹے سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ بیوی اپنے شوہر سے اور بھائی بھائی سے جدا ہو جاتا ہے[2]

یہ ابتدائی تدبیریں تھیں۔ پھر جو کچھ کیا گیا، اسلام لانے والوں کو طرح طرح ستایا گیا۔ پھر اُن کا بائیکاٹ کیا گیا۔ اُن کو ترکِ وطن پر مجبور کیا گیا اور جب وطن ترک کر چکے تو مدینہ پر بار بار حملے کر کے اُن کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب کچھ کیا گیا مگر یہ نہ ہوسکا کہ قرآن حکیم کے چیلنج کا جواب دیدیں اور ایک سورت اس کے مقابلہ میں پیش کر کے صداقتِ قرآن اور صداقتِ محمدؐ کی تردید کر دیں۔

---

[1] ۱۵ حٰم سجدہ آیت ۲۶ [2] سورہ ۵۱ الذاریات آیت ۵۲، سورہ ۵۲ الطور آیت ۲۹ وغیر ذلک

یہ صداقت کی دوسری دلیل تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی اور یہ دلیل جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ورود مسعود میں برھان قاطع اور حجۃ کاملہ تھی، آج چودہ سو برس کے بعد ایسی ہی درخشاں اور تاباں دلیل ہے جو پوری دنیا کو للکار رہی ہے لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۝ ——— (سورہ بنی اسرائیل ۱۷، آیت ۸۸)

ضمیر سے بغاوت کی یہ بدترین مثال تاریخ نے فراموش نہیں کی کہ قریش کے یہی سرغنہ ابوجہل، اخنس بن شریق اور ابو سفیان جو دوسروں کو قرآن شریف سننے سے منع کرتے تھے، راتوں کو چھپ چھپ کر خود قرآن شریف سنا کرتے تھے۔ رات کے آخری حصہ میں جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھینی بھینی آواز سے قرآن شریف پڑھتے تھے تو قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت صدا، پُرسوز میں عجیب کیفیت پیدا کردیتی تھی، جو ایک دفعہ سُن لیتا وہ بار بار سننے کے لئے بے چین رہتا۔ ان سرداروں کو کسی طرح سننے کا اتفاق ہوگیا تو پھر جب موقع ملتا خلوت کدہ کے آستانہ مبارک پر پہنچ جاتے اور کان لگائے سنتے رہتے۔ کبھی آپس میں مڈبھیڑ بھی ہوجاتی تو ہر ایک دوسرے کو ملامت کرتا۔ مگر یہ ایک ایسا جرم تھا جس سے باز رہنا مشکل تھا۔ البتہ نوجوانوں کو منع کرتے ہیں۔ سب کا اتفاق تھا کہ اگر وہ گرویدہ ہو گئے تو ہماری طرح اپنے ضمیر سے بغاوت نہیں کرسکیں گے[۲]

---

[۱] اگر تمام انسان اور سارے جن اس پر متفق ہوجائیں کہ اس قرآن جیسا قرآن پیش کردیں تو وہ اس جیسا قرآن پیش نہیں کرسکیں گے، خواہ وہ اس میں ایک دوسرے کی کتنی ہی مدد کریں۔ [۲] سیرۃ ابن ہشام ص۱۹۳ ج۱ البدایہ والنہایہ ص۶۴ ج۳ الاصابہ ص۲۵ ج۱ ذکر اخنس بن شریق

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیثیت
فرائض اور خصوصیات

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے "محمد" صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ۝

(سورۂ احزاب)

"اے نبی ہم نے تم کو بھیجا ہے اس شان سے کہ آپ

۱۔ شہادت دینے والے ہیں۔

۲۔ بشارت دینے والے ہیں۔

۳۔ آگاہ کرنے والے ہیں۔

۴۔ خدا کی طرف بلانے والے ہیں۔

۵۔ خدا کی طرف سے دعوت دینے کے مجاز ہیں۔

۶۔ چراغ ہیں روشنی دینے والے۔

یہ معجزانہ بلاغت ہے کہ خطاب ایسے الفاظ سے کیا گیا جس سے یہ بنیادی حیثیت پہلے ظاہر ہو گئی کہ آپ خدا کے بھیجے ہوئے نبی ہیں۔ اس کے بعد مندرجۂ بالا چھ خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں:

پہلی خصوصیت اور نبی اور فلسفی کا فرق پہلی خصوصیت یہ ہے کہ آپ حق بات کو اس یقین

اور ایسے وثوق اور بھروسے سے بیان کرتے ہیں جیسے کوئی آنکھوں دیکھی چیز کی شہادت دیتا ہے۔

یہ فرق ہے نبی اور فلسفی میں۔ فلسفی کے پاس قیاس، تخمینے اور تجربے ہوتے ہیں۔ تجربوں کی بنیاد اگرچہ بسا اوقات مشاہدہ پر ہوتی ہے مگر انسان کا مشاہدہ بھی بسا اوقات غلطی کرتا ہے۔

ہزاروں برس تک دنیا کے فلسفی (جن میں سقراط، ارسطو اور افلاطون جیسے ماہر بھی داخل ہیں جو فلاسفہ کے امام مانے جاتے ہیں) یہی یقین کرتے رہے کہ چاند اور سورج آسمانوں میں گڑے ہوئے ہیں، آسمان زمین کو گھیرے ہوئے ہیں اور وہ زمین کے گرد گھوم رہے ہیں۔ زمین اپنی جگہ ساکن ہے۔ یہ نہ حرکت کرتی ہے نہ کر سکتی ہے۔ یہ سب کچھ وہ اپنے مشاہدہ کی بنا پر کہتے رہے ان کی عظیم الشان رصدگاہیں اسی یقین کی تصدیق کرتی رہیں اور اپنے اس یقین کی بنا پر انھوں نے نجوم، جوتش وغیرہ بہت سے فن ایجاد کئے اور یقین کرتے رہے کہ یہ تمام فنون اور اُن کی یہ تمام تحقیقات صحیح اور درست ہیں۔ ان میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں[1]۔ مگر آج سائنس کی تحقیق یہ ہے کہ یہ جو کچھ تھا فریبِ نظر تھا۔ آج کی دنیا میں اس سے بڑا احمق اور جاہل کوئی نہیں جو آسمان کو گھومتا ہوا مانے اور چاند سورج کو اس میں جڑا ہوا سمجھے۔

ان فلاسفہ کو پورا یقین تھا کہ ہماری زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں وہ فوراً ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ اُن کے فلسفی ضابطہ کا فیصلہ یہی تھا کہ حرکت اور اس کے اثرات کا کوئی اپنا وجود ہی نہیں ہے لہٰذا اُن کے بقاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری آواز اور ہمارے الفاظ زبان کی حرکت کا اثر ہے جو ساتھ ساتھ ختم ہوتا رہتا ہے۔ لیکن آج ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ جو لفظ زبان سے نکلتا ہے وہ باقی رہتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جو الفاظ انسانوں کی زبان سے بولے گئے وہ سب فضا میں موجود ہیں۔

---

[1] ان کے اس یقین میں بسا اوقات جارحیت ہوتی تھی وہ اپنے مخالف کو سختی سے سخت سزا کا مستحق سمجھتے تھے انہیں کے پیش رو وہ تھے جنھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نذر آتش کرنے کے لئے جہنم تیار کیا تھا۔

بہرحال سابق فلاسفہ نے جو باتیں صرف ذہانت سے معلوم کی ہیں اور موجودہ فلسفی جن باتوں کا مشاہدہ کر رہے ہیں ان تمام تحقیقات اور مشاہدات کے باوجود یہ سب قدیم اور جدید فلاسفہ اور ماہرین سائنس یہی سمجھتے رہے اور یہی سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہماری تحقیق ہے وہ حرف آخر نہیں ہے، ممکن ہے کوئی جدید تحقیق اس تحقیق کو غلط قرار دیدے۔ لہٰذا یہ یقین کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہی حرفِ آخر ہے اور وہی حق ہے اس کے سوا باطل ہے۔ یہ یقین فلسفی کو میسّر نہیں آتا۔ اس کو خود اپنی تحقیق کے اندر شک رہتا ہے اس بنا پر وہ اطمینان سے محروم رہتا ہے۔ اور جب اطمینان کی دولت خود اس کے پاس نہیں ہوتی تو وہ کسی دوسرے کو یہ دولت کہاں سے دے سکتا ہے اور جب اس کو اپنی تحقیق پر مکمل اطمینان اور یقین نہیں ہوتا تو اس کے لئے فدا ہو جانے اور قربان ہونے کا جذبہ بھی اس کے اندر نہیں ہوتا۔ لہٰذا عمل کے لحاظ سے وہ عموماً کوتاہ رہتا ہے۔

مادّہ کی طرح روح اور خدا سے تعلق رکھنے والے مسائل (مثلاً خالق کائنات کی ذات و صفات، اس سے انسان کا تعلق، حیات بعد الممات، عمل اور پاداش عمل جیسے مسائل) میں بھی فلسفی کا فیصلہ دو ٹوک نہیں ہوتا۔ اس کا ترقی پذیر دماغ جس چیز کو آج روشنی سمجھتا ہے وہی چیز اگلے روز اس کو تاریک نظر آتی ہے اور سکون و اطمینان کے بجائے اس کا دماغ نئے خلجان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے پیروکار جو بصیرت سے محروم اور اندھی تقلید کے عادی ہوں، فلسفی کے کسی نظریہ کے معتقد ہو جائیں، مگر ان کی یہ تقلید بھی شک و شبہ کی گرد سے پاک نہیں ہوتی اور یہی سبب ہوتا ہے کہ اس کے مخالف اور متضاد نظریہ کو بھی حق[1] سمجھنے لگتے ہیں۔

قرآن حکیم میں بار بار کہا گیا ہے کہ ان عقل پرستوں کے پاس جو کچھ ہے وہ "ظن" ہے جو شک و

---

[1] برادران وطن کے دھرم کا مدار وحی پر نہیں ہے کیونکہ وہ نبوّت کو نہیں مانتے ان کے دھرم کا مدار فلسفہ پر ہے۔ وہ اپنے رشیوں اور مُنیوں کو فلسفی ہی مانتے ہیں۔ اسی کا اثر ہے کہ کسی ایک عقیدہ اور نظریہ پر ان کو یقین نہیں ہوتا وہ ہر ایک عقیدہ کو صحیح ماننے لگتے ہیں۔ وہ اس کو وسعت نظر اور فراخیٔ ظرف سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا سبب گم گشتگی نظر اور فقدان یقین ہے۔

شبہ اور خلجان کے گرد و غبار سے پاک اور صاف نہیں۔ جہاں حق کی ضرورت ہو وہاں "ظن" کام نہیں دے سکتا۔[1]

مکڑی کا جالا کرم شب تاب کو الجھا تو سکتا ہے اس کو منزل تک نہیں پہونچا سکتا۔ قطب مینار کی بلندی تک وہی رسّی پہونچا سکتی ہے جو نہایت مضبوط ہو۔ نبی کے پاس حق اور یقین کی یہی مضبوط رسّی ہوتی ہے جو اس کو اس کا رب اور معبود عطا کرتا ہے[2] اور اس کو یقین ہوتا ہے کہ یہ رسّی خود اس کے رب کی عطا کردہ ہے۔ وہ اپنی جان قربان کر سکتا ہے۔ مگر اس رسّی کو نہیں چھوڑ سکتا۔

اس یقین کا ثمرہ وہ غیر معمولی اعتماد اور توکّل ہوتا ہے جو نبی کو اپنے رب پر ہوتا ہے جو بڑی سے بڑی جابر و ظالم طاقت کے مقابلہ میں بھی اسکو پہاڑ کی چٹان بنائے رکھتا ہے اور سخت سے سخت خطرہ کے موقع پر بھی اس کا تصور یہ ہوتا ہے:

"ہم اس خدا پر اعتماد اور بھروسہ کیوں نہ کریں جس کا (فضل و کرم یہ ہے کہ روحانی اور مادی زندگی کے) تمام راستوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی ہے۔ بلاشبہ ہمیں یہ کرنا ہے کہ ہم اُن تمام اذیّتوں کے مقابلہ پر استقلال اور ضبط و تحمل سے کام لیں جو تم ہمیں پہنچا رہے ہو اور اللہ ہی ہے جس پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہیئے۔"

(سورۂ ابراہیم ۱۴، آیت ۱۱)

مختصر یہ کہ اللہ کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شاہد ہیں یعنی جو کچھ بتاتے ہیں وہ ایسے یقین کے ساتھ جو مشاہدہ سے بھی بڑھا ہوا ہوتا ہے، جس کی پشت پر حق و صداقت کی سرفروشانہ اور فداکارانہ پختگی ہوتی ہے۔

---

[1] سورہ والنجم ۵۳ آیت ۲۳ و ۲۸ [2] سورہ ۲ بقرہ آیت ۲۵۶ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ۔

دوسری خصوصیت یہ کہ جو لوگ اس حق و صداقت کو قبول کر لیتے ہیں اُن کو پہلی[1] بشارت یہ ہوتی ہے کہ اُنھوں نے سچائی کا راستہ پالیا اور خدا پرستی کے جس صراطِ مستقیم کی تلاش میں وہ سرگرداں تھے وہ صراطِ مستقیم اُن کو مل گیا۔ وہ تشنہ کام، جو تلاشِ حق میں سالہا سال سے سرگرداں رہے اُن کیلئے اس سے زیادہ بشارت کیا ہوسکتی ہے کہ وہ گوہر مراد اُن کے دامن میں آگیا جس کے لئے وہ بے چین تھے اور جس کی جستجو میں وہ اپنی عمر کھپا رہے تھے۔ دوسری بشارت یہ ہے کہ اس کے بہترین فوائد اور نتائج اُن کو موجودہ زندگی میں بھی میسّر آئیں گے اور اس عالم میں بھی میسّر آئیں گے جہاں حق و باطل کا فیصلہ ہوگا۔ جہاں کی زندگی حقیقی زندگی ہے اور جہاں کی کامیابی ابدی کامیابی ہے۔

تیسری حیثیت یہ کہ جو لوگ سچائی کے سامنے گردن نہ جھکائیں جو اس سے مونھ موڑیں اُن کو آگاہ کر دیں کہ وہ موجودہ اور آخرت کی زندگی کی کامیابیوں سے مونھ موڑ رہے ہیں اس کے بدترین نتائج اس زندگی میں بھی اُن کے سامنے آئیں گے اور اُس زندگی میں بھی جو حقیقی زندگی ہے۔ آپ کی حیثیت یہ ہے کہ آپ نذیر ہیں۔ (آگاہ کرنے والے)

چوتھی حیثیت یہ کہ آپ داعی الی اللہ ہیں۔ اور پانچویں حیثیت یہ ہے کہ آپ محض نظری خیراندیشی اور خیرسگالی کی بنا پر دعوت نہیں دیتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس جلیل اور عظیم خدمت کے لئے مامور ہیں۔

چھٹی خصوصیت وہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کا لب لباب ہے آپ کی تمام سوانح حیات ان دو لفظوں میں سموئی ہوئی ہے کہ آپ سراج منیر ہیں یعنی نوعِ انسان کی محفل میں رونق افروز ہیں مگر اس طرح کہ سراسر سوز وگداز ہیں اور یہ سوز وگداز ہی وہ نور ہے جو دوسروں کو روشن کر رہا ہے۔

---

[1] ایک سبق۔ نبی اور نہ صرف نبی بلکہ ہر ایک داعی حق کا یہ کام ہے کہ وہ پُرامید رہے اور جس کو وہ دعوت دے تو پہلے اس دعوت کے فائدہ بخش اور روشن پہلو اس کے سامنے رکھے۔

اس چھٹی خصوصیت کا مشاہدہ کرانے کے لئے حیاتِ مقدسہ کی مختصر سوانح آئندہ صفحات میں پیش کی جارہی ہے۔ (واللہ الموفق وھو المعین)

شمع سوزاں اور سراج منیر کو گُل کرنے کی کوشش

وہی "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) سردارانِ قریش جس کو "الصادق" اور "الامین" کہا کرتے تھے اس کی مقدس تعلیم کو جب اُنھوں نے اپنے مفادات کے لئے خطرۂ عظیم اور برق خرمن سوز سمجھا تو اب رات دن ان کی کوشش یہ تھی کہ اس آواز کو دبائیں اور اس شمع کو گُل کردیں۔ چنانچہ باپ دادا کے مذہب قدیم کے نام پر عوام میں اشتعال پیدا کردیا جس پر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور گنے چُنے مٹھی بھر مسلمانوں کے درپے ہوگئے، اس کے علاوہ خود ان کی سرگرمیاں نئے نئے ستم ایجاد کرنے میں مصروف رہنے لگیں۔ خانہ کعبہ کا حرم محترم جہاں خود اُن کے عقیدے کے بموجب کسی بھی جاندار کو ستانا گناہ تھا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) وہاں اپنے رب کی عبادت کرتے تو ستائے جاتے اور طرح طرح ستائے جاتے تھے۔ ایک دفعہ ابوجہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا: اگر میں نے دیکھ لیا کہ حرم کعبہ میں "محمد" اپنا چہرہ زمین پر رکھے ہوئے ہیں تو میں اسکی گردن اپنے پیر سے روندھ دونگا۔[1]

ابوجہل نے تو ایسا نہیں کیا لیکن اس کا دوست "عقبہ بن ابی معیط" اس سے بھی زیادہ حرکت کر گذرا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حرم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ عقبہ بن ابی معیط نے چادر گردن میں ڈالدی اور اتنی زور سے اس کو اینٹھا کہ "محبوبِ خدا" (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سانس

---

[1] بخاری شریف ص۷۴۲ لَاَطَئَنَّ عنقہٗ ۱۲

گھٹ گیا، آنکھیں باہر کو آنے لگیں۔

اتفاق سے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ وہاں پہنچ گئے۔ عقبہ کو دھکیل کر پیچھے کیا، چادر گردن مبارک سے ڈھیلی کی اور ان دشمنانِ حق سے کہا:

اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ (المؤمن)

"کیا تم ایک آدمی کو اس پر قتل کر رہے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے وہ روشن دلیلیں لایا ہے (جن کا تم انکار نہیں کر سکتے)"[1]

خانہ کعبہ کے قریب اکثر سردارانِ قریش کی نشست رہتی تھی۔ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مصروف تھے۔ ابوجہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا: فلاں محلہ میں اونٹنی ذبح ہوئی ہے، ایسا کرو کہ اس کا بچہ دان[2] اٹھالاؤ اور "محمد" کے سر پر رکھ دو۔ یہی بدبخت عقبہ بن ابی معیط کھڑا ہوگیا۔ اس محلہ میں گیا، بچہ دان اٹھوا کر لایا اور جب آپ سربسجود تھے، پورا الغوبا سر مبارک پر ڈال دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حرکت کرنی مشکل ہوگئی (یا بارگاہ خداوندی میں مظلومانہ[3] شکایت کے لئے قصداً حرکت نہیں کی)۔ مگر یہ بدبخت اپنی اس بدمستی پر خوش تھے اور

لہ بخاری شریف ص۱۰۰ ۲ سلا جزور۔ سلا بچہ دان (بخاری شریف وغیرہ)

۳ قانونِ اسلام کے ماہرین یعنی حضرات ائمہ مجتہدین کیلئے یہ واقعہ ایک دوسرے نقطۂ نظر سے موضوع بحث بن گیا کہ نماز کے لئے پاکی شرط ہے، جب اتنی پلیدی ڈالدی گئی تو کیا نماز باقی رہی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ ختم کیوں نہیں کیا۔ فقہی نقطۂ نظر سے یہ مسئلہ بحث طلب ہے۔ اس بنا پر امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدار نماز اور بقار نماز کی حالت میں فرق ہے۔ نماز کی ابتدار بیشک اس طرح کرنی چاہئے کہ بدن یا کپڑوں پر کوئی ناپاکی نہ ہو۔ لیکن بقار نماز کے لئے یہ شرط نہیں ہے لیکن دیگر ائمہ کا یہ مسلک نہیں ہے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر نماز میں ناپاکی اتنی دیر رہے کہ اتنی دیر میں ایک رکن ادا کیا جاسکتا ہے تب نماز نہیں ہوگی اور اگر اس سے کم وقفہ تک رہے تو نماز ہوجائے گی۔ جو حضرات ابتدار اور بقار دونوں کے لئے پاکی ضروری قرار دیتے ہیں ان کا ایک جواب وہ ہے جس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا (باقی بر صفحہ آئندہ)

قہقہے مارتے ہوئے ایک دوسرے پر ڈھلک رہے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چھوٹی صاحبزادی سیّدہ فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کو خبر ہوئی، وہ دوڑی ہوئی آئیں اور گندگی کے اس بوجھ کو سر مبارک سے ہٹایا[1]۔

جب حرم پاک میں رہنماؤں اور سرداروں کی یہ حرکتیں تھیں تو مکّہ کے عوام مکّہ کی گلیوں، کوچوں میں جو کچھ کر گذرتے کم تھا چنانچہ ایسا بھی ہوا کہ اوپر سے کوڑا کرکٹ "جسد اطہر" پہ ڈالا گیا۔ اور ایک پڑوسی عورت کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ وہ آپؐ کے راستے میں کانٹے

(بقیہ حاشیہ صفحہ) کیا گیا۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ناپاکی کا احساس ہوا تو آپ نے یقین فرمالیا کہ نماز ختم ہوگئی اور اسی لئے آپ کو اتنا صدمہ ہوا کہ آپؐ نے دعا فرمائی۔ باقی آپ کا اسی حالت میں رہنا احتجاجاً تھا یعنی آپ نے سر مبارک اس لئے نہیں اٹھایا کہ آپ بارگاہ رب العالمین میں یہ حالت پیش فرما کر احتجاج فرما رہے تھے۔ لیکن حقیقت ہے کہ یہ تمام تحقیق اس وقت ہے جب یہ مان لیا جائے کہ پاکی کے احکام اس واقعہ سے پہلے نازل ہو چکے تھے۔ لیکن اگر پاکی کا حکم وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (مدثر) بعد میں نازل ہوا تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حافظ ابن حجرؒ نے سورۂ مدثر کی تفسیر میں ابن منذر کی روایت پیش کی ہے سالتی علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سلی جزور فنزلت یعنی اس آیت کا سبب نزول ہی یہ واقعہ ہے۔ فتح الباری سورہ مدثر ص۵۱۱ ج۸

[1] بخاری شریف ص۳۷ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تکلیف پہونچائی جاتی تھی آپ اس کا انتقام تو کیا لیتے کبھی بددعا بھی نہیں کرتے تھے، البتہ حقوق اللہ کی توہین کی جاتی تھی تو آپ بے چین ہو جاتے تھے اور اس وقت بددعا کے الفاظ بھی زبان مبارک پر آجاتے تھے۔ یہاں اس وقت جو کچھ کیا گیا اس میں اول حرم کعبہ کی توہین تھی جو خود عقیدہ قریش کے بموجب بھی حق اللہ کی توہین تھی، دوم یہ کہ بارگاہ خدا میں سجدہ ریزی کی توہین تھی جس کو ہر ایک سلیم الفطرت انسان کی فطرت حق اللہ کی توہین سمجھتی ہے چنانچہ اس موقع پر ان سرداران قریش کے حق میں آپ کی زبان سے بددعائیہ کلمات نکلے اور وہ اس طرح پورے ہوئے کہ یہ سب سردار جنگ بدر میں مارے گئے۔ (بخاری شریف ص۳۷ وغیرہ)

بچھا دیا کرتی تھی۔[1]

اس قسم کی حرکتیں خدا جانے کتنی ہوئیں اور لطف یہ ہے کہ یہ حرکتیں اصل پروگرام سے زائد تھیں۔

منصوبہ بند کوششیں

ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ عام نہیں دی تھی، آپؐ خاموشی سے ذکر وفکر اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی تربیت میں مصروف تھے۔ اس وقت بھی قریش کے تاڑنے والوں نے یہ کوشش کی تھی کہ یہ سلسلہ آگے نہ بڑھے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی طرح کی مفاہمت ہوجائے مگر ان کی یہ کوششیں ناکام رہی تھیں، لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے پورے قریش بلکہ پورے عرب کو مخاطب کرکے تبلیغ شروع کی تو مخالفانہ کوششوں کا بھی نیا دور شروع ہوا۔

قریش کے لئے یہ سوال بہت اہم اور بہت پیچیدہ تھا کہ جس کا وہ احترام کرتے رہے تھے اور جس کو الصّادق اور الامین کہا کرتے تھے اب اس کی تردید کس طرح کریں اور عوام کو کس طرح مطمئن کرکے الصّادق الامین کے خلاف مشتعل کریں۔ حج کا زمانہ قریب آیا تو یہ سوال بہت اہم ہوگیا، کیونکہ یہ یقین تھا کہ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اس اجتماع عظیم سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے قبائل مکہ کے ذمہ داروں کا اجتماع کیا گیا۔
بحث مباحثہ کے بعد طے کیا گیا کہ پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے الگ گفتگو کرلی جائے۔ ولید بن مغیرہ کو گفتگو کے لئے منتخب کیا گیا۔ ولید بن مغیرہ مکہ کا سب سے بڑا دولتمند تھا۔ بہترین خطیب، بلند پایہ شاعر، جہاں دیدہ، عمر رسیدہ، تجربہ کار اور ایسا سلیقہ مند کہ شاہانِ ایران، افریقہ اور شام

[1] یہ ابولہب کی بیوی تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چچی بھی ہوتی تھی، اس نے آپ کو بچپن میں گود کھلایا بھی تھا۔ طبقات ابن سعد ص۱۲۳ ج۱

کے درباروں میں جاتا رہتا تھا اور وہاں اس کی عزت کی جاتی تھی۔

(ولید بن مغیرہ کا آسان تعارف اب یہ ہے کہ اسلام کے مشہور اور کامیاب ترین جرنیل حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس کے نامور فرزند تھے جو اس واقعہ سے تقریباً پندرہ سال بعد حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔)

ولید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، گفتگو کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مقصد کی وضاحت کی اور چند آیتیں قرآن پاک کی پڑھ کر سنائیں۔

ولید آیتیں سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ سے منع تو کیا کرتا خود گم ہوگیا۔ خاموشی سے مجلس سے اٹھا اور جب مجلس قریش میں واپس پہنچا تو حالت عجیب تھی۔ لوگوں کو خیال ہوا ولید بہک گیا۔ محمد کا ہوگیا (صلی اللہ علیہ وسلم) مگر ولید باہمہ عقل و دانش حیران تھا کہ جو کلام سنا ہے اس کے بارہ میں اور خود محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارہ میں کیا فیصلہ کرے۔ پورے غور و فکر اور موازنہ کے بعد ولید نے ارکان مجلس سے کہا:

"محمد کو کاذب نہیں کہہ سکتے۔ اس کو کاہن بھی نہیں کہہ سکتے۔ شعر و سخن کا میں ماہر ہوں، اس کا کلام شعر بھی نہیں ہے۔ کاہنوں کی تک بندیوں کو بھی میں جانتا ہوں۔ محمدؐ جو کلام پیش کرتے ہیں وہ ان سب سے بہت بلند ہے، اس کا کوئی جواب نہیں۔ اس کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ مجھ جیسا پختہ اور ٹھوس آدمی بھی چکرا گیا۔"

اصل سوال کے متعلق ولید نے رائے دی کہ 'محمد' صلی اللہ علیہ وسلم کی شائستہ اور شیریں گفتگو اور اس کلام کی غیر معمولی تاثیر کا توڑ یہی ہو سکتا ہے کہ پوری قوت سے پروپیگنڈہ کرو کہ (۱) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جادوگر ہے۔ وہ ایسے منتر پڑھتا ہے کہ گھر گھر میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ لہٰذا اس کی بات نہ سنو۔ (۲) وہ دین سے پھر گیا ہے، وہ کہتا ہے کہ تم سب تمہارے باپ دادا، اور تمہارے وہ دیوتا جن کی پوجا کرتے ہو، یہ سب دوزخ کا ایندھن

ہیں۔ (۳) تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

ولید کی رائے سے سب نے اتفاق کیا۔ اور صرف طے ہی نہیں کیا بلکہ اس شدومد سے عمل بھی شروع کر دیا کہ ابھی قبائل کے لوگ حج کے لئے روانہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بے دینی کا چرچا اُن کی گلی کوچوں تک پہنچ گیا۔ اور نہ صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بلکہ آپ کے خاندان "آل ہاشم" کے متعلق بھی نفرت کی لہر اُن تمام قبائل میں دوڑ گئی جو حج کے لئے آنے والے تھے۔ ابولہب کے متعلق طے کیا گیا کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نگرانی رکھیں گے اور جہاں وہ تقریر کرنا چاہیں یا لوگوں سے گفتگو کریں وہ اُن کو منتشر کر دیں۔

"ابولہب" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا چچا (تایا) تھا، مالدار اور باوجاہت بھی تھا۔ عرب کے قاعدے کے مطابق خاندان کا بڑا شخص خاندان کے ہر فرد کا ولی مانا جاتا تھا اور اس کو حق ہوتا تھا کہ وہ اپنے چھوٹے کے متعلق کوئی اعلان کر دے۔ قصاص وغیرہ کے قضیوں میں ایسے ولی کے قول کی خاص اہمیت ہوتی تھی۔ اسی غرض سے اس کو اس خدمت کے لئے مقرر کیا گیا تھا کہ خاندان کے سب سے بڑے شخص کی حیثیت سے لوگوں کو بتائے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ اپنے خاندانی بزرگوں کو جہنمی بتاتا ہے۔ اور دیوتاؤں کی توہین کرتا ہے۔ وغیرہ ظاہر ہے خاندان کے سب سے بڑے شخص کے قول سے زیادہ کس کی بات معتبر ہو سکتی ہے۔

حج کے موقع پر انتظام کے متعدد شعبے خصوصًا سقایہ یعنی حاجیوں کیلئے پانی کا انتظام (جو سرزمین حجاز خصوصًا مکہ میں سب سے سخت کام تھا) آل ہاشم کے سپرد ہوتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ابولہب کے علاوہ آپ کا پورا خاندان اگرچہ مسلمان نہیں ہوا تھا مگر آپ کا حامی تھا۔ خواجہ ابوطالب ان میں پیش پیش تھے۔ سرداران قریش کے پروپیگنڈے کے باعث جو نفرت خاندانِ ہاشم سے عرب میں پھیل گئی تھی، خواجہ ابوطالب کو اس کا اندازہ تھا۔ انھیں خطرہ ہوا کہ حج کے موقع پر یہ نفرت بغاوت کی شکل اختیار کرلے گی اور وہ ان خدمات سے محروم ہو جائیں گے جو حج کے موقع پر ان کے سپرد ہوتی تھیں۔ قبائلی رقابت اس فتنہ کو اور ہوا دے سکتی تھی۔

لہٰذا خواجہ ابو طالبؓ نے تقریباً سو شعر کا طویل قصیدہ لکھا جس میں خانہ کعبہ، حرم شریف کی عظمت و حرمت، اس کے واجب الاحترام ہونے کے متعلق مسلّمہ روایات، پھر خاندان ہاشم کی عظیم الشان خدمات کا تذکرہ کیا۔ اس قصیدہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر بھی روشنی ڈالی کر اُن کے اخلاق و اوصاف کیا ہیں اور قریش کس طرح ان کی تعظیم کرتے رہے ہیں۔ اسی قصیدہ کا وہ مشہور شعر ہے جو نعت شریف کے موقع پر عام طور سے پڑھا جاتا ہے :

وابیضُ یستسقی الغمام بوجھہ

ثمال الیتامیٰ عصمۃ للاراملِ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محامد بیان کرنے کے بعد یہ بھی واضح کیا کہ اگرچہ وہ ایک نئے مذہب کی دعوت دے رہے ہیں مگر ابناء ہاشم جو حُجّاج کی خدمت کرتے ہیں وہ ان کے مذہب کے حامی نہیں ہیں وہ بدستور اپنے قدیم مذہب پر قائم ہیں اور اُن کے عقائد وہی ہیں جو سردارانِ قریش اور عام عرب کے عقائد ہیں، وہ اسی طرح دیوتاؤں کو مانتے ہیں اور اُن کی پوجا کرتے ہیں، بایں ہمہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ "محمدؐ" کو مخالفین کے حوالے کر دیں۔ خاندانِ ابو طالب اپنی جانیں قربان کر دیگا مگر اپنی موجودگی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بال بیکا نہیں ہونے دیگا۔

عرب شعر کے دلدادہ ہوتے تھے۔ شاعروں کے قصیدے جیسے ہی پڑھے جاتے تھے، بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ جاتے تھے اور پھر جگہ جگہ وہ نقل کئے جاتے تھے۔ اس وقت شعراء کے قصائد کو وہی طاقت حاصل تھی جو دورِ حاضر میں کسی مضبوط پریس کو حاصل ہے۔ چنانچہ خواجہ ابو طالب

۱؎ ابن ہشام نے اس پورے قصیدہ کو نقل کیا ہے اور اس کی وجہ تصنیف یہی بیان کی ہے جو اوپر گذری۔ ج ۱ ص ۱۷۲ تا ص ۱۷۱

۲؎ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تعریف یہ ہے کہ ایسا روشن چہرہ جس کا واسطہ دیکر بادل سے بارش مانگی جاتی ہے (یہ ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ بارش نہیں ہوئی تھی تو قریش نے آپ سے دعا کرائی تھی اور بارش ہوگئی تھی)۔ یتیموں کی پناہ ہیں، بے سہارا بیوہ عورتوں کی عصمتوں کے محافظ۔

کا یہ قصیدہ تمام قبائل میں پھیل گیا اور اس طرح وہ فتنہ فرو ہوا جو بنو ہاشم کے خلاف کھڑا کیا جا رہا تھا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے متعلق اس کی وہی قوت باقی رہی بلکہ خواجہ ابو طالب کے قصیدے نے اور تائید کر دی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نئے مذہب کے داعی ہیں۔ چنانچہ خواجہ ابو طالب اور اُن کے ساتھیوں کو تو اپنی خدمات کی انجام دہی میں کوئی نئی دشواری پیش نہیں آئی مگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تعاقب پوری طرح کیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاں تشریف لے جاتے عرب کا گورا چٹا[1] ایک با وجاہت سردار (ابو لہب) اُن کے پیچھے ہوتا، جو لوگوں کو ڈانتا رہتا کہ ان کی بات نہ سنو، یہ پاگل ہو گئے ہیں[2] (معاذ اللہ)

ہُٹ بونگ اور انتشار

ابو لہب کا یہ طریقہ انفرادی نہیں رہا بلکہ اجتماعی بن گیا اور یہ طے کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جہاں بھی تقریر کریں یا قرآن پاک کی آیتیں سنائیں اتنا شور مچاؤ کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) زچ ہو کر رہ جائیں[3]۔ قریش مکہ کی شرارت پسندی کو داد دینی چاہیئے کہ کئی سال تک یہ پروگرام چلاتے رہے۔

ناکہ بندی

ابو ذر قبیلہ غفار کے نمایاں شخص تھے، دل میں صداقت کی تڑپ رکھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت کا چرچا آپ تک پہنچا، حقیقت معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چھوٹے بھائی (اُنیس) سے کہا: کہ معظمہ جاؤ اور تحقیق کر کے آؤ۔ اُنیس مکہ آئے، ملے جلے اور واپس جا کر رپورٹ دی: "ایک صاحب ہیں اچھی باتیں بتاتے ہیں بری باتوں سے روکتے ہیں۔"

---

[1] ابو لہب کا رنگ سفید، سُرخی رخساروں میں گُھلی ہوئی، اس کے رخساروں کو شعلوں سے تشبیہ دیتے ہوئے اس کا لقب "ابو لہب" رکھا گیا تھا، یعنی شعلوں والا۔ [2] طبقات ابن سعد ص۱۴۵ ج۱ وغیرہ

[3] قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی لَا تَسْمَعُوْا لِھٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْهِ لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَ (حٰم السجدۃ ۲۶)

ابوذر اس دوحرفی رپورٹ سے مطمئن نہیں ہوئے۔ خود سفر کا ارادہ کرلیا اور فوراً ہی تیار ہو کر چل دیئے۔

ابوذر مکہ میں آئے لیکن تحقیق کس سے کریں؟ جہاں نام لینا بھی مصیبت کا سر لینا تھا، لوگ مارنے اور پیٹنے کو تیار ہو جاتے تھے، وہاں راستہ کون بتاتا اور تعارف کون کراتا۔ کئی دن اسی شش و پنج میں گذر گئے۔ حضرت علیؓ ان کو دیکھا کرتے تھے ایک روز ان کو دیکھ کر کھٹکے اتہ پتہ اور مکہ آنے کا سبب معلوم کیا اور جب مقصد معلوم ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ میرے ساتھ چلو، مگر اس طرح چلو کہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ میرے ساتھ چل رہے ہو میں کوئی اندیشہ محسوس کروں گا تو چپل ٹھیک کرنے کے بہانے دیوار سے لگ کر کھڑا ہو جاؤں گا تم آگے چلتے رہنا غرض حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑی رازداری سے کام لیا تب حضرت ابوذر منزلِ مقصود تک پہنچ سکے۔

حضرت ابوذر کی نظر روئے انور پر پڑی، دل نے تصدیق کی کہ گو ہر مراد حاصل ہو گیا۔ آپ نے اسلام کا پیغام معلوم کیا۔ اور بقول ابوذرؓ ہیں کے وہیں[1] (فوراً) مسلمان ہو گئے۔

زدوکوب اور مشقِ ستم ایمان کا نور تھا یا جرأت وہمت کا فولاد جو ابوذرؓ کو حاصل ہوا۔ واپس ہو کر حرم کعبہ میں پہنچے۔ قریش کے کئی سردار حرم میں موجود تھے۔ حضرت ابوذرؓ کی نظران فرعون منش سرداروں پر پڑی تو جوش آگیا۔ ایسی سیدھی راہ اور ایسی سچی بات۔ اور ان لوگوں نے اس کے ناکے بند کر رکھے ہیں اور یہ "محمدؐ" مجسّم صداقت وہدایت۔ ان کا کوئی نام تک زبان پر نہیں لاسکتا۔ اس تصور نے جذبہ کی قوت حاصل کی۔ چنانچہ آپ نے ان رؤسا کو خطاب کرکے فرمایا: یامعشر قریش. انی اشھد ان لا الٰہ الا اللہ۔

قریش کے سردار اس جرأت کو کب نظر انداز کرسکتے تھے، آواز دی: قوموا الی ھذا الصّابی۔ "اُٹھ کھڑے ہو اس بے دین کی طرف (مارو اس بے دین کو)" سب طرف سے لوگ

---

[1] اسلمت مکانی۔ بخاری شریف صہ ۴۹۹

حضرت ابوذرؓ پر ٹوٹ پڑے اور جاں بلب کر دیا۔ حضرت عباس جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، وہاں موجود تھے، انھیں خطرہ ہوا کہ ابوذرؓ کی جان جاتی رہے گی وہ اُن کے اوپر اوندھے پڑ گئے اور پکار کر کہا:

"یہ قبیلہ غفار کا آدمی ہے، اس کے قبیلہ والوں نے اگر تمہارا راستہ بند کر دیا تو بھوکے مر جاؤ گے۔ غلّہ کا ایک دانہ تم تک نہ پہونچ سکے گا۔"

غلّہ کا نام سُن کر لوگوں نے اُن کو چھوڑا۔

اگلے روز پھر یہی ہوا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اسلام کا نعرہ بلند کیا اور قریش کے نوجوانوں نے اِن کو پیٹنا شروع کیا، تب بھی حضرت عباس ہی کسی طرح وہاں پہنچ گئے اور یہی کہہ کر اُن کو بچایا۔[1]

اس طرح کے واقعات اسلام لانے والوں کے ساتھ مسلسل ہوتے رہتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کئی بار اس طرح تختۂ مشق بن چکے تھے، مگر مارنے والوں میں کوئی بچانے والا بھی کھڑا ہو جاتا تھا جس سے جان بچ جاتی تھی۔ لیکن ایسا بھی ہوا کہ کوئی بچانے والا نہیں پہنچ سکا تو جان بھی جاتی رہی۔

حارث بن ابی ہالہ جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لڑکے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردہ تھے۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھڑانے آئے، لوگوں نے آپؐ کو تو چھوڑ دیا مگر ان کو اتنا مارا کہ شہید ہو گئے۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا جس سے حرم مکہ کی وہ زمین رنگین ہوئی جہاں اللہ کے بندے طواف کیا کرتے ہیں[2]

حضرت عمار رضی اللہ عنہ۔ مشہور صحابی ہیں، اُن کے والد کا نام یاسر اور والدہ کا نام سُمیّہؓ تھا۔ ابوجہل نے حضرت سمیہؓ کے اندام نہانی میں برچھی ماری وہ غریب شہید ہو گئیں۔ یہ پہلی خاتون

---

[1] بخاری شریف ص۴۹۹ [2] اول من قتل فی سبیل اللہ تحت الرکن الیمانی۔ الاصابہ ص۲۸۷ ج۱

تھیں جو راہِ خدا میں شہید ہوئیں۔ رضی اللہ عنہا[1]۔

حضرت عمارؓ کو جلتی ہوئی زمین پر لِٹاتے اور اتنا مارتے کہ بے ہوش ہو جاتے تھے، مگر زندگی تھی باقی رہ گئے۔

حضرت بلالؓ اُمیہ بن خلف کے غلام تھے۔ جب ٹھیک دوپہر ہو جاتا تو اُن کو تپتے ہوئے بالو پر لٹایا جاتا اور پتھر اُن کے سینہ پر رکھ دیا جاتا کہ جنبش نہ کرنے پائیں۔ اور اُن سے کہا جاتا کہ اسلام سے باز آئیں، مگر اُن کی زبان سے "اَحَدْ" ہی نکلتا یعنی معبود ایک ہی ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

جب دھوپ میں تیزی نہ رہتی تو گلے میں رسّی بندھوا کر لڑکوں کے حوالے کر دیا جاتا کہ مکّہ کے اس سرے سے اُس سرے تک گھسیٹتے پھریں۔

حضرت ابو فکیہہؓ صفوان بن اُمیہ کے غلام تھے۔ صفوان ان کو بھی یہی سزا دلواتا تھا۔ کہ اُن کو گھسیٹتے ہوئے تپتے ہوئے ریت پر ڈال دیا جاتا اور سینہ پر پتھر رکھ دیا جاتا۔ ایک روز اتنا بھاری پتھر سینہ پر رکھ دیا گیا کہ اُن کی زبان نکل آئی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جو تیسرے خلیفہ ہوئے، بہت اونچے خاندان کے باحیثیت رئیس تھے، جب مسلمان ہوئے تو دوسروں نے نہیں خود ان کے چچا نے اُن کو رسی سے باندھ کر مارا۔

حضرت زبیر بن العوامؓ اسلام لائے تو اُن کے چچا اُن کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیتے تھے۔

حضرت خباب بن الارتؓ مسلمان ہوئے تو ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں ایک روز دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹا دیا گیا۔ ایک شخص چھاتی پر پیر رکھ کر کھڑا ہو گیا کہ کروٹ نہ لے سکیں، یہاں تک کہ کوئلے خون اور چربی سے تر ہو کر ٹھنڈے ہو گئے۔ مدتوں کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اُنھوں نے یہ واقعہ بیان کیا اور پیٹھ کھول کر دکھائی جو برص کے داغ کی طرح بالکل سفید تھی[2]۔

---

[1] اول شہیدۃ فی الاسلام الاستیعاب ص ۶۳۵ [2] یہ تمام واقعات ان حضرات کے حالات میں الاستیعاب اور الاصابہ وغیرہ میں درج ہیں۔

الغرض اس طرح کے مظلوموں کی فہرست بہت طویل ہے اور مظالم کی داستان اس سے بھی زیادہ طویل۔ مقصد یہ ہے کہ اس طرح کے مظالم جو سوچے سمجھے منصوبے کے بموجب قریش کی طرف سے کئے جا رہے تھے انھوں نے مکہ کی پوری فضا کو اس درجہ دہشت زدہ اور مرعوب کر دیا تھا کہ کھلے بندوں اعلانِ حق تو درکنار لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی زبان پر لانے کی ہی ہمت نہیں ہوتی تھی حتیٰ کہ حضرت ابوذر غفاری بعض روایتوں کے بموجب ایک ماہ تک حرم شریف میں پڑے رہے۔ صرف زمزم پر گذر رہا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچ سکے۔ کسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اندازہ ہوا تو بڑی رازداری کے ساتھ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔ (جس کی تفصیل اوپر گذری)

اس طرح کے بے پناہ مظالم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجبور کر دیا کہ کسی خفیہ مقام پر قیام فرمائیں۔ چنانچہ ایک مدت تک دارِ ارقم میں آپؐ اور آپ کے ساتھی جن کی تعداد تیس کے قریب تھی، پناہ گزیں رہے۔ نہایت عجیب بات یہ ہے کہ ان تمام مظالم کے مقابلہ میں رحمۃ للعالمین کی زبان مبارک اگر متحرک ہوتی تو صرف دعائے خیر کیلئے۔ یہی حضرت خباب جن کو انگاروں پر لٹایا گیا تھا انھوں نے ایک روز درخواست کی کہ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) ان ظالموں کے لئے بددعا فرمادیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیوارِ کعبہ کے سایہ میں چادر کا تکیہ بنائے ہوئے اس کے سہارے تشریف فرما تھے۔ جیسے ہی حضرت خبابؓ کے الفاظ سنے سیدھے بیٹھ گئے، روئے انور سرخ ہوگیا۔ فرمایا: پہلی امتوں میں یہاں تک ظلم ہوئے ہیں کہ لوہے کے کنگھے سے ہڈیوں اور پٹھوں تک گوشت کھرچ دیا جاتا تھا۔ کسی داعی حق کے سر پر آرہ رکھ کر بیچ سے چیر دیا گیا مگر ان حضرات کے پائے استقلال میں جنبش نہیں آئی۔ پھر فرمایا: یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو مکمل فرمائے گا۔ یہاں تک ایک مسافر تنہا صنعاء یمن سے حضرموت تک پہنچ جایا کرے گا، راستہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہیں ہوگا۔ بہت سے بہت بھیڑیئے کا خطرہ ہوگا جو اس کے گلہ پر حملہ کر سکیگا۔[1]

---

[1] بخاری شریف ص ۵۴۳

مقصد

حضرت عمار اُن کے والد اور والدہ تینوں کو طرح طرح ستایا جارہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس طرف سے گذرے، اُن کو مبتلاء عذاب دیکھ کر فرمایا: صبرًا یا آل یاسر، ان موعدکم الجنۃ[1] "آل یاسر! صبر کرو۔ تم سے جنت کا وعدہ ہے" یعنی اس انقلابی پارٹی کی پہلی شرط یہ تھی کہ اس کے مجاہدین کی نظر صرف آخرت پر ہوگی۔ اُن کی ہر قربانی اللہ کے لئے ہوگی۔ غلبہ اور اقتدار حاصل ہونے کے بعد یقینًا دنیاوی مفادات بھی حاصل ہوں گے۔ مگر وہ اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام مانا جائیگا، مجاہد کا نصب العین نہیں ہوگا۔ قرآن حکیم نے اعلان فرمادیا تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ[2] "یہ عالم آخرت ہم انھیں لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دُنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔ اور نیک نتیجہ متقی لوگوں کے ہوتا ہے۔"

ہجرتِ حبشہ

قریش اور ترقی پذیر قبائلِ عرب کے پاس نہ فوج تھی نہ پولیس۔ البتہ معاہدات کا سلسلہ ایسا تھا جو فوج اور پولیس کا کام دیتا تھا۔

معاہدہ ایک حصار ہوتا تھا جو جان کا بھی محافظ ہوتا تھا اور مال کا بھی۔ اور ان معاہدات کے ذریعہ طاقت کا بھی توازن قائم رہتا تھا۔ حضرت ابوذر غفاری کو اسی چیز نے بچایا تھا کہ قبیلۂ غفار (جس سے قریش کا معاہدہ تھا) اگر بگڑ گیا تو قریش کا اُس طرف سے گذرنا اور غلّہ برآمد کرنا ناممکن ہوجائیگا۔ ابوبکر صدیق، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہم) خود اپنے طور پر مختلف قبائل سے معاہدے کئے ہوئے تھے۔ ابتداء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم براہِ راست کسی قبیلہ سے معاہدہ کئے ہوئے نہیں تھے مگر اُن کی حفاظت کی ذمہ داری خواجہ ابوطالب نے لے رکھی تھی۔ خواجہ ابوطالب دوسرے قبائل سے معاہدے کئے ہوئے تھے اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح خواجہ

---

[1] الاستیعاب ص۲۳۶ نمبر ۲۷۹۔ [2] سورۂ قصص پ۲۰ آیت ۸۳

ابی طالب کی پناہ میں تھے اور خواجہ ابوطالب آپ کی پناہ کے ذمہ دار تھے اسی طرح وہ تمام قبائل بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے ذمہ دار تھے جو ابوطالب سے معاہدہ کئے ہوئے تھے مگر اسلام سے مشرف ہونے والوں میں بڑی تعداد وہ تھی جن کے کسی سے خود اپنے معاہدے نہیں تھے کیونکہ وہ اپنے قبیلوں کے شیوخ اور سربراہ نہیں تھے، سربراہ دوسرے تھے، یہ ان کے تابع تھے۔ شیوخ اور سربراہوں کے معاہدات کے باعث یہ فائدہ تو تھا کہ غیر قبیلہ کے لوگ ان کو مظالم کا نشانہ نہیں بنا سکتے تھے مگر خود قبیلہ کے لوگوں کی مخالفت سوہان روح تھی۔ یہ مسلمان ہوگئے تھے مگر جس مقصد سے مسلمان ہوئے تھے وہ حاصل نہیں تھا یعنی یہ لوگ خدا رواحد کی عبادت نہیں کر سکتے تھے، چھپ کر قرآن شریف پڑھتے۔ اگر راز فاش ہو جاتا تو طرح طرح کے ظلم سہنے پڑتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اذیتیں اور تکلیفیں سہہ رہے تھے مگر آپ کو اپنی تکلیف کا احساس نہیں تھا۔ البتہ ان ساتھیوں کی اذیت کا احساس آپ کو بے چین رکھتا تھا۔ آپ کو معلوم ہوا کہ حبش کا بادشاہ نیک نفس عیسائی ہے۔ اس کی مملکت میں لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ لہٰذا آپؐ نے مشورہ دیا کہ جو جا سکتے ہوں وہ حبش چلے جائیں۔

اس مشورہ پر عمل ہوا۔ پہلے پندرہ صحابہ کا قافلہ روانہ ہوا، گیارہ مرد تھے اور چار عورتیں۔ یہ قافلہ ساحل سمندر پر پہنچا۔ ایک جہاز روانہ ہونے والا تھا۔ اس میں نہایت سستے محصول پر جگہ مل گئی۔ قریش کو اس قافلہ کی روانگی کا علم ہوا تو ایک جماعت ان کو پکڑنے کے لئے دوڑا دی۔ مگر جب وہ ساحل سمندر پر پہنچی تو جہاز روانہ ہو چکا تھا۔

ان حضرات کو وہاں اطمینان میسر آیا تو پھر اور مسلمانوں نے بھی یہ راستہ اختیار کیا۔ مکہ معظمہ سے خفیہ طور سے اکا دکا روانہ ہو کر پہلے ساحل پر جمع ہو گئے اور وہاں سے حبش روانہ ہو گئے۔ اس دوسرے قافلہ میں تقریباً ستر افراد تھے۔

قریش کے لئے یہ بہت بڑا المیہ تھا کہ اتنے مسلمان وہاں جمع ہو گئے۔ انھوں نے بہت کچھ ہدیوں اور تحفوں کے ساتھ شاہ حبش کے پاس سفارت بھیجی کہ یہ لوگ بھاگ کر چلے آئے ہیں ان کو

حوالہ کر دیا جائے۔ بادشاہ نے مسلمانوں کو طلب کر کے اُن کا مقصد معلوم کیا۔

حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے مسلمانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی وہ تمام مؤرخین نے نقل کی ہے اس کا اُردو پیرہن یہ ہے:

"بادشاہ عالیجاہ!

یہ درست ہے کہ ہماری قوم بت پرست ہے، جاہل ہے، اس کو حلال حرام کی تمیز نہیں، مُردار کھاجاتی ہے۔ بدکاریاں کرتی ہے۔ ہمسایوں کو ستاتی ہے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا ہے۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا ہے۔ جو بُرائی ہو سکتی ہے وہ سب ہمارے معاشرہ (سماج) میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا ہم میں ایک شخص پیدا ہوا۔ عمر کے چالیس سال اس نے ہمارے بیچ میں رہ کر اس طرح گذارے کہ پوری قوم اس کی شرافت کی قائل ہوگئی۔ اس کی صداقت اور سچائی سے یہاں تک متاثر ہوئی کہ اس کو الصّادق اور الامین کہنے لگی۔ اُس نے بتایا کہ خدا نے اُس کو نبی بنا کر بھیجا ہے اور خدا کا حکم یہ ہے کہ صرف خدا ر واحد کی عبادت کرو، بُت پرستی چھوڑدو۔ خدا کے سوا کسی کے سامنے ماتھا مت ٹیکو۔ کسی کو ناحق نہ ستاؤ، کمزوروں کی مدد کرو، غریبوں پر رحم کرو، خلق خدا کی خدمت کرو، رشتہ داروں اور پڑوسیوں سے اچھا سلوک کرو۔ ایک دوسرے سے محبت کرو، آپس میں شفقت اور مہربانی سے کام لو، سچائی اختیار کرو، بُری باتیں چھوڑدو، نیک اور دیانتدار بن جاؤ۔

اے بادشاہ! ہمیں یہ باتیں اچھی معلوم ہوئیں ہم نے اس کا دامن سنبھال لیا ہے اور اس کے کہنے پر عمل شروع کر دیا ہے۔"

سفارت قریش کے ارکان نے دیکھا کہ بادشاہ حضرت جعفرؓ کی تقریر سے متاثر ہو رہا ہے تو

انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام اور حضرت مریم کے متعلق ان کا عقیدہ معلوم کیجئے۔ یہ کچھ اور کہتے ہیں اور عیسائیوں کی تردید کرتے ہیں۔

بادشاہ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام اور حضرت مریم کے متعلق اُن کا عقیدہ معلوم کیا تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سورہ مریم کا پورا رکوع پڑھ کر سُنا دیا جس میں حضرت مریم کی پاکدامنی بیان کرکے بتایا گیا ہے کہ عیسٰی علیہ السلام خدا کے بیٹے نہیں ہیں بلکہ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے معجزے عطا فرمائے تھے۔ اور پہلا معجزہ یہ تھا کہ انھوں نے گہوارے ہی میں بولنا شروع کر دیا تھا۔

بادشاہ قرآن پاک کی آیتوں اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر سے یہاں تک متاثر ہوا کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، پادریوں کو خطاب کرکے کہا کہ میرا یقین ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی حیثیت اس سے ایک تنکہ کی برابر بھی زیادہ نہیں ہے جو اُنھوں نے قرآن شریف کے حوالہ سے بیان کی ہے۔ پھر قریش کے سفیروں سے کہہ دیا کہ یہ لوگ آپ کے غلام نہیں ہیں، آپ کے مقروض نہیں ہیں، پھر ان کو آپ کے حوالے کیوں کیا جائے۔ مسلمانوں سے کہا کہ وہ اس کی مملکت میں اطمینان سے رہیں[1]

مسلمان وہاں پر رہے۔ ایک مرتبہ ایک غنیم کا حملہ ہوا تو مسلمانوں نے شاہی فوج کی مدد بھی کی[2]

قریش کا تاثر قریش کو اس سفارت کی ناکامی کا علم ہوا تو مسلمانوں کے خلاف ان کا غیض و غضب اور بڑھ گیا۔ اور خواجہ ابوطالب اور آلِ ہاشم پر پورا زور ڈالنا شروع کر دیا کہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذمہ داری سے دست کش ہو جائیں۔ چنانچہ روٴسار

[1] یہ بادشاہ مسلمان ہو گیا تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی روز اسکے انتقال کی خبر دیدی اور غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ [2] المبسوط للسرخسی ص۹۸ ج۱۰ باب نکاح اہل الحرب و دخول التجار الیہم بامان۔

قریش کا ایک وفد خواجہ ابوطالب کے پاس پہونچا اور بہت زور ڈالا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منع کردیں ورنہ اُن کو ہمارے حوالہ کردیں۔ مجبور ہوکر ابوطالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کی۔ آپؐ نے فرمایا:

"چچا جان! آپ کی شفقت ومحبت کا شکریہ۔ آپ یقیناً معذور ہیں۔ آپ میری امداد سے دست کش ہو جایئے۔ مگر مجھے میرے رب نے جس مقام پر کھڑا کردیا ہے میں اس سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹ سکتا۔"

خواجہ ابوطالب نے یہ پختگی دیکھی تو قریش کو جواب دیدیا کہ وہ محمدؐ کی حمایت نہیں چھوڑ سکتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت دی کہ وہ اپنا کام کرتے رہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لئے یہ نئی صورت پیدا ہوگئی تھی کہ ایک سو کے قریب مسلمان حبشہ چلے گئے تو اب صرف تیس چالیس مسلمان رہ گئے جن کے لئے مکہ کی غضبناک فضا میں زندگی اور بھی دو بھر ہوگئی تھی۔ ان میں کافی تعداد غلاموں کی تھی۔ اگرچہ ان میں سے زیادہ تر کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خرید کر آزاد کردیا تھا۔ لیکن آزادی کے بعد بھی وہ بے پناہ تھے مسلمان ان کی پناہ ہوسکتے تھے مگر وہ خود چھپ چھپ کر زندگی گذارنے پر مجبور تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہونا

مسلمانوں کی تعداد سو سے زیادہ ہوگئی تھی۔ ان میں طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص اور شیر خدا حضرت علی رضی اللہ عنہم جیسے جنگجو بہادر بھی تھے، جنھوں نے مستقبل میں عظیم الشان کارنامے انجام دیئے اور غزوات میں بہادری کے بے نظیر جوہر دکھائے۔ مگر یہ حضرات اس وقت ایسے نہیں تھے جن کی مکہ میں دھاک ہو اور جن سے پورا شہر مرعوب رہتا ہو۔ یہ بات صرف دو[1] کو حاصل تھی: عمر بن الخطاب اور اُن کے ماموں ابوجہل بن ہشام کو، مگر یہ دونوں اسلام کے مقابلہ میں بہت سخت تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے کہ خداوندا ان دونوں میں جو تجھے زیادہ محبوب ہو اُس سے اسلام کو تقویت فرما۔

---

[1] نام دونوں کا عمر تھا الخطاب دوسرے عمر بن ہشام جو ابوالحکم کی کنیت سے مشہور تھا پھر ابوجہل کے نام سے مشہور ہوا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یہ جرأت ہی تھی کہ ایک روز طے کر لیا کہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قصہ تمام کر کے اس خلفشار کا خاتمہ کر دوں جس سے قریش کی زندگی تلخ ہو گئی ہے۔ اور آئے دن ایک ہنگامہ برپا رہتا ہے۔

عمر بن الخطاب نے تلوار ہاتھ میں لی اور محمدؐ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلاش میں نکلے۔ راستہ میں ایک صاحب نعیمؓ بن عبداللہ (رضی اللہ عنہ) نے آپ کو دیکھا۔ تیور چڑھے ہوئے تھے۔ دریافت کیا: ابن الخطاب کیا ارادہ ہے۔

عمر بن الخطاب: اس فتنہ کو ختم کرنے جا رہا ہوں جو "محمدؐ" نے برپا کر دیا ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

نعیم بن عبداللہ: خاندان ہاشم اور جو اُن کے حلیف ہیں اُن سے کیسے نمٹو گے؟ اور دیکھو ابن الخطاب! محمدؐ کو ختم کرنے سے پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ تمہاری بہن فاطمہ اور بہنوئی "سعید بن زید" مسلمان ہو چکے ہیں۔

عمر (رضی اللہ عنہ) ان طعن آمیز، اشتعال انگیز فقروں کو کب برداشت کر سکتے تھے۔ وہ فوراً پلٹے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش چھوڑ کر بہن کے مکان پر پہونچ گئے۔ وہاں حضرت خباب بن الارث رضی اللہ عنہ قرآن شریف پڑھا رہے تھے۔ جیسے ہی حضرت عمر نے دروازے پر پہنچ کر آواز دی۔ ہمشیرہ صاحبہ نے حضرت خبابؓ کو اندر کر دیا، مگر تلاوت کی کچھ بھنک عمر کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ عمر جیسے ہی مکان میں داخل ہوئے، پوچھا: تم کیا پڑھ رہے تھے۔ بہن بہنوئی نے بات کو چھپانا چاہا۔ کچھ خاموش رہے تو عمر نے اسی تیزی میں کہا: میں نے سنا ہے تم بے دین ہو گئے ہو۔ یہ کہہ کر بہنوئی پر ہاتھ اُٹھایا۔ بہن اپنے شوہر کو بچانے کے

---

[1] نعیم بن عبداللہ النحام۔ مسلمان ہو چکے تھے۔ مگر اپنے اسلام کا اظہار نہیں کیا تھا۔ النحام نحم سے ماخوذ ہے۔ نحم کے معنیٰ ہیں آہٹ یا کھنکار کی آواز۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا تھا: سمعت نحمتہ فی الجنۃ۔ میں نے جنت میں ان کا نحمہ سنا ہے۔ اسی بشارت کی بناء پر اُن کا خطاب نحام ہو گیا۔ سیرت حلبیہ صفحہ ۳۴۹ ج ۱

آگے بڑھیں تو اُن کے سر پر بھی اتنی زور سے مارا کہ خون بہنے لگا۔ اب بہن کو جوش آگیا۔ فرمایا:
عمر جو چاہو کرلو۔ ہم مسلمان ہو چکے ہیں اور ہم قرآن شریف پڑھ رہے تھے۔
بہن کے سر سے خون بہتا ہوا دیکھ کر حضرت عمر کچھ پسیجے۔ غصہ ٹھنڈا ہوا تو فرمایا: مجھے
دکھاؤ کیا پڑھ رہے تھے۔
بہن نے فرمایا: تم دیکھنا چاہتے ہو تو پہلے غسل کرو۔ تم کافر ہو۔ ناپاک ہو۔ قرآن کو
نہیں چھو سکتے۔

اب عمر فاروق کا غصہ ختم ہو چکا تھا اور اصل حقیقت معلوم کرنے کا شوق اتنا بڑھ چکا تھا
کہ بہن کے توہین آمیز کلام کو برداشت کیا اور غسل کر کے کلام اللہ کے اوراق پڑھنے شروع کئے:

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ① (سورۂ حدید ۵۷ آیۃ ۱)

ترجمہ: "آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے (کہ وہ ہر ایک نقص سے
مبرا ہے) وہ زبردست حکمت والا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اسی کی ہے،
(مستحق بادشاہت وہی ہے) وہی زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے اور وہ ہر چیز
پر قادر ہے۔ وہی پہلے ہے۔ وہی پیچھے۔ وہی ظاہر ہے اور وہی مخفی (باطن)
اور وہ ہر چیز کا پورا علم رکھنے والا ہے۔ وہ ایسا ہے کہ اُس نے پیدا کیا آسمانوں اور
زمین کو چھ روز (دَور) میں۔ پھر وہ عرش پر رونق افروز ہوا (پوری کائنات کو اپنے
اقتدار میں لے لیا) ہر چیز کا اس کو علم ہے۔ وہ جانتا ہے ہر اُس چیز کو جو زمین کے
اندر داخل ہوتی ہے اور جو زمین سے نکلتی ہے، جو آسمان سے اُترتی ہے جو
آسمان پر چڑھتی ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے تمام اعمال
دیکھتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اُسی کی ہے اور تمام باتوں کا مرجع وہی
اللہ کی ذات ہے وہ ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں وہ
دل کی باتوں کو پوری طرح جانتا ہے۔ ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول پر

اوپر کی آیتوں میں اللہ کی ذات اور صفات کا ذکر ہے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیان فرمایا کرتے تھے، میں یہ آیتیں پڑھ رہا تھا اور جب اللہ کا نام آتا تھا دل کانپ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب ساتویں آیت پر پہونچا "ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر" تو بے اختیار زبان سے نکلا اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ

حضرت خباب رضی اللہ عنہ جن کو اندر چھپا دیا گیا تھا اُنھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے کلمۂ شہادت سُنا تو خوش ہوتے ہوئے باہر آئے اور فرمایا: عمرؓ بشارت ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی کہ خداوندا ابوجہل اور عمر میں سے جو تجھے زیادہ محبوب ہو اُس سے اسلام کی تقویت فرما۔ حضرت عمرؓ یہ بشارت سُن کر فوراً ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دار بنی ارقم میں جو کوہِ صفا کی تلی میں تھا، پناہ گزیں تھے۔ حضرت حمزہؓ، حضرت طلحہؓ اور کچھ اور صاحبان حاضرِ خدمت تھے۔ ان صاحبان نے عمرؓ کو دیکھا، تلوار ہاتھ میں لئے آرہے ہیں، کچھ خیال پیدا ہوا، مگر یہ بھی سوچ لیا کہ بھرپور جواب دیا جائے گا۔ لیکن عمرؓ پہونچے تو انداز دوسرا تھا۔ آگے بڑھے تو رحمۃ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر استقبال کیا اور چادر یا کُرتے کا کنارہ پکڑ کر فرمایا: عمر کیسے آئے۔ پھر فرمایا: عمر باز نہ آؤ گے۔ کیا خدا کے قہر کا انتظار کر رہے ہو۔

عمر فاروق: (رضی اللہ عنہ) حضرت باز آچکا ہوں۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کی اتنی مسرت ہوئی کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زور سے تکبیر کہی اور آپ کے ساتھیوں نے بھی زور سے تکبیر کہی یہاں تک کہ یہ دامنِ کوہ نعرۂ تکبیر سے گونج اُٹھا[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہوجانے سے اسلام کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اب تک

---

[1] البدایہ والنہایہ ص۳۱ج۳ [2] ماخوذ از البدایۃ والنہایہ ص۹۰ تا ص۸۲ ج۳ السیرۃ الحلبیہ ص۳۲۹ تا ص۳۵۴ وتاریخ الخلفاء

یہ موقع نہیں ملتا تھا کہ مسلمان حرم کعبہ میں نماز پڑھ سکیں۔ مگر عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو پہلے سرداران قریش میں سے ہر ایک کی ڈیوڑھی پر پہنچکر ہر ایک کو آگاہ کیا کہ عمر مسلمان ہوگیا ہے، اس کے بعد تمام مسلمانوں کو ساتھ لے کر حرم شریف میں داخل ہوئے اور کھلے بندوں نماز پڑھی لیکن قریش نے سب کی پوری طرح تواضع کی خصوصاً حضرت فاروق ہر ایک کا نشانہ بنے[1] کافی مار پیٹ کے بعد کسی طرح یہ ہنگامہ ختم ہوا۔ مگر عمر بن الخطاب کا مسلمان ہوجانا ایسا حادثہ نہیں تھا جس پر قریش آسانی سے صبر کر لیتے۔ انھوں نے حضرت عمرؓ کی زندگی دوبھر کردی۔ حتّٰی کہ وہ بھی مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ لیکن عرب کے مشہور اور باہیبت قبیلہ بنی سہم سے اُن کا معاہدہ تھا یہ معاہدہ اس وقت کام آیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ کی روایت ہے "عمر فاروق رضی اللہ عنہ مکان میں چھپے ہوئے تھے۔ باہر میدان میں اتنا ہجوم تھا کہ پوری وادی آدمیوں سے پٹی ہوئی تھی اور یہ شور تھا کہ عمر بے دین ہوگیا ہے۔ میں مکان کی چھت پر کھڑا ہوا یہ ہنگامہ دیکھ رہا تھا۔ میں پریشان تھا کہ کیا ہوگا۔ دفعتہً ایک صاحب نمودار ہوئے۔ ریشمی کفوں دار قمیص پہنے ہوئے، اُس کے اوپر ریشمی قبا اور شیوخ عرب کے قاعدے کے بموجب ایک بڑھیا چادر اوڑھے ہوئے وہ اندر مکان میں پہنچے۔ والد صاحب سے دریافت کیا۔ کیا واقعہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ جرم یہ ہے کہ مسلمان ہوگیا ہوں۔ اس سردار نے کہا: ہرگز نہیں۔ یہ کچھ نہیں کرسکتے میں آپ کو پناہ دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر یہ سردار باہر آیا اور اعلان کردیا کہ عمر کو میں نے پناہ دیدی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جیسے ہی اس سردار نے یہ اعلان کیا وہ تمام مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا۔ میں نے کسی سے پوچھا: یہ صاحب کون ہیں۔ جواب دیا قبیلۂ بنی سہم

---

[1] ماخوذ از تاریخ الخلفاء لجلال الدین السیوطی والبدایہ والنہایہ ص۲۹ تا ص۳۲ ج۳ والسیرۃ الحلبیہ ص۳۴۹ تا ص۳۸۲ ج۱

کا شیخ و رئیس عاص بن وائل سہمی [1]

با ایں ہمہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے مسلمانوں کی ڈھارس بندھی اور بقول حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وہ قوت حاصل ہوئی جو پہلے نہیں تھی [2] ـــــ ہم کھلے بندوں حرم کعبہ میں پہنچے، طواف کیا، نماز پڑھی۔ حضرت ابن مسعود فرمایا کرتے تھے ــ حضرت عمرؓ کا مسلمان ہونا، اسلام کی فتح تھی۔ اُن کی ہجرت نصرت اور اُن کی حکومت رحمت [3]

---

[1] بخاری شریف ص۵۴۵

[2] بخاری شریف ص۵۲۰

[3] البدایہ والنہایہ ص۷۹ ج۳

شعب ابی طالب میں پناہ

قریش کی طرف سے قومی بائیکاٹ

پے در پے ناکامیوں نے قریش کو اور زیادہ مشتعل کر دیا۔ کھلم کھلا قتل کرنے میں قبائلی جنگ چھڑ جانے کا خطرہ تھا۔ لیکن خفیہ طور پر قتل کرنے میں پہلے ثبوت کی ضرورت تھی جس کا مہیا کرنا بنو ہاشم کے لئے تقریباً ناممکن تھا۔ چنانچہ خفیہ طور پر جانِ جہاں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان لینے کی سازش ہونے لگی۔ خواجہ ابو طالب کے چوکنے دماغ نے اس کو بھانپا۔ اُنھیں صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق ہی نہیں بلکہ خاندانِ ہاشم کے اور لوگوں کے متعلق بھی خطرہ ہوا۔ مثلاً خواجہ ابو طالب کے بڑے صاحبزادے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اگرچہ ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے لیکن چھوٹے صاحبزادے حضرت "علیؓ" یہیں تھے جو ہر دم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ خواجہ ابو طالب نے خاندان کے لوگوں سے مشورہ کیا اور طے یہ کیا کہ شہر کے خطرناک ماحول سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر پناہ لی جائے۔

پہاڑیوں کے بیچ میں ایک مقام "خیف بنی کنانہ" تھا۔ یہ بنو ہاشم کا موروثی رقبہ تھا۔ طے یہ ہوا کہ وہاں جا کر قیام کیا جائے۔ چنانچہ پورا خاندان (جس کے بہت سے افراد ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے) اس مقام پر چلا گیا جس کا دوسرا نام شعب ابی طالب تھا۔ صرف ابو لہب اور اس کا گھرانا مکہ میں رہ گیا، جو اپنے خاندان کے خلاف قریش کا سرگرم حامی تھا۔ ابو طالب یہاں پہنچ کر بھی اپنے بھتیجے کی نگرانی راتوں کو کیا کرتے تھے۔ اُن کے سونے کی جگہ بھی بدلتے رہتے تھے۔

قریش کے سرداروں نے اس کا جواب یہ دیا کہ تمام مخالف گروہوں کو ملا کر ان سب کا مقاطعہ کر دیا جو خواجہ ابو طالب کے ساتھ اس گھاٹی میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ قریش کے ساتھ قبیلہ بنی کنانہ بھی اس معاہدہ میں شریک ہوا[1]۔ مقاطعہ صرف رشتے ناتے کا نہیں تھا، بلکہ کھانے پینے کی چیزیں بھی بند کر دیں۔ ایک عہد نامہ لکھا گیا کہ ان کے ساتھ نہ نکاح بیاہ کیا جائیگا، نہ خرید و فروخت اور کوشش کی جائے گی کہ مکہ سے باہر بھی کہیں سے یہ لوگ کچھ نہ خرید سکیں۔ بیوپاریوں کو آمادہ کیا گیا کہ مکّہ کے راستوں کی نگرانی رکھیں اور باہر سے آنے والی جنس کو مکہ میں پہنچنے سے پہلے ہی خرید لیا کریں۔

سرداران قریش کے اس معاہدہ پر دستخط ہوئے اور یہ عہد نامہ قومی حفاظت خانہ (خانہ کعبہ کے خزانہ) میں محفوظ کر دیا گیا[2]

نبوت کے ساتویں سال۔ محرم کی پہلی تاریخ سے یہ مقاطعہ شروع ہوا تھا[3] جو تقریباً تین سال تک رہا۔ اس عرصہ میں درختوں کے پتّے اور جڑیں کھا کر زندگی گذارنی پڑی۔ بچّے بلبلاتے تھے مگر اُن کو دودھ میسّر نہیں آتا تھا۔ بکریاں ختم ہو گئی تھیں اور پے درپے فاقوں سے ماؤں کے دُودھ خشک ہو گئے تھے ——— حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما جیسے رفقاء اگرچہ بنو ہاشم نہیں تھے مگر وہ ان کے ساتھ تھے تو مقاطعہ ان سے بھی اتنا ہی سخت تھا۔[4]

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا چمڑا ہاتھ آگیا۔ میں نے اس کو پانی سے دھویا۔ پھر آگ پر بھونا اور پانی ملا کر کھایا۔[5]

---

[1] بخاری شریف ص۵۴۳ [2] البدایہ والنہایہ بحوالہ موسیٰ بن عقبہ عن الزہری ص۸۴ ج۳

[3] ابن سعد ص۱۴۱ ج۱ [4] سیرۃ ابن اسحاق بحوالہ ازالۃ الخفاء ص۲۰ ج۲

[5] روض الانف بحوالہ سیرۃ النبی ج ۱

مکہ میں جو رشتہ دار تھے اُن میں وہ بھی تھے جن کو اس حالت پر ترس آتا تھا۔ مگر پابندیاں ایسی سخت تھیں کہ کوئی کچھ امداد نہیں کرسکتا تھا۔

اس معاہدہ کی کوئی مدت نہیں تھی۔ اس کی انتہا یہ تھی کہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کے لئے حوالہ کردیں[1]

تین سال پورے ہونے لگے تو یک طرفہ متواتر ظلم وستم نے کچھ اہلِ قرابت کے دلوں میں نرمی پیدا کی اور یہ بحث شروع ہوئی کہ معاہدہ کی پابندی کب تک کی جائے۔ لیکن پلّہ اُن کا بھاری تھا جن کے سینوں میں دلوں کی جگہ پتھر بھرے ہوئے تھے۔ دفعۃً ایک قدرتی حل سامنے آگیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چچا ابو طالب کو خبر دی کہ کیڑوں نے معاہدہ کے تمام حرف چاٹ لئے ہیں۔ صرف اللہ کا نام باقی رہ گیا ہے۔ خواجہ ابو طالب نے یہ الہامی خبر سنی تو قریش کے سرداروں کے پاس پہنچے کہ آج ہمارا تمہارا معاملہ طے ہے۔ محمدؐ نے یہ خبر دی ہے اگر یہ خبر جھوٹی ہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں اور اگر سچی ہے تو جب معاہدہ ہی نہیں رہا تو اس کی پابندی کیسی۔

سردارانِ قریش نے یہ فیصلہ منظور کیا۔ ان کو یقین تھا کہ جیت ہماری ہوگی۔ مگر جب خزانہ کھول کر دستاویز نکالی گئی تو دیکھا "الصادق الامین" کی خبر حرف بحرف صحیح ہے سنگدلوں کے پیشواؤں نے پھر بھی یہ کہہ کر ٹالنا چاہا کہ یہ محمدؐ کا جادو ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) مگر اب وہ اپنے اصرار میں کامیاب نہ ہو سکے اور مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ معاہدہ ختم ہوگیا۔ اس قدرتی کرشمہ کے بعد ایسی فضا ہوگئی کہ بنو ہاشم شعب سے نکل کر مکہ میں آگئے[2]

ایسے سخت امتحان میں روحانی ترقی کہاں تک ہوسکتی ہے وہ محتاج بیان نہیں چنانچہ اسی زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کا شرف عظیم حاصل ہوا۔ معراج میں پنج وقتہ

---

[1] موسیٰ بن عقبہ بحوالہ الزہری۔ البدایہ والنہایہ ج۳ ص۸۴ [2] البدایہ والنہایہ ج۳ ص۹۶

نمازیں فرض ہوئیں۔ نماز کے آخر میں التحیات پڑھی جاتی ہے جس میں نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان بزرگوں پر جو اس امتحان میں کامیاب ہوئے تھے بلکہ اُن کے طفیل میں تمام عباد صالحین پر سلام بھیجا جاتا ہے۔ السّلام علینا وعلیٰ عباد اللہ الصّالحین۔

پناہ کی دیواریں منہدم

قریش کا مقاطعہ جو بعثت مبارکہ کے ساتویں سال شروع ہوا تھا تین سال بعد (سنہ بعثت مبارکہ میں) ختم ہوا۔ چند ماہ بعد رمضان کا مہینہ آیا۔ اس مہینہ میں چند روز کے فرق سے خواجہ ابو طالب اور سیّدہ خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کی وفات ہوگئی۔ سیّدہ خدیجہ وہ خاتون تھیں جو سب سے پہلے ایمان لائیں اور ابو طالب وہ شیخ قبیلہ تھے جو آخر تک ایمان نہیں لائے اور یہ اعلان کرتے ہوئے مَرے کہ میں نے اپنے باپ دادا کا مذہب نہیں چھوڑا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں جاں نثار تھے۔

پناہ کی یہ دونوں دیواریں منہدم ہوگئیں، تو اب دشمنوں کا راستہ صاف تھا عقبہ بن ابی معیط اور ابولہب جو بدترین موذی دشمن تھے اور دونوں پڑوسی تھے[1] اُن کا طریقہ یہ تھا کہ راستہ میں کانٹے بچھوا دیتے۔ دروازہ میں غلاظت کا بھرا ہوا ٹوکرا ڈلوا دیتے تھے۔ اُن کے چھوٹے اُن سے بھی آگے تھے، وہ کاشانۂ نبوی میں گھس کر برتنوں کو خراب کرتے۔ پکتی ہوئی ہنڈیا کو اوندھی کر دیتے یا اُس میں پلیدی ڈال دیتے تھے[2]

خدا جانے کتنی مرتبہ ایسا ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر سے تشریف لائے۔ سر مبارک اور کپڑے گرد وغبار اور پلیدی سے آلودہ۔ صاحبزادیاں یہ حالت دیکھ کر دلگیر ہورہی ہیں، کپڑے دھو رہی ہیں، سر مبارک صاف کر رہی ہیں۔ زبان سے بددعا دیتی ہیں تو ارشاد ہوتا ہے: "لا تبکی یا بُنَیّۃ فانّ اللہ مانع اباک"[3] (بیٹی دلگیر نہ ہو اللہ تمہارے باپ کا محافظ ہے)

---

[1] ابن سعد ص۱۳۲ ج۱ [2] البدایہ والنہایہ ص۱۲۲ ج۳ [3] ایضاً

پناہ کی تلاش

نبی کا بھروسہ خدا پر ہوتا ہے۔ اور شروع میں جب یہ حکم نازل ہوا تھا کہ "اپنے قریبی رشتہ داروں کو دعوتِ اسلام دو"۔[1]

تو ساتھ ہی حضرت حق جل مجدہٗ نے یہ ہدایت بھی فرمائی تھی۔

بھروسہ کر خدا، قادر و رحیم پر جو تم کو دیکھتا رہتا ہے جب تم کھڑے ہوتے ہو اور نمازیوں کے ساتھ تمہاری نشست و برخاست کو وہ دیکھتا رہتا ہے۔[2]

مگر چونکہ نبی کی زندگی کا ہر ورق اُمت کے لئے سبق ہوتا ہے اس لئے وہ اللہ تعالیٰ پر مکمل اور کامل بھروسہ کے باوجود ظاہری ذرائع اور اسباب سے دامن نہیں جھٹکتا۔ کیونکہ اگر سلسلۂ اسباب کو چھوڑ دیا جائے تو اس عالمِ اسباب کا نظام ہی درہم برہم ہو جائے، بہرحال جب خواجہ ابو طالب کی وفات کے بعد قریش کو موقع مل گیا کہ جو کچھ وہ اب تک نہیں کر سکتے تھے اس کو کر گذریں تو آپکو بھی ایسے ذریعہ کی تلاش ہوئی جو قانونِ عرب کے بموجب آپ کے لئے پناہ بن سکے۔

مگر مٹھی بھر مسلمانوں یا آلِ ہاشم کے علاوہ مکہ کا بچہ بچہ دشمن تھا اور کوئی ہمدرد بھی تھا تو کس کی ہمت تھی کہ قریش کے مقابلہ میں آپ کی ڈھال بن سکے۔ لہٰذا آپ نے مکہ سے باہر نظر دوڑائی۔

طائف کا سفر

طائف

مکہ سے تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر ایک سرسبز پہاڑ ہے۔ نہایت زرخیز وہاں بڑے بڑے باغات اب بھی ہیں اور اس وقت بھی تھے۔ مکہ کے رئیسوں کی وہاں کوٹھیاں تھیں۔ قبیلۂ ثقیف کا وہاں تسلط تھا۔ وہ عرب کا طاقتور قبیلہ مانا جاتا تھا قریش بھی اُس کا لوہا مانتے تھے۔ اس قبیلے سے اُن کی رشتہ داریاں بھی تھیں۔

---

[1] سورۂ شعراء ۲۶، آیت ۲۱۴ [2] سورۂ شعراء ۲۶، آیت ۲۱۷ و ۲۱۸

رؤسائے طائف اور اُن کے جواب تین بھائی عبدیالیل، مسعود اور حبیب یہاں کے رئیس اعظم اور قبیلہ ثقیف کے سردار تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اُن پر پڑی کہ اگر وہ پناہ میں لے لیں تو آپ کو فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی میں آسانی ہو۔ چنانچہ آپ رمضان گذرنے کے بعد ماہ شوال میں طائف تشریف[1] لے گئے۔ دس روز وہاں قیام فرمایا[2]۔ عوام وخواص اور ہر ایک کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کی۔ رؤسا اور معززین کے مکانوں پر پہنچ کر گفت گو کی[3]۔ ان تینوں بھائیوں سے بھی ملاقات کی، اپنا مقصد واضح کیا۔ مگر کسی ایک نے بھی انسانیت سے جواب نہیں دیا۔

ایک نے کہا اگر خدا نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا ہے تو وہ خانہ کعبہ کے کپڑے کھسوٹ رہا ہے (اس کی عزت پامال کر رہا ہے)۔

دوسرے نے کہا۔ اللہ کو آپ کے سوا کوئی اور نہیں ملا تھا جس کو رسول بنا کر بھیجتا۔

تیسرے نے کہا: واللہ میں تم سے بات نہیں کروں گا۔ کیونکہ جیسا تمہارا دعویٰ ہے، اگر واقعی تم خدا کے رسول ہو تو رسول کی شان یہ نہیں ہے کہ اس سے بحث کی جائے اور اگر تم خدا پر جھوٹ باندھ رہے ہو تو میری شان یہ نہیں ہے کہ میں جھوٹے سے بات کروں[4]۔

ان لوگوں کے بھونڈے جواب سن کر آپ نے فرمایا کہ اتنی مہربانی کرو کہ میرے آنے کی خبر کسی کو نہ دو۔ آپ کو خیال ہوا کہ مکہ والوں کو میرے آنے اور اُن کے جوابوں کی خبر ہو گی تو وہ اپنی حرکتوں میں اور دلیر ہو جائیں گے۔ مگر ان بدنصیبوں نے اس فرمائش کی تعمیل اس طرح کی کہ طائف کے آوارہ گردوں کو اشارہ کر دیا۔ وہ آپ کے پیچھے پڑ گئے اور گستاخیاں کرنے لگے اور جب کسی طرح اُن سے جان چھڑا کر آگے بڑھے تو طائف کے لوگوں نے جو دونوں طرف صف بنائے کھڑے تھے ذاتِ اقدس پر دونوں طرف سے پتھر برسانے شروع کر دیئے

---

[1] یہ سفر بظاہر پیادہ ہوا۔ کسی سواری کا کوئی تذکرہ روایتوں میں نہیں ملتا۔ محمد میاں

[2] ابن سعد ص۱۴۲ [3] ایضاً [4] البدایہ والنہایہ ص۱۳۵ ج۳

سنگ باری سے پنڈلیاں مجروح ہوگئیں۔ گھٹنے چور ہو گئے۔ بدن مبارک لہولہان ہوگیا۔ ایک جاں نثار حضرت زید بن حارثہ ساتھ تھے۔ وہ کبھی آگے کبھی پیچھے بچانے کی کوشش کر رہے تھے مگر تنہا کیا کر سکتے تھے۔ پتھروں سے ان کا سر بھی پھٹ گیا[1] بالآخر کسی طرح آبادی سے باہر نکلے تو بیہوش ہو کر گر پڑے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے اٹھایا۔ قریب ہی کچھ پانی تھا۔ وہاں لے گئے تاکہ خون کے دھبے دھو دیں۔ نعلِ مبارک اُتارنے چاہے تو خون سے اس طرح جم گئے تھے کہ اتارنا مشکل پڑا۔ طبیعت سنبھلی تو قریب کے ایک باغ میں تشریف لے گئے ــــ ایک درخت کے سایہ میں تشریف فرما ہوئے اور اپنے معبود کی بارگاہ میں مشغول دُعا ہو گئے[2]۔

بارگاہ ربّ العزّت میں عجز و انکسار

پتّھر برسانے والوں کے حق میں خیراندیشی اور ہمدردی

اہلِ طائف کی وحشیانہ حرکتوں سے مجروح و مضروب" محمّد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) انگور کی ٹٹّی کے سایہ میں نڈھال بیٹھے ہیں۔ دل میں درد ہے، زخموں میں ٹیس، مگر پیشانی بارگاہِ ربّ العزّت میں جھکی ہوئی ہے اور زبانِ مبارک[3] مصروفِ دعا ہے (ترجمہ یہ ہے):

"میرے اللہ میں تجھ ہی سے اپنی بے بسی کا شکوہ کرتا ہوں میں لوگوں میں ذلیل ہو رہا ہوں۔ اس کا شکوہ تجھ ہی سے کرتا ہوں۔ اے سارے مہربانوں میں سب سے زیادہ مہربان۔

ان کا رب (نگران و مددگار) تو ہی ہے جو دنیا میں کمزور سمجھے جاتے ہیں، جن کا کوئی سہارا نہیں ہوتا، جن کے پاس وسیلے اور ذریعے نہیں ہوتے اور ہاں میرا رب تو ہی ہے، اے میرے پروردگار تو مجھے کن کے حوالے کر رہا ہے ان کے جو مجھ سے دُور ہیں! جو مجھ سے بات بھی

---

[1] طبقات ابن سعد ص۱۴۲ ج۱ [2] البدایہ والنہایہ ص۱۳۶ ج۳ [3] غور کیجئے کیا ایسا شخص (معاذ اللہ) کاذب یا ساحر یا شاعر ہو سکتا ہے؟

کرتے ہیں، تو منھ بگاڑ کر ـــ یا اُن کو جو میرے دشمن ہیں، کیا تو نے میرے معاملہ کا مالک اُن کو بنا دیا ہے۔

اے اللہ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے، خداوندا اگر مجھ پر تیرا عتاب نہیں ہے تو مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں ہے۔ خداوندا تیری عافیت کا دامن بہت وسیع ہے، میری سمائی تیری عافیت کی گود ہی میں ہے تیرے چہرہ کا وہ نور ـــــ جس سے اندھیریاں روشنی بن جاتی ہیں جس کے ادنیٰ جلوے سے دنیا اور آخرت کے بگڑے ہوئے کام سنور جاتے ہیں میں اسی نور کی پناہ لیتا ہوں۔

میں پناہ مانگتا ہوں اُس سے کہ مجھ پر تیرا غضب پڑے یا عتاب نازل ہو، تجھ ہی کو منانا ہے اور اس وقت تک منانا ہے جب تک تو راضی نہ ہو۔ اے اللہ مجھ میں نہ طاقت ہے نہ زور ہے۔ جو کچھ طاقت ہے تیرا ہی صدقہ ہے۔ جو کچھ قوت ہے وہ تیری ہی عطا ہے۔

میری کوئی تدبیر کارگر نہیں، کارساز تو ہی ہے، بگڑی کو بنانے والا تو ہی ہے۔"

یہاں سے اُٹھے، دل غمگین تھا، حسرت و افسوس کے دھوئیں سے دم گھٹ رہا تھا۔ سر جھکائے ہوئے تشریف لے جا رہے تھے۔ کچھ دھیان پلٹا تو دیکھا پہاڑی سامنے ہے جس کو قرن الثعالب یا قرن المنازل کہتے ہیں۔ آپ یہاں ٹھٹکے، اوپر نظر اُٹھی تو دیکھا۔ ایک بادل آپ پر چھایا ہوا ہے۔ بادل پر نظر ڈالی تو دیکھا حضرت جبرئیلؑ امین جلوہ افروز ہیں اور فرما رہے ہیں:

" اللہ تعالیٰ نے سُن لیا، دیکھ لیا، تم نے جو کچھ کہا، جو لوگوں نے جواب دیا، جس طرح تم کو واپس کیا اور جو سلوک تمہارے ساتھ کیا وہ بھی دیکھ لیا

لہ البدایہ والنہایہ ص ۱۳۶ ج ۳

اب یہ پہاڑوں کے فرشتے (ملک الجبال) موجود ہیں۔ اللہ تعالٰی نے ان کو بھیجا ہے۔ آپ حکم کیجئے، یہ تعمیل کریں گے۔"

پھر ملک الجبال سامنے آیا۔ سلام عرض کیا، پھر کہا:

"یا محمدؐ! تمہاری قوم کی تمام باتیں خدا نے سنیں، دیکھیں، اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے، آپ جو چاہیں حکم کریں، میں تعمیل کروں گا۔ آپ حکم دیں مکّہ کے دونوں طرف جو پہاڑ ہیں ان کو ملا کر ان تمام گستاخ بے ادب لوگوں کو پیس ڈالوں۔"

ایک آزمائش وہ تھی کہ اہل طائف ہر طرف سے پتھر برسا رہے تھے۔ دوسری آزمائش یہ ہے کہ جبرئیل امینؑ اور ملک الجبال ان سب کو پیس ڈالنے کی فرمائش کے منتظر ہیں۔ وہ امتحان تھا صبر و ضبط، تحمل اور استقلال کا۔ یہ امتحان ہے وسعتِ ظرف، فراخ حوصلہ اور دعوے رحم و کرم کا۔

جس خدا نے آپ کو اس امتحان میں ثابت قدم رکھا، اُس نے آپ کو اس امتحان میں بھی کامیاب فرمایا۔

فرشتے کی درخواست سن کر دل مبارک بیتاب ہوگیا۔ یہ خدا کی مخلوق جو نبی کی کھیتی ہے برباد کردی جائے؟

آپؐ نے فرشتوں کو جواب دیا:

ارجو ان یخرج اللہ من اصلابھم من یعبد اللہ ولا یشرک بہ شیئاً۔[1]

"اگر یہ بدنصیب راہِ راست پر نہ آئیں تو ان کی نسل سے میں نا اُمید نہیں ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ ان کی نسل میں وہ ہوں گے جو خدا واحد کی عبادت کرینگے اور

---

[1] بخاری شریف ص۴۵۸ مسلم شریف ص۱۰۹ ج ۲

شرک سے باز رہیں گے۔[1]

باغ کے مالک اور اُن کا غلام یہ باغ عتبہ[2] اور شیبہ بن ربیعہ کا تھا جو مکہ کے مشہور رئیس تھے۔ یہ دونوں بھائی باغ میں موجود تھے، اُنھیں غیرت آئی کہ اُن کے شہر کے ایک شخص کے ساتھ طائف والوں نے یہ سلوک کیا۔ مگر یہ ہمت پھر بھی نہیں ہوئی کہ آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلم سے آکر بات کرتے۔ انگوروں کے خوشے تھال میں رکھ کر غلام کو دیئے کہ وہ ان مظلوم مہمانوں کے پاس لیجائے، جو سایہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

غلام کا نام عداس تھا، مذہباً عیسائی تھا۔ وہ آپؐ کے پاس انگور لے کر آیا۔ آپ نے انگوروں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو زبان مبارک پر آیا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

عداس الرحمٰن الرحیم سُن کر چونکا، کہنے لگا: یہاں کے آدمی تو الرحمٰن الرحیم نہیں کہتے[3]

آپ نے فرمایا: تم کہاں کے ہو۔ عداس نے جواب دیا: میرا آبائی وطن "نینوی" تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم: وہی نینوی جو میرے بھائی یونس (علیہ السّلام) کا وطن تھا۔

عداس: آپؐ حضرت یونسؑ کو کیسے جانتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: میرے اور اُن کے درمیان "نبوت" کا رشتہ ہے۔ وہ بھی اللہ کے نبی تھے۔ میں بھی اُسی خدا کا بھیجا ہوا نبی ہوں۔

عداس یہ سُن کر تڑپ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پیر چومنے لگا۔ عتبہ اور شیبہ نے دور سے دیکھا تو کہنے لگے اس کو تو "محمدؐ" نے بگاڑ دیا۔

---

[1] حضرت نوح علیہ السّلام کو اس کی توقع نہیں رہی تھی آپ نے بارگاہِ رب العزت میں یہ عرض کیا تھا اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (سورہ نوح۔ "اگر ان کو مہلت رہی تو یہ بندگان خدا کو گمراہ ہی کریں گے۔ اور صرف انھیں کو جنم دیں گے جو بدکار اور بدترین کافر ہوں گے۔")

[2] حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نانا: حضرت ابوسفیان کے خسر، غزوۂ بدر میں سب سے پہلے یہ دونوں بھائی اور عتبہ کا لڑکا ولید بن عتبہ ہی حضرت حمزہ حضرت علی اور حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہم کے ہاتھ سے مارے گئے تھے۔ تفصیل سلسلہ غزوات میں ملاحظہ فرمایئے۔

[3] ملاحظہ فرمایئے سورہ ۲۵ الفرقان کی آیت ۶۰ "جب ان مشرکین مکہ سے کہا جاتا ہے کہ سجدہ کرو رحمٰن کو تو وہ (انجان بن کر کہتے ہیں) رحمٰن کون؟"

جب عداس واپس پہونچا، تو دونوں بھائیوں نے غلام سے پوچھا: تم یہ کیا حرکت کر رہے تھے۔

عداس: یہ نبی ہیں۔ ان سے بہتر کوئی آدمی نہیں۔ اُنھوں نے مجھے دو باتیں بتائیں جو نبی ہی بتا سکتا ہے۔

دونوں رئیس: اس کی باتوں میں نہ آؤ، اپنے مذہب پر رہو۔ تمہارا مذہب اس کے دین سے بہت اچھا ہے[1]

مطعم بن عدی کی قدردانی

طائف میں یہ سب کچھ ہوا۔ مگر وہ سوال پھر بھی رہ گیا جس کے لئے آپؐ نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔ آپ نے مکہ پہونچنے سے پہلے یکے بعد دیگرے رؤسار مکہ اخنس بن شریق اور سہیل بن عمرو کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ حمایت کا وعدہ کرلیں، مگر دونوں نے انکار کر دیا کہ وہ قریش کے حلیف ہیں، وہ قریش کے خلاف کسی کو پناہ نہیں دے سکتے۔ پھر آپ نے اُس کے پاس پیغام بھیجا جس کے لئے یہ شرف مقدر تھا۔

یہ رئیس مکہ "مطعم بن عدی" تھا۔ اُس نے حمایت کا وعدہ بھی کیا اور یہ فرمائش بھی کی کہ آپ اُس کے یہاں تشریف لائیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مطعم کے یہاں تشریف لے گئے۔ رات اُن کے یہاں گذاری۔ صبح ہوئی تو مطعم نے خود ہتھیار سجائے۔ اُس کے چھ سات لڑکے تھے سب کو مسلح کیا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لیکر چلا۔ حرم کعبہ میں پہنچا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا آپ طواف کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کیا مطعم اور بیٹے حفاظت کرتے رہے۔ جب طواف سے فارغ ہوئے تو "مطعم" نے اعلان کر دیا کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میری پناہ میں ہیں"۔

ابوسفیان مطعم بن عدی کے پاس آیا دریافت کیا: تم نے محمدؐ کو اپنی پناہ میں دیا ہے یا اُن کا مذہب قبول کرلیا ہے۔ مطعم نے جواب دیا: میں نے مذہب نہیں بدلا صرف محمدؐ کو پناہ دی ہے۔ ابوسفیان نے کہا: تب آپکے اعلان کا احترام کیا جائے گا۔[2]

---

[1] البدایہ والنہایہ ص۱۳۶ ج ۳ [2] البدایہ والنہایہ ص۱۳۷ ج ۳

یثرب - مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(۱)

مکہ معظمہ سے شمال کی جانب تقریباً دو سو میل (سوا تین سو کیلومیٹر) کے فاصلہ پر ایک زرخیز علاقہ ہیں آبادیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ ان میں سب سے بڑی آبادی کا نام یثرب[1] ہے[2]۔ اس کے دو طرف دو سنگلاخ ہیں، ان کو لابتین کہا جاتا ہے اور حرتین[3] بھی کہلاتے ہیں۔

جانب مشرق میں تقریباً آٹھ میل تک چھوٹی چھوٹی آبادیوں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ اُن کو عوالی کہا جاتا ہے۔ موضع قبا اسی طرف ہے۔[4] دوسری جانب بھی اسی طرح کی آبادیاں ہیں ان کو اسافل کہا جاتا ہے[5]۔

یثرب کے نشیبی حصہ میں برسات میں پانی بھر جاتا ہے جس کی وجہ سے یہاں کی آب و ہوا

---

[1] وكانت يثرب ام قرى المدينة وهى ما بين طرف قناة الى طرف الجرف وما بين المال الذى يقال له البرنى الى زبالة۔ (وفاء الوفاء ص۱۲۳)

[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں قیام فرمایا تو اس کا نام مدینۃ النبی ہو گیا (صلی اللہ علیہ وسلم) کثرتِ استعمال نے مدینۃ النبی کو مختصر کر کے صرف مدینہ کر دیا۔ مگر عاشقان رسول نے محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر کے بہت سے نام رکھ ڈالے: طابہ، طیبہ، مجبوبہ، مبارکہ، عاصمہ، مرزوقہ، قاصمہ، اکالۃ البلدان۔ غرض اس طرح نوے سے زیادہ نام ہو گئے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: وفاء الوفاء ج ۱

[3] لابہ اور حرہ کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں۔ یعنی ایسا سنگلاخ جس کے پتھر اس طرح کے کالے ہوں جیسے کوئی پرانا پتھر مسلسل کائی چڑھنے سے کالا ہو جاتا ہے۔ (مجمع البحار و قاموس) یہ کئی میل تک چلے گئے ہیں۔ ان پر نہ کاشت ہو سکتی ہے نہ ان پر آبادی ہے۔ فوج بھی ان پر نہیں گذر سکتی۔ یہ دو طرف حفاظت کی قدرتی دیواریں ہیں۔ [4] مجمع البحار و معجم البلدان [5] معجم البلدان

مرطوب رہتی ہے۔ یہاں کا بخار "حمی یثرب" پورے عرب میں مشہور ہے۔ یثرب نام میں آب و ہوا کی خرابی کو بھی دخل ہے (کیونکہ ثرب جو یثرب کا ماخذ ہے۔ ملامت کرنے کے معنیٰ میں آتا ہے)۔ اس پورے علاقے میں کاشت ہوتی ہے۔ مگر خاص پیداوار کھجور ہے۔ کھجوروں کے بڑے بڑے باغات ہیں۔ یہاں کے کھجور دور دور جاتے ہیں۔

(۲)

کم و بیش ایک ہزار سال[1] پہلے، یمن سے اُجڑ کر دو بھائی سرزمینِ حجاز میں داخل ہوئے اور یہاں آکر آباد ہو گئے۔ اُن میں سے ایک کا نام "اوس" تھا دوسرے کا نام "خزرج" باپ کا نام حارثہ ماں کا نام قیلہ۔ اس لئے اوس اور خزرج کی اولاد کو بنو قیلہ بھی کہتے ہیں[2]۔

اب (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مسعود میں) اوس اور خزرج دو قبیلے ہیں جن کی بہت سی شاخیں (بطن)، الگ الگ نام سے مشہور ہیں۔ (بنو نجار، بنو ساعدہ، بنو عمرو بن عوف وغیرہ) اس طرح یہ دو قبیلے بہت سے بطنوں میں بٹ گئے ہیں۔

یثرب کی آبادی تقریباً چھ ہزار[3] ہے۔ اور اتنی ہی آبادی عوالی اور اسافل کی ہے۔

ان سب کا ایک "دیوتا" ہے۔ "المناۃ الطاغیہ"

مشلل[4] مکہ اور یثرب کے بیچ میں ایک مقام ہے۔ وہاں اس کا مندر ہے۔ یہ سب "المناۃ الطاغیہ" کے بھگت[5] ہیں۔ مگر اصل تیرتھ کعبہ ہے۔ وہاں ہر سال "حج" کو جاتے ہیں اور ان بتوں کی بھی پوجا کرتے ہیں، جو "قریش" نے کعبہ میں رکھ رکھے ہیں۔ قریش اُن کے

---

[1] سیلِ عرم سے تباہ ہو کر یا بقول ابن ہشام سیلِ عرم سے کچھ پہلے اس سیل کے متعلق پیشین گوئی سن کر۔ سیرۃ ابن ہشام ج۱ [2] معجم البلدان و فتح الباری وغیرہ [3] ہجرت کے چوتھے سال غزوۂ احزاب میں تین ہزار مسلمانوں نے شرکت کی جب کہ ان میں کئی سو مہاجرین بھی شامل تھے اس سے یہاں کی آبادی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ [4] قدید کے قریب، والقدید اسم موضع قریب بمکہ معجم البلدان [5] بخاری شریف ص۲۲۳ و ص۶۴۱ وغیرہ

مہنت ہیں اور یہ سب اُن کے ہم مذہب اور اُن کے تابع ہیں۔ ان سب کی نسل بھی ایک ہی ہے کیونکہ یہ بھی حضرت اسمٰعیل اور حضرت ابراہیم علیہما السّلام کو اپنا مورث اعلیٰ مانتے ہیں[1] اور اس بنا پر رشتہ داریاں بھی ہیں۔ یہ سب کاشتکار اور زمیندار ہیں۔ عموماً ناخواندہ، جاہل کسی وقت یہ اس پورے علاقہ کے فرماں روا تھے۔ اس زمانہ کے قلعوں کے اونچے اونچے آثار (کھنڈر) اس وقت بھی موجود ہیں۔ ان کو "اطام یثرب[2]" کہا جاتا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اس کا نام "مدینۃ النبی" رکھ دیا گیا پھر کثرتِ استعمال کے باعث صرف "مدینہ" (ادام اللہ شرفہا) کہا جانے لگا۔

(۳)

اس علاقہ میں دوسری نسل بنو اسرائیل[3] کی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں۔

---

[1] احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ بخاری شریف ص۴۹۹ باب نسبۃ الیمن الی اسمٰعیل علیہ السلام اور قریش سے ان کی رشتہ داری تھی اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ یہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں اگرچہ ماہرین انساب کا خیال یہ بھی ہے کہ قحطان جو اہل یمن کا مورثِ اعلیٰ ہے وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی اولاد میں سے نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اوس اور خزرج بنو اسمٰعیل یعنی عرب مستعربہ نہیں تھے بلکہ عرب عاربہ تھے۔

[2] مورخین نے بیان کیا ہے کہ یہ قلعے زیادہ تر یہود نے بنائے تھے جب وہ تنہا اس علاقہ میں صاحب اقتدار تھے۔ اوس اور خزرج۔ یہودیوں کے دورِ اقتدار میں یہاں آئے۔ پہلے یہ صرف دو بھائی تھے پھر اُن کی اولاد نے ترقی کی۔ یہود کو حسد ہوا۔ انھوں نے ان کو ختم کر دینا چاہا مگر نتیجہ الٹا نکلا۔ مقابلہ ہوا تو یہود کا اقتدار ختم ہو گیا اور اوس و خزرج کے قبائل اس علاقہ کے حکمراں بن گئے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو وفاء الوفاء ص۱۲۵ تا ص۱۳۲ ج ۱ و معجم البلدان (کچھ تفصیل بعد کے حاشیہ میں ملاحظہ فرمایئے)

[3] یہ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے بھائی حضرت اسحاق علیہ السّلام کی اولاد ہیں۔ حضرت اسحاق علیہ السّلام کے فرزند رشید حضرت یعقوب علیہ السّلام تھے ان کو اسرائیل بھی کہا جاتا تھا۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

اور یہودی کہلاتے ہیں۔ یثرب (مدینہ) کے اطراف میں تین تین چار چار میل کے فاصلہ پر اُن کے قبیلے آباد ہیں اُن میں سے مشہور یہ تین ہیں: بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ یہ سب خوش حال ہیں۔ان کی آبادیاں قلعہ نما ہیں شاداب باغات میں گھری ہوئیں ہر طرح سے محفوظ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اُن کی اولاد کو بنو اسرائیل کہتے ہیں حضرت اسحاق علیہ السّلام شام میں رہے۔ حضرت یوسف علیہ السّلام کو مصر میں اقتدار حاصل ہوا تھا تو حضرت یعقوب اور اُن کے لڑکے مصر چلے گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے زمانے تک اُن کی تعداد کئی لاکھ ہوگئی تھی۔ لیکن اب اقتدار کے بجائے طوقِ غلامی ان کی گردن میں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو لے کر مصر سے نکلے۔ اول یہ پوری قوم تیہ میں رہی۔ پھر ان کا مرکز شام ہوگیا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عہد زریں اور مقدمہ سیرۃ مبارکہ۔

۵۴ مدینہ میں بنو اسرائیل کی آمد اور اُن کا اقتدار ایک روایت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کے مقابلہ میں کامیابی بخشی اور وہ تیہ میں جاکر مقیم ہوئے تو انھوں نے دیگر علاقوں میں مجاہدین بھیجنے شروع کئے جو بزور شمشیر اپنے دین کی اشاعت کرتے تھے اور جو ان کے مذہب میں داخل نہ ہوتا اس کو قتل کردیتے تھے۔ ان مجاہدین کی ایک فوج یثرب بھیجی۔ اس نے بھی کیا کہ جو اُن کے مذہب میں داخل نہ ہوا اُس کو قتل کردیا۔ لیکن ایک شاہزادہ نہایت حسین تھا اُس پر اُن کو رحم آگیا۔ اُس کو قتل نہیں کیا اُسے ساتھ لے کر حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی خدمت میں حاضر ہو رہے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی وفات ہوگئی۔ اُن کے جانشین کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا کہ اس فوج نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت پر عمل نہیں کیا کہ واجب القتل نوجوان کو پناہ دیکر ساتھ لے آئے۔ جانشین نے اُن کے بارہ میں مشورہ کیا۔ طے یہ کیا گیا کہ اس پوری فوج کو اپنی جماعت سے خارج کردیا جائے۔ یہ لوگ وہاں سے جلا وطن ہوئے تو انھوں نے یثرب کو اپنے قیام کے لئے منتخب کیا جہاں وہ فتح حاصل کرچکے تھے۔ ایک روایت یہ ہے کہ اہلِ روم کے حملہ کے وقت کچھ لوگ شام سے یہاں چلے آئے۔ ایک روایت یہ ہے کہ بخت نصر نے جب یروشلم کو تباہ کیا تب یہ لوگ یثرب آئے۔ بہرحال روایتیں اگرچہ متعدد ہیں مگر علماء تاریخ نے ان کو متضاد قرار نہیں دیا کیونکہ ان سب روایتوں کا حاصل یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے جانشین کے زمانہ سے اُن کی آمد شروع ہوئی اس کے (دیکھئے آئندہ صفحہ)

باغات کے علاوہ اُن کے تجارتی سلسلے بھی ہیں اور اُن کا سودی کاروبار بھی بہت پھیلا ہوا ہے۔ اپنی اپنی حیثیت میں یہ سب قبیلے آزاد ہیں۔ ان کی مجموعی آبادی بھی یثرب کی آبادی کے لگ

(سلسلہ صفحہ گذشتہ) بعد مختلف اوقات میں آمد ہوتی رہی۔ ان سیاسی محرکات اور اسباب کے علاوہ ایک مذہبی محرک بھی بیان کیا گیا ہے کہ کچھ باخدا احبار یہود کو جب توریت کے اشارات سے معلوم ہوا کہ نبی آخرالزماں کا ظہور مدینہ میں ہوگا تو وہ یثرب منتقل ہوگئے کہ اگر ان کو نبی آخرالزماں کی زیارت نہ ہوسکے تو کم از کم ان کی اولاد اس سعادت و شرف سے مشرف ہوسکے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے بنو قریظہ یہی کہا کرتے تھے کہ اُن کے بزرگ انھیں پیشین گوئیوں کی بنا پر یہاں آکر قیام پذیر ہوئے تھے۔

عروج | بنو اسرائیل (یہود) نے یہاں کافی ترقی کی۔ اس پورے علاقہ پر وہ چھا گئے۔ حکومت بھی تھی اور دولت بھی اور نسلیں بڑھیں تو بیس اکیس قبیلے اُن کے ہوگئے اور شام تک انہیں کی بستیوں کی کثرت ہوگئی۔ وادی قریٰ تیما خیبر اُن کے اہم اور خاص مرکز تھے۔ اوس اور خزرج یہاں آباد ہوئے تو ان سے معاہدہ کرکے ان کے حلیف بن کر آباد ہوئے۔

زوال | یہودیوں میں ایک راجہ (ملک) ہوا جس کا نام "فطیون" تھا۔ یہ نہایت عیاش اور بدکار تھا۔ اس نے یہ حکم دیا کہ ہر ایک دلہن اس کے عشرت کدہ میں خراج عیش دے۔ یہود نے اس کو گوارا کرلیا مگر جب اوس اور خزرج کی نوبت آئی تو اُنھوں نے سرتابی کی۔ اس زمانہ میں قبیلہ خزرج کا ایک سردار مالک بن عجلان تھا۔ اس کی بہن کی شادی ہوئی تو وہ عین شادی کے دن گھر سے نکلی اور اپنے بھائی مالک بن عجلان کے سامنے سے بے پردہ گذری۔ مالک کو غیرت آئی وہ اٹھکر گھر میں آیا اور بہن کو سخت ملامت کی۔ بہن نے کہا ہاں لیکن کل کو جو کچھ ہوگا وہ اس سے بھی سخت ہوگا۔ دوسرے دن جب حسب دستور مالک کی بہن دلہن بن کر فطیون کی خلوت گاہ میں گئی تو مالک بھی زنانہ کپڑے پہن کر سہیلیوں کے ساتھ اندر چلا گیا اور فطیون کو قتل کرکے شام بھاگ گیا۔ یہاں غسانیوں کی حکومت تھی اور ابو جبلہ حکمراں تھا اس کو یہ تکلیف دہ حالات معلوم ہوئے تو وہ لشکر لیکر آیا اور اوس اور خزرج کو انعامات دیئے اور ایک عام دعوت کرکے رؤسا یہود کو مدعو کیا اور ان کو قتل کرادیا۔ اب یہود کا زور ٹوٹ گیا۔ اوس اور خزرج نے قوت حاصل کرلی مگر پھر ان دونوں قبیلوں میں جنگ شروع ہوئی جو سو سال سے زیادہ رہی۔ یہود نے ان کو لڑانے میں بھی اپنا تمام چالبازیاں ختم کردیں اور ان کو سودی رقم دیکر ننگا بھی کردیا۔ یہی حالت تھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا (معجم البلدان۔ ابن ہشام۔ وفاء الوفاء وغیرہ)

بھگ ہے۔ اُن کے یہاں تعلیم کا انتظام بھی ہے۔ ایک تعلیمی ادارہ "بیت المدارس" کے نام سے قائم ہے جس میں توریت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یثرب کے عام باشندے ان کی تعلیمی برتری سے متاثر ہیں۔ یہاں تک کہ بعض خوش عقیدہ اپنے ہونہار بچوں کو یہود کے حوالے کر دیتے ہیں کہ علمی شائستگی حاصل کر سکیں۔

اوس اور خزرج کبھی بھائی برادر کی طرح رہے ہوں گے۔ مگر اب وہ جنگجو حریف ہیں۔ اور تقریباً سوا سو برس سے برابر لڑائی کا سلسلہ جاری ہے۔ حال ہی میں نہایت خوں ریز لڑائی ہوئی جو "حرب بعاث" کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں دونوں قبیلوں کے بڑے بڑے سردار کام آچکے ہیں۔

یہودی ان لڑائیوں میں شریک نہیں ہوئے البتہ ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں۔ پھر اُن کی بدحالی سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ سودی قرض دیکر اُن کی بہت سی جائدادیں قبضہ میں لے چکے ہیں۔

یثرب کے دو لیڈر اوس اور خزرج کے بڑے لوگوں میں اب صرف دو باقی رہ گئے تھے۔ عبداللہ بن اُبَیّ بن سلول قبیلہ خزرج کا رئیس اور لیڈر اور ابو عامر بن صیفی بن نعمان قبیلہ اوس کا رئیس و امیر[1]

یثرب میں آنے والے نبی کا چرچا

توریت کی پیشین گوئیوں کے بموجب یہودی ایک آنے والے نبی کے منتظر تھے وہ اس کی علامتیں بھی بیان کیا کرتے تھے۔ ان یہودیوں میں کچھ خاندان وہ بھی تھے جن کے مورث اور اجداد اسی اُمید پر یہاں آکر آباد ہوئے تھے کہ نبی آخرالزماں کا ظہور اسی سرزمین میں ہوگا۔ مگر وہ تعصّب، گروہ پرستی اور صرف اپنے گروہ کو سب سے اونچا اور خدا کا محبوب سمجھنے کا غلط عقیدہ

---

[1] وفاء الوفاء صفحہ ۱۵۵ ج ۱

جو اُن کے ذہنوں میں رچا ہوا تھا اور ایک جذبہ بن گیا تھا اُس نے اس خوش آئند تصور کو اور اس تمنّا کو یقین کا درجہ دے دیا تھا کہ آنے والا نبی انھیں کے گروہ میں سے ہوگا[1]۔ اس سلسلہ میں بہت سی روایتیں بھی گھڑ لی تھیں[2]۔ وہ سمجھتے تھے کہ جیسے ہی وہ نبی ظاہر ہوگا ان کا اقبال نقطۂ عروج پر پہنچ جائے گا۔ چنانچہ مشرکین یعنی اوس اور خزرج سے کسی بات پر بحث ہوتی یا کسی موقع پر مشرکین کے سامنے زچ ہونا پڑتا تو یہی روایتیں اور پیشین گوئیاں بیان کرکے ان کو مرعوب کیا کرتے تھے کہ "مستقبل کی سربلندی ہمارے لئے ہے"۔ مشرکین اگرچہ اُن کے ہم عقیدہ نہیں تھے، مگر چونکہ جاہل تھے وہ متاثر ہو جاتے تھے۔ اس طرح اُن کے کان آنے والے نبی کے تذکرہ سے نا آشنا نہیں رہے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہی آشنائی اُن کے لئے مشعل راہ بنی[3]۔

یثرب میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ خیر

اوس اور خزرج کی طویل جنگ نے ایک فریق کو اتنا دبایا کہ اُس نے کسی بڑے طاقتور قبیلہ کی مدد حاصل کرنی ضروری سمجھی۔ چنانچہ اس فریق کا ایک وفد زمانہ حج میں مکہ پہنچا اور اُس نے قریش کو اپنا مددگار اور حلیف بنانا چاہا۔ یہ وفد اس مقصد میں تو کامیاب نہیں ہوا۔ مگر یہ سعادت اُس کو ضرور حاصل ہوگئی کہ اس کے ایک رکن (ایاس بن معاذ) داعیِ حق کی صدائے حق کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ باقاعدہ مسلمان تو نہیں ہوئے مگر دعوتِ حق کے اثر سے اپنا دامن جھٹک بھی نہیں سکے۔

---

[1] ان کی یہ دلیل ایک حد تک معقول تھی کہ صدہا سال سے نبوت انھیں کے گروہ میں چلی آرہی ہے۔ یہاں تک کہ جتنے انبیاء علیہم السّلام کے نام ان کو معلوم تھے وہ سب اسرائیلی تھے۔ قرآن حکیم نے پوری اہمیت کے ساتھ یہود کے قومی جرائم شمار کرا کر اس دلیل کی تردید کی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ یہ درست ہے کہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کے تمام طبقات پر فضیلت دی تھی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے ان قومی جرائم نے ان کو اس فضیلت سے محروم کر دیا۔ سورۂ نساء آیات ۴۵ و ۴۶ و ۵۱ تا ۵۴ و آیات ۱۵۲ تا ۱۶۱ وغیرہ

[2] دیکھو آیت ۱۵۳ سورہ آل عمران [3] دیکھو آیت ۸۸ سورہ بقرہ

یہ وفد واپس یثرب پہنچا تو روئیداد سفر میں لامحالہ اس دعوت کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ ایاس اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے۔ مگر اُن کے خاندان والوں کا یقین یہ تھا کہ اُن کی وفات اسلام پر ہوئی ہے۔ کیونکہ وفات کے وقت اُن کی زبان پر لاالٰہ الا اللہ اور سبحان اللہ والحمد للہ اور اللہ اکبر کے کلمات جاری تھے [1]

یثرب میں اسلام

اسعد بن زرارہ اور ذکوان بن عبد القیس مدینہ کے عمائدین میں سے تھے۔ یہ مکہ کے رئیس اعظم عتبہ بن ربیعہ کے پاس مدد حاصل کرنے کے لئے پہنچے۔ عتبہ نے کہا ہم خود عجیب پریشانی میں مبتلا ہیں۔ ہمارے یہاں ایک شخص پیدا ہو گیا ہے۔ توحید کا قائل ہے۔ ہمارے دیوتاؤں کی تردید کرتا ہے، نمازیں بہت پڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ اس نے ہمارے سارے نظام کو درہم کر رکھا ہے۔ ہمیں خود اپنے سے فرصت نہیں۔ ہم کسی کی مدد کیا کر سکتے ہیں۔

عتبہ کے اس شکوہ نے نفرت کے بجائے ان دونوں کے دلوں میں محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) سے ملاقات کی امنگ پیدا کر دی۔ یہ عتبہ سے رخصت ہوئے۔ ناکہ بندی کی وجہ سے پہنچنا مشکل تھا مگر ان دونوں نے کوشش کی اور کسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچنے میں کامیاب ہو گئے۔ خدمت میں حاضر ہوئے، گفتگو کی، کلام پاک کی آیتیں سنیں، دعوت اسلام کو سمجھا، دماغ صاف تھا، دل صاف تھا، طبیعت حق کی طرف مائل تھی۔ اللہ کے کلام نے اثر کیا اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

مدینہ واپس پہنچے تو حضرت اسعدؓ نے اپنے دوست ابوالہیثم بن تیہان سے اپنے مسلمان ہونے کا ماجرا سنایا۔ وہ بھی مسلمان ہو گئے۔ ان دونوں کے متعلق یہ بھی روایت ہے کہ یہ پہلے ہی سے شرک سے بیزار اور توحید کی طرف مائل تھے [2]

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص ۲۵۶ ج ۱ [2] طبقات ابن سعد جلد اول ص ۱۴۶

دو بزرگ اور تھے: رافع بن مالک ازرقی اور معاذ بن عفراء۔ یہ حج یا عمرہ کے لئے مکہ معظمہ آئے۔ اور کسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تبادلہ خیالات کا موقع مل گیا۔ یہ دونوں بھی اسلام سے مشرف ہوگئے۔[1]

یثرب کی پہلی جماعت جس نے دعوتِ اسلام قبول کی

اہلِ طائف نے جس سعادت کی قدر نہیں کی، اہل یثرب کی خوش نصیبی نے اس کا استقبال کیا۔ طائف سے واپس ہوکر مطعم بن عدی کی پناہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ پہونچے تو حج کے مہینے شروع ہوچکے تھے۔ مراسم حج ادا کرنے کے دن آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستور کے بموجب قبائل کے کیمپوں اور زائرین کی مجلسوں میں پہونچکر تبلیغ شروع کی جس سرگرمی سے آپ تبلیغ کرتے تھے قریش کا تعاقب بھی اتنا ہی شدید ہوتا تھا۔ خصوصًا ابولہب کی سرگرمی نے دیوانگی کی صورت اختیار کرلی تھی، لیکن قدرت کی کارفرمائیوں کا وہ مقابلہ نہ کرسکا۔ اسی گرما گرمی میں کچھ پاک نفوس ایسے بھی نکل آئے جنھوں نے متاعِ جان اس دعوت کے نذر کردی۔

یہ یثرب کے چھ یا آٹھ آدمی تھے جو حج کے لئے آئے تھے اور اب مراسم حج کے بموجب ایک جگہ سروں کے بال منڈوا رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچے۔ کچھ موقع مناسب معلوم ہوا۔ آپؐ نے اپنی دعوت پیش کرنی شروع کردی۔ کلام اللہ شریف کی آیتیں تلاوت کیں۔ سننے والوں کی پاک روحیں متوجہ ہوئیں۔ اُن کے آپس میں کچھ باتیں اشاروں میں ہوئیں:

"یہودی جس نبی کی خبر دیا کرتے تھے، معلوم ہوتا ہے، یہ وہی نبی ہیں۔ بیشک یہ کلام سچا اور یہ دعوت برحق ہے۔ اب ہیں ہمت کرکے پہل کردینی چاہیئے۔ کہیں ایسا نہ ہو یہودی سبقت کرجائیں اور اقبال مندی کا جو تاج ہمارے سروں کو بوسہ دینے کو تیار ہے، وہ یہودیوں کو میسر آجائے۔"

---

[1] طبقات ابن سعد جلد اوّل ص۱۴۶

اس طرح کی کچھ باتیں ہوئیں۔ پھر سب نے اپنی گردنیں قبولِ دعوت کے لئے خم کردیں۔ ان حضرات نے کلمہ شہادت پڑھ لیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری زندگی کا مقصد اسی دعوت کی اشاعت ہے۔ مکہ کی زمین میرے لئے تنگ ہوگئی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے میں آپ کے ساتھ یثرب چلوں اور یثرب کو دعوت و تبلیغ کا مرکز بناؤں۔ ان حضرات نے عرض کیا: ہم بسروچشم تیار ہیں۔ مگر فی الحال آپ کا تشریف لے چلنا مصلحت کے خلاف ہے۔ ہمارے یہاں ابھی ایک سال پہلے بعاث کا نہایت سخت معرکہ ہوچکا ہے جس کے زخم اب تک ہرے ہیں، جذبات برانگیختہ ہیں اور دماغوں میں نفرت بھری ہوئی ہے۔ اس حالت میں آپ کی دعوت صدا بصحرا ہوگی۔ کیونکہ اس وقت دونوں کا جمع ہونا ناممکن ہے آپ کسی بھی فریق سے رابطہ پیدا کریں گے تو دوسرا فریق دشمن بن جائے گا۔ آپ ہمیں موقع دیں ہم یثرب پہونچکر جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کریں۔ خدا کرے کوئی اصلاح کی صورت پیدا ہو اور فضا ہموار ہوجائے تو آپ کا تشریف لے چلنا مفید ہوگا۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ سال اسی مقام پر حاضر ہوں گے اور امید ہے کہ اس وقت تک ہم اس قابل ہوجائیں گے کہ آپ کو یثرب آنے کی دعوت دے سکیں۔

بات معقول اور ہمدردانہ تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرمالی۔

ان کے اسمار گرامی[1] یہ ہیں:

رافع بن مالک، عبادہ بن الصامت، ابوعبدالرحمٰن یزید بن ثعلبہ، عویم بن ساعدہ

---

[1] (الف) ابن سعد نے چند روایتیں پیش کی ہیں اور ہر روایت میں کچھ نام شمار کرائے ہیں ہم نے مکرر نام حذف کردیئے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ طبقات ابن سعد ص ۱۴۵ تا ص ۱۴۷ ج ۱ (الجزء الاول من کتاب الطبقات فی السیرۃ الشریفۃ النبویہ القسم الاول)

(ب) ان حضرات میں سے دو بزرگوں کا تعلق قبیلہ اوس سے ہے: ابوعبدالرحمٰن یزید بن ثعلبہ اور عویم بن ساعدہ (رضی اللہ عنہما) اور باقی چھ حضرات خزرجی ہیں۔

(ج) چھ یا آٹھ کی تعداد میں اگرچہ اختلاف ہے مگر اس پر اتفاق ہے کہ ان سب حضرات نے جو اس وقت بیعت ہوئے تھے راہِ خدا میں قتل ہوکر درجہ شہادت حاصل کیا۔ (الاستیعاب ص ۱۷۹ تذکرہ رافع بن مالک)

عوفؓ بن حارث بن عفراء، قطبہؓ بن عامر بن حدیدہ، عقبہؓ بن عامر بن نابی، جابرؓ بن عبداللہ بن رئاب۔ (رضی اللہ عنہم)

بیعت عقبہ اولیٰ

وعدہ پورا کرنے کی بہترین مثال ان چھ حضرات نے اپنے عمل سے پیش کی جو گذشتہ سال دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ باہمی نفرت اور بغض و عداوت کے دہکتے ہوئے ماحول میں ان حضرات نے ایسے سلیقہ سے کام کیا کہ معرکہ بعاث کے اشتعال انگیز تذکرہ کے بجائے ہر ایک گھر میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ اور جب حج کا زمانہ آیا تو بارہ افراد نے اپنے آپ کو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پیش کر دیا۔ مگر یہ پیشی نہایت رازداری کے ساتھ ہوئی۔

مکّہ معظمہ سے چند میل کے فاصلہ پر منیٰ کا میدان ہے، جہاں ۱۰ رذی الحجہ سے ۱۳ ر ذی الحجہ تک زائرینِ بیت اللہ کا اجتماع ہوا کرتا ہے۔ اس وسیع میدان میں وہ جگہ بھی ہے جس کو عقبہ کہتے ہیں جو شہر مکہ سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہے[۱]۔ اسی کے قریب ایک گھاٹی میں یہ حضرات جمع ہوتے ہیں۔ چاندنی رات ہے، نور کی چادر پھیلی ہوئی ہے۔ اسی نورانی فضا میں محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف لاتے ہیں، جو سراسر نور ہیں۔ آپؐ خدار واحد کی پرستش کی دعوت دیتے ہیں۔ سننے والوں کی دلوں کی گہرائیوں سے آمنّا کی صدا بلند ہوتی ہے۔ پھر ان سب سے چھ باتوں کا عہد لیا جاتا ہے:

(۱) ہم صرف خدار واحد کی عبادت کیا کریں گے۔ کسی کو اس کا شریک نہیں مانیں گے (۲) چوری نہیں کریں گے (۳) زنا نہیں کریں گے (۴) اولاد کو قتل نہیں کریں گے (۵) کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے (جھوٹی تہمت نہیں لگائیں گے (۶) آپ جس

---

[۱] معجم البلدان

اچھی بات کا حکم فرمائیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ (نافرمانی نہیں کریں گے)[1]

یہ معاہدہ عمل کرنے کے لئے تھا۔ عمل کرنے کے لئے معلم اور مربی کی ضرورت تھی ان لوگوں نے معلم کی درخواست کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک باعمل معلم کو اُن کے ساتھ کر دیا۔ یہ سیدنا حضرت مصعب بن عمیر ہیں۔ دولت مند گھرانے کے چشم و چراغ ناز و نعم میں پلے۔ جب گھوڑے پر سوار ہو کر چلا کرتے تھے تو آگے پیچھے ہٹو بچو کہتے ہوئے غلام دوڑا کرتے تھے۔ بدن پر سیکڑوں درہم سے کم کا لباس نہیں ہوتا تھا، جو طرح طرح کے عطر سے معطر ہوتا تھا مگر جب دولتِ اسلام سے مالا مال ہوئے تو دولتِ دنیا اُن کی نظر میں گرد بن گئی۔ روح نے وہ لذّت پائی کہ ساز و سامان بار لگنے لگا۔ اب معلّمِ خیر کا لباس ایک کمبل تھا۔

مدینہ پہنچ کر حضرت اسعد بن زرارہ کے یہاں ان کا قیام ہوا۔ اس وقت تک جتنا قرآن نازل ہو چکا تھا وہ لوگوں کو یاد کراتے، سمجھاتے، اس پر عمل کراتے۔ لوگ اُن کو مقری[2] کہا کرتے تھے۔

نیا دارِ ہجرت

اب تک حبش دارِ ہجرت تھا۔ اس بیعت کے بعد ایک دارِ ہجرت کا اضافہ ہو گیا۔ مکہ کو خیر باد کہنے والے اب یثرب آنے لگے۔

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا ارادۂ ہجرت

ماہ شوال ختم ہو رہا تھا، ذی قعدہ[3] شروع تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی ہجرت کا ارادہ کر لیا۔ اجازت لینے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا: کچھ توقف کیجئے

---

[1] بخاری شریف ص۵۵ [2] ابن سعد و استیعاب وغیرہ [3] بخاری شریف وغیرہ کی روایتوں میں یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ چار ماہ تک ان سانڈنیوں کو گھر پر رکھ کر چارہ کھلاتے رہے جن کو آپ نے سفرِ ہجرت کے لئے خریدا تھا۔ سفرِ ہجرت ربیع الاوّل کے آغاز میں ہوا تو ان سانڈنیوں کو شوال کے آخر یا ذیقعدہ کے شروع میں خریدا ہوگا۔

اُمید یہ ہے کہ مجھے بھی ہجرت کی اجازت مل جائے گی۔ حضرت ابو بکرؓ نے یہ ارشاد سُنا تو تعجب[1] ہوا مکرر دریافت کیا۔ کیا آپ کو یہ توقع ہے میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں اُمید تو یہی ہے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے اس سے زیادہ مسرت کی بات کیا ہوسکتی تھی کہ شرف رفاقت حاصل ہو۔ آپ نے اس وقت ارادہ ملتوی کردیا اور اپنے آقا کے ساتھ سفر کرنے کی تیاری شروع کردی۔ فوراً دو عمدہ سانڈنیاں خرید لیں[2] اور اس خیال سے کہ نہ معلوم کس وقت حکم ہو جائے۔ ان سانڈنیوں کو چرواہے کے حوالے نہیں کیا بلکہ گھر پر کھڑا رکھا اور بازار سے چارہ خرید کر کھلاتے رہے۔ اس انتظار میں چار ماہ گذر گئے۔ اس اثنار میں بیعتِ عقبہ ثانیہ بھی ہوئی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

صدیق اکبرؓ نے دو سانڈنیاں ہی نہیں خریدیں بلکہ سفر کا نقشہ ذہن میں جما کر ضرورت کی تمام چیزیں فراہم کرلیں حتیٰ کہ سفر میں ایک تحریر لکھنے کی ضرورت پیش آئی تو تحریر کا تمام سامان ساتھ تھا۔ ٹھنڈے پانی کا اور نہ صرف پانی بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پانی پلانے کے برتن کا بھی یہ انتظام تھا کہ اس کے مونھ پر کپڑا بندھا رہتا تھا۔ جیسا کہ سراقہ جعشم کے واقعہ میں آئندہ معلوم ہوگا۔ (ان شاء اللہ)

بیعت عقبہ دوم

پچھلے سال چھ مسلمانوں کی کوشش سے یثرب کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا ہونے لگا تھا۔ اس سال حضرت مصعب بن عمیر مُقری رضی اللہ عنہ کی رہنمائی میں بارہ حضرات نے کوشش کی تو نہ صرف یثرب بلکہ یثرب سے باہر موضع قبا تک اسلام پہونچ گیا۔

اسلام کیا تھا؟ صرف کلمۂ توحید پڑھ لینا؟ بے شک قانونی اور فقہی نقطۂ نظر سے کسی کو مسلمان قرار دینے کے لئے یہی کافی ہے لیکن سیّدنا مصعب بن عمیر جس اسلام کا درس دے رہے

---

[1] ابھی تک بیعت عقبہ ثانیہ نہیں ہوئی تھی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی گفت گو ہوئی اور حضرات انصار سے عہد لیا گیا۔ [2] بخاری شریف ص۵۵۳

تھے وہ قانونی نمائش سے بہت بلند تھا۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ کا مکتب، مکتبِ عشق تھا۔ یہاں ایثار اور فدائیت کا درس دیا جاتا تھا۔ مشائخِ طریقت کے یہاں "درجہ فنا" آخری منزل ہے۔ یہ حضرت مصعبؓ کی خانقاہ کا پہلا سبق ہوتا تھا۔

قرآنِ حکیم نے مومن کی شان یہ بتائی ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ [1] اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے: لا یومن احدکم حتی اکون احب الیه من والدہ و ولدہ والناس اجمعین۔ [2]

حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کی دعوت کی خصوصیت یہ تھی کہ جیسے ہی زبان پر کلمہ توحید جاری ہوتا، دل کے خلوت کدہ میں عشق و محبت کی شمع روشن ہو جاتی جو نہ صرف ظلمت دور کرتی بلکہ انانیت کو بھی فنا کر دیتی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یثرب میں تشریف لانے کی دعوت دینا صرف ایک معزز مہمان کو بلانا نہیں تھا بلکہ ایک ہیبت انگیز اور حد سے زیادہ پُرخطر اقدام تھا۔ آپ کو تشریف لانے کی دعوت دینا ایک عظیم ترین انقلاب کو دعوت دینا تھا۔ یعنی ایسی حاکمیت کو تسلیم کرنا تھا، جس کے مقابلہ میں ہر ایک حاکمیت ختم ہو رہی تھی۔ اوس اور خزرج کے رؤسا اور شیوخ خصوصاً عبداللہ بن اُبی بن سلول رئیس خزرج اور ابو عامر بن صیفی بن نعمان رئیس اَوس، جو نہ صرف حاکمیت بلکہ ملوکیت اور بادشاہت کے خواب دیکھ رہے تھے، آپؐ کا مدینہ تشریف لے آنا ان سب کے لئے پیغامِ ناکامی تھا، جو اُن سب کے لئے مایوس کن تھا جو اُن کی حاکمیت تسلیم کرانے کے لئے ایسے سرگرم اور پُرجوش تھے کہ عبداللہ بن اُبی بن سلول کے لئے شاہانہ تاج کی تیاری کی فرمائش بھی دے چکے تھے۔ دوسری طرف آپ کی تشریف آوری قریش کی ناکامی تھی اور تشریف آوری کی دعوت دینا قریش جیسی جماعت کے مقابلہ پر سینہ سپر ہونا تھا جس کی عظمت کی چھاپ ہر ایک عربی بولنے والے کے دل پر تھی اور جس کی ناکامی پورے عرب کی ناکامی تھی۔ اس کے علاوہ

---

[1] "جو ایمان لائے وہ بہت مضبوط ہوتے ہیں اللہ کی محبت میں"۔ [2] "کوئی مومن کہلانے کے لائق نہیں ہوتا جبتک میں اُس کو باپ اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں"۔

اقتصادی مسائل بھی نہایت اہم تھے۔ مثلاً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار جو اہل و عیال کو ساتھ لے کر آئیں گے ان کی ضروریات زندگی کس طرح فراہم ہوں گی۔

یہ تمام مسائل تھے جو ایمان لانے والے تھے وہ دانشمند تھے، ان تمام باتوں کو سمجھتے تھے مگر ان کے ایمان کی حرارت اس طرح کے تمام خطرات کے لئے برق خرمن سوز تھی:

عشق چوں خام ست باشد بستۂ ناموس ونگ
پختہ مغزانِ جنوں را کے حیا زنجیر پاست
باہر کمال اندکے آشفتگی خوش ست
ہرچند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

یہ نومسلم تھے، ان کا اسلام نیا تھا، مگر یہ نیا اسلام سراسر عشق تھا جس نے محبوب کے لئے ہر ایک قربانی اور ایثار کو محبوب بنا دیا تھا:

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

حج کا زمانہ آیا۔ اوس اور خزرج کے تقریباً پانچ سو زاد حج کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ اہلِ ایمان بھی اس عزم کے ساتھ روانہ ہوئے کہ محبوب رب العالمین کو دعوت دیں کہ وہ مکہ کی خشک پہاڑیوں کو خیرباد کہیں اور یثرب کے سبزہ زار کو ایمان کا کشت زار بنائیں۔ لیکن یثرب کے سربراہ جو قریش کے ہم مشرب و ہم نوا تھے اس جرأت کے لئے تیار نہیں تھے جس میں قریش سے براہ راست تصادم تھا۔ لہٰذا ان فداکاروں نے اپنے منصوبہ کو پوشیدہ رکھا۔ ان کی تعداد تہتر تھی[1]۔ ان میں دو عورتیں تھیں، تینتیس نوجوان باقی ادھیڑ عمر۔

مکہ پہونچکر بھی اس منصوبہ کو راز ہی رکھا اور رازداری کے ساتھ ہی تاریخ، وقت اور

---

[1] ابن ہشام ص ۲۶۶ ج ۱ ابن اسحاق نے اُن کے نام بھی شمار کرائے ہیں۔ ص ۲۶۳ تا ص ۲۷۹ ج ۱

مقام طے کیا گیا۔

۱۱ ذی الحجہ[1] کی رات جاند آدھی مسافت طے کر چکا لوگ سو گئے تو طے کردہ خفیہ قرار داد کے بموجب اسلام کے یہ جاں نثار فرداً فرداً روانہ ہوئے[2] اور اسی گھاٹی میں پہنچے جہاں گذشتہ سال بیعت ہوئی تھی۔ سرورِ کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے چچا عباسؓ وہاں رونق افروز ہو چکے تھے۔

یہ بھی خواجہ ابو طالب کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے بہی خواہ، محافظ اور جان چھڑکنے والے مددگار تھے اور اگرچہ عمر میں صرف دو سال بڑے تھے مگر خود کو اپنے عزیز بھتیجے کا سرپرست[3] سمجھتے تھے اور تجارتی کاروبار کے باعث باہر آنا جانا رہتا تھا تو قبائل سے واقف تھے۔ شیوخ قبائل سے تعلقات تھے اُن کو جانتے پہچانتے تھے۔ اس تعارف کے ساتھ خوبی یہ تھی کہ بات کرنے کا بھی اچھا سلیقہ تھا۔ چنانچہ جب آنے والے آگئے تو سلسلہ کلام آپ نے ہی شروع کیا:

"آپ جس ارادہ سے آئے ہیں یقین ہے کہ اس کی ذمہ داری کا بھی آپ صاحبان نے بخوبی اندازہ کر لیا ہوگا، محمدؐ کی حمایت پورے عرب کی مخالفت ہے۔ محمدؐ اپنے خاندان کے سب سے زیادہ باعزت رکن ہیں۔ خاندان کا ہر فرد اُن کی حفاظت کے لئے سر بکف رہتا ہے جو اُن کے ہم نوا ہو گئے ہیں وہ ہم نوائی کی وجہ سے اور جو اُن کے ہم نوا نہیں ہوئے ہیں وہ خاندانی حمایت، قرابت اور خود اُن کے اخلاق و کردار کی وجہ سے اُن کے جاں نثار ہیں۔ محمدؐ کی حفاظت سے ہم نہ اکتائے ہیں نہ تھکے ہیں۔ محمدؐ نے خود ہی آپ کی دعوت منظور کی ہے اور وہ ہم سے

---

[1] وسط ایام التشریق لیلۃ النفر الاولیٰ اذا ھدأت الرجل (ابن سعد ص ۱۴۹ ج ۱) فتسلل تسلل القطا مستخفین۔ (ابن ہشام ص ۲۶۶ ج ۱) [2] سب سے پہلے رافع بن مالک زرقی رضی اللہ عنہ باریاب ہوئے۔ ابن سعد ص ۱۴۹ ج ۱ [3] تعمیر کعبہ کے وقت جب پتھر ڈھو رہے تھے تو آپ نے اسی بزرگانہ شفقت کی وجہ سے بھتیجے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فرمائش کی تھی کہ لنگی کھول کر مونڈھے پر رکھ لیں تاکہ پتھر کی رگڑ نہ لگے۔

الگ ہو کر آپ کے یہاں جانا چاہتے ہیں۔

آپ پوری طرح غور کرلیں، اپنی طاقت اور ہمت کا موازنہ کرلیں۔ پورے عرب کی متحدہ طاقت سے آپ کو مقابلہ کرنا ہوگا۔ سارا عرب ایک کمان سے آپ پر تیر برسائے گا۔ کیا آپ میں مقابلہ کی طاقت ہے۔ آپ صاحبان کو لڑائیوں کا تجربہ ہے۔ کیا آپ لوگ نامعلوم مدت تک پامردی اور استقلال سے پورے عرب کے مقابلے میں ثابت قدم رہ سکیں گے۔ صاف بات اچھی ہوتی ہے۔ پوری طرح سوچ لو۔ جدا ہونے سے پہلے پختہ فیصلہ کرلو۔ بعد کی شرمندگی سے اس وقت کی صاف بات ہزار درجہ بہتر ہے[1]"

حضرت عباسؓ کی بات ختم ہوئی تو حضرت براء بن معرورؓ[2] نے مجمع کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا: "آپ نے جو فرمایا ہم پہلے سے ہی سمجھے ہوئے ہیں۔ ہم وفاداری، سچائی اور رسول اللہؐ کی حفاظت میں اپنی جانیں قربان کردینے کا عزم مصمم لے کر یہاں آئے ہیں۔ لیکن ہم چاہتے ہیں حضرتِ والا (جن کے لئے سر ہتھیلی پر رکھ کر ہم یہاں آئے ہیں) وہ خود فرمائیں کہ کیا چاہتے ہیں"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام پاک کی چند آیتیں تلاوت فرمائیں، پھر فرمایا: "میں

(الف) اپنے رب (پروردگار) کے لئے یہ چاہتا ہوں کہ صرف اسی وحدہٗ لاشریک لہٗ

---

[1] ابن سعد ص۱۴۹ ج۱ [2] یہ سب سے زیادہ سن رسیدہ اور اپنی جماعت کے سردار تھے سیدنا کبیرنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ) (سیرۃ ابن ہشام ص۲۶۴ ج۱) مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں تشریف آوری سے ایک ماہ پہلے وفات پاچکے تھے (فتح الباری)

لطیفہ: جب یہ حضرت (براء بن معرورؓ) یثرب سے روانہ ہوئے تو راستہ میں سوال پیدا ہوا کہ نماز کس رخ پڑھنی چاہیئے۔ شام کا رخ کرکے یا کعبہ کا رخ کرکے۔ سب کی رائے ہوئی کہ شام کی طرف۔ مگر حضرت براءؓ نے طے کیا کہ وہ کعبہ کی طرف نماز پڑھا کریں گے۔ راستہ بھر یہی رہا کہ ساتھی شام کی طرف نماز پڑھتے رہے اور یہ کعبہ کی طرف۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے استفسار کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کی طرف نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی۔ سیرۃ ابن ہشام ص۲۶۴-۲۶۵ ج۱

کی عبادت کرو۔ اُس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔

(ب) اپنی ذات اور اپنے صحابہ (ساتھیوں) کے لئے یہ چاہتا ہوں کہ ہمیں رہنے کو جگہ دو، ہماری مدد کرو اور جس طرح تم خود اپنی جانوں کی حفاظت کرتے ہو ہماری بھی حفاظت کرو۔" ایک روایت میں ہے کہ جس طرح اپنے بچّوں اور عورتوں کی حفاظت کرتے ہو ہماری حفاظت کرو۔

مجمع نے دریافت کیا: ہمیں کیا ملے گا۔ فرمایا: "جنّت"[1]

اس کے بعد جوابی تقریریں شروع ہوئیں۔

(۱) سیّد القوم حضرت براء بن معرورؓ نے دستِ مبارک پر اپنا ہاتھ رکھا اور عرض کیا:

"یقیناً ہم اسی طرح حفاظت کریں گے۔ ہم کسی کے مقابلہ سے جان چُرانے والے نہیں ہیں۔ (ہم ابناء الحروب ہیں) لڑائیوں کی گود میں پلے ہیں۔ آباء و اجداد سے یہی ترکہ میں ملا ہے۔"

(۲) عباس بن عبادہ بن نضالہ انصاریؓ۔ مجمع کو خطاب کرتے ہوئے:

"حضرات آپ سمجھتے ہیں کیا ہو رہا ہے۔ ہم عہد کر رہے ہیں کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حمایت میں پوری دنیا کا مقابلہ کریں گے۔ ہر ایک گورے اور کالے کے مقابلے میں سینہ سپر ہوں گے، جانیں قربان کریں گے، مال لٹائیں گے۔ ہمارے سردار مارے جائیں گے، کیا ہم تیار ہیں۔ اگر ایسا نہ کر سکیں تو کل کے بجائے آج الگ ہو جائیں۔ آج دامن بچا لینا کل کی رسوائی سے بہت بہتر ہے۔"

(۳) حضرت ابوالہیثم بن تیہان: "یا رسول اللہؐ گستاخی معاف۔ ایک بات واضح کرنی ہے، یہودیوں اور دوسرے قبائل سے ہمارے تعلقات ہیں۔ یہ تعلقات اب باقی نہیں رہیں گے۔ مگر ایسا تو نہ ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ آپ کو کامیاب فرما دے آپ ہمیں چھوڑ کر اپنے لوگوں میں چلے جائیں۔"

---

[1] مسند امام احمد ص۳۲۲ج۳ و سیرۃ ابن ہشام ص۲۶۶ج۱ [2] کسی دنیاوی ترقی یا برتری کا وعدہ نہیں ہے جو کچھ ہو آخرت کے لئے ہو۔ صرف اسی کا وعدہ ہے اور یہی نصب العین ہے۔

محمد میاں عفی عنہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ الفاظ سُنے تو مسکراتے ہوئے فرمایا:

"یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کا خون میرا خون، آپ کی ناکامی میری ناکامی۔ میں آپ کا آپ میرے، جن سے تمہاری جنگ اُن سے میری جنگ، جن سے تمہاری صلح اُن سے میری صلح۔"

اس کے بعد سلسلہ بیعت شروع ہوا۔ حضرت برار بن معرور رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے بیعت کی[1] بیعت میں اسی عہد کو دہرایا گیا[2] جو پہلی بیعت (عقبۂ اولیٰ) کی بیعت کے وقت کیا گیا تھا کہ خدا[1] واحد کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔ اللہ کا کسی کو شریک نہیں گردانیں گے، چوری[2] نہیں کریں گے۔ زنا[3] نہیں کریں گے، اپنی[4] اولاد کو قتل نہیں کریں گے، کسی[5] پر بہتان نہیں باندھیں گے۔ جس اچھی بات کا حکم کیا جائے گا تعمیل کریں گے۔ نافرمانی

---

[1] ابن اسحاق کا بیان ہے کہ بنو نجار کا دعویٰ ہے کہ سب سے پہلے حضرت اسعد بن زرارہ نے بیعت کی اور بنو عبدالاشہل کہتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت ابوالہیثم بن تیہان نے بیعت کی۔ مگر ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ یہ حضرات بہت پہلے مسلمان ہو چکے تھے اس وقت ان حضرات نے مکرر بیعت کی۔ نئے بیعت کرنے والوں میں اس وقت حضرت برار ہی تھے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[2] سورۂ ممتحنہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائش کی گئی ہے کہ جو عورتیں ہجرت کرکے آئیں اُن سے آپ بیعت لیجئے۔ اس بیعت میں انھیں چھ چیزوں کا تذکرہ ہے۔ اس مناسبت سے اس بیعت کو بیعت نسار کہتے ہیں۔ مردوں سے اس موقع پر انھیں باتوں کا عہد کرایا گیا۔ اس کے بعد بہت سے موقع آئے ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص اس موقع کے لحاظ سے صحابہ کرام[رض] سے بیعت لی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ اس پر بیعت لی اور عہد کرایا کہ کسی سے کوئی سوال نہیں کریں گے۔ ایک مرتبہ اس پر بیعت لی کہ ہر ایک کے حق میں خیر خواہی کریں گے۔ (بخاری شریف ص۱۳)

یا مثلاً حدیبیہ کے موقع پر بیعت لی گئی جس کو بیعت رضوان کہا جاتا ہے کہ مر جائیں گے مگر میدان سے نہیں ہٹیں گے۔

نہیں کریں گے۔

اس کے علاوہ یہ بھی عہد لیا گیا:

کسی کو[1] ناحق قتل نہیں کریں گے، لوٹ نہیں[2] ڈالیں گے، ہر[3] موقع پر حق بات کہیں گے، کسی کی مذمت و ملامت کا خوف ہمیں کبھی بھی حق بات کہنے سے نہیں روک سکے گا۔ جب[4] رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یثرب تشریف لے آئیں گے تو اپنی اولاد اور خود اپنی جانوں کی طرح اُن کی حفاظت کریں گے[5] ان سب باتوں کا بدلہ جنت ہوگا۔[6]

بارہ نقیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جماعت میں بارہ نقیب منتخب فرمائے تاکہ حالات[7] کی نگرانی رکھیں۔ اُن کے نام خود انصار نے پیش کیے تھے۔

---

[1] ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق ولا ننتھب لا نعصی بالجنۃ۔ بخاری شریف ص ۵۵۰۔۵۵۱

[2] یاد رکھیے غنیمت کو لوٹ نہیں کہا جا سکتا۔ لوٹ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہ کبیرہ قرار دیا ہے۔ جس طرح مُثلہ (ناک کان کاٹ ڈالنے) سے منع فرمایا ایسے ہی (النھبہ) لوٹ سے منع فرمایا۔ اس پر بیعت لی کہ لوٹ نہیں ڈالیں گے (بخاری شریف ص ۳۳۶) لوٹ ڈالنے والے کے متعلق فرمایا: لیس منا ہیکا (ابو داؤد شریف) گویا وہ مسلمان ہی نہیں ہے۔ لوٹ کا مقصد ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ خوف خدا جماعتی تنظیم یا امانت اور دیانت کا کوئی ضابطہ لوٹ میں نہیں ہوتا۔ غنیمت میں یہ تمام باتیں شرط ہوتی ہیں۔ غنیمت میں جو کچھ لیا جاتا ہے وہ پوری احتیاط اور دیانتداری کے ساتھ جمع کرایا جاتا ہے۔ ایک شخص میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ھو فی النار (یہ دوزخ میں گیا)۔ صحابہ کو تعجب ہوا۔ سامان کی تلاشی لی تو ایک عبا (اچکن) برآمد ہوئی جو مال غنیمت میں سے بلا اجازت اس شخص نے رکھ لی تھی (بخاری شریف ص ۴۳۲) انتہا یہ کہ جوتہ کے تسمہ کے متعلق بھی یہی ارشاد ہوا شراک او شراکین من نار۔ (بخاری شریف ص ۶۰۸ غنیمت کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ غنیم کے مال کو سرکاری طور پر ضبط کر لینے کا نام غنیمت ہے۔ کچھ نا آشنا ارب مصنف جو بظاہر اپنا درجہ حضرات صحابہؓ سے کم رکھنا نہیں چاہتے وہ غنیمت کے لئے بلا تکلف لوٹ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ معاذ اللہ

[3] بیہقی بحوالہ البدایہ والنہایہ ص ۱۶۳ ج ۳

[4] بخاری شریف ص ۵۵۱

[5] ...

[6] ...

[7] لیکونوا علٰی قومہم بما فیھم (ابن ہشام ص ۲۶۷ ج ۱)

اُن میں سے نو خزرج کے تھے اور تین اَوس کے۔ بروایت ابن اسحاق اُن کے نام یہ ہیں:
ابوامامہ، اسعد بن زرارہ، سعد بن ربیع، عبداللہ بن رواحہ، رافع بن مالک،
برار بن معرور، عبداللہ بن عمرو بن حرام، عبادہ بن صامت، سعد بن عبادہ، منذر
بن عمرو بن خنیس، اسید بن حضیر، سعد بن خیثمہ، رفاعہ بن عبدالمنذر۔ (رضی اللہ عنہم)
جلسہ ختم ہوا۔ سب حضرات اپنی اپنی قیام گاہوں پر خاموشی سے واپس ہو گئے۔ طے
یہ ہوا کہ صبح سویرے الگ الگ اپنی اپنی قیام گاہ سے مدینہ روانہ ہو جائیں گے۔

حضرات نقباء کا تعارف اور مختصر حالات

حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کنیت ابوامامہ۔ یہ سب سے کم عمر تھے مگر اسلام میں سب سے مقدم۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے سب سے پہلے یثرب میں اسلام کا تعارف انہیں کے ذریعہ ہوا۔ پھر ہر بیعت کے موقع پر حاضر اور ہر بیعت میں شریک رہے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مبلّغ اور معلّم بن کر آئے تو انہیں کے یہاں قیام رہا۔ دعوت و تبلیغ میں اُن کے شریک رہے۔ نماز جمعہ کا سلسلہ بھی آپ نے ہی شروع کیا۔ مگر عمر نے وفا نہیں کی۔ ابھی مسجد نبوی کی تعمیر ہو رہی تھی کہ وفات ہو گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بار بار مزاج پُرسی کے لئے تشریف لے گئے۔ علاج میں بھی شریکِ مشورہ رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد مدینہ میں سب سے پہلے انہیں کی وفات ہوئی۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی۔ یہ سب سے پہلی نمازِ جنازہ تھی جو پڑھائی گئی (الاستیعاب واصابہ) یہودیوں نے طعنہ دیا کہ محمد اپنے ساتھی کو نہ بچا سکے تو اور کیا کر سکیں گے۔ (مسند احمد)

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص ۲۶۷/۱ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے ایک قصیدہ میں ان سب ناموں کو جمع کر دیا ہے (ص ۲۶۸/۱ ابن ہشام)

حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ مہاجر سے مواخاۃ (برادرانہ رشتہ قائم فرمایا تو حضرت سعدؓ نے اپنے مہاجر بھائی سے کہا کہ میں انصار میں سب سے زیادہ خوش حال اور صاحب جائداد ہوں، آدھی جائداد آپ کی ہے اور میری دو بیویاں ہیں اُن میں سے جس کو آپ مناسب سمجھیں مجھے بتادیں، میں طلاق دیدوں گا آپ نکاح کرلینا۔ حضرت عبدالرحمٰن نے جواب دیا:—— اللہ تعالیٰ آپ کے اہل اور مال میں برکت دے، مجھے تو (زیادہ چلنے والا) بازار بتا دیجئے۔ میدان اُحد میں معرکہ ٹھنڈا ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سعد بن ربیع کو تلاش کرو۔ یہ میدان میں پڑے ہوئے تھے، بارہ زخم جسم مبارک پر تھے۔ حضرت اُبی بن کعبؓ جو تلاش کرنے گئے تھے اُن سے کہا کہ آقا دوجہان سے میرا سلام عرض کر دینا اور مسلمانوں کو یہ پیغام پہنچا دینا کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ رہ گیا اور سرتاج دوعالم شہید ہوگئے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اُن کی کوئی معذرت قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں اُن کی صاحبزادی آئیں تو حضرت ابوبکرؓ نے اپنی چادر بچھادی اُس پر ان کو بٹھایا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا یہ اُن کی صاحبزادی ہیں جو مجھ سے بھی بہتر تھے اور تم سے بھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے راہِ خدا میں قربان ہوگئے اور میں بھی زندہ ہوں اور تم بھی زندہ ہو۔ (الاصابہ)

حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ شاعر تھے۔ اُن کے ترانے بڑے شوق سے سُنے جاتے تھے اور پڑھے جاتے تھے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دلچسپی ہوتی تھی۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حسب معاہدہ عمرہ کرنے کے لئے تشریف لے گئے تو مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے آگے یہ ترانہ پڑھتے جارہے تھے:

خلوا بنی الکفار عن سبیلہ اليوم نضربکم علی تنزیلہ

ضرباً یزیل الھام عن مقیلہ ویذھل الخلیل عن خلیلہ

ترانہ کا مفہوم یہ ہے کہ ــ "کافر بچو! راستہ سے ہٹ جاؤ۔ آج ہم بزورِ شمشیر اپنے آقا کو

یہاں اُتاریں گے۔ ہماری شمشیر زنی ایسی ہوگی جو کھوپڑیوں کو گردنوں سے اڑا دے گی اور دوست کو دوست سے جدا کردیگی۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مقداد بن الاسود سے رشتۂ اخوت قائم کیا تھا۔ وہ بھی ایسے ہی جوشیلے تھے۔ جاں باز عبداللہ بن رواحہ نے غزوہ موتہ میں جام شہادت نوش کیا۔ رضی اللہ عنہ۔

حضرت رافع بن مالک رضی اللہ عنہ

سب سے پہلے مسلمان ہونے والے ہیں۔ پہلی بیعت میں بھی شریک تھے، جس میں چھ یا آٹھ آدمیوں نے بیعت کی تھی، پھر بارہ اور ستّر میں بھی شریک تھے۔ جتنا قرآن اس وقت تک نازل ہوا تھا سب حفظ کر لیا تھا۔ غزوۂ اُحد میں درجۂ شہادت حاصل کیا۔ (استیعاب واصابہ)

حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ

جب یہ قافلہ مکہ جارہا تھا تو راستہ میں اور ساتھیوں نے بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھی مگر اُنھوں نے کعبہ کی طرف نماز پڑھی، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے کعبہ کی طرف نماز پڑھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی ہجرت کرکے مدینہ میں تشریف لائے تھے کہ اُن کی وفات ہوگئی مگر وفات کے وقت وصیّت کردی کہ ترکہ کا ایک ثلث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کردیا جائے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے صاحب خیر ہیں جنھوں نے تہائی ترکہ کی وصیّت کی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ

غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوسکے، بہت صدمہ ہوا۔ غزوۂ اُحد ہوا تو تمنّا پوری ہوئی۔ بیٹے کو بٹھا کر رات ہی کو سمجھا دیا مجھے اُمید ہے کہ میں کل کو سب سے پہلے جان فدا کروں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مجھے سب سے زیادہ تم محبوب ہو۔ تم سب سے پہلے میرا قرض ادا کرنا اور اپنی بہنوں کا خیال رکھنا۔ بہنیں سات تھیں۔ جابر اُن کے سعادت مند صاحبزادے تھے۔ یہودی کا قرض تھا۔ خیال تھا کہ باغ کے پھل سے قرض ادا نہیں ہوسکیگا لہٰذا کچھ اب وصول کرلے کچھ بعد میں۔ مگر یہودی راضی

نہیں ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفارش کی تب بھی راضی نہیں ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باغ میں تشریف لے گئے، ٹوٹے ہوئے کھجوروں کے ڈھیر پڑے تھے۔ اُن سب کے پاس پہونچ کر ملاحظہ فرمایا۔ پھر حکم دیا کہ تمام قرض ادا کردو۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت تھی کہ تمام قرض ادا کردیا۔ اور کھجوروں کے ڈھیر جوں کے توں باقی رہ گئے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابومرثد غنوی رضی اللہ عنہ سے برادرانہ رشتہ قائم فرمایا۔ تمام معرکوں میں شریک رہے۔ ۳۴ھ میں وفات ہوئی۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ

قبیلۂ خزرج کے سردار، رئیس گھرانے کے چشم وچراغ، بہت بڑے حوصلہ مند سخی۔ باپ دادا بھی ایسے ہی رئیس اور سخی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے گھر کو بیت جود فرمایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا تو انھوں نے بیعت نہیں کی۔ مگر کوئی مخالفت بھی نہیں کی۔ بلکہ وطن چھوڑ کر شام چلے گئے "حوران" میں قیام کیا۔ وفات دفعتہً ہوگئی۔ غسل خانہ میں مُردہ پائے گئے۔ یہ ۱۵ھ کا واقعہ ہے یا ۱۴ھ یا ۱۱ھ کا (علیٰ اختلاف الاقوال) ـــــ الاستیعاب

حضرت منذر بن عمرو بن خنیس رضی اللہ عنہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے برادرانہ رشتہ قائم فرمایا۔ بیر معونہ کے حادثہ میں شہید ہوئے۔ یہ ستر حضرات جو اس موقعہ پر شہید کئے گئے وہ انہیں کی قیادت میں سفر کررہے تھے (الاستیعاب وبخاری وغیرہ) یہ سب حضرات خزرجی تھے۔ قبیلہ اوس کے یہ تین حضرات تھے مندرجہ ذیل

حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ

قبیلۂ اوس کے سردار بہت بڑے سخی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ۲۰ھ یا ۲۱ھ میں وفات ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے وصی تھے۔ چار ہزار دینار قرض چھوڑا جس کو حضرت فاروق اعظم نے باغ کی آمدنی سے ادا کیا۔ (الاستیعاب) غزوہ بدر میں شریک خاص تھے۔

حضرت سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہ

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبا میں قیام تھا تو عام نشست ان کے یہاں ہوتی تھی۔ جو حضرات مہاجرین تن تنہا آتے تھے

وہ بھی انہیں کے یہاں ٹھیرتے تھے۔ جب غزوۂ بدر کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہونے لگے تو باپ (خیثمہ) اور بیٹے (سعد) نے طے کیا کہ ہم میں سے ایک مکان پر رہے ایک ساتھ جائے، پھر باپ بیٹے میں بحث ہوئی کہ کون ساتھ جائے۔ بحث ختم کرنے کے لئے قرعہ ڈالا تو قرعہ میں بیٹے (حضرت سعدؓ) کا نام نکلا۔ باپ نے بیٹے سے اپیل کی کہ اپنا حق مجھے دیدیں اور مجھے جانے دیں، تو بیٹے نے کہا کوئی اور معاملہ ہوتا تو میں آپ کے لئے اپنا حق بخوشی چھوڑ دیتا، مگر یہ راہِ خدا میں قربان ہونے اور رضا مولیٰ حاصل کرنے کا معاملہ ہے اس میں تو میں اپنا حق نہیں چھوڑ سکتا۔
چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گئے اور جامِ شہادت نوش فرمایا۔ (رضی اللہ عنہم اجمعین)

حضرت رفاعہ بن عبد المنذر رضی اللہ عنہ

ابولبابہ کنیت۔ یہ کنیت ہی سے مشہور ہیں۔ غزوۂ بدر اور غزوۂ سویق کے موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو انھیں کو مدینہ کا ناظم امور (والی) بنائے گئے۔ غزوۂ خندق کے بعد بنو قریظہ کا مسئلہ پیش ہوا جنھوں نے غزوۂ خندق کے وقت غداری کی تھی بنو قریظہ منتظر تھے کہ ان کے متعلق کیا فیصلہ کیا جائیگا۔ ابولبابہؓ سے دریافت کیا تو اُنھوں نے گردن کی طرف اشارہ کیا کہ سب غداروں کو قتل کیا جائے گا۔ پھر احساس ہوا کہ میں نے راز فاش کردیا تو مسجد شریف میں آکر اپنے آپ کو کھمبے سے باندھ دیا اور کھانا پینا سب بند۔ نماز کے وقت ان کی صاحبزادی آکر ان کو کھول دیتی تھیں تو نماز میں شریک ہو جاتے تھے۔ چھ روز تک اور بعض روایتوں کے بموجب چودہ پندرہ دنوں تک اسی طرح بندھے [illegible] پھر سورۂ توبہ نازل ہوئی، آپ کو بشارت دی گئی اور کھولنے کا ارادہ کیا گیا۔ آپ [illegible] ر دیا کہ میں قسم کھا چکا ہوں کہ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود نہ کھولیں گے میں نہیں [illegible]ھلوں گا۔ چنانچہ خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے اُن کو کھولا۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اُن کی وفات ہوئی۔ بغیر کھائے پئے بندھے رہنے کا اثر ظاہری جسم پر یہ پڑا کہ قوتِ سماعت ختم ہوگئی تھی (الاستیعاب)۔

قریش کا تعاقب یہ اجلاس جو پہاڑ کی گھاٹی میں ریت کے فرش پر چاندنی میں کیا گیا تھا، بہت ہی خفیہ تھا۔ جانے والے بھی ایک ایک کر کے گئے تھے، اسی طرح نہایت خاموشی سے واپس ہوئے۔ لیکن پچہتر آدمیوںؓ کی نقل و حرکت چھپنے والی نہیں تھی۔ لوگوں نے بھانپا۔ کچھ بھنک قریش کے کانوں میں بھی پڑی۔ فوراً دوڑے اور جیسے ہی صبح ہوئی تحقیقات شروع کردی۔ اہل مدینہ کے خیموں میں پہونچے اور کہا:

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ اس لئے آئے ہیں اور کوئی ایسا معاہدہ کر چکے ہیں کہ اس صابی۔ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے ساتھ لے جائیں گے اور ہمارے مقابلہ پر محاذ قائم کریں گے۔ ہم آگاہ کئے دیتے ہیں "محمد" کو لے جانا ہمارے لئے چیلنج ہوگا۔ طاقت آزمائی ہو تو ایسا کرلو۔"

رؤسا مدینہ عبداللہ بن ابی بن سلول وغیرہ سے قریش کے تعلقات تھے انہیں سے تعارف تھا۔ انہیں سے تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا گیا اور انہیں سے یہ باتیں کہی گئیں۔ اُن میں سے کوئی بھی اس بیعت میں شریک نہیں ہوا تھا نہ ان کو خبر تھی۔ انھوں نے قسمیں کھا کھا کر انکار کیا۔ عبداللہ بن ابی بن سلول نے کہا: میری قوم اگر ایسا کرتی تو وہ یقیناً مجھ سے مشورہ کرتی، ورنہ کم از کم خبر ضرور دیتی۔ یہ ممکن نہیں میری اطّلاع بغیر کوئی ایسا عمل ہو جائے۔ یہ انکار کرنے والے سچّے تھے۔ لیکن بیعت کرنے والوں کو فکر تھی کہ اُن سے دریافت کیا گیا تو کیا جواب دیں گے۔ وہ خاموش تھے اور ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ دفعۃً حضرت کعب بن مالکؓ کی نظر ایک قریشی رئیس زادے "حارث بن ہشام مخزومی" کی نئی جوتیوں پر پڑگئی جو قیمتی اور خوبصورت تھیں۔ انھیں مذاق کرنے اور لوگوں کی توجّہ ہٹانے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے عبداللہ بن ابی بن سلول کو مخاطب کر کے کہا: دیکھئے جوتیاں ایسی ہونی چاہئیں۔ آپ رئیس مدینہ اور قوم کے سردار ہیں۔ آپ بھی ایسی ہی جوتیاں پہنا کیجئے۔ اس مزاحیہ فقرہ کو

---

[1] شمول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و حضرت عباس رضی اللہ عنہ

حارث نے طنز سمجھا۔ اس نے دونوں جوتیاں نکال کر کعبؓ کی طرف پھینک دیں۔ لو تم پہنو، ضرور پہنو۔ خدا کی قسم ضرور پہنو۔

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی نے دیکھا کہ حارث کو ناگواری ہوئی ہے تو اس نے مجھے ڈانٹا: تم نے خواہ مخواہ ان کو ناراض کر دیا۔ ان کی جوتیاں واپس کر دو۔ میں نے کہا۔ یہ دے چکے ہیں اب میں واپس نہیں کروں گا اور دل میں سوچا یہ فال نیک ہے۔ عنقریب وہ وقت آئے گا کہ میں ان تکلفات کو ان لوگوں سے ختم کر دوں گا۔

بہر حال اس طنز اور مذاق میں اصل بات رل گئی ہماری جان بچ گئی ہم سے کسی نے نہیں پوچھا۔ جب یہ لوگ ہمارے خیموں سے باہر نکل گئے تو طے شدہ پروگرام کے بموجب بیعت کرنے والے حضرات نے کھسکنا شروع کیا۔ قریش کو پھر احساس ہوا۔ وہ پھر دوڑے۔ مگر ہم سب نکل چکے تھے۔ دو آدمی کسی طرح باقی رہ گئے تھے ان کو راستہ میں پکڑ لیا۔ یہ قبیلۂ خزرج کے رئیس سعدؓ بن عبادہؓ تھے اور اسی قبیلہ کے دوسرے صاحب منذر بن عمروؓ۔ یہ دونوں نقیب بھی منتخب ہوئے تھے۔ حضرت منذرؓ پھر بھی کسی طرح بچکر نکل آئے لیکن حضرت سعد رضی اللہ عنہ نہ نکل سکے۔ اونٹ کے کجاوہ میں سے چمڑہ کا تسمہ نکال کر اُن کی مشکیں کس دیں۔ ان کے سر پر بڑے بال تھے، مارتے پیٹتے اور اُن کے بڑے بال کھینچتے ہوئے مکہ میں لے گئے۔ وہاں لوگوں نے بہت ذلیل کیا، مارا پیٹا۔ کسی نے مونھ پر بھی تھوک دیا۔

انہیں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک شخص آیا، بظاہر نہایت سنجیدہ، نیک خصلت، شریف صورت تھا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ مجھ پر رحم کرے گا اور میری جان چھڑا دے گا۔ مگر ع " بھولی بھالی شکل والے ہوتے ہیں جلاد بھی"

میرے پاس پہونچا تو اس نے رحم کے بجائے بڑے زور سے کھینچ کر طمانچہ مارا، تب میں نے سوچا کہ ان انسان نما وحشیوں میں کم از کم مسلمانوں کے حق میں شرافت کا نام و نشان نہیں رہا۔ ایک اور شخص جو غالبًا یہ حرکتیں دیکھتے دیکھتے تھک گیا تھا، اس نے کہا کیا مکہ میں تمہارا کوئی حلیف

نہیں ہے۔ تب مجھے خیال آیا۔ میں نے کہا: میرے بہت سے حلیف ہیں۔ جبیر بن مطعم بن عدی سے میرے تجارتی تعلقات بھی ہیں، حارث بن حرب بن اُمیّہ سے بھی میرے تعلقات گہرے ہیں۔ آپ کی عنایت ہوگی اُن میں سے کسی کو خبر کردو۔ یہ شخص گیا۔ حرم کعبہ کے قریب ہی اُن سے ملاقات ہوگئی۔ اُن کو میرا نام بتایا۔ یہ دونوں آئے اور ان ظالموں سے مجھے نجات دلائی۔[1]

* * * *

مکّہ معظمہ میں اصول کار (پروگرام)

ہاتھ نہیں اُٹھا سکتے

تیرہ سال مکہ معظمہ میں گذرے۔ اس طویل مدت میں پروگرام یہ تھا:

۱۔ كُفُّوٓا اَيْدِيَكُمْ[2]	ہاتھ روکو
۲۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ	نماز قائم کرو (اللہ سے تعلق مضبوط کرو)
۳۔ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ،	زکوٰۃ[3] ادا کرو۔
۴۔ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ[4] قَرْضًا حَسَنًا،	اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دیتے رہو۔

---

[1] طبقات ابن سعد صفحہ ۱۵ ج ۱ تفصیل امام المغازی ابن اسحاق کی روایت سے ماخوذ ہے۔ سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۲۷ ج ۲

[2] سورہ نساء آیت ،، [3] یہ پہلے گذر چکا ہے کہ مکہ معظمہ میں زکوٰۃ کا حکم تو ہوا مگر اس کا نصاب نہیں مقرر کیا گیا۔ نصاب مدینہ طیبہ میں سنہ ۲ھ میں مقرر کئے گئے۔ بس مکہ معظمہ میں زکوٰۃ اور قرض حسن کا فرق محض مصرف کے لحاظ سے تھا۔ یعنی غریبوں اور مسکینوں کو جو کچھ دیا جاتا وہ زکوٰۃ۔ اور غلاموں کو خرید کر رہا کرنا یا دوسرے ملّی اور اجتماعی کاموں میں خرچ کو قرآن حکیم میں قرض سے تعبیر فرمایا گیا۔ حاصل یہ کہ جو کچھ ہو خرچ کر ڈالو اور جو کچھ خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس سے بہتر ملے گا۔ (واللہ اعلم بالصواب) [4] سورہ ۷۳ المزمل آیت ۲۰

مگر اس موقع پر جب بیعت اس پر بھی لی گئی کہ حضرات انصار جس طرح اپنی جانوں اور اپنی اولاد کی حفاظت کرتے ہیں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کی بھی حفاظت کریں گے تو امام المغازی ابن اسحاق رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہ اس طرف اشارہ تھا کہ ہاتھ روکنے کا پروگرام آئندہ نہیں رہے گا، بلکہ ہاتھ اٹھانے کی بھی اجازت ہوگی[۱]۔ چنانچہ جب بیعت ہوچکی تو ایک منچلے بہادر حضرت عباس بن عبادہ بن فضلہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر اجازت ہو تو ہم صبح ہی کو ان لوگوں کو تلوار کے ہاتھ دکھادیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابھی مجھے اس کا حکم نہیں ملا ہے[۲]۔

---

[۱] سورۂ حج اگرچہ مدنی ہے مگر ماہرین قرآن کی ایک جماعت کی تحقیق یہ ہے کہ اِذنِ قتال کی آیت ع۳۹ (اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ ۔ تا آخر) مکہ معظمہ ہی میں نازل ہوچکی تھی یعنی الفاظ بیعت میں جس کی طرف اشارہ تھا اُس کے متعلق صریح حکم بھی مکہ معظمہ ہی میں نازل ہوچکا تھا، البتہ ابھی عمل کا حکم نہیں ہوا تھا۔ عمل کا حکم جب ہوا جب مدینہ منورہ میں طاقت مجتمع ہوگئی اور محاذ قائم ہوگیا (واللہ اعلم بالصواب) ماخوذ از سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۲۸۹ ج ۱ [۲] یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی احتیاط اور اطاعت شعاری تھی کہ صرف اجازت سے آپ نے فائدہ اٹھانا مناسب نہیں سمجھا بلکہ حکم صریح کے منتظر رہے جو مدینہ میں مرکز قائم ہونے کے بعد ملا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ہجرت مدینہ کی اجازت

فتنۂ کفر سے بچنے اور اپنے ایمان کو محفوظ رکھنے کی خاطر کسی امن کی جگہ جاکر پناہ لینے کا سلسلہ پہلے سے جاری تھا۔ اسی غرض سے ایک جماعت حبشہ گئی تھی اور حضرت ابو سلمہؓ، حضرت عامر بن ربیعہؓ، حضرت عبداللہ بن جحش بن رئابؓ وغیرہم کو جب معلوم ہوا کہ یثرب میں ان کو امن مل سکتا ہے تو وہ بیعتِ عقبہ سے پہلے ہی یثرب چلے آئے تھے[1]

پھر جب مدینہ کے چند افراد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دی، تو آپ نے اس خواہش کا بھی اظہار فرمایا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اُن کے ساتھ چلیں۔ مگر مدینہ کی فضاء خانہ جنگی کے باعث خراب تھی تو ان حضرات نے اس وقت تعمیل فرمائش سے معذرت کردی تھی لیکن یہ سب باتیں اس وقت تک اس بنا پر تھیں کہ وہاں امن مل جانے کی توقع تھی، لیکن جس مقصدِ عظیم کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تھی اُس کو سامنے رکھ کر کس مقام کو مرکز بنایا جائے جو ضرورت کے وقت ایک مضبوط محاذ بھی ثابت ہوسکے یہ اب تک طے نہیں ہوا تھا۔ اسی اثناء میں ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تین[2] مقامات بتائے گئے ہیں کہ ان میں سے کسی کو منتخب کرلو: مدینہ، بحرین، یا قنسرین۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مکہ سے ہجرت کرکے ایک ایسے مقام پر جارہا ہوں جہاں کھجور کے باغات ہیں۔ مجھے خیال ہوا کہ یہ مقام یمامہ ہوگا یا ہجر[3] لیکن جس طرح اہلِ مدینہ نے اسلام کا استقبال کیا، اُس نے طے کردیا کہ یہ مرکز وہ ارض پاک ہے جس کو یثرب کہا جاتا تھا جس نے بعد میں مدینۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا غیر فانی اسم گرامی اختیار کیا۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج۱ ص۳۱۷ فتح الباری ج۷ ص۱۸۱ [2] ترمذی شریف و فتح الباری ج۷ ص۱۸۱ [3] بخاری شریف ص۵۵۱

انتہا یہ کہ مقام عقبہ پر جو آخری بیعت ہوئی اس میں باقاعدہ وعدہ ہوگیا کہ حضرات مہاجرین وہاں پہونچیں گے اور اہل مدینہ اُن کا انتظام کریں گے۔ چنانچہ اس کے بعد نہ صرف یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دیدی بلکہ ایک اصول طے ہوگیا کہ جو دائرۂ اسلام میں داخل ہو اس پر لازم ہے کہ وہ مدینہ منورہ کو اپنا قیام گاہ بنائے[1]۔

سیدنا بلال رضی اللہ عنہ روئے انور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عاشقِ جاں نثار اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام۔ یہ ان دونوں سے جدا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ مگر اسی اصول کی پابندی نے اُن کو ہجرت پر مجبور کیا[2]۔ چنانچہ بیعتِ عقبہ کے بعد ہجرت کرنے والوں میں حضرت بلالؓ، حضرت عمار بن یاسر اور حضرت سعدؓ کے اسماء گرامی سب سے پہلے ہیں۔ ان کے بعد سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیس نفر کے قافلہ کے ساتھ تشریف لائے اور قبا میں رفاعہ بن عبد المنذرؓ کے یہاں فروکش ہوئے[3] پھر رفتہ رفتہ جس کو موقع ملا وہ مکہ سے نکل کر مدینہ پہونچتا رہا۔ (رضی اللہ عنہم)

شوقِ استقبال حضرات انصار نے اس دعوت پر ہی اکتفا نہیں کی جو بیعتِ عقبہ کے سلسلہ میں دے چکے تھے، بلکہ بیعت کے بعد جب مدینہ واپس آگئے تو یہاں سے چند حضرات مکہ تشریف لے گئے اور حضرات مہاجرین کے ساتھ واپس ہوئے۔ ان کو مہاجر انصاری کہا جاتا ہے[4]۔

---

[1] قرآن حکیم نے سچا مومن اسی کو قرار دیا جو ہجرت کرکے آئے یا ہجرت کرنے والوں کے لئے قیام کا انتظام کرے اور راہِ خدا میں جان اور مال سے جہاد کرے۔ (سورۂ انفال کی آخری آیت)

[2] فتح الباری صفحہ ۲۰۷ ج ۷ [3] ایضاً صفحہ ۲۰۹ ج ۷ [4] ان حضرات کے اسماء گرامی یہ ہیں: حضرت ذکوان بن عبد قیس، حضرت عقبہ بن وہب بن کلدہ، حضرت عباس بن عبادہ بن فضلہ، حضرت زیاد بن لبید رضی اللہ عنہم (ابن سعد صفحہ ۱۵۲ ج ۱)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا کی تلقین

اور ہجرت کا اشارہ

سورۂ اسرار کی چند آیتیں یہ ہیں :

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا ○ وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّکَ عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ○

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ○

ترجمہ: "اے رسول نماز قائم کر سورج ڈھلنے کے وقت سے لے کر رات کے اندھیرے کے وقت تک (ظہر، عصر، مغرب، عشار کے وقتوں میں) اور نماز فجر میں خاص اہتمام سے قرآن پڑھو - بلاشبہ صبح کے وقت تلاوت قرآن ایک ایسی تلاوت ہے جس میں حاضری زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے[۲] -

اور اے نبی رات کا کچھ حصہ (یعنی پچھلا حصہ) شب بیداری

---

[۱] آفتاب پرستوں کی عبادت طلوع آفتاب کے وقت ہوتی ہے اور توحید پرستوں کی عبادت اس سے پہلے ہوتی ہے - یا اس وقت جب ان معبودانِ باطل کا زوال ہوتا ہے -

[۲] رات اور دن کے کارپرداز فرشتے اس وقت جمع ہوتے ہیں - (بخاری شریف ص۶۸۶ و ۹۰)

میں بسر کر۔ یہ تیرے لئے ایک مزید عمل ہے۔ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے ایسے مقام میں پہنچا دے جو نہایت پسندیدہ مقام ہو (جس کی تعریف کی جاتی ہے) اور تیری دعا یہ ہونی چاہیئے کہ اے پروردگار (مجھے جہاں کہیں پہنچا تو) سچائی کے ساتھ پہونچا اور (جہاں کہیں سے نکال تو) سچائی کے ساتھ نکال۔ اور مجھے اپنے حضور سے قوت عطا فرما۔ ایسی قوت کہ (ہر حال میں) مددگاری کرنے والی ہو۔"

(آیات ۷۸ تا ۸۰ سورہ ۱۷ اسراء)

تشریحات: (۱) سورۂ اسراء جس کا آغاز معراج کے واقعہ سے ہوا۔ اسی کے نویں رکوع کی یہ آیات ہیں جن میں اس دعا کی تلقین ہوئی ہے رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ۔" جہاں سے نکالنا ہو سچائی کے ساتھ نکال اور جہاں پہونچانا ہو سچائی کے ساتھ پہونچا۔ جن میں بقول ابن عباس (رضی اللہ عنہما) ہجرت[1] کا ایماء ہے۔

(۲) معراج شریف ابتلاء اور آزمائش کے اس نازک دور میں ہوئی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے حامی اور مددگار یعنی بنو ہاشم شعب ابی طالب میں پناہ گزیں اور محصور تھے اور اہل مکہ اور بالفاظ دیگر پوری دنیا آپ سے بائیکاٹ کئے ہوئے تھی۔

اسی شب میں پانچ نمازیں فرض ہوئیں جن کی طرف ان آیتوں میں اشارہ ہے۔ ان کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم اور عمل متواتر سے فرمائی۔

شعب ابی طالب میں محصور ہونے کا دور اور اس کے بعد کے سال وہ تھے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء کی مظلومیت، لاچارگی اور بے مائگی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں کون امید کر سکتا تھا کہ انھیں مظلومیوں سے فتح اور کامرانی پیدا ہو سکتی ہے لیکن وحی الٰہی نے صرف فتح و کامرانی ہی کی بشارت نہیں دی کیونکہ فتح و کامرانی کی عظمت کوئی

---

[1] ترمذی شریف کتاب التفسیر صفحہ ۱۴۲ ج ۲

غیر معمولی عظمت نہیں تھی بلکہ ایسے مقام تک پہنچنے کی خبر دی جو نوع انسان کے لئے عظمت اور ارتفاع کی سب سے آخری منزل ہے۔ عَسٰۤی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾ (بنی اسرآءیل ۷۹)

فضل و کمال کا ایسا مقام جہاں پہونچکر محمودیت خلائق کی عالمگیر اور دائمی عظمت حاصل ہو جائے، کوئی عہد ہو، کوئی ملک ہو، کوئی نسل ہو، لیکن کروڑوں دلوں میں اس کی ستائش ہوگی۔ ان گنت زبانوں پر اس کی مدحت طرازی ہوگی۔ محمود یعنی سرتاسر محمود ہستی ہو جائے گی:

ما شئت قل فیه فانت مصدق فالحب یقضی

والمحاسن تشهد۔

" جو تعریف تم کرنا چاہو کرلو، تمہاری تعریف درست اور تم راست گو ہوگے، محبت کا یہی تقاضا ہے اور محاسن و کمالات اس کی شہادت دیتے ہیں۔"

یہ مقام انسانی عظمت کی انتہا ہے۔ اس سے زیادہ اونچی جگہ اولادِ آدم کو نہیں مل سکتی اس سے زیادہ انسانی رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی سعی اور ہمت ہر طرح کی بلندیوں تک اڑ سکتی ہے لیکن یہ بات نہیں پا سکتی کہ روحوں کی ستائش اور دلوں کی مداحی کا مرکز بن جائے۔ خالق کائنات اس کی مدح کرے اور وہ کائنات انسانی کی اس وقت مدد کرے جس وقت ہر ایک نفس خواہ وہ نفس عوام ہو یا نفسِ خواص کسی ولی مقرب کا نفس ہو یا کسی اولوالعزم نبی مرسل کا نفس "نفسی نفسی" پکار رہا ہو۔

(۳) جس اولوالعزم نبی اور رسول کے بلند ترین درجات کا زینہ معراج تھا اور سطحِ اعلیٰ مقام محمود۔ اسی کی حیات مقدسہ کا اہم واقعہ "ہجرت" ہے۔

یہ ترکِ وطن معاذ اللہ جان بچانے کے لئے نہیں تھا بلکہ اس جہادِ عظیم کے لئے تھا جس کا ثمرہ مقام محمود ہے۔

یعنی رحمت کا ملہ اور امنِ عالم کی وہ مقدس دعوت جس کا نام اسلام ہے جس کے مبلّغین

اور داعیانِ کرام کی تربیت تیرہ سال تک مکہ کی سنگلاخ امتحان گاہ میں ہوتی رہی، اب وقت آیا ہے کہ اس کو وقفِ عام کیا جائے اور ایک شہر یا ایک علاقہ یا ملک کی تنگنائی سے نکالکر پورے عالم کو اس سے آشنا کیا جائے اور وہ تمام مشقتیں برداشت کی جائیں اور تمام مصیبتیں جھیلی جائیں جن کی نذر پیش کرنا ایسی غیر معمولی عظیم الشان دعوت کے لئے ضروری ہے جس کی بنا پر رہتی دنیا تک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف ہوتی رہے اور قیامت کو مقام محمود کا شرف اعظم حاصل ہو۔

یہ ترکِ وطن اسی جہادِ عظیم کے لئے تھا، اسی لئے یہ ایک ایسا شرف تھا کہ اگر اللہ رب العالمین کو منظور نہ ہوتا کہ یہ شرف عطا کیا جائے تو محبوب رب العالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) مکی یا ہاشمی اور قریشی ہونے کے بجائے حضرات انصار میں سے ہوتے۔[۱]

اسی ہجرت نے اس موقف کی بنیاد رکھی جہاں سے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا: يَآيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (سورہ اعراف آیت ۱۵۸)

"اے افرادِ نسل انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں، وہ خدا کہ آسمانوں اور زمین کی ساری بادشاہت اسی کی ہے۔

مسجد جو اسلامی تعلیمات کے بموجب حیاتِ اجتماعی کی علامت بلکہ شرطِ اوّل ہے۔ اس ہجرت کے بعد ہی وہ پہلا دن میسّر آیا جس میں تاسیس مساجد کا سلسلہ شروع کیا گیا۔[۲] اسی پہلے دن کو اسلام کی نشأتِ اجتماعی کا پہلا دن مانا گیا جس سے اسلامی سنہ (سنہ ہجری) کا آغاز کیا گیا۔[۳]

---

[۱] لولا الهجرة لكنت امرأً من الانصار۔ بخاری شریف ص۵۳۳ [۲] قال الله تعالىٰ: لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ قال السهيلي من اول يوم حل النبي صلى الله عليه وسلم بدار الهجرة (تفسیر مظہری) [۳] بخاری شریف ص۵۶۰ حدیث سہل رض

مخالفین کا منصوبہ

اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۙ[1] وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۚۖ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۚ (سورہ ۸۶ طارق)

"وہ ایک منصوبہ بنا رہے ہیں اور میں ایک منصوبہ بنا رہا ہوں سو ڈھیل دیجئے منکروں کو تھوڑے دن ڈھیل دیدیجئے۔[2]"

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝

(سورہ ۸ الانفال)

"اور (اے نبیؐ) وہ وقت یاد کرو جب (مکہ میں) کافر تیرے خلاف اپنی چھپی تدبیروں میں لگے تھے کہ تجھے باندھ کر ڈالدیں[3] یا قتل یا جلا وطن کردیں اور وہ اپنی مخفی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی مخفی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔"

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا ... تا تَحْوِيْلًا ۝ (سورہ ۱۷ آیت ۷۶، ۷۷)

"اور اُنھوں نے اس میں بھی کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی کہ تجھے اس

---

[1] قال ابن عباس هذا وعيد من الله عز وجل وقد اخذهم الله يوم بدر ۔ (تفسیر مظہری)

[2] "البتہ وہ لگے ہیں ایک داؤ کرنے میں اور میں لگا ہوں ایک داؤ کرنے میں ۔ سو ڈھیل دے منکروں کو۔ ڈھیل دے ان کو (صبر کر)۔" (حضرت شاہ عبدالقادرؒ)

[3] "تجھ کو بٹھا دیں" (حضرت شاہ صاحبؒ)

سرزمین (ملک عرب) سے عاجز کر کے نکال دیں اور اگر وہ ایسا کر بیٹھے
تو (یاد رکھ) تیرے (نکالے جانے کے پیچھے) مہلت نہ پاتے مگر بہت
تھوڑی، (وہ سب تباہ کر دیئے جاتے) ہم تجھ سے پہلے جو پیغمبر بھیج چکے
ہیں ان سب کے معاملہ میں ہمارا قاعدہ یہی رہا ہے اور ہمارے ٹھیرائے
قاعدے کو تو بدلتا ہوا نہ پائے گا۔"

تشریح: جس قوم نے اپنا نصب العین یہ بنا رکھا تھا کہ اسلام کا نام و نشان مٹا ڈالے اُس کی ناکامی اس سے زیادہ کیا ہو سکتی تھی کہ جس کو وہ مٹانا چاہتی تھی وہ بڑھ رہا تھا، پھیل رہا تھا۔ اُس کی حفاظت اور ترقی کے مرکز قائم ہو رہے تھے۔

عرب سے باہر افریقہ میں (مملکتِ حبش میں) مسلمانوں کی ایک جماعت پہونچی ہوئی تھی۔ وہ ایک مرجع اور ایک مرکز بن گئی تھی[1]۔ قریش کا نمائندہ وفد جو اس کو اکھاڑنے کے لئے گیا تھا وہ ناکام ہو چکا تھا۔ اب تازہ ناکامی یہ تھی کہ یثرب میں اور خاص ان میں جو نہ صرف قریش کے ہم عقیدہ اور پیرو تھے بلکہ ان میں قریش کی رشتہ داری اور قرابت بھی تھی، اسلام کی جڑیں مضبوط ہو رہی تھیں، یہاں تک کہ ساری دنیا کا مقابلہ کرنے کے عزم اور حوصلہ کے ساتھ فداکاروں کی ایک جماعت منظم ہو چکی تھی۔ وہ سخت جان جو دس بارہ سال تک مکہ میں ہر طرح کی مصیبتیں جھیل کر اور امتحان و آزمائش کی بھٹی میں تپ کر کندن ہو چکے تھے وہ مکہ سے

---

[1] حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور اُن کے تقریباً تیس ساتھی یمن سے بذریعہ جہاز روانہ ہوئے کہ خدمتِ مبارک میں حاضر ہو کر اسلام قبول کریں، مگر بادِ مخالف نے جہاز کو بندرگاہ حجاز کے بجائے افریقہ کی بندرگاہ پر پہونچا دیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت حبش میں موجود ہے تو اس کے پاس پہنچے اور اسلام قبول کر کے اس کے ساتھ رہنے لگے اور فتح خیبر کے موقع پر ۷ھ میں وہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں باریاب ہوئے۔ (بخاری شریف ص۵۴۴ وغیرہ)

نکل نکل کر یثرب پہونچ رہے تھے اور اس طرح ایک محاذ مضبوط ہو رہا تھا۔ اس پر قریش کے رہنما جتنے بھی خوف زدہ ہوں، جتنے بھی چراغ پا ہوں کم تھا، کیونکہ زندگی اور موت کا سوال جو پہلے چلمن کے پیچھے سے جھانک رہا تھا اب بے نقاب ہو کر سامنے آچکا تھا۔ لہٰذا ضروری تھا کہ قریش کے تمام سردار سر جوڑ کر بیٹھیں اور پوری سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور کریں۔ چنانچہ مکہ کے تاریخی پنچایت گھر یا کونسل ہاؤس (دارالندوہ) میں خاص اجلاس طلب کیا گیا۔ ارکانِ ندوہ کے علاوہ دوسرے ہمنوا رہنماؤں کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ ایجنڈا (غور طلب اور فیصلہ طلب مسئلہ) یہی تھا کہ اسلام اور اس کے داعی کا قصہ کس طرح ختم کیا جائے۔

ربیع الاول کے پہلے ہفتہ میں یہ اجتماع ہوا اور پوری سنجیدگی سے مسئلہ پر غور کیا گیا۔ چند تجویزیں پیش کی گئیں:[1]

(۱) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بیڑیاں پہنا کر لوہے کی سلاخوں کے پیچھے باندھ کر ڈال دو۔[2] نجد کا ایک شخص جو وہاں وقت پر پہنچ گیا تھا اس نے کہا: اس سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مقبولیت بڑھے گی، لوگوں کی ہمدردیاں زیادہ ہوں گی۔ اور بہت ممکن ہے اس کے ساتھی کسی طرح اس کو چھڑا کر لے جائیں اس سے قریش کی بدنامی اور ہوا خیزی ہوگی۔

(۲) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو وطن سے نکال دو۔[3] تمہیں چھٹی مل جائے گی۔ تم اپنا نظام

---

[1] پیش کرنے والا: رئیس قریش ابوالبختری، مقتول غزوۂ بدر [2] لِيُثْبِتُوكَ

[3] أَوْ يُخْرِجُوكَ، (قرآن حکیم) نیز آخری آیت وَإِن كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ —— پورا ترجمہ اوپر گذر چکا ہے اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجویز بھی کافی اہمیت اختیار کر چکی تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان اور عاجز کر کے سرزمین عرب سے ہی نکال دیں بظاہر اس پر عمل اس لئے نہیں ہوا کہ اس میں یہ خطرہ محسوس کیا گیا کہ یہ جہاں پہونچ جائیں گے وہاں اپنا مرکز قائم کر کے حملہ کر دیں گے اور قریش کو تباہ کر دیں گے۔ مگر ارشاد ربانی کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت حق جل مجدہٗ اس قوم عرب یا قبیلہ قریش کو برباد کرنا نہیں چاہتے تھے اس لئے یہ تجویز منظور نہیں کی گئی کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے تو سنت اللہ یہ ہے کہ وہ قوم برباد ہو جاتی ہے جو اپنے نبی کو جلاوطن کر دے۔

قائم کر سکو گے اور موجودہ انتشار ختم ہو جائے گا۔

نجدی شیخ: بہت غلط رائے ہے، وہ ایسا ہوشیار ہے اور اس کے کلام میں ایسی طاقت ہے کہ جہاں جائے گا اپنا جتھا بنالے گا۔ تمہارے لئے عذاب بن جائے گا۔

(۴) ابوجہل: میری تو قطعی رائے یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کام تمام کر دیا جائے، باقی یہ خطرہ کہ اس کے ولی (بنو ہاشم) انتقام لیں گے اور اس طرح قبائلی جنگ بھڑک اٹھے گی تو اس سے نجات کی صورت یہ ہے کہ کسی ایک قبیلہ کے آدمی قتل نہ کریں، بلکہ ہر ایک قبیلہ سے آدمی منتخب کئے جائیں، یہ سب مل کر حملہ کریں۔ اس صورت میں خون کی ذمہ داری سب پر ہوگی۔ بنوہاشم اس اجتماعی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ لامحالہ دیت اور خون بہا طے ہوگا جس کو ہم لامحالہ سب مل کر ادا کریں گے۔

تمام ارکین نے ابوجہل کی تجویز سے اتفاق کیا اور اس کی تیاری شروع کر دی۔[1]

---

[1] البدایۃ والنہایہ ص۱۷۵ و ص۱۷۶ ج ۳ وغیرہا من کتب السیر
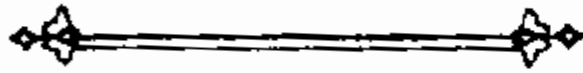
مخرج صدق (مکہ سے ہجرت) اور امداد خداوندی

اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ (سورہ ۱۷ اسرائیل آیت ۸۰)

"اے رب جہاں سے تو مجھ کو نکالے تو سچائی کے ساتھ نکال۔"

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا

(سورہ ۹ توبہ آیت ۴۰)

"اگر تم مدد نہ کرو گے رسول کی تو اللہ نے اس کی مدد کی ہے جب نکالا اس کو کافروں نے

گرمیوں کا موسم، ستمبر کی ۱۳ تاریخ، ربیع الاول[1] کی یکم، پیر کا دن۔ مکہ والے گرمیوں میں مکان سے باہر ڈیوڑھیوں کے سامنے یا راستہ کے کنارے پر چارپائیاں بچھا لیتے ہیں اور آدھی رات تک گپ شپ کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ ہے کہ تہائی رات تک نماز عشاء سے فارغ ہو جاتے ہیں پھر کچھ سورتوں کی تلاوت فرماتے ہوئے باوضو بستر پر اور عموماً کھری چارپائی پر آرام فرماتے ہیں اس وقت کچھ آنکھ لگ جاتی ہے۔ صحن میں آپ تنہا ہی ہوتے ہیں یا آپ کی زوجہ مطہرہ۔

---

[1] جو حضرات سفر ہجرت کے رفقاء یا اس سفر کے مددگار تھے انھوں نے تاریخ یا دن نہیں بیان کیا۔ دوسرے حضرات نے بیان کیا ہے۔ چونکہ ڈائری یا روزنامچہ کا رواج نہیں تھا اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی تقویمات (جنتریوں) میں اختلاف رہتا تھا اس لئے قدرتی طور پر تاریخوں کے بیان میں اختلاف ہو گیا۔

ہم نے تقویم ہجری وعیسوی مرتبہ ابوالنصر محمد خالدی صاحب ایم اے (عثمانیہ) کے لحاظ سے یہ تاریخ اور دن مقرر کیا ہے (واللہ اعلم بالصواب)۔

لیکن آج خلافِ معمول آرام نہیں فرمارہے اور آج آپ تنہا بھی نہیں ہیں۔ آپ کے چچا زاد بھائی (حضرت علی رضی اللہ عنہ) جن کی عمر تقریباً بائیس سال ہے وہ بھی حاضر ہیں اور کچھ باتیں ہو رہی ہیں جیسے حساب سمجھا رہے ہیں۔

دوسری طرف عجیب بات یہ ہے کہ مکان سے باہر کچھ آدمی آرہے ہیں، تلواریں اُن کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ نہایت خاموشی سے آتے ہیں اور دروازے کے قریب بیٹھ جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ دس بارہ آدمی آگئے ہیں ان میں ابوجہل بھی ہے ابولہب بھی اور عقبہ بن ابی معیط اور اُمیہ بن خلف بھی۔ اُن میں سے کوئی اُٹھتا ہے اور کواڑوں کی درازسے اندر جھانکتا ہے۔

اب آدھی رات گذرچکی ہے۔ آخری پہر شروع ہوگیا ہے، پورے مکہ پر سناٹا چھاگیا یہ کافر جو باہر آگئے تھے غالباً کھڑے کھڑے تھک گئے اس لئے قطار لگاکر دروازہ کے سامنے بیٹھ گئے ہیں، دفعۃً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر لٹاتے ہیں، اپنی چادر اُن کے اوپر ڈال دیتے ہیں، پھر دروازہ سے باہر تشریف لاتے ہیں۔ سورۂ یٰسین تلاوت فرمارہے ہیں اور جب کافروں کی برابر پہنچتے ہیں تو یہ آیت زبان مبارک پر ہے:

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا
فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ۝ (سورہ یٰسین ۳۶ آیت ۹)

(ترجمہ) "کردی ہم نے اُن کے آگے دیوار اور اُن کے پیچھے دیوار، پھر اوپر سے ڈھانک دیا۔ سو اُن کو نظر نہیں آتا"۔

اب نہیں کہا جاسکتا کہ ان کافروں کو نیند آگئی تھی یا جیسا کہ آیت کا مفہوم ہے ان کی آنکھوں کے سامنے دیوار کھڑی کردی گئی تھی۔ لیکن جو اطمینان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اُس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے سامنے قدرت نے کوئی دیوار کھڑی کردی ہے جس کو آپ محسوس فرمارہے ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) اطمینان کی بھی انتہا ہوگئی کہ آپ یونہی نہیں گذر جاتے بلکہ دستِ مبارک میں مٹی لیتے ہیں اور ہر ایک کے سر پر مٹی رکھتے ہوئے تشریف لے جاتے ہیں۔ یہ نبیؐ کا

لے ابن سعد و ابن ہشام (وغیرہ)

اعتماد، وثوق اور یقین ہے خدا پر اور خدا کے کلام پاک پر۔

خدا پر بھروسہ اور اطمینان کی دوسری مثال۔ یہ نوجوان (علی رضی اللہ عنہ) پیش کر رہے ہیں کہ وہ بستر پر آرام سے لیٹے ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ آج کی شب، شب مقتل ہے، دشمن اسی لئے اکٹھے ہو رہے ہیں کہ اس بستر والے کو ذبح کریں، آرام گاہ کو ذبح خانہ بنائیں۔ بستر والا نہ ہو تو جو بستر پر ہوگا وہ ذبح ہوگا۔ گویا تو اللہ کی حفاظت پر اطمینان کامل ہے یا دیدارِ محبوب کے شوقِ مضطر نے موت کو بھی محبوب بنا دیا ہے۔

اگر شاہدہ دوست از پس مرگ است

حیات خضر و مسیحا نصیب دشمن باد

یہی تسکین بخش اطمینان ہے کہ جیسے ہی لیٹتے ہیں سو جاتے ہیں۔ خدا جانے کتنی دیر تک یہ دشمن جو تلواریں لئے ہوئے تھے غافل بیٹھے رہے۔ انھیں ایک شخص نے آکر چونکایا جس نے خبر دی کہ جس کو تم قتل کرنے آئے تھے وہ نکل گیا اور تمہاری غفلت کی انتہا ہے کہ خاک تمہارے سروں پر ہے اور تمہیں خبر نہیں۔ اب یہ گھبرا کر اٹھے، سروں پر ہاتھ پھیرے تو خاک آلود تھے۔ یقین ہوگیا کہ یہ شخص سچ کہتا ہے۔ دروازہ دیکھا تو وہ بھی کھلا ہوا تھا۔

کسی کے مکان میں گھسنا بہت معیوب تھا مگر یہ لوگ ضابطۂ اخلاق سے دامن پھاڑ کر خاص منصوبہ کے تحت آئے تھے اور اب ناکامی کی جھونجل بھی تھی۔ غصہ اور جوش میں اندر گھس گئے، دیکھا کہ ایک سن رسیدہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم فداہ روحی) کی جگہ خواجہ ابو طالب کا سب سے چھوٹا لڑکا "علیؓ" بستر پر دراز خرّاٹے لے رہا ہے۔

حواس باختہ دشمنوں نے جھنجوڑ کر اٹھایا۔ پوچھا "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) کہاں ہے؟" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: مجھے کیا خبر؟ جواب صحیح تھا، انھیں خبر نہیں تھی۔ بہت پوچھ گچھ کی، ڈرایا، دھمکایا مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کچھ نہیں بتا سکے۔

یہاں سے دوڑے ہوئے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مکان پر گئے۔ ایک لڑکی (بڑی

صاحبزادی حضرت اسماء) سامنے آئی۔ پوچھا: تمہارے باپ کہاں ہیں؟ مجھے خبر نہیں۔ لڑکی نے جواب دیا۔ ابوجہل نے اس معصومہ کے اتنی زور سے طمانچہ مارا کہ کان کی بالی گر گئی۔[1]

جب ان بدبختوں کو یقین ہوگیا کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا تو اس کی تلاش میں دوڑے۔ مکہ کی گلی گلی چھان ماری اور جب کہیں پتہ نہ چلا تو فوراً منادی کرادی کہ جو محمدؐ اور اس کے ساتھی کو زندہ گرفتار کر کے لائے یا ان کا سر لائے اس کو (ایک دیت کے بموجب) سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے۔[2] سو اونٹ کا انعام معمولی نہیں تھا۔ انعام کے شوق میں بہت سے من چلے دوڑے مگر کامیابی کسی کو بھی نہیں ہوئی، کیونکہ ربِّ محمد اپنے محمد کی مدد کر رہا تھا (صلی اللہ علیہ وسلم)

یہی تو ہے ارشادِ خداوندی فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ (التوبہ) ("بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اس کی (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کی") اور وہ جو دعا بتائی گئی تھی جس کا ایک جز تھا وَاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا۝ ("اور مجھے اپنے حضور سے قوت عطا فرما ایسی قوت جو ہر حال میں میری مددگار رہے") تو اس اطمینان سے زیادہ جس سے پوری طرح مسلح ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بستر سے اٹھے اور روانہ ہوئے تھے، سلطانِ[3] نصیر کیا ہو سکتا ہے۔

صادق وامین کی امانت داری دشمنوں نے اگرچہ یہ خطاب[4،5] اب چھوڑ دیا تھا مگر آپ کی صداقت و امانت ان دشمنوں کی خاطر نہیں تھی

---

[1] ابن سعد و ابن ہشام وغیرہ [2] بخاری شریف ص۵۵۴ [3] ایسی قوت جو ہر حال میں مددگار رہو۔

[4] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ عجیب بات ہے اللہ تعالیٰ نے میرے نام کو سب وشتم سے بچا لیا ان کو میرا نام لینا گوارا نہیں ہوتا یہ مُذَمَّم کو برا بھلا کہتے ہیں حالانکہ میں محمد ہوں میرا نام مذمم نہیں بخاری شریف ص۵۰۱

[5] یہ خطاب استعمال نہیں کرتے تھے مگر آپ کی صداقت اور امانت سے انکار نہیں تھا۔ مانتے تھے، جانتے تھے، پہچانتے تھے کہ آپ صادق و امین ہیں۔ اسی پر تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ۝ (مومنون) (کیا ان لوگوں نے اپنے رسول کو پہچانا نہیں ہے کہ اس کا انکار کرتے ہیں) قرآن حکیم نے اصل مرض کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا (معبودان باطل) کی محبت (باقی برصفحہ آئندہ)

بلکہ اس لئے تھی کہ آپ کی فطرتِ مبارکہ کا جوہر تھی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو سمجھا رہے تھے وہ ان امانتوں کا حساب ہی تھا جو انھیں دشمنوں کی آپ کے پاس تھیں، جو اب منصوبہ قتلِ ناحق کو کامیاب بنانے کے درپے تھے۔ آپ نے اس خطرناک اور ہیبت ناک فضا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اسی لئے چھوڑا تھا کہ جن کی امانتیں ہیں ان کو واپس کر کے اور پوری طرح حساب سمجھا کر تشریف لائیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تین دن بعد روانہ ہوئے جب امانتیں ادا کر چکے اور حساب سمجھا چکے۔

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) ان لوگوں سے یہ حرکتیں کرائی تھی وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (بقرہ ع ۲۰) "کچھ لوگ وہ ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو مانتے ہیں جن کو انھوں نے خدا کا شریک ٹھیرا رکھا ہے اور ان سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی خدا سے کرنی چاہیئے اور جو ایمان والے ہیں وہ بہت سخت ہوتے ہیں اللہ کی محبت میں" حُبِّ انداد یعنی معبودانِ باطل کی محبت اور خدا کی محبت میں یہ فرق ہوتا ہے کہ اللہ سے محبت کرنے والا ہٹ دھرمی نہیں کر سکتا کیونکہ اللہ کا حکم ہے کہ "ہر موقع پر عدل و انصاف سے کام لو، حق کی شہادت دینے والے رہو" كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ اور معبودانِ باطل کا کوئی حکم ہی نہیں اگر ہے تو باطل پرستی لہٰذا وہ جو کچھ کر بیٹھے کم ہے۔

غارِ ثور میں قیام اور ضروری انتظامات

ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔

"صرف دو تھے دو میں سے ایک اللہ کے رسولؐ تھے۔ جب کہ یہ دونوں غار میں تھے اور اللہ کے رسول اپنے صاحب (ساتھی) سے کہہ رہے تھے غمگین نہ ہو۔ یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

(التوبہ ۹)

انبیاء علیہم السلام خدا پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ اعلیٰ درجہ کے متوکل بلکہ آداب توکل کے معلّم اور متوکلین کے امام و پیشوا ہوتے ہیں۔ اس غیر معمولی توکل اور اعتماد کے نتیجہ میں غیبی تائید اور نصرتِ خداوندی کی وہ غیر معمولی صورتیں بھی پیش آتی رہتی ہیں جو انھیں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں جن کو معجزہ کہا جاتا ہے اس کے باوجود وہ ظاہری اور مادی اسباب کو نظر انداز نہیں کرتے کیونکہ وہ صرف خانقاہ نشین درویش نہیں ہوتے ان کی زندگی صرف ان کے لئے نہیں ہوتی وہ نوعِ انسان کے معلم ہوتے ہیں اور اُن کی زندگی پوری نوعِ انسان کے لئے سبق ہوتی ہے۔ مکان سے نکلتے وقت قدرت نے خاص طرح کی مدد کی مگر آپؐ نے اور آپ کے رفیق خاص نے روپوش رہنے اور خفیہ روانگی کا جو نظام قائم کیا تھا وہ اُمت کے لئے بہترین سبق ہے۔ اس کی تفصیل خاص طور پر قابل مطالعہ ہے۔

دار الندوہ کا وہ اجلاس جس میں آپ کے متعلق غیر معمولی تجویز منظور کی گئی اور مشترک طور پر شہید کرنے کا منصوبہ طے کیا گیا۔ وہ غالباً صبح کے وقت ہوا۔ اس کی اطلاع بطور تائید غیبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فوراً ہی ہو گئی ـــــــ[1] اور فوراً ہی آپ نے روانگی کی تیاری شروع کر دی۔

---

[1] ابن سعد کی روایت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ منصوبہ طے کر کے لوگ منتشر ہو گئے (اجلاس ختم ہو گیا) جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ یہ خبر سنائی اور کہا کہ آج کی شب اپنے اس بستر پر آرام نہ فرمائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے صفحہ ۱۵۳ ج ۱ اس تفصیل سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اجلاس صبح کے وقت ہوا۔

سیدہ[1] عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ روزانہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے یہاں تشریف لایا کرتے تھے، مگر صبح یا شام کو۔ ایک روز ہم نے دیکھا کہ ٹھیک دوپہر کے وقت تشریف لا رہے ہیں، سر مبارک پر کپڑا ڈالے ہوئے ہیں، چہرہ مبارک کو بھی کچھ کپڑے سے چھپائے ہوئے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خبر دی گئی۔ فوراً حاضر ہوئے۔ یا رسول اللہ آپ پر میرے ماں باپ قربان یہ ناوقت تشریف آوری کیسی؟

ارشاد ہوا: کچھ بات کرنی ہے، تنہائی ہونی چاہیئے۔ کوئی غیر آدمی ہو تو اُسے ہٹا دو۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ: غیر کوئی نہیں، دو لڑکیاں ہیں۔ ایک آپ کی خادمہ عائشہؓ، دوسری اس کی بہن اسماءؓ۔

فرمایا تمہیں معلوم ہے؟ مجھے ہجرت کی اجازت[2] مل گئی ہے۔

صدیق اکبرؓ: یہ خادم ساتھ رہے گا[3] آپ پر میرے باپ قربان یا رسول اللہؐ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم: بہت اچھا۔

یہ اجازت ایسی بشارت تھی کہ فرطِ مسرت سے حضرت ابوبکرؓ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا کہ خوشی میں آنسو آ جاتے ہیں۔[4]

---

[1] بخاری شریف ص ۵۵۳ تا ص ۵۵۴ [2] یعنی آج یہ سفر اس لئے نہیں ہے کہ دشمنوں نے قتل کا منصوبہ بنا رکھا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اب تک ہجرت کی اجازت نہیں تھی۔ آج مل گئی ہے۔ اور اگر دار الندوہ کا اجلاس رات کے وقت ہوا تھا تو اگرچہ اس کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فوراً مل گئی تھی مگر دوپہر تک آپؐ نے روانگی کا قصد اس لئے نہیں کیا کہ اب تک ہجرت کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اب جیسے ہی اجازت ملی آپ نے تیاری شروع کر دی۔ واللہ اعلم بالصواب [3] یہ ہے عشقِ رسولؐ۔ اہل و عیال، مال اور جائداد وغیرہ کا کوئی تصور سامنے نہیں تھا۔ قلب مضطر کی تڑپ صرف یہ ہے: الصحابۃ بابی انت یا رسول اللہ۔ (بخاری شریف ص ۵۵۳) "آپ کی رفاقت۔ میرے باپ آپ پر قربان یا رسول اللہ" [4] سیرۃ ابن ہشام ص ۴۹۱ ج ۱

پھر صدیق اکبرؓ نے عرض کیا: دو سانڈنیاں[1] تیار ہیں۔ ان میں سے ایک منظور فرمائیے۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم: ضرور، مگر قیمت[2] لینی ہوگی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نے بڑی تیزی سے سامانِ سفر کی تیاری شروع کردی اور جلدی جلدی میں جو ناشتہ[3] تیار ہوسکتا تھا' وہ تیار کرلیا، پھر ہم نے چمڑے کے تھیلے میں ناشتہ بھر دیا۔ ایک مشکیزے میں پانی بھر دیا، لیکن تھیلے کا مُنہ بند کرنے کے لئے کپڑے کی ضرورت تھی اور مشکیزے میں بھی تسمہ نہیں[4] تھا جس سے اس کو اٹھایا جاسکے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بڑی ہمشیرہ (حضرت اسماء رضی اللہ عنہا) نے فوراً اپنے نطاق[5] کے دو حصے کرلئے[6]، ایک میں کھانے کا تھیلہ باندھ دیا، دوسرے میں مشکیزہ باندھ دیا تاکہ اس کو اٹھایا جاسکے۔

روانگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دولت کدہ سے روانہ ہوکر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

---

[1] یہ پہلے گذر چکا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ چار ماہ پہلے یہ سانڈنیاں خرید چکے تھے اور اس خیال سے کہ نہ معلوم کس وقت حکم ہوجائے ان اونٹنیوں کو چرواہے کے سپرد نہیں کیا تھا بلکہ گھر پر کھڑا کرکے ان کو چارہ کھلاتے رہے تھے۔ [2] واقدی کی روایت یہ ہے کہ ان دونوں کی قیمت آٹھ سو درہم تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سانڈنی منظور فرمائی وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قبیلہ بنی قشیر سے خریدی تھی' اس کا نام قصواء رکھا گیا۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری میں آخر تک رہی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بہت کم زندہ رہی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اس کی زندگی کا خاتمہ ہوا۔ (فتح الباری ص۱۸۹ ج۷)

[3] پراٹھے نہیں تھے صرف اُبلا ہوا یا بھنا ہوا بکری کا گوشت تھا۔ (فتح الباری بحوالہ واقدی ص۱۸۵ ج۷،

[4] لیس فیھا عصام سیرۃ ابن ہشام ص۲۹۲ ج۱ [5] نطاق خاص قسم کا تہہ بند ہوتا تھا اس کا عرض تقریباً ڈھائی میٹر (۹۰ انچ) ہوتا تھا۔ اس کو بیچ میں سے باندھ دیا جاتا۔ پھر اوپر کا حصہ نیچے لٹکا دیا جاتا جس سے یہ دہرا ہوجاتا تھا۔ مجمع البحار و فتح الباری ص۱۸۵ ج۷، [6] یہ ایثار عند اللہ مقبول ہوا۔ چنانچہ آپ کا خطاب ذات النطاقین ہوگیا۔ (بخاری شریف ص۵۱۱)

کے یہاں پہونچے ۔ پھر یہ دونوں مکان کی پشت کی طرف سے کھڑکی سے نکل کر کوہ ثور کی طرف[1] روانہ ہوگئے جو مکہ معظمہ سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر ہے اور جس کی چوٹی پر یہ غار ہے جس نے غارِ ثور کے نام سے غیر فانی شہرت حاصل کی ۔

جب آپ روانہ ہوئے تو یہ دعا زبانِ مبارک پر تھی[2] :

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ[3] الَّذِی خَلَقَنِی وَلَمْ اَكُ شَيْئًا اَللّٰهُمَّ اَعِنِّی عَلٰی هَوْلِ الدُّنْيَا وَ

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ص ۲۹۱/۱ج البدایہ والنہایہ ص ۱۷۸/۳ج [2] ایضاً البدایہ والنہایہ ص ۱۷۸/۳ج

[3] ترجمہ : "اس خدا کی حمد جس نے مجھے پیدا کیا، درانحالیکہ میں کچھ بھی نہیں تھا (مجھے نیست سے ہست کیا) اے اللہ میری مدد فرما، دنیا کی دہشت، زمانہ کے ہلاکت انگیز واقعات، رات اور دنوں (گردش روز و شب) کی مصیبتوں کے مقابلہ پر اے اللہ تو میرا ساتھی بنا رہ میرے سفر میں اور میرا قائم مقام بن میرے اہل و عیال میں میرے بعد (میری غیوبت میں تو ان کا محافظ اور نگراں رہ) اور اے اللہ جو تو مجھ کو رزق دے اس میں برکت عطا فرما اور اے اللہ صرف اپنی ذات کے لئے ہی ایسا کر کہ مجھے اپنا مطیع اور اپنے سامنے عاجز بنا کے کسی اور کے سامنے مجھے عاجز اور ذلیل نہ کر ۔ اے اللہ نہایت صالح اور مناسب اعمال پر میری تربیت فرما! افعالِ خیر کے بہترین سانچے میں مجھے ڈھال دے اور اے میرے رب صرف اپنی طرف کی محبت ہی میرے اندر بھر دے اور جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے اے اللہ مجھے تو ان کے حوالے مت کر ۔ اے کمزوروں کے رب تو ہی میرا رب ہے ۔ میں تیری اس باعزت ذات کی (جس کی برکت سے آسمان اور زمین روشن ہیں اور جس سے تمام تاریکیاں فنا ہو جاتی ہیں اور جس کے فضل و کرم سے پہلے لوگوں اور بعد والوں کا سب کا معاملہ درست ہوا) پناہ لیتا ہوں اس سے کہ میرے اوپر تیرا غضب اور تیری ناراضگی نازل ہو ۔ میں تیری پناہ لیتا ہوں اس سے کہ تیرا انعام مجھ کو نصیب نہ ہو یا اس سے کہ تیرا عتاب دفعۃً مجھ پر نازل ہو جائے اور پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ تیری معافی جو مجھے میسر ہے اس میں تبدیلی آجائے اور میں ایسی ہر چیز سے پناہ چاہتا ہوں جو تیری ناراضی کا سبب ہو انجام کار تیرے ہی لئے ہے ۔ میں جہاں تک میرے امکان میں ہے خیر اور بھلائی ہی کی کوشش کرتا ہوں (مگر) تیرے بغیر نہ کوئی طاقت ہے نہ کوئی قوت ہے جو کچھ قوت و طاقت ہے وہ تجھ سے ہی ہے ۔"

وبوائق الدھر ومصائب اللیالی والایام۔ اللّٰھمّ اصحبنی فی سفری واخلفنی فی اھلی وبارک لی فیما رزقتنی ولک فذللنی وعلی صالح خلقی فقوّمنی والیک ربّ فحبّبنی والی الناس فلا تکلنی ربّ المستضعفین وانت ربّی اعوذ بوجھک الکریم الذی اشرقت لہ السمٰوٰت والارض وکشفت بہ الظلمات وصلح علیہ امر الاولین والاخرین ان تحل علیّ غضبک وتنزل بی سخطک۔ اعوذبک من زوال نعمتک وفجاءۃ نقمتک وتحول عافیتک وجمیع سخطک لک العقبٰی عندی خیر ما استطعت لا حول ولا قوۃ الا بک۔

ایک روایت[۱] یہ بھی ہے کہ آپ نے یہ دُعا فرمائی تھی:

اللھم اخرجتنی من احب البلاد الیّ فاسکنی فی احب البلاد الیک۔

"اے اللہ تو نے مجھے اس شہر سے نکالا ہے جو مجھے تمام شہروں میں سب سے محبوب تھا تو اب میری سکونت اس شہر میں فرما جو تجھکو سب سے زیادہ محبوب ہو۔

سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ساتھ ساتھ تھے مگر جذبۂ بیتاب قابلِ دید تھا۔ کبھی آگے چلتے کبھی پیچھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا تو عرض کیا یارسول اللہ آگے چلتا ہوں کہ حضورؐ کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ خیال آتا ہے کہ شاید پیچھے سے تعاقب کرنے والے پہنچ جائیں تو پیچھے ہوجاتا ہوں۔ رحمۃ للعالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: تمہیں اپنی جان کا خطرہ نہیں ہے۔ عرض کیا: حضرت وہ تو قربان ہونے کے لئے ہے ہی[۲]۔

راستہ طے ہوا۔ غار کے کنارے پہنچے تو عرض کیا: حضرت ذرا توقف فرمائیں۔ حضرت ابوبکرؓ غار کے اندر اُترے، صاف کیا، پھر آقا دوجہان (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کیا: تشریف لایئے۔

---

[۱] البدایہ والنہایہ ص۲۰۵ ج۳

[۲] دلائل النبوت للبیہقی بحوالہ فتح الباری ص۱۸۹ ج۷

اُن کو کیا فکر جن کا ساتھی اللہ ہو

سو اونٹ کا انعام جو قریش کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا، معمولی نہیں تھا۔ مکہ والوں کی بہت سی ٹولیاں انعام کے شوق میں دوڑ پڑیں، کچھ ٹولیاں اس طرف بھی آئیں۔ ایک ٹولی غار کے قریب پہونچی تو وہاں سے کبوتر اڑے۔ ٹولی آگے نہیں بڑھی کہ یہاں اگر ہوتے تو کبوتروں کا یہاں کیا کام تھا۔ غار کے مونہ پر جھاڑ تھا۔ ایک ٹولی جھاڑ کے قریب تک پہونچی اس نے دیکھا کہ جھاڑ پر مکڑی کا جالا تنا ہوا ہے۔ وہ جالا دیکھ کر واپس ہو گئی۔[1] ایک ٹولی اوپر چڑھی اور غار کے کنارے کے اوپر سے اس طرح گذر گئی کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اُن کے پاؤں دیکھے۔ یہ ٹولی گذر چکی تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

لو ان احدھم نظر الیٰ قدمیہ لابصرنا۔	اگر ان میں سے کوئی اپنے پیروں پر نظر ڈالتا تو ہمیں دیکھ لیتا۔

یہ نبی کا اطمینان و اعتماد تھا کہ برجستہ جواب دیا:

اسکت یا ابا بکر اثنان اللہ ثالثھما[2]	خاموش رہو ابو بکر! ہم دو ہمارا تیسرا اللہ ہے۔
وفی روایۃ ما ظنک یا ابا بکر باثنین اللہ ثالثھما[3]	ایک روایت میں یہ ہے: ابو بکر! ان دو کے متعلق تم کیا گمان رکھتے ہو جن کا تیسرا اللہ ہے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ زحمتِ سفر،[4] صدیق اکبرؓ کی رفاقت اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعتماد بارگاہ ربّ العزت میں قبول ہوا۔ چنانچہ سورۂ توبہ کی اس آیت (مذکورہ عنوان) میں اس کا ذکر فرمایا گیا۔

---

[1] طبقات ابن سعد جلد اول ص۱۵۴ [2] بخاری شریف ص۵۱۶
[3] ایضاً ص۵۱۶ و فتح الباری [4] یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ یہ سفر اور غار میں قیام ستمبر کے مہینہ میں ہوا جو سخت گرمی کا مہینہ ہوتا ہے۔

سب کچھ قربان

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۔ (الحشر ۹)

("وہ مقدم رکھتے ہیں اپنے نفسوں پر باوجود دیکہ خود انکو شدید حاجت اور سخت ضرورت ہوتی ہو")

یہ آیت اگرچہ ہجرت سے کئی سال بعد حضرات انصار (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے بارے میں نازل ہوئی مگر اس کی عملی مثال حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پہلے ہی پیش کر چکے تھے۔ جب آپ نے سفرِ ہجرت کے وقت اپنی پوری پونجی ساتھ لے لی تھی۔ پانچ چھ ہزار آپ کے پاس نقد تھے، آپ روانہ ہوئے تو آپنے سب رقم ساتھ لے لی اور اہل و عیال کو خدا کے نام پر چھوڑ دیا۔ آپ کے بچوں کا ایثار یہ تھا کہ اس کی ان کو کوئی ناگواری ہوئی نہ تہی دستی سے پریشانی۔ گویا خود ان کی بھی خواہش یہی تھی۔ انتہا یہ کہ جب حضرت ابو بکرؓ کے والد ابو قحافہ کو خبر ہوئی کہ ابو بکرؓ چلے گئے، تو بچوں کے پاس آئے اور فرمایا ابو بکرؓ تو چلے ہی گئے، کچھ تمہارے لئے بھی چھوڑ گئے ہیں؟ میرا خیال یہ ہے کہ جو کچھ اُن کے پاس تھا سب لے گئے۔

جان سے تو گئے ہی مال بھی لے گئے۔ تمہیں خالی چھوڑ گئے۔ تو بڑی صاحبزادی حضرت اسماءؓ نے فوراً جواب دیا: نہیں، دادا جی وہ ہمارے لئے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ ابو قحافہ کچھ مطمئن نہیں ہوئے تو حضرت اسماءؓ نے اس جگہ جہاں رقم رہا کرتی تھی کنکریاں تھیلی میں بھر کر رکھ دیں۔ دادا کی بصارت جاتی رہی تھی۔ اُن کا ہاتھ پکڑ کر لے گئیں اور تھیلی پر ہاتھ رکھکر بتا دیا کہ یہ رقم محفوظ ہے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ محض دادا کو مطمئن کرنے کے لئے کر دیا۔ ورنہ واقعہ یہ تھا کہ جو کچھ تھا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سب لے آئے تھے، ہمیں خالی چھوڑ آئے تھے۔ [1]

---

[1] سیرۃ ابن ہشام صہ ۲۹۳/۱

حالات سے باخبر رہنے اور دوسری ضروریات کا انتظام

تین آدمیوں کے خاص خاص کام سپرد کئے گئے تھے[1]

(۱) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فرزند ارجمند عبداللہ[2] نوجوان[3] تھے مگر نہایت ہوشیار، بہت تیز، بات کو تاڑنے والے، پرکھنے والے۔ اُن کے ذمہ یہ تھا کہ مخالفین کے اقدامات پر نظر رکھیں، حالات کا جائزہ لیتے رہیں۔

یہ دن بھر مکہ معظمہ میں کنسوئیں لیتے رہتے۔ دن چھپے اندھیرا ہوجاتا تو غار پر پہنچتے تھے، تمام روئیداد سنا دیتے، حالات سے باخبر کردیتے، پھر آخر پہر میں مکہ معظمہ پہنچ جاتے گویا رات بھر یہیں رہے ہیں۔

(۲) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ[4] غلام عامر بن فُہیرہ جن کو حضرت ابوبکرؓ نے حضرت بلالؓ کے ساتھ ہجرت کی اجازت نہیں دی تھی، بلکہ روک لیا تھا۔ اُن کے ذمہ یہ تھا کہ تازہ دودھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے رہیں۔ شام کو جب اندھیرا ہوجاتا یہ بکریاں غار پر لیجاتے، دودھ دُھتے، اس کو گرم کرتے اور سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے آقا (ابوبکرؓ) کی خدمت میں پیش کردیتے پھر بکریوں کو ہنکا کر صبح سے پہلے تڑکے میں مکہ پہنچ جاتے۔

(۳) اس زمانہ میں سڑکیں نہیں تھیں، اس لئے راستوں اور خصوصاً پہاڑی راستوں سے واقف ہونا بھی ایک خاص فن تھا۔ اس کے ماہر کو "خرّیت" کہا کرتے تھے۔ قافلہ کے ساتھ خرّیت

---

[1] ماخوذ از بخاری شریف ص۵۵۳ [2] ان کے حالات آئندہ آئیں گے زیرعنوان متعلقین کی آمد حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔ [3] غلام شاب۔ ثقف لقن (بخاری شریف ص۵۵۳)

[4] گمراں اُن کے آقا۔ بیرمعونہ کے حادثہ میں ان کو شہید کردیا گیا۔ قاتلوں کے سردار عامر بن طفیل نے لوگوں سے دریافت کیا یہ لاش کس کی ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس کو اٹھاکر آسمان کی طرف لیجایا گیا، پھر آہستہ آہستہ نیچے اتارا گیا اور رکھ دیا گیا۔ بخاری شریف ص۵۸۶

ضرور ہوتا تھا۔ اس کی معقول اُجرت ہوتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے قبیلہ بنی دیل کے ایک شخص کو جس کا نام عبداللہ بن اریقد تھا (اور عبداللہ بن اریقط بھی کہلاتا تھا) اس خدمت کے لئے طے کر لیا تھا۔

یہ مسلمان نہیں تھا بلکہ مشرکین مکہ کا ہم مسلک تھا۔ عاص بن وائل سہمی کے خاندان کا حلیف تھا۔ یہ تو نہیں معلوم کہ اُجرت کیا طے ہوئی تھی البتہ ان دونوں بزرگوں کو اس پر پورا اطمینان[1] تھا۔ یہاں تک کہ دونوں سانڈنیاں اسی کے حوالے کر دی تھیں اور بتا دیا تھا کہ تین رات گذرنے کے بعد وہ چوتھے دن صبح سویرے غارِ ثور پر پہنچ جائے۔

یہ "خرّیت" وعدہ کے مطابق ٹھیک وقت پر پہونچا اور یہ حضرات سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ "خرّیت" نے سیدھا راستہ چھوڑ کر ساحلِ سمندر کا راستہ اختیار کیا جو چکّر کاٹ کر مدینہ پہونچتا تھا۔ ایک ہفتہ بعد ۱۲[2] ربیع الاوّل کو پیر کے دن[3] یہ مقدس قافلہ منزلِ مقصود پر پہونچا۔

با ہوش و با تدبیر رفاقت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس راستہ سے پہلی دفعہ تشریف لے جا رہے تھے۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کاروباری ضرورتوں سے شام جاتے رہتے تھے۔ قبائل کے شیوخ سے ان کے تعلقات تھے، لوگ ان کو پہچانتے تھے۔ اس وقت جب کہ باوجاہت، شریف صورت، رفیق

---

[1] اطمینان کا سبب بظاہر یہ حلف ہی تھا۔ اس کی تفصیل مقدمہ میں ملاحظہ ہو۔ زیر عنوان معاہدات

[2] ابن سعد ابن ہشام وغیرہ [3] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پیر (دوشنبہ) کے روز ہوئی۔ پیر ہی کو نبوت عطا ہوئی، پیر کے دن ہی مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے اور پیر کے دن ہی مدینہ منورہ میں رونق افروز ہوئے (مسند احمد) ابن سعد اور ابن ہشام وغیرہ نے بھی پیر کا دن ہی بیان کیا ہے۔ لیکن تقویم سنہ عیسوی و سنہ ہجری کے لحاظ سے یکم ربیع الاول پیر کے دن ہوتی ہے تو ۱۲ ربیع الاول کو پیر کا دن نہیں ہوتا۔ بظاہر تقویمات کا فرق ہے۔

کو ساتھ دیکھتے تو پوچھتے تھے یہ کون صاحب ہیں۔ حضرت صدیقؓ کا جواب یہ ہوتا تھا:

هذا الرجل يهديني الطريق "یہ صاحب مجھے راستہ بتاتے ہیں"[1]

غار ثور سے روانہ ہوئے تو تمام رات چلتے رہے۔ اگلے دن دوپہر کا وقت ہو گیا، دھوپ تیز ہو گئی۔ اس کھلے ہوئے لق ودق میدان میں پتھر کی چٹان کے نیچے کچھ سایہ تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کو غنیمت سمجھا۔ میں چٹان پر پہونچا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے گیا۔ میرے ساتھ ایک "فروۃ" چمڑے کا بستر تھا۔ میں نے اس کو سایہ میں بچھا دیا اور اپنے آقا (آقائے دوجہاںؐ) کو اس پر لٹا دیا۔

پھر میں نے نظر دوڑائی تو ایک چرواہے کو دیکھا جو بکریوں کے چھوٹے سے گلہ کو ہنکاتے ہوئے اس طرف لا رہا تھا۔ اور وہ بھی اس چٹان کے سایہ میں آرام کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کے پاس پہونچا اور دریافت کیا: یہ بکریاں کس کی ہیں؟ تمہارا کون مالک ہے۔ چرواہے نے ایک شخص کا نام لیا۔ جس کو میں جانتا تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا کوئی بکری دودھ دیتی ہے اور کیا تم دودھ دے سکتے ہو۔ اس نے اقرار کیا۔ چنانچہ وہ ایک بکری پکڑ کر لے آیا۔ میں نے کہا پہلے تم بکری کے تھن پونچھ کر صاف کرو۔ پھر اپنے ہاتھ صاف کرو۔ پھر دودھ نکالو۔ اس نے میری فرمائش پر عمل کیا۔ اور تھوڑا سا دودھ دوھ کر مجھے دے دیا۔

میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک چھاگل میں پانی رکھ چھوڑا تھا۔ اس کے منھ پر کپڑا باندھ رکھا تھا (کہ گرد وغبار نہ پڑے) میں نے دودھ میں اتنا پانی ڈالا کہ تلی تک تمام دودھ ٹھنڈا ہو گیا (دودھ کی لسی بنالی) پھر میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ آپؐ نے نوش فرمایا۔ میرا جی خوش ہو گیا۔[2]

---

[1] بخاری شریف ص۵۵۶ ابن سعد ص۱۵۹ ج۱

[2] بخاری شریف ص۵۵۶ و ص۳۳۰ وغیرہ

راستہ کی مختصر سرگذشت

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ

("اور اللہ آپ کی حفاظت کرے گا لوگوں سے")

آیت کا نزول اگرچہ بعد میں ہوا ہے، مگر حفاظتِ خداوندی کا عجیب و غریب ظہور اس سفر میں ہو چکا تھا۔ سراقہ بن مالک بن جعشم کا واقعہ[1] اس کی مثال ہے۔ یہ قبیلہ بنی مدلج کا ایک شیخ تھا۔ اعلانچی اس کے یہاں بھی پہنچے تھے اور یہ اعلان اُس نے بھی سُنا تھا جو قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفیق سفر کے گرفتار کرنے یا قتل کرنے والے کے متعلق کیا تھا۔ سُراقہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں قبیلہ میں ایک چوپال میں بیٹھا ہوا تھا کہ کچھ آدمیوں نے آ کر کہا کہ سمندر کے کنارے جاتے ہوئے کچھ آدمیوں کی پرچھائیاں سی نظر آئی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ محمد اور اس کے ساتھی ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم)

سراقہ کہتے ہیں کہ میرے ذہن میں بھی یہی آیا کہ ان کا خیال صحیح ہے مگر اس شوق میں کہ سارا انعام تنہا میں حاصل کر لوں میں نے ان کی بات ٹال دی۔ میں نے کہا کہ "محمدؐ" یہاں کہاں؟ فلاں فلاں آدمی ہمارے سامنے سے گذرے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوں گے۔ خبر دینے والوں نے میری بات مان لی۔ کسی اور نے کچھ خیال نہیں کیا۔ میں تھوڑی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ پھر خاموشی سے اُٹھا، اپنے مکان میں گیا۔ باندی سے کہا میری گھوڑی ٹیلے کے پیچھے چر رہی ہے اس کو لے آ اور تیار کر دے۔ میں نے بھی ضروری سامان ٹھیک کر لیا۔ پھر میں نے نیزہ لیا اور اس خیال سے کہ لوگ نیزہ نہ دیکھ لیں، اسکی بھال ہاتھ میں لی اور پھولی زمین پر ڈال کر کھینچتا ہوا چلا اور مکان کی پشت کی طرف سے نکل کر گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ وہ کبھی دُلکی اور کبھی پویا دوڑتی ہوئی مجھے لے چلی۔ یہاں تک کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہونچ گیا۔ اچانک گھوڑی کے

---

[1] ماخوذ از بخاری شریف ص۵۵۶

ٹھوکر لگی اور میں زمین پر آ رہا۔ میں فوراً اٹھا۔ میرے ترکش میں فال معلوم کرنے والے تیر تھے۔ میں نے اُن کو نکالا اور میں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ میں ان کو نقصان پہونچا سکوں گا یا نہیں۔ اتفاق سے میری مرضی کے خلاف فال نکلی۔ مگر میں نے اس کا خیال نہیں کیا۔ میں نے فال کے فیصلے سے بغاوت کی، پھر گھوڑے پر سوار ہوا اور اس کو تیز دوڑا دیا اور اتنے قریب پہنچ گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کی آواز میرے کانوں میں آنے لگی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت کلام اللہ میں مشغول تھے۔ آپ کسی اور طرف دھیان قطعاً نہیں دے رہے تھے۔ البتہ ابو بکرؓ دائیں بائیں سب طرف دیکھتے ہوئے چل رہے تھے۔

جب میں اتنے قریب پہنچ گیا تو دفعۃً میری گھوڑی کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے اور میں نیچے گر گیا۔ میں اُٹھا۔ میں نے گھوڑے کو اٹھایا۔ اس کو ڈانٹا۔ اس کے پیر زمین سے بڑی مشکل سے نکلے۔ ساتھ ساتھ پیروں کی جگہ سے دھوئیں کی طرح غبار نکلا جو آسمان کی طرف چڑھ رہا تھا۔ اب میں نے پھر فال نکالی۔ اس مرتبہ بھی فال میری مرضی کے خلاف ہی نکلی۔ تو میں نے ہمت ہار دی۔ فال کی مخالفت نہیں کی اور میرے دل میں یہ بات جم گئی کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ضرور کامیاب ہوں گے۔ میں نے وہیں سے پکار کر کہا: "میں آپ صاحبان سے امن چاہتا ہوں"۔

یہ حضرات ٹھیرے۔ میں نے اُن کے قریب جا کر قریش کی تمام باتیں جو اب تک کر چکے تھے اور جو وہ آئندہ کرنے والے تھے اُن کو سنا دیں۔

میں نے آپ کی خدمت میں کچھ ناشتہ اور کچھ سامان پیش کرنا چاہا مگر میری پیش کش ان حضرات نے منظور نہیں فرمائی۔

میں نے یہ بھی عرض کیا کہ میرے اونٹ آپ کو راستہ میں ملیں گے اُن کے ساتھ چرواہے بھی ہیں۔ میں اپنا تیر دیے دیتا ہوں یہ اُن کو دکھا دیں اور جتنے دودھ کی ضرورت ہو آپ ان سے

لہ ابن ابی شیبہ بحوالہ فتح الباری ص ۱۹۲ ج ۷

لے لیں۔ مگر ان حضرات نے میری کوئی پیش کش منظور نہیں فرمائی۔ صرف ایک فرمائش کی کہ کسی کو ہماری خبر نہ کرنا۔ میں نے وعدہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی کہ میرے لئے امن کا پروانہ لکھ دیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عامر بن فہیرہ کو حکم فرمایا۔ انھوں نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر پروانۂ امن لکھ کر سراقہ کو دے دیا۔ پھر یہ حضرات مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے اور سراقہ مکہ کی طرف واپس ہوا۔

سراقہ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ راستہ میں جو ملتے رہے ان کو اطمینان دلا کر واپس کرتا رہا کہ میں دور تک دیکھ آیا ہوں، اس طرف کوئی نہیں ہے ——— اس طرح بقول حضرت انس رضی اللہ عنہ سراقہ بن مالک بن جعشم کی مختصر روئداد یہ ہے کہ صبح کے وقت حملہ آور، شام کے وقت محافظ۔[1]

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے ملاقات اور پیش کش اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا عجیب کرشمہ ہے کہ حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنا نطاق چاک کر کے اس میں ناشتہ دان اور مشکیزہ باندھا تھا، اُن کے شوہر حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خلعت پیش کیا۔ (جس کی تفصیل یہ ہے):

حضرت زبیر اور اُن کے ساتھ کچھ اور تاجر بسلسلۂ تجارت شام گئے تھے وہاں سے واپس ہو رہے تھے کہ راستہ میں ان مقدس مہاجرین سے ملاقات ہو گئی۔ حضرت زبیرؓ نے سفید کپڑے کا جوڑا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور ایک جوڑا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو پہنایا۔[2]

ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس قافلہ میں حضرت عمر حضرت طلحہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ واپسی کے وقت حضرت زبیر رضی اللہ عنہ آگے آ گئے تھے۔ جب مدینہ کے قریب پہنچے تو باقی حضرات سے ملاقات ہوئی وہاں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی ان دونوں حضرات کی خدمت میں جوڑے پیش کئے۔[3]

---

[1] بخاری شریف ص۵۵۴ [2] بخاری شریف ص۵۵۴ [3] فتح الباری ص۱۹۳ ج۷

یثرب میں ورود مسعود

وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ۝ (سورہ مومنون)

"کہو: اے میرے پروردگار! مجھے برکت کے ساتھ اُتار اور تو بہتر اُتارنے والا ہے۔"

یَا مَعْشَرَ العرب ھٰذا اجدُّکُمُ الذی تنتظرون

اَللّٰہُ اَکْبَرْ جَآءَ مُحَمَّد اَللّٰہُ اَکْبَرْ جَآءَ مُحَمَّد

صلی اللہ علیہ وسلم

تذکرہ سیدنا نوح علیہ السلام کے ضمن میں اس دعار کی تلقین مکہ معظمہ میں ہوئی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ آج آپ کے حق میں اس کی مقبولیت ظاہر ہو رہی ہے جبکہ معصوم بچیوں کے معصوم جذبات اس ترانہ سے آپ کا استقبال کر رہے ہیں:

طلع البدر علینا من ثنّیاتِ الوداع
وجب الشُّکرُ علینا ما دعا لِلّٰہِ داع

"ثنّیاتُ الوداع سے چودھویں رات کا چاند طلوع ہوا، ہم پر اللہ کا شکر واجب ہوگیا جب تک کوئی دعا کرنے والا دعا کرے (ہمیشہ ہمیشہ کے لئے)۔"

مدینہ میں روانگی کی خبر ڈاک کا سلسلہ اس وقت نہیں تھا، مگر آنے جانے والوں کے موتھ زبانی خبریں پہنچ جاتی تھیں۔ مشتاقانِ دیدار کو یہ معلوم ہو چکا تھا

لہ ثنیہ: گھاٹی اور وداع کے معنے ہیں رخصت کرنا۔ چونکہ لمبا سفر کرنے والوں کو رخصت کرنے کے لئے اہل یثرب یہاں تک آیا کرتے تھے اس لئے یہ نام پڑ گیا (معجم البلدان)۔

کہ ان کا محبوب آقا، مکہ معظمہ سے نکل چکا ہے۔ اب انتظار کے دن اور گھڑیاں گنی جارہی تھیں۔ طلوعِ آفتاب سے بہت پہلے، پو پھٹنے کے وقت لوگ اُٹھتے اور مدینہ سے باہر "حرہ"[1] پہنچ کر آفتابِ رسالت کے طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگتے۔ اسی انتظار میں دوپہر ہوجاتا۔ مسافروں کی آمد کا وقت ختم ہوجاتا تو مرجھائے دلوں کو بے تاب سینوں میں دبائے ہوئے واپس ہوجاتے۔ ایک روز اسی پژمردگی اور افسردگی کے ساتھ واپس ہوئے تھے کہ ایک آواز نے عورتوں اور بچوں تک کو وارفتۂ مسرّت بنادیا:

یا معاشر العرب هذا جدکم الذی تنتظرون[2]

ایک یہودی اپنی کسی ضرورت سے ایک پُرانے قلعہ کی اونچی اٹاری پر چڑھا تھا اس کی نظر چند سفید پوش سواروں پر پڑی جو اس طرف چلے آرہے تھے۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ انتظار کرنے والوں کی مراد پوری ہوگئی۔ یہ خود بے تاب نہیں تھا مگر انتظار کرنے والوں کی بیتابی کا اُس پر یہ اثر تھا کہ خود قابو میں نہ رہا اور زور سے چیخ اُٹھا:

"اہلِ عرب! یہ ٹھیک تمہارے وہی مہمان آگئے جن کا تمہیں انتظار ہے۔"

اہلِ قبا کی خوش نصیبی تھی کہ یہ آواز ان کے کانوں میں پڑی اب کوئی کیا بتائے جاں بازوں، جاں نثاروں اور فداکاروں کا کیا حال تھا۔ وہ کس بے تابی سے دوڑے اور حرہ پہونچ کر کس طرح رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زیرِ پا اپنی آنکھیں بچھائیں، نظر اشتیاق کو فرش راہ بنایا۔[3] قبیلہ بنی عمرو بن عوف (جو اُوس کا بطن[4] تھا) یہاں آباد تھا، یہ خوش نصیب اسی[5] قبیلہ کے لوگ تھے جنھوں نے یہودی کی آواز سُنی اور دوڑے۔

عرب کا دستور تھا کہ معزز مہمانوں کا استقبال ہتھیاروں سے آراستہ ہوکر کیا کرتے تھے۔

---

[1] بخاری شریف ص۵۵۵ [2] اے اہلِ عرب یہ آگئے تمہارے آقا جن کا تم انتظار کر رہے تھے۔

[3] فتح الباری ص۱۹۴ ج۷ [4] طبقات ابن سعد ص۱۵۵ ج۱

اس بے تابی میں انھوں نے اپنی اس آن کو نہیں چھوڑا۔ پہلے ہتھیاروں کی طرف لپکے، پھر استقبال کو دوڑے[1]

حرّہ سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دہنی طرف[2] رُخ کیا اور پھر پورے مجمع کے ساتھ قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں رونق افروز ہوگئے۔ لوگ آنے شروع ہوئے وہ اپنے قاعدہ سے سلام کرتے تھے اور بیٹھ جاتے تھے۔ سیّد الکونین صلی اللہ علیہ وسلم خاموش تشریف فرما تھے۔ رفیق سفر (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) کھڑے تھے اور آنے والوں کا استقبال کر رہے تھے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے نہیں دیکھا تھا وہ صدیق اکبرؓ ہی کو سلام کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر دھوپ آگئی تو صدیق اکبرؓ نے سر مبارک پر اپنی چادر سے سایہ کرلیا تب لوگ پہچان سکے کہ خادم کون ہے اور مخدوم کون[3] ؟

آرام گاہ اور نشست گاہ کلثوم بن ھدم قبیلہ کے بڑے آدمی تھے۔ یہ شرف اُن کو حاصل ہوا کہ آپ نے قیام[4] اُن کے یہاں فرمایا۔

دوسرے صاحب سعد بن خیثمہؓ تھے۔ ان کا مکان خالی تھا۔ ان کے متعلقین نہیں تھے۔ مکہ سے جو صحابہ (رضی اللہ عنہم) اس طرح کے آتے تھے وہ بھی انہیں کے یہاں ٹھہرتے اس لئے

---

[1] ثار المسلمون الی السلاح۔ بخاری شریف ص۵۵۲ [2] بخاری شریف ص۵۵۵ [3] ایضاً ص۵۵۵

[4] اکثر صحابہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مدینہ آچکے وہ بھی انہیں کے یہاں اُترے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ، حضرت مقداد بن اسودؓ، حضرت خبابؓ، حضرت سہیلؓ، حضرت صفوانؓ، حضرت عیاضؓ، حضرت عبداللہ بن مخرمہؓ، حضرت وہب بن سعدؓ، حضرت معمر بن ابی سرحؓ، حضرت عمیر بن عوف اب تک انہیں کے یہاں تھے (ابن سعد تذکرہ کلثوم بن ھدم) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے چند ماہ بعد ان کی وفات ہوگئی (رضی اللہ عنہ) محمد بن الحسن بن زبالہ نے اخبار المدینہ میں وثوق سے بیان کیا ہے کہ کلثوم بن ھدم اس وقت تک مشرک ہی تھے مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ فتح الباری ج۷ ص۱۹۵ وفاء الوفاء ص۱۴۷ اگر یہ صحیح ہے تو اس سے اہل مدینہ کی معاشرت کا پتہ چلتا ہے کہ مذہبوں کے فرق کے باوجود آپس میں تعاون مکمل تھا۔

اس مکان کو بیت العزاب[1] کہا جانے لگا۔ یہ مکان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست کے لئے طے کیا گیا[2]۔ تلقین و تذکیر بھی یہیں فرمایا کرتے تھے۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سنح میں قیام فرمایا[3]۔ یہ پیر کا دن تھا[4] جس روز آفتاب رسالت مدینہ کے خط استوار پر پہنچا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امانتیں پہنچانے کے لئے مکۃ معظمہ چھوڑا تھا تین دن بعد وہ بھی تشریف لے آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قیام کیا[5]۔

---

[1] عزاب: عازب کی جمع ہے۔ اُس شخص کو کہتے ہیں جس کے بیوی نہ ہو۔

[2] ابن سعد ص۱۵۸ ج۱ و ابن ہشام ص۲۹۶ ج۱

[3] خبیب بن یساف خزرجی یا خارجہ بن زید خزرجی کے یہاں (ابن ہشام ص۲۹۶ ج۱)

[4] تاریخوں میں بہت اختلاف ہے۔ اگر مکہ معظمہ سے روانگی یکم ربیع الاول کو پیر کے دن ہوئی تھی جیسا کہ راقم حروف نے لکھا ہے، تو اس پیر کو ربیع الاول کی پندرہ ہوگی۔ خبر المدینہ بن زبیر نے ابن شہاب (زہری) سے یہی روایت نقل کی ہے کہ نصف ربیع الاول (۱۵ ربیع الاول) کو تشریف آوری ہوئی (فتح الباری ص۱۹۲ ج۷)

[5] ابن ہشام ص۲۹۶ ج۱

حق پرستوں کا اعترافِ حق

سرزمین یثرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا خطاب

حصین بن سلام ایک یہودی عالم تھے۔ مطالعہ نہایت وسیع، طبیعت انصاف پسند، اور اپنی قوم کے معزز سردار تھے۔ جو بشارتیں یہود کی کتابوں میں پڑھی تھیں ان کی بنا پر آنے والے نبی کے منتظر تھے۔ یہ اپنے باغ میں کام کر رہے تھے کہ خبر سنی:[1] "اللہ کے نبی تشریف لے آئے۔"

---

[1] بخاری شریف کی روایت ص۵۵۶ کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ قبا میں نہیں بلکہ مدینہ میں حاضر خدمت ہوئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوایوب انصاری کے یہاں قیام فرمالیا۔ مگر بخاری رحمۃ اللہ کے استاد ابن اسحاق رحمۃ اللہ نے تصریح کی ہے کہ آپ قبا میں قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں تھے اس وقت عبداللہ بن سلام حاضر ہوئے۔ سیرۃ ابن ہشام ص۱/۲۱۔ اس لئے ہم نے اس واقعہ کو اس موقع پر ذکر کردیا۔ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچنے پر دوسرا واقعہ ہوا۔ بخاری کے راوی صاحبان نے ان دونوں کو ایک ساتھ ذکر کیا تو اشتباہ ہوگیا کہ یہ واقعہ بھی حضرت ابوایوبؓ کے یہاں قیام کے دوران ہوا۔ مگر حقیقت یہ نہیں ہے۔ ابن اسحاق کی روایت جو صرف ایک واسطہ سے ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ مسلمان ہوگئے تو انھوں نے چاہا کہ یہود کی افترا پردازی اور غلط بیانی کا تجربہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کرادیں۔ چنانچہ ابھی عبداللہ بن سلام کے اسلام لانے کی شہرت نہیں ہوئی تھی کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے اصرار پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کے نمائندگان کو بلا کر دریافت کیا کہ حصین بن سلام کیسے آدمی ہیں انھوں نے بہت تعریف کی اور کہا کہ سید بن سید اعلم بن اعلم اور ہم میں سب سے بہتر ہیں۔ لیکن جیسے ہی ان یہودی علماء کو معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہوچکے تو فوراً پلٹ گئے اور اسی مجلس میں کہہ دیا کہ یہ بھی جھوٹے ان کے باپ بھی جھوٹے۔ یہ بھی بدترین انسان ہیں اور ان کے باپ بھی بدترین انسان تھے۔ (ابن ہشام و بخاری شریف وغیرہ)

فوراً کام چھوڑ کر نبی کی زیارت کے لئے دوڑے۔ جیسے ہی چہرۂ مبارک پر نظر پڑی دل نے شہادت دی۔

انہ لیس بوجہ کذاب "جھوٹے آدمی کا چہرہ تو نہیں ہے۔"

آپ فرماتے ہیں:

کان اول شئی تکلم بہ ان قال یا ایہا الناس افشوا السلام

واطعموا الطعام وصلوا والناس نیام تدخلوا الجنۃ

بسلام۔ (ترمذی شریف ص ج ۲)

"سب سے پہلے جو بات آپ نے فرمائی وہ یہ تھی کہ اے لوگو سلام کا رواج عام کرو (پھیلاؤ) کھانا کھلاؤ اور اس وقت نماز پڑھو جب لوگ سو رہے ہوں۔ اطمینان سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔"

یہی حصین بن سلام ہیں جن کا اسلامی نام عبداللہ بن سلام ہے۔ رضی اللہ عنہ۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت یوسف علیہ السلام تک پہنچتا ہے [۱]

قبا سے مدینہ منورہ

جمعہ [۲] کے روز صبح سویرے مدینہ کے حضرات آراستہ ہوئے، تلواریں سجائیں۔ اور

---

[۱] الاصابہ [۲] مدت قیام میں اختلاف ہے۔ چار روز، چودہ روز، اٹھارہ روز اور ۲۴ روز تک کی روایتیں ہیں۔ لیکن اس پر اتفاق ہے کہ قبا سے روانگی جمعہ کے روز ہوئی اور تشریف آوری پیر کے روز ہوئی تھی اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ قبا اور مدینہ دونوں جگہ نزول اجلال ربیع الاول کے مہینہ میں ہوا تو بظاہر تاریخوں کا تعین اس طرح ہوتا ہے کہ دولت کدہ سے روانگی یکم ربیع الاول دوشنبہ کے روز؛ غار ثور سے روانگی ۴ ربیع الاول پنجشنبہ؛ قبا میں تشریف آوری ۸ ربیع الاول پیر کے روز؛ مدینہ منورہ میں تشریف آوری ۲۶ ربیع الاول یوم جمعہ۔ واللہ اعلم بالصواب۔

آقائے دوجہان کو اپنے یہاں لانے کے لئے قبا پہنچ گئے۔

کچھ دن چڑھا تو تاجدار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ناقہ قصواء[1] پر سوار ہوئے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ساتھ[2] بٹھایا (ردیف بنایا) تقریباً پانچسو مسلح[3] انصار کی دو صفیں دائیں بائیں ہو گئیں۔

راستہ پر زیارت کرنے والے مردوں کا اور کوٹھوں اور چھتوں پر خانہ نشین خواتین کا ہجوم تھا۔ جو مسلمان نہیں ہوئے تھے وہ بھی دیدار کے لئے بیتاب تھے۔ لڑکے اور بچے جوشِ مسرت میں نعرہ لگا رہے تھے:

اللہ اکبر جاء محمد۔ اللہ اکبر جاء محمد[4]

یثرب اور اہل یثرب کے لئے اس سے زیادہ مسرت کا دن کونسا ہو سکتا تھا؟ آج آسمان نبوت کا آفتاب زمین یثرب پر اتر رہا ہے۔ آج وہ نبی رونق افروز ہو رہا ہے جس کی بشارتیں کتب سابقہ کے صفحات میں اور اہلِ کتاب کی زبانوں پر عرصہ سے تھیں۔ آج ہر طرف یہی صدا ہے، یہی چرچا ہے۔ جاء نبی اللہ۔ جاء نبی اللہ[5] اللہ کے نبی آ گئے۔ اللہ کے نبی آ گئے۔

قبیلہ بنی سالم تک پہنچے تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ آپ نے جمعہ کی نماز یہیں ادا فرمائی[6]

نماز جمعہ کے بعد آپ سوار ہونے لگے تو قبیلہ والوں نے مہار تھام لی اور اصرار کیا کہ آپ یہیں قیام فرمائیں۔ اس کے بعد حضرات انصار (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کا جو قبیلہ بھی آتا رہا[7] یہی اصرار

---

[1] یہ وہی ناقہ ہے جس پر آپ نے سفر ہجرت طے فرمایا تھا۔ (ابن سعد) [2] بخاری شریف ص۵۵۵ و ص۵۵۶

[3] فتح الباری ص۱۹۶ ج۷ بحوالہ تاریخ صغیر للبخاری و البدایۃ والنہایہ ص۱۹۴ ج۳ بحوالہ مسند احمد [4] البدایہ والنہایہ ص۱۹۴ ج۳ [5] بخاری شریف ص۵۵۶ [6] ابن سعد (ص۱۶ ج۱) نے نمازیوں کی تعداد سو لکھی ہے لیکن تاریخ بخاری اور مسند احمد کی روایتوں کے بموجب اگر استقبال کے لئے جانے والوں کی تعداد پانچسو تھی تو ظاہر ہے نماز جمعہ میں یہ سب ہی شریک ہوئے ہوں گے واللہ اعلم بالصواب۔ [7] وفاء الوفاء میں ان قبائل کی تفصیل ہے اور جو گفتگو ہوتی رہی وہ بھی نقل کی گئی ہے (ص۱۸۴ و ص۱۸۵ ج۱)۔

کرتا رہا کہ غریب خانہ کو دولت خانہ بنائیے، مکان حاضر ہے۔ مال حاضر ہے، جان حاضر ہے لیکن وہ رؤف رحیم جس کا دامنِ شفقت ہر ایک کے لئے پھیلا ہوا تھا، جس کو کسی کی دل شکنی گوارا نہیں تھی جس طرح اس کا پورا سفر[1] غیبی اشاروں پر ہوا تھا اس کے ارحم الراحمین رب نے یہاں بھی ایسی صورت کردی کہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ آپ نے خود ہی ناقہ کی مہار چھوڑ دی اور اصرار کرنے والوں سے بھی یہی فرمایا کہ وہ مہار چھوڑ دیں۔ یہ ناقہ مامور[2] ہے جہاں بیٹھ جائے گی وہیں قیام ہوگا۔

---

[1] پہلے گذر چکا ہے کہ صحابہ کرامؓ ہجرت کر رہے تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم کے منتظر تھے اور جب من جانب اللہ اجازت ہوگئی تو آپ فوراً دوپہر ہی میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے اور فرمایا کہ مجھے اجازت ہوگئی ہے فوراً ہی روانگی کا پروگرام بنالیا اور پھر یہ سفر ہی نہیں بلکہ دار ہجرت کا تعین بھی الہام ربانی سے ہوا تھا، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔

[2] ابن سعد ص۱۶؍ج۱ و فتح الباری ص۱۹۶؍ج۷ علامہ شبلی کو یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی۔ آپ نے یہ واقعہ حذف کردیا۔ میزبانی کے سلسلہ میں جو بحث ہوئی تھی صرف اس کا ذکر فرمایا کہ قرعہ ڈالا گیا اور آخر یہ دولت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی۔ اور حاشیہ میں ناقہ کے واقعہ کی تردید کرتے ہوئے مسلم شریف کی ایک حدیث سے استدلال کیا جس میں راوی نے بہت اختصار سے کام لیا ہے اور لطف یہ ہے کہ قرعہ اندازی کا تذکرہ اس روایت میں بھی نہیں ہے مزید براں اس روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات کو مدینہ پہونچے فقدمنا المدینہ لیلاً۔ علامہ نے اس کو نظر انداز فرمادیا۔ علامہ نے مسلم شریف کے باب الہجرۃ کا حوالہ دیا ہے حالانکہ مسلم شریف میں باب الہجرۃ کوئی نہیں اس کا عنوان حدیث الہجرۃ ہے اور علماء محدثین کی اصطلاح میں اس کو حدیث الرحال بھی کہا جاتا ہے۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے جلد ثانی کے آخر میں اس کو نقل کیا ہے ص۴۱۹؍ج۲ اور واقعہ یہ ہے کہ بسلسلہ قیام چند مرحلے پیش آئے تھے۔ مثلاً سب سے پہلے قبیلہ کا انتخاب۔ پھر قبیلہ میں وہ جگہ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مستقل قیام فرمائیں، جہاں مکان بنایا جائے یا مسجد بنائی جائے پھر مکان بننے تک عارضی قیام، عارضی قیام کے بعد کھانے وغیرہ کا انتظام، اصطبل کا (باقی صفحہ آئندہ پر)

ناقہ چلتی رہی، یہاں تک کہ قبیلہ بنی نجار آگیا۔ اس قبیلہ میں جب ناقہ اس جگہ پہونچی جہاں مسلمان نماز پڑھا کرتے تھے تو ناقہ بیٹھ گئی۔ آپ نے فرمایا ھذا انشاء اللہ منزل[1] "یہیں انشاء اللہ قیام ہوگا (مکان بنے گا)"۔

ابھی آپ اُترے نہیں تھے کہ ناقہ کھڑی ہو گئی۔ کچھ چلی، پھر آکر اسی جگہ بیٹھ گئی۔ اور اپنی گردن زمین پر پھیلادی[2]۔

بنی نجار کو یہ سعادت میسر آئی تو بچہ بچہ کے دل کی کلی کھل گئی۔ لڑکیوں نے فوراً ایک شعر موزوں کرلیا:

نحن جوار من بنی نجار یا حبذا محمد من جار

"ہم بنی نجار کی لڑکیاں ہیں (یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے پڑوسی بنے۔ محمد کیسے اچھے پڑوسی ہیں۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ محمد ہمارے پڑوسی ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم)"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازراہِ شفقت فرمایا: "تمہیں مجھ سے محبت ہے"۔

سب نے یک زبان ہوکر کہا: ای واللہ یا رسول اللہ۔ ("ہاں خدا کی قسم یا رسول اللہ")۔

ارشاد ہوا[3]: انا واللہ احبکم۔ انا واللہ احبکم۔ انا واللہ احبکم۔

"خدا کی قسم مجھے بھی تم سے محبت ہے، خدا کی قسم مجھے بھی تم سے محبت ہے، خدا کی قسم مجھے بھی تم سے محبت ہے"۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) انتخاب جہاں سواری رکھی جائے۔ ان تمام مرحلوں پر بحث ہوئی اور ہر ایک جاں نثار نے سعادت حاصل کرنی چاہی۔ بحث کے بعد معاملہ طے ہوا، کبھی قرعہ سے کبھی الہام ربانی کبھی کسی اور صورت سے۔ آئندہ سطور میں یہ تمام مراحل ترتیب وار بیان کئے گئے ہیں۔ وللہ الحمد۔

[1] بخاری شریف ص۵۵۵ [2] ابن ہشام ص۲۹۵ ج۱ [3] البدایہ والنہایہ ص۲۰۰ ج۳ بحوالہ بیہقی

اب قیام کا مسئلہ پیش ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمارے رشتہ داروں[1] میں کس کا مکان قریب ہے۔ یہ خوش نصیبی حضرت خالد بن زید[2] ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو میسر تھی۔ آپ فوراً بول اٹھے: انا یانبی اللہ ھذہ داری وھذا بابی۔ "میں حاضر ہوں یا رسول اللہ! یہ میرا مکان ہے۔ یہ میرا دروازہ ہے۔"

عجیب بات یہ ہے کہ حضرات انصار نے آپس میں قرعہ ڈالا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام کس کے یہاں ہوگا اس میں بھی حضرت ابو ایوب ہی کا اسم گرامی برآمد[3] ہوا تھا۔

---

[1] بخاری شریف ص۵۵۵ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے ننھیال رشتہ دار اسی قبیلہ کے تھے تو آپ نے یہ فرمایا: ای بیوت اھلنا اقرب۔ "ہمارے رشتہ داروں میں سے کس کا مکان قریب ہے۔ اس وقت آقائے دو جہان کی زبان مبارک سے قرابت و رشتہ داری کا اظہار ان رشتہ داروں کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ جیسا کہ مسلم کی روایت میں ہے آپ نے اس کا اظہار بھی فرمایا۔ مگر یہ بھی صحیح نہیں کہ ناقہ کا واقعہ پیش نہیں آیا۔ اور آپ نے رشتہ داری کی بنا پر بنو نجار کو منتخب فرمایا۔ ورنہ پھر قرعہ اندازی کی بھی ضرورت نہیں تھی جس کو علامہ شبلی نے بہت اہمیت دی ہے۔ [2] اصل نام خالد، پسر زید، کنیت ابو ایوب۔ یہ اپنی اس کنیت ہی سے مشہور ہیں۔ [3] اصابہ ص۹ ج۲ بحوالہ احمد۔ علامہ شبلی نے اسی روایت کو لے کر ناقہ وغیرہ کے تمام واقعات کو حذف کر دیا جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ حالانکہ اس روایت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل حضرات انصار نے از خود کیا تھا اور بہت ممکن ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں رونق افروز ہونے سے پہلے کیا ہو، کیونکہ روایت میں مدینہ میں تشریف آوری کا ذکر ہے۔ قبیلہ بنو نجار میں رونق افروز ہونے کا ذکر نہیں ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں روی احمد من طریق جبیر بن نفیر عن ابی ایوب قال لما قدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینۃ اقترعت الانصار ایھم یؤویہ فقرعھم ابو ایوب۔ یعنی "حضرات انصار نے خود قرعہ اندازی کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کون مکان دیگا (کس کے یہاں قیام ہوگا) تو سب کے مقابلہ میں ابو ایوبؓ کا نام قرعہ میں برآمد ہوا" حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ بھی موافقات صحابہ کی ایک مثال ہے یعنی صحابہ کرامؓ نے بھی وہی فیصلہ کیا جو پہلے مشیت خداوندی طے کر چکی تھی۔ بعد کے الہام یا وحی نے اس کی توثیق کر دی۔ واللہ اعلم

قیام کا مسئلہ طے ہو گیا تو ارشاد ہوا:

فانطلق فهيئ لنا مقيلا [۱] "تشریف لے جایئے ہمارے قیلولہ کا انتظام کر دیجئے"۔

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے اندر جا کر آرام فرمانے کا انتظام کیا۔ پھر اُن کو لے گئے اور آرام کرایا۔[۲]

حضرت زید[۳] بن ثابت رضی اللہ عنہ ہمیشہ خوش ہوا کرتے تھے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو ایوبؓ کے یہاں جیسے ہی تشریف لے گئے سب سے پہلا ہدیہ میری والدہ کا تھا جو آپ نے خود بھی تناول فرمایا اور حاضرین کو بھی اس میں شریک کیا۔ میری والدہ نے روٹیوں پر گھی لگا کر دودھ میں چورا اور ایک بڑے بادیہ میں بھر کر میرے ہاتھ بھیجا۔ یہ میری سعادت تھی کہ سب سے پہلا ہدیہ یہی پیش ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ میری والدہ نے یہ ہدیہ بھیجا ہے تو آپ نے دعا فرمائی: بارك الله فيك ("اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے") پھر حاضرین کو بلا کر سب کے ساتھ یہ ہدیہ تناول فرمایا اور ابھی میں دروازہ سے نکلا نہیں تھا کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے یہاں سے ثرید آ گیا۔ آپ نے اسے بھی منظور فرمایا۔ پھر اگرچہ آپ مہمان ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے تھے مگر روزانہ تین چار انصار کے یہاں سے برابر کھانے کا ہدیہ آتا رہتا تھا۔[۴] دسترخوان مبارک پر چار پانچ کھانے والے ضرور ہوتے تھے۔ کبھی پندرہ سولہ بھی ہو جاتے تھے۔[۵]

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ خود بھی کھانا پکواتے، دسترخوان پر اگرچہ شریکِ طعام نہیں ہوتے تھے مگر جو کھانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے آتا تھا اس کو کھاتے اور خاص

---

[۱] بخاری شریف ص۵۵۶ [۲] فتح الباری ص۲۰۱ [۳] یہ وہی زید بن ثابت ہیں جو آگے چل کر کاتب وحی اور جامع قرآن اور بہت بڑے فقیہ اور ماہر زائض ہوئے۔ ایسے ذہین کہ سریانی زبان اور سریانی خط پندرہ روز میں سیکھ لیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ والدہ محترمہ کا اسم گرامی نوار بنت مالک۔ یہ بھی بخاریہ تھیں۔ (الاصابہ والاستیعاب) [۴] ابن سعد ص۱۶۹ ج۱ خصوصاً حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہما کے یہاں سے تو روزانہ طشت بھر کر کھانا آتا تھا۔ وفا الوفا ص۱۹۵ ج۱ [۵] ایضاً

اس جگہ سے کھاتے جہاں آقا دو جہاں کی انگلیوں کے نشان معلوم ہوتے تھے[۱]

کسی نے حضرت ابوایوبؓ کے یہاں سے تحقیق کرنی چاہی کہ آپ کے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام ہے، آپ مزاج سے واقف ہوگئے ہوں گے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کون سا کھانا پسند ہے کون سا ناپسند۔ جواب ملا: خود سے آپؐ نے کبھی کسی کھانے کی فرمائش نہیں کی اور جو کھانا پیش کیا گیا کبھی اس کی برائی نہیں کی[۲]

ایک روز حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ نے خاص طور سے ایک کھانا پکوایا اور اس میں لہسن بھی ڈالا۔ وہ کھانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا۔ مگر اس کو آپ نے تناول نہیں فرمایا[۳] جوں کا توں کھانا واپس آگیا تو حضرت ابوایوبؓ گھبرا گئے، فوراً خدمت مبارک میں حاضر ہوئے، وجہ دریافت کی۔ فرمایا: اس میں لہسن تھا۔ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ کیا لہسن کھانا حرام ہے۔ ارشاد ہوا: حرام تو نہیں ہے مگر مجھے اس کی بو سے کراہیت ہے۔ عرض کیا: جس سے حضور والا کو کراہیت ہے مجھے بھی اس سے کراہیت ہوگی[۴]

---

[۱] علامہ نوویؒ نے اس حدیث سے چند مسئلے اخذ کئے ہیں: (۱) ہر موقع اور ہر جگہ پر برتن کا صاف کرنا مستحب نہیں ہے بلکہ اگر بچے ہوئے کو کھانے پینے والے ہیں تو برتن میں کچھ چھوڑ دینا مستحب ہے (۲) خصوصاً جب معلوم ہو کہ لوگ اس کو تبرک سمجھ کر کھائیں گے (۳) یا کھانا کم ہو اور دوسرے کھانے والے موجود ہوں (۴) یا جیسا کہ بعض جگہ ہوتا ہے کہ پورا کھانا مہمان کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور اہل خانہ بعد میں بچا ہوا کھانا کھاتے ہیں۔ بظاہر حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کا یہی طریقہ تھا۔ (نووی علی مسلم صہ ۱۸۳ ج ۲)

[۲] وفاء الوفاء صہ ۱۹۰ ج ۱ ایک مرتبہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے یہاں سے طفیشل آیا (خاص قسم کا شوربا ہوتا تھا) آپؐ نے بڑے ذوق سے اس کو تناول فرمایا اور کچھ نوش جان بھی فرمایا۔ پھر ہم بھی اپنے یہاں اس طرح شوربا تیار کیا کرتے تھے۔ وفاء الوفاء صہ ۱۹۰ ج ۱ [۳] یہی آپ کا طریقہ تھا جو کھانا ناپسند ہوتا تھا چھوڑ دیتے تھے، مگر عیب نہیں نکالتے تھے۔ (شمائل ترمذی وغیرہ) [۴] مسلم شریف صہ ۱۸۳ ج ۲

بالائی منزل میں قیام حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کے مکان کی دو منزلیں تھیں۔ آپ نے نیچے کی منزل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خالی کردی۔ خود اوپر چلے گئے۔ ایک روز اتفاق سے اوپر کی منزل میں پانی کا برتن (گھڑا یا مٹکا) ٹوٹ گیا۔ ابوایوب رضی اللہ عنہ کو خدشہ ہوا کہ پانی نیچے ٹپکے گا اور تاجدار دوجہان (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تکلیف ہوگی۔ گھر میں ایک لحاف تھا فوراً اسی کو پانی پر ڈال دیا کہ پانی جذب ہوجائے، نیچے نہ ٹپکے[1]

ایک روز خیال آیا کہ سردار دوجہان (صلی اللہ علیہ وسلم) نیچے ہیں اور ہم اوپر کیسی بے ادبی ہے؟ فوراً ایک کنارے سمٹ گئے اور اسی طرح رات گذاردی۔ صبح کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اوپر قیام فرمائیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آنے جانے والوں کو اسی میں آسانی ہے۔ حضرت ابوایوبؓ نے دست بستہ عرض کیا:

لا اعلو سقيفةً انت تحتها[2]

"میں تو اس چھت پر چڑھ نہیں سکتا جس کے نیچے حضور والا ہوں"

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے درخواست منظور فرمائی اور اوپر منتقل ہوگئے۔ سات ماہ اسی مکان میں قیام رہا، جب مسجد اور حجرے تیار ہوگئے تب آپؐ وہاں تشریف لے گئے۔ (تفصیل آگے آتی ہے۔ انشاء اللہ)

قصواء کا قیام اور حضرت اسعدؓ کا والہانہ جذبہ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ جو بیعت عقبہ اولیٰ میں شریک تھے اور تبلیغی و تعلیمی کوششوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادہ معلم (حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ) کے شریک رہے تھے ان کا مکان بہت وسیع تھا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا قیام انھیں کے یہاں رہا تھا۔ ان کے علاوہ اور حضرات بھی جو تشریف لاتے تھے ان کے یہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔

---

[1] وفاء الوفاء ص۱۸۸ سیرۃ ابن ہشام [2] مسلم شریف ص ۱۸۳/۲

جب انھوں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے یہاں طے ہوگیا ہے تو ناقہ کی مہار پکڑی اور اپنے یہاں لے گئے[1] کہ یہ بھی ایک شرف اور جذبۂ شوق کو تسکین دینے والی ایک سعادت تھی۔

متعلقین کی آمد

مدینہ میں آکر آپ نے حضرت زید بن حارثہ اور حضرت ابو رافع[2] (رضی اللہ عنہما) کو دو اونٹ اور پانچسو درہم دیکر مکہ بھیجا کہ متعلقین کو لے آئیں۔ صاحبزادیوں میں حضرت رقیہ حضرت عثمان کے ساتھ حبش میں تھیں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو اُن کے شوہر ابوالعاص بن ربیع نے آنے نہیں دیا۔ بس حضرت زیدؓ کے ساتھ ام المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا اور دو صاحبزادیاں ام کلثوم اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا آئیں انکے علاوہ حضرت زید اپنی اہلیہ ام ایمن اور اپنے فرزند اُسامہؓ کو بھی ساتھ لے آئے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ[3] کو بھی حضرت زیدؓ کے ساتھ

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۶ ج ۱ [2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے قبطی تھے۔

[3] حضرت عبداللہ بن ابی بکر حضرت عائشہؓ کے سوتیلے اور حضرت اسماءؓ کے حقیقی (ماں شریک) بھائی تھے۔ غزوہ فتح مکہ اور غزوہ حنین میں شریک رہے جب غزوۂ حنین کے بعد طائف پر حملہ کیا گیا تو انکے ایک تیر لگا اسکا زخم اوپر سے مندمل ہوگیا مگر اندر اندر پھوڑا بن گیا۔ تقریباً دو سال تک یہ پھوڑا رہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تقریباً سات ماہ بعد شوال ۱۱ھ ہجری میں حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں پھوڑے کے پھٹنے سے ان کی وفات ہوگئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کفن کے لئے ایک حُلّہ لایا گیا تھا یعنی یمن کی بنی ہوئی دھاریدار چادروں کا جوڑا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کفن سفید سوتی کپڑے کا بنایا گیا۔ یہ حُلّہ کام میں نہیں آیا تو حضرت عبداللہ نے اپنے کفن کے لئے نو دینار میں خرید لیا تھا لیکن وفات کے وقت وصیت کردی کہ اس کا کفن نہ بنایا جائے کیونکہ اگر اس کپڑے کا کفن اچھا ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کفن اسی کا ہوتا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس کو منتخب نہیں کیا گیا تو میں بھی اس کو اپنے لئے پسند نہیں کرتا۔ یہ تھا نازک احساس عاشقانِ اتباعِ سنت کا۔ رضی اللہ عنہ۔ (الاستیعاب)

بھیجا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلقین کو وہ اپنے ساتھ لائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ان کے ساتھ آئیں۔ ان سب کو حارثہ[1] بن نعمان کے مکان میں ٹھہرایا گیا۔[2]

[1] حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی تھے۔ کسی سائل کو دروازہ سے محروم نہیں جانے دیتے تھے اور جو کچھ دیتے وہ خود اپنے ہاتھ سے دیتے تھے۔ آخر عمر میں بصارت جاتی رہی تھی تو جہاں ان کی نشست رہتی تھی وہاں سے دروازہ تک ایک رسّی باندھ لی تھی۔ دروازہ میں کھجوروں کا ٹوکرا رکھا رہتا تھا۔ جب سائل آتا تو یہ رسّی پکڑ کر دروازہ تک جاتے اور خود اپنے ہاتھ سے فقیر کو دیتے تھے۔ بچوں نے عرض کیا کہ یہ خدمت ہم انجام دے سکتے ہیں۔ فرمایا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مناولۃ المسکین تقی میتۃ السوء (یعنی مسکین کو خود اپنے ہاتھ سے دینا بُری موت سے محفوظ رکھتا ہے)۔ ایک مرتبہ حضرت جبرئیلؑ امین انسانی شکل میں نزول فرما ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی پیغام پہنچایا۔ حاضرین کو نہ پیغام کی خبر ہوئی نہ حضرت جبرئیلؑ کی تشریف آوری کی۔ مگر حضرت حارثہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: یہ صاحب کون تھے جو آپ سے گفتگو فرمارہے تھے۔ یہ حضرت حارثہؓ کی مخصوص فضیلت تھی کہ آپ نے حضرت جبرئیلؑ کو دیکھ لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تعجب بھی ہوا اور ایک امتی کی اس فضیلت پر مسرت بھی ظاہر فرمائی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں وفات ہوئی۔ رضی اللہ عنہ۔ الاستیعاب [2] طبقات ابن سعد ص۱۶۱ ج ۱

نیا دَور - غیر محدود میدانِ عمل

قُلْ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا الَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (سورۂ ۷ الاعراف آیت ۱۵۷)

"(اے پیغمبر تم لوگوں سے کہو) اے افراد نسل انسانی (اے بنی نوع انسان)! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں وہ خدا کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اُسی کے لئے ہے۔"

(۱)

وہ آفتاب جو مشرق مکہ سے طلوع ہوا تھا، جس کی کرنیں اب تک فاران کی چوٹیوں سے ٹکرا رہی تھیں، مدینہ کے خطِ استوا پر پہونچا تو وہ آفتاب نیم روز تھا۔ ویسے بھی دعوت و تبلیغ کے دس[۱] سال پورے ہو چکے تھے اور آنے والے سال بھی دس ہی تھے۔

(۲)

اس کا دائرۂ عمل نوعِ انسان کے کسی خاص گروہ[۲] یا طبقہ تک تو کبھی محدود نہیں ہوا۔ البتہ ظاہری وسائل و ذرائع کی بنیاد پر اس کا مخاطب اب تک اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَھَا[۳] تھا۔

---

[۱] نبوت کے ابتدائی تین سال میں دعوت اور تبلیغ کا حکم عام نہیں تھا (تفصیل پہلے گذر چکی ہے)۔

[۲] جیسا کہ بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام کا دائرۂ عمل گروہ بنی اسرائیل تھا چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل ہی کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ سورۂ ۱۰۹ صف آیت ۵ و ۶

[۳] سورہ ۶ الانعام آیت ۹۲ سورہ ۴۲ الشوریٰ آیت ۷ ام القریٰ مکہ۔ مَن حولھا جو اس کے اطراف میں ہیں۔

تھا اور اب اس کا موقف وہ ہے جو [51] وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا [52] کا مطلع اور منظر ہے۔

(۳)

سکندر اعظم جیسے فاتح عالم کی تاریخ کا پہلا باب یہ ہوگا کہ اس نے ایسی زبردست فوجی طاقت کس طرح فراہم کی جو فاتح عالم بن سکی۔ اس کی فوج کی خصوصیات کیا تھیں اور وہ خود کس درجہ کا صاحبِ شجاعت اور صاحب حوصلہ تھا۔ لیکن وہ فردِ کامل جو پوری بنی نوع انسان کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا تھا اس کی تاریخ و سیرت کا پہلا باب یہ ہونا چاہیئے کہ وہ کیا اصول تھے، کیا طریقہ کار تھا اور کون سے اخلاق تھے جو وَمَآ [53] اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝ کی غرض و غایت کو پورا کر سکے۔ (آنے والے صفحات میں انہیں سوالات کے جوابات ہیں۔)

وما توفیقی اِلّا باللہ

---

[51] یعنی آپ کے مبعوث کرنے کا مقصد یہ ہے کہ پوری نوع انسان کو (وہ عرب ہوں یا عجم، کالے ہوں یا گورے) ان برکتوں کی بشارت سنادو جو ایمان و عمل سے حاصل ہوتی ہیں اور انکار حق کے جو برے نتیجے ہوتے ہیں اُن سے متنبہ اور آگاہ کردو۔ [52] سورہ ۳۴ سبا آیت ۲۸

[53] آپ کو یہ آخری پیغام دیکر نہیں بھیجا گیا مگر اس لئے کہ رحم کرنا تھا تمام جہانوں پر، پس آپ کی ذات سراسر رحمت کیونکہ جو پیغام آپ کے ذریعہ بھیجا گیا وہ سرتاسر رحمت ہے۔

دعوت الی اللہ

داعی کے اوصاف و خصائل اور خصوصیات

(۱)

ارشادِ ربانی ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًاۙ۝ وَّ دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا۝
وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِیْرًا۝
وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ دَعْ اَذٰىهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا۝

(سورہ ۳۳ احزاب)

"اے نبی! یہ حقیقت ہے کہ ہم نے آپ کو (ان خصوصیتوں کے ساتھ مبعوث کیا ہے کہ) آپ شاہد ہیں (ایمان و عمل کے بہتر نتائج اور اُن کی برکتوں کی) بشارت دینے والے، (انکارِ حق کے بُرے نتیجوں سے) آگاہ اور متنبہ کرنے والے اور اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف دعوت دینے والے۔ اور (آپ ایک) چراغ ہیں نور پھیلانے والے (روشن کرنے والے) اور (اے نبی) اہلِ ایمان کو بشارت دیجے کہ اُن کے لئے اللہ کی طرف سے بڑا فضل (اعزاز) ہے اور کہنا نہ مان منکروں اور منافقوں (دغابازوں) کا اور

نظر انداز کردے اُن کی ایذا رسانی کو اور بھروسہ کر اللہ پر اور اللہ کافی کارساز ہے۔"

(۲)

توریت[1] میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارت دی گئی تھی:

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَحِرزًا للاُمِّیِّیْن۔ اَنْتَ عَبْدِیْ وَ رَسُوْلِیْ وسَمَّیْتُکَ المتوکّل لیس بِفَظٍّ وَّلاَ غَلِیْظٍ ولا صَخَّابٍ فی الاسواق وَ لا یدفع بالسیئۃ السیئۃ ولکن یعفو وَ یَغفِرُ۔ ولن یقبضَہُ اللہ حتّٰی یقیمَ بِہٖ المِلّۃَ العوجاء۔ بان یقولوا لا الٰہ الا اللہ تفتح بہا اَعیُنٌ عُمْیٌ وَّاٰذان صُمٌّ وَّ قُلُوْبٌ غُلْفٌ۔

(بخاری شریف ص۲۸۵)

"اے نبی! یہ حقیقت ہے کہ ہم نے آپ کو ان خصوصیتوں کے ساتھ مبعوث کیا ہے کہ آپ شاہد ہیں (ایمان وعمل کے بہتر نتائج اور اُن کی برکتوں کی) بشارت دینے والے، (انکارِ حق کے بُرے نتیجوں سے) آگاہ اور مُتنبّہ کرنے والے۔ پناہ اور محافظ اُن کے جن کے یہاں پہلے کوئی نبی نہیں آیا تھا، تم میرے بندے ہو۔ اور میرے رسول ہو میں نے تمہارا

---

[1] حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص توریت کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ حضرت عطاء بن یسار رضی اللہ عنہ نے اُن سے دریافت کیا "توریت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے یا نہیں اگر ہے تو آپ کے کیا اوصاف بیان کئے گئے ہیں؟ حضرت عبداللہ بن عمرو نے توریت کے حوالہ سے یہ اوصاف بیان فرمائے۔ بخاری ص۲۸۵ باب کراہیۃ الصخب فی الاسواق کتاب البیوع

نام رکھا ہے المتوکّل، (اس متوکّل کی شان یہ ہے) نہ بدخلق ہے، نہ سخت دل، نہ بازاروں میں شور و شغب کرنے والا، (یعنی نہ بازاری قسم کا غیر سنجیدہ) بُرائی کا جواب بُرائی سے نہیں دیتا بلکہ درگذر کرتا ہے اور بخشدیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس وقت تک (اس کی جان) قبض نہیں کریگا جب تک کہ اس کے ذریعہ اس ملّت کو ٹھیک نہ کردے۔ جس کو ٹیڑھا کردیا گیا ہے ٹھیک اس طرح کرے کہ وہ قائل ہوجائیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کلمہ سے اُن کی اندھی آنکھیں، بہرے کان اور وہ دل جن پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں کھول دیئے جائیں۔"

مندرجہ بالا قرآن پاک کی آیت اور توریت کی بشارت میں آپؐ کی چند خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) شَاهِدًا: گواہی دینے والا۔ شہادت[1] اور گواہی کا مدار مشاہدہ پر ہوتا ہے۔ یعنی قیاس اور گمان و تخمینہ کی بنا پر گواہی نہیں دی جاتی، بلکہ گواہی اس چیز کی دی جاتی ہے جو خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہو یا اپنے کانوں سے سُنی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ شاہد کو اس چیز کا یقین[2] ہوتا ہے، جس کی وہ شہادت دے رہا ہے، اگر یقین نہ ہو محض گمان اور قیاس ہو تو شہادت دینا صحیح نہیں ہے۔ پس یہ لفظ "شاہد" ایک فلسفی اور نبی میں امتیاز پیدا کردینے والا ہے

---

[1] الشهادة قول صادر عن علم حصل بمشاهدة بصيرة او بصر (المفردات في غرائب القرآن للراغب رحمه الله) [2] انما حقيقة الشهادة هو تيقن الشيء وتحققه من شهادة الشيء ـــ اے حضورہ عینی شرح بخاری فی شرح کلمۃ الاذان أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ۔

فلسفی کے پاس ایمان ویقین نہیں ہوتا۔ فلسفی کا سرمایہ محض فکر[1] ہوتا ہے (سوچ بچار، غور و خوض) یا تجربہ[2] غور و خوض یا تجربہ سے جو نتیجہ برآمد ہو اُس پر ایسا یقین نہیں ہوتا کہ وہ قسم[3] کھا سکے۔

نبی اس عالم کے فنا ہونے، قیامت اور محشر کے برپا ہونے پر قسم کھا سکتا ہے کیونکہ اس کو یقین[4] ہوتا ہے کہ اس عالم کا آخری انجام قیامت ہے۔ فلسفی کے قیاس اور فکر میں اس عالم کا جو انجام بھی ہو وہ اس پر قسم نہیں کھا سکتا کیونکہ اس کے پاس یقین کی مضبوطی اور ایمان کی روشنی نہیں ہے۔ اس کے پاس ظن، گمان ہے، تخمینہ اور اندازہ ہے وہ یہی کہے گا میری تحقیق یہ ہے، ممکن ہے غلط ہو۔ چونکہ فلسفی نور یقین سے محروم ہوتا ہے تو وہ اپنے نظریہ کی دعوت بھی نہیں دیتا اور خود اس کا حوصلہ بھی پست رہتا ہے۔ نہ اس میں ذوقِ ایثار ہوتا ہے، نہ شوقِ فدائیت، نہ جذبۂ قربانی۔

---

[1] یونان اور ہندوستان کے فلاسفر قدیم کے پاس محض فکر تھا۔ اسی فکر سے انھوں نے آسمانوں کی تحقیق کی، اُن میں تارے گڑے ہوئے سمجھے اور زمین کو ساکن اور آسمان کو متحرک مانا وغیرہ وغیرہ۔ آج ان سب باتوں کی تردید کی جا رہی ہے حالانکہ یہی باتیں تھیں جن پر ایمان لانا فلاسفہ کے نزدیک ضروری تھا۔

[2] ماہرین سائنس کے پاس صرف تجربہ ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے بقول شاعر:

اے برادر بے نہایت درگہیست   ہرچہ بروے میرسی بروے مایست

[3] پس سائنس کی تمام تحقیقات ظنیات ہیں۔ خود ماہرین سائنس کو اعتراف ہوتا ہے کہ اُن کی آج کی تحقیقات حرف آخر نہیں ہے، ممکن ہے کوئی نیا انکشاف اس تمام تحقیق کو فریب نظر قرار دیدے۔ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ سورہ ۶ الانعام آیت ۱۱۶ وسورۂ ۱۰ یونس آیت ۶۶ [4] اس کا مدار وحی پر ہوتا ہے یعنی اعلام خداوندی پر جو سراسر یقین ہوتا ہے کیونکہ خالق سے بڑھ کر اپنی مخلوق کا حال کسی کو نہیں معلوم ہو سکتا۔ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۭ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝ سورہ ۶۷ الملک آیت ۱۴

اس کے برخلاف نبی جو کچھ کہتا ہے وہ شرح صدر[1] سے کہتا ہے، کیونکہ اس کے پاس یقین کا نور اور ایمان کی روشنی ہوتی ہے۔ وہ علم اور انکشاف کے اس دیدبان اور مینارہ پر ہوتا ہے جہاں سے وہ غنیم کی فوجوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے، جبکہ اہل شہر کو غنیم کا تصور بھی نہیں ہوتا اور فلسفی نے اگر کسی طرح اندازہ لگا لیا ہو کہ دشمن کی فوجیں قریب آگئی ہیں اور اس اندازہ کے عقلی دلائل بھی اس کے پاس ہوں تب بھی وہ اپنے اندر وہ جذبہ نہیں پاتا جو اس کو قربانی پر آمادہ کردے، نہ اس کے دل میں وہ دہشت ہوتی ہے جو اس کو بے چین اور مضطرب کردے، کیونکہ اس کا یہ اندازہ تذبذب کی دلدل سے پاک اور آزاد نہیں ہوتا۔

جو شخص اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے کہ آگ کی خندق اس کے سامنے ہے اور وہ اس کے کنارے اس طرح کھڑا ہے کہ آگے قدم بڑھاتا ہے تو وہ ٹھیک خندق میں جاتا ہے۔ وہ صرف اپنے قدم کو آگے بڑھنے سے نہیں روکے گا بلکہ وہ پوری قوت صرف کردے گا کہ وہ اپنی جگہ جارہے اس کا قدم آگے نہ بڑھ سکے اور جس قوت سے وہ اپنے قدم کو آگے بڑھنے سے روکے گا، اتنی ہی قوت سے وہ دوسروں سے بھی اصرار کرے گا کہ اس طرف نہ بڑھیں۔ اگر اس کو مزاحمت کرنی پڑے تو وہ مزاحمت میں بھی کمی نہیں کرے گا۔ یہاں تک کہ اگر اس مزاحمت میں اس کی جان بھی

---

[1] اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۝ —— سورہ ۵۳ النجم آیت ۲۳۔ "وہ (فلسفی یا مشرکین) اپنے ظن کی اتباع کرتے ہیں اور ان خیالات کی جو ان کے نفس پیدا کرتے ہیں (اور اس کو عقیدہ کی حیثیت دیدیتے ہیں)۔ نیز ارشاد ہے:

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۝ (ایضاً سورہ ۵۳ آیت ۲۸)

"وہ (فلسفی اور ماہرین سائنس اپنے فکر یا اپنے تجزیہ کی بنا پر۔ اور مشرکین اپنے دعوؤں کی چاہ اور ان عقائد اور خیالات کے بموجب جو خاندانوں میں پشتہا پشت سے چلے آرہے ہیں اور دلوں میں رچ گئے ہیں) ظن کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں اور جہاں حق کی غیر فانی سچائی اور اصل حقیقت کی ضرورت ہو وہاں یہ وہم وگمان کام نہیں آتا۔"

جاتی رہے تو وہ اس کو شہادت سمجھے گا کہ اس نے بے شمار مخلوق کے ساتھ خیر خواہی کی اور اپنی ایک جان دیکر بہت سی جانیں بچا دیں۔

یہ جذبہ یہ جوش اور ولولہ فلسفی میں نہیں ہوتا جبکہ نبی ہر آن اور ہر لمحہ اس جذبہ سے سرشار رہتا ہے۔ لفظ شاہد نے جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یقین کامل[1] اور ایمان مکمل کی خبر دی اس نے یہ بھی بتا دیا کہ داعی کے لئے لازم ہے کہ اس کے پاس وثوق کامل اور اعتماد ہو اور وہ متاع یقین کا سرمایہ دار ہو۔

(۲) مُبَشِّرًا: بشارت دینے والا۔ لفظ بشارت بُشرہ سے ماخوذ ہے۔ کھال کے بیرونی اور ظاہری حصہ کو بشرہ کہتے ہیں۔ غیر معمولی خبر کا اثر بشرہ پر بھی پڑتا ہے۔ خوشی کی خبر سے بشرہ کھل جاتا ہے اور رنج کی خبر سے ہوائیاں اُڑنے لگتی ہیں۔ بسا اوقات بُشرہ کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔

(۳) نَذِيرًا[2] مستقبل کے خطرات سے آگاہ کرنے والا۔ یہ دو لفظ اس دعوت کی اہمیت و عظمت کی طرف بھی اشارہ کر رہے ہیں یعنی اس کو مان لینا غیر معمولی خیر و برکت کا ذریعہ ہوگا (جو بشارتِ عظیم ہے اہلِ ایمان کے لئے) اور انکار کرنا ایسا عمل ہوگا جس کا نتیجہ تباہ کن اور ہلاکت انگیز ہوگا۔ (یہ تنبیہ اور انذار و اعلام ہے اہل کفر کے لئے۔)

(۴) وَدَاعِيًا إِلَى اللهِ: اللہ کی طرف بلانے والا۔

خدا کا نام لینے والے بہت ہیں اسی طرح خدا کا نام لیکر تبلیغ کرنے والے بھی بہت ہیں۔

---

[1] یہی یقین کامل اس شہادت کی بنیاد ہوگا جو انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی اُمتوں کے حق میں نافرمان قوموں کے برخلاف اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جملہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں جملہ اقوام عالم کے برخلاف قیامت کے روز دیں گے۔ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ۝ سورہ نساء آیت ۴۱

[2] النذر والانذار۔ اخبار فیہ تخویف کما ان التبشیر اخبار فیہ سرور۔ (المفردات لغرائب القرآن)

مگر کیا وہ واقعی خدا کی طرف بُلاتے ہیں، یا اپنے ذاتی نظریات و خیالات کو منشاء قدرت اور حکم خدا سمجھے ہوئے ہیں اور ان کی طرف لوگوں کو بُلاتے ہیں، یا یہ صورت ہے کہ اپنی اغراض کی خاطر دعوت و تبلیغ کا بازار لگا رکھا ہے اور دین کے نام پر دنیا کما رہے ہیں۔ داعیًا الی اللہ کے بعد باذنہٖ کے لفظ نے وضاحت کردی کہ آپ جو پیغام یا تعلیم پیش کرتے ہیں وہ منجانب اللہ ہے اور اس کے حکم سے ہے۔ آپ کے ذاتی نظریات نہیں ہیں۔

(۵) کسی مملکت کا پیغام مملکت کی طرف سے نہیں مانا جاتا جب تک پیغام دینے والا مجاز نہ ہو۔ سفراء پہلے سندِ سفارت پیش کرتے ہیں اس کے بعد ان کو اجازت ہوتی ہے کہ اس مملکت میں سفارتی فرائض انجام دے سکیں۔ بِاِذۡنِہٖ کے لفظ نے ایک سند عطا فرمادی کہ آپ کو اللہ کی طرف سے مجاز کی حیثیت حاصل ہے گویا اس فرض اور اس خدمت کے لئے آپ لائسنسدار ہیں۔

(۶) سِرَاجًا مُّنِيۡرًا ۝ : چراغ، روشنی بخشنے والا۔

کہتے ہیں کہ آفتاب سراسر آگ ہے۔ اور چاند اگرچہ روشن ہے مگر اُس کا نور اپنا نہیں۔ وہ آفتاب کی عکاسی کرتا ہے۔ لیکن چراغ کی چند خصوصیتیں ایسی ہیں جو نہ آفتاب میں ہیں نہ چاند میں۔

سب سے پہلی خصوصیت وہ سوز و گداز ہے جو نہ آفتاب کو میسر ہے نہ چاند کو۔ دوسری خصوصیت یہ کہ چراغ شریکِ محفل ہوتا ہے جب کہ آفتاب اور چاند بزمِ انسان سے لاکھوں میل دُور ہیں۔

تیسری خصوصیت فیض رسانی اور تکمیلِ تربیت ہے۔ آپ چراغ کی ٹمٹماتی بتّی سے بھی بیشمار چراغ جلا سکتے ہیں اور قندیل روشن کرسکتے ہیں، جبکہ آفتاب جہاں تاب نے آج تک کسی دوسرے کو آفتاب نہیں بنایا اور نہ چاند اپنے وجود سے کوئی دوسرا چاند بنا سکا۔

(۴) چراغ کی حقیقت 'مٹی یا روئی کا وہ گالا ہے جس سے اُس کی بتّی بنائی جاتی ہے۔ مٹی میں

آگ نہیں لگتی، رُوئی آگ پکڑتی ہے۔ مگر شعلہ نہیں بنا سکتی۔ پس چراغ کی ہستی اور اس کی روشنی کا سرمایہ وہ تیل ہے جو چراغ روشن کرنے والا اُس کے ظرف میں بھر دیتا ہے۔

یہ ہیں چراغ کی خصوصیتیں۔ ان خصوصیتوں کے ملاحظہ کے بعد آیت پر نظر ثانی فرمائیے۔

آیت میں دَاعِيًا إِلَى اللهِ کے بعد سِرَاجًا مُّنِيرًا فرما کر اس حقیقت کو طشت ازبام فرما دیا کہ

(الف) محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا سرمایہ وحی الٰہی کا وہ روغن ہے جو اس کے تن بدن سے پیوست ہے بلکہ وہ روغن کہ داعی کا تن بدن اس کی تراوٹ میں غرق ہے۔ اس کا نور تمام تر اسی کا فیض[1] ہے۔

(ب) داعی کی دعوت شاعرانہ تفریح نہیں بلکہ شعلہ ہے اُس سوزش[2] کا جو اُس کے بدن کو پگھلا رہی ہے۔ یہ سوزش، ہمدردی نوعِ انسان کی سوزش ہے۔ انسان اپنے اعمال کے نتائج سے غافل ہے، یہ نبی اُن کو دیکھ رہا ہے اور پگھل[3] رہا ہے۔

(ج) اہلِ محفل مشغول ہیں مگر چراغ اپنا کام[4] برابر کر رہا ہے۔

(د) سُورج اور چاند روشنی بخشتے ہیں، مگر ایثار اور قربانی کا سبق نہیں دیتے۔ یہ خصوصیت چراغ کی ہے کہ اُس کی بتّی جل کر فنا ہو رہی ہے اور ہر ایک داعی کو داعیانہ جہاد میں فنا ہونے کا سبق دے رہی ہے۔ یعنی داعی کی دعوت اس وقت نور بخش ہو سکتی ہے

---

[1] وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ سورہ والنجم۔ وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما انا قاسم واللہ یعطی [2] لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۝ سورہ شعراء

[3] حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ آپ وقت سے پہلے بوڑھے ہو گئے۔ فرمایا: مجھے سورہ ھود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔ (شمائل ترمذی ص۲۶) ان سورتوں میں ان ناعاقبت اندیش انسانوں کے نتائجِ بد بیان کئے گئے ہیں جنھوں نے انبیاء کی دعوت سے گریز کر کے کفر کی راہ اختیار کی۔ ان نتائج کے صدمہ نے آپؐ کو بوڑھا بنا دیا۔ [4] يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ ——— (سورہ مائدہ ع ۱۰)

جبکہ خود داعی سوز و گداز بن جائے۔ اپنے تن بدن کو مقاصد دعوت کے لئے قربان کر دے۔ اور اس ایثار اور قربانی کو اپنے وجود کا مقصد اعظم اور اپنے ظہور کی آخری غرض و غایت بنالے۔ (حقیقت یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری سیرت اسی لفظ سراجاً منیراً میں سموئی ہوئی ہے۔ آپ سیرتِ مقدسہ کا جتنا گہرا مطالعہ کریں گے آپ کا ضمیر اس کی شہادت دیتا رہیگا)

(۵) ارشاد ربّانی ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (سورہ ۳۳ احزاب آیت ۴۰)

ترجمہ: "نہیں ہیں محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں[۱] (سب کے ختم پر ہیں)۔"

یعنی بقول حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ اللہ کے رسول ہیں۔ اس حساب سے سب آپکے بیٹے ہیں (موضح القرآن) اگر آپ کے بعد کوئی اور نبی آتا تو نوع انسان کا یہ تعلق اس سے ہو جاتا، مگر چونکہ آپ خاتم الانبیاء ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آنے والا، تو آپ کا یہ تعلق ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے۔ اسی سورۂ احزاب میں پہلے یہ ارشاد ہوا ہے: اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى

[۱] خاتم کے معنی ہیں مہر۔ اسی لئے حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے ترجمہ یہ کیا ہے: "مہر سب نبیوں پر۔ یعنی جس طرح مہر آخر میں ہوتی ہے اور مہر لگا دینے کے معنیٰ ہوتے ہیں ختم کر دینا۔ اور اس سلسلہ کو بند کر دینا، ایسے ہی آپ کے بعد نبی بنانے کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ کوئی نبی نہیں بنایا جائے گا۔ باقی عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری ہوگی تو آپ کی نبوت نئی نہیں ہوگی بلکہ آپ کی نبوت وہی ہوگی جو آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے تقریباً چھ سو سال پہلے عطا ہوئی تھی۔ آپ کی نبوت دہی ہے۔ البتہ دورِ محمدی میں آپ تشریف لائیں گے تو شریعتِ محمدیہ پر عمل کریں گے کیونکہ اس دور کا تقاضا یہی ہے صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ط (ع ۱، آیت ۶)

ترجمہ: "نبی سے لگاؤ ہے، ایمان والوں کو زیادہ اپنی جان سے اور اُس کی عورتیں اُن کی (مومنین کی) مائیں ہیں۔"

تشریح: آیت کا اشارہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت باپ سے بھی زیادہ ہے۔ اسی لئے جب ازواج مطہرات کو اُمت کی مائیں قرار دیا گیا تو یہ نہیں فرمایا گیا کہ آپ اُمت کے باپ ہیں، کیونکہ باپ کی شفقت رشتۂ پدری میں محدود ہوتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت ان حدود سے بہت بالا ہے۔ ہمارے الفاظ اس کی کوئی حد نہیں بیان کر سکتے البتہ عمل سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ اگر کوئی مفلس مسلمان وفات پاجائے اور ترکہ کے بجائے اُس کے ذمہ قرض ہو اور اُس کے لاوارث بچے ہوں جن کا کوئی پرساں نہ ہو تو اس کا قرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ادا فرمائیں گے اور اس کے بچوں کی ذمہ داری بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ہوگی۔ آپ اُن کے مربی بھی ہوں گے اور متکفل بھی ہوں گے، لیکن اگر کوئی مسلمان ترکہ چھوڑ کر وفات پاتا ہے تو اس کا ترکہ اُس کے وارثوں پر تقسیم ہوگا (رشتہ کا باپ ترکہ میں حصہ دار ہوتا ہے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ترکہ میں سے کوئی حصہ نہیں لیا۔ البتہ لاوارث بچوں کی اور مرنے والے کے قرض کی ذمہ داری لے لی۔ (بخاری شریف وغیرہ) اس لئے کہ آپ کی شفقت، شفقتِ پدری کی حدود سے آگے بڑھی ہوئی تھی۔

ہدایات

وہ نبی جس کو ان خصوصیات کے ساتھ مبعوث کیا گیا تھا، اس آیت کے دوسرے حصہ میں اس کو چند ہدایات فرمائی گئی ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) پہلی ہدایت: اہلِ ایمان کو بشارت دیدیجئے کہ اُن کے لئے اللہ کی طرف سے

بہت بڑا فضل (اعزاز) ہے۔

تشریح | اس ہدایت میں: (الف) جس طرح طریقۂ دعوت و تبلیغ کی تلقین ہے کہ داعی الی اللہ کو تخویف و ترہیب (ڈرانے، دھمکانے اور مرعوب کرنے) کے بجائے ترغیب اور تشویق کا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے یعنی خدا کے قہر و غضب کے تذکرہ سے پہلے ان نعمتوں اور ان فوائد کو ذہن نشین کرانا چاہیئے جو دعوت کے قبول کرنے پر صاحب ایمان کو میسر آئیں گے۔

(ب) اور جس طرح حوصلہ افزائی ہے ان اہلِ ایمان کی جو دعوت قبول کر رہے ہیں۔

(ج) اسی طرح پیشین گوئی ہے ان امتحانات کی جو دعوت قبول کرنے والوں کے ہوا کرتے ہیں جن کی بنا پر اللہ کے یہاں ان کا اعزاز[1] ہوتا ہے۔ سورہ ۲ (بقرہ) آیت ۲۱۴ میں فرمایا گیا ہے[2]:

"کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ (محض ایمان کا زبانی دعوے کرکے) تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تو تمہیں وہ آزمائشیں پیش ہی نہیں آئی ہیں جو تم سے پہلے لوگوں کو پیش آ چکی ہیں۔ ہر طرح کی سختیاں انھیں بھگتنی پڑیں، ہولناک مصائب سے ان کو جھنجوڑا گیا، یہاں تک کہ اللہ کے رسول اور جو لوگ ایمان لائے تھے پکار اٹھے، اے نصرتِ خداوندی تیرا وقت کب آئیگا۔ (تب اچانک پردۂ غیب چاک ہوا اور خداوند عالم کی نصرت یہ کہتی ہوئی نمودار ہوگئی) ہاں گھبراؤ نہیں خدا کی نصرت تم سے دور نہیں ہے۔"

اس عام ضابطۂ قدرت کے علاوہ خاص اس امت کو بھی آگاہ کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو

---

[1] یعنی جب فضل و اعزاز کی بشارت ہے تو لامحالہ ان امتحانات کی بھی پیشین گوئی ہے جن میں کامیاب ہونے پر فضل و اعزاز کا تمغہ ملتا ہے۔ [2] اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا (الی قولہ) قریب

سورہ بقرہ کی آیات[1] ۱۵۴ تا ۱۵۷ جن کا ترجمہ یہ ہے:

" یاد رکھو یہ ضرور ہونا ہے کہ ہم تمہارا امتحان لیں۔ خطرات کا خوف، بھوک کی تکلیف، مال و جان کا نقصان — پیداوار کی تباہی۔ وہ آزمائشیں ہیں جو تمہیں ضرور پیش آئیں گی۔ پھر جو لوگ صبر کرنے والے ہیں اُنھیں (فتح و کامرانی کی) بشارت دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں جب کبھی کوئی مصیبت اُن پر آتی ہے (تو بے قرار اور بدحواس ہونے کے بجائے ذکرِ الٰہی سے اپنی رُوح کو تقویت پہونچاتے ہیں اور اُن کی زبانِ حال کی صدا یہ ہوتی ہے کہ) اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۝ ہم اللہ کے ہیں (ہماری زندگی اور موت، رنج و غم، سود و زیان جو کچھ بھی ہے سب اللہ کے لئے ہے اور ہم سب کو بالآخر مرنا اور) اس کی طرف لوٹنا ہے۔ سو یقیناً ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اُن کے پروردگار کے الطاف وکرم ہیں جن پر اُن کے رب کی رحمت اُترتی ہے اور یہی ہیں جو اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔" (سورہ بقرہ، آیت ۱۵۴ تا ۱۵۷)

(۲) دوسری ہدایت: اور کہنا نہ ماننا منکروں اور منافقوں کا۔

سورہ[2] (دہر) کی آیت ۲۴ میں یہ ارشاد ہے:

" آپ اپنے پروردگار کے حکم پر مضبوطی سے قائم رہیئے

[1] وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ الیٰ قولہ تعالیٰ الْمُهْتَدُوْنَ۝ سورہ بقرہ ع ۱۹

ان (دشمنان دین) میں سے کسی گنہگار اور ناشکرے کا کہنا
نہ مانئے۔"

بیشک داعی الی اللہ اللہ کے حکم پر مضبوطی سے قائم رہے گا، وہ غیر اللہ کے حکم کی تعمیل نہیں کرے گا۔ ان سے قطع تعلق کریگا، مگر یہ قطع تعلق خاص رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہوگا، دل آزاری کے ساتھ نہیں ہوگا، کیونکہ جس رب کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہا ہے، اس کا حکم یہ بھی ہے کہ

"یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو۔ اور خوبصورتی کے ساتھ اُن سے الگ ہوجاؤ۔" (سورہ ۷۳ مزمل، آیت ۱۰)

(۳) تیسری ہدایت: دَعْ اَذَاهُمْ — "نظر انداز کردے اُن کی ایذا رسانی کو" یعنی معاف کرو، درگذر کرو۔ صبر و ضبط اور تحمل سے کام لو۔ داعی الی اللہ کی یہی شان ہے اور یہی اس کا فرض ہے۔

چنانچہ سورہ ۳ (آل عمران) کی آیت ۱۸۵ میں فرمایا گیا ہے[1]:

"(یاد رکھو) ایسا ہونا ضروری ہے کہ تم جان و مال کی آزمائشوں میں ڈالے جاؤ۔ یہ بھی ضرور ہونا ہے کہ اہلِ کتاب اور مشرکینِ عرب سے تمہیں دکھ پہونچانے والی باتیں بہت کچھ سننی پڑیں۔ اگر تم نے صبر کیا

---

[1] حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت جس کو بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں ص۶۵۶ اور باب کینۃ المشرک میں ص۹۱۶ پر تفصیل سے نقل کیا ہے اس کے آخری الفاظ سے یہ وہم ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت تک تھا جب تک جہاد کی اجازت نہیں ہوئی تھی اس کے بعد یہ حکم نہیں رہا، مگر یہ صحیح نہیں ہے دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ میں یہ حکم ہمیشہ کے لئے ہے۔ چنانچہ سورہ توبہ میں جہاں یہ حکم ہے فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ ۔ آیت ۵ "جب حرمت کے مہینے گذر جائیں تو (جنگ کی حالت قائم ہوجائے گی اس وقت) مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کرو"۔ اس آیت کے بعد اگلی آیت یہ ہے: (باقی بر صفحہ آئندہ)

(یعنی مصیبتوں میں ثابت قدم رہے) اور تقویٰ کا طریقہ اختیار کیا۔
(اللہ تعالیٰ کے احکام کی پوری تعمیل کی اور نا فرمانی سے پوری احتیاط
برتی) تو بلا شبہ یہ ہوں گے بہت (بڑے حوصلہ) کے کام۔"

(۴) چوتھی ہدایت : اللہ پر بھروسہ کر۔

یعنی جملہ ذرائع استعمال کرو۔ ذرائع کا مہیا کرنا بھی فرض ہے، مگر بھروسہ ذرائع پر نہ ہو، بھروسہ خدا پر ہو کہ ہدایت بخشنا اُس کا کام ہے وہی جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے:

اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ
يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ (سورہ ۲۸ القصص آیت ۵۶)

"تم جس کو چاہو راہِ راست پر نہیں لگا سکتے اللہ جس کو چاہے
راہِ راست پر لگا دیتا ہے اور ہدایت پانے والوں کا پورا علم
اُسی کو ہے۔"

سیرۃ مبارکہ کا اہم اور اصل جز دعوت ہے۔ داعی کی حیثیت سے آپؐ کے اوصاف و خصائل سطورِ بالا میں بیان کئے گئے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر دعوت کے آداب

(بقیہ صفحہ گذشتہ) وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ (آیت ۶) یعنی اے نبی اگر مشرکوں میں سے کوئی آدمی آئے اور تم سے امان مانگے تو اسے ضرور امان دو یہاں تک کہ وہ (اچھی طرح) اللہ کا کلام سُن لے، پھر اُسے امن کے ساتھ اس کے ٹھکانے پر پہونچا دو (اسلام قبول کرے یا نہ کرے)۔"

دراصل حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا تعلق پورے واقعہ سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب تک جہاد کی اجازت نہیں ہوئی تھی اور صرف صبر ہی کی ہدایت تھی تو اُس وقت تک عبداللہ بن ابی بن سلول اور اُن کی پارٹی کے آدمی کھلے بندوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کیا کرتے تھے جو بسا اوقات توہین آمیز ہوتی تھی اور جب جہاد کی اجازت ہوگئی اور غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو فتح بھی حاصل ہوگئی تو ان لوگوں نے ظاہرداری کے لئے اسلام قبول کرلیا اور کھلم کھلا مخالفت کے بجائے درپردہ سازشیں شروع کردیں۔

اور طریقۂ کار بھی بیان کر دیا جائے۔ یہ بھی سیرت مبارکہ کا سب سے مقدم باب ہے۔ آئندہ سطور میں آداب اور طریقۂ کار بیان کیا جا رہا ہے جو وحیٔ الٰہی نے مقرر فرمایا ہے۔

واللہ الموفق وھو المستعان۔

آداب دعوت وطریقہ کار

(۱)

(الف) اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ (تا) وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿﴾

(سورہ ۱۶ النحل رکوع ۱۶)

ترجمہ: "(اے نبی) اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ اس طرح کہ حکمت (اور دانشمندی) کی باتیں بیان کرو۔ اور اچھے طریقہ پر پند اور نصیحت کرو اور مخالفوں سے بحث و نزاع کرو تو (وہ بھی) ایسے طریقہ پر کہ وہی طریقہ سب سے بہتر (اور زیادہ سے زیادہ حسن وخوبی) کا طریقہ ہو۔ تمہارا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک گیا اور وہی جانتا ہے کہ کون راہِ راست پر ہے اور مخالفوں کی سختی کے جواب میں اگر سختی کرو تو چاہیئے کہ ویسی ہی اور اتنی ہی کرو جیسی تمہاری ساتھ کی گئی اور اگر تم نے صبر کیا (یعنی جھیل گئے اور سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا) تو بلاشبہ صبر کرنے والوں کے لئے صبر ہی بہتر ہے اے پیغمبر صبر کر اور تیرا صبر کرنا نہیں ہے مگر اللہ کی مدد سے۔ اور ان لوگوں کے حال پر غم نہ کھا، نہ ہی ان کی مخالفانہ تدبیروں سے دل تنگ ہو۔ یقیناً اللہ انہیں کا ساتھی ہے جو متقی ہیں۔ اور نیک عملی میں سرگرم رہتے ہیں۔"

(سورہ ۱۶ نحل آیت ۱۲۵ تا ۱۲۸)

(ب) خُذِ الْعَفْوَ (تا) سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ (سورہ اعراف، رکوع ۲۴)

ترجمہ: "درگذر اور معافی کا طریقہ اختیار کر، نیک کام کو کہہ۔ اور
کنارہ کر جاہلوں (نادانوں) سے اور اگر ابھار دے تجھکو شیطان
کی چھیڑ (یعنی اگر ایسا ہو کہ کسی بات پر جھونجل آجائے جو یقیناً
شیطان کی حرکت ہوگی۔ داعی اِلی اللہ کو جھونجل نہ آنی چاہیئے)
تو فوراً اللہ کی طرف متوجہ ہوجاؤ، اس کی پناہ پکڑو (جھونجل کو
ختم کردو) بلاشبہ اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔"

(سورہ ۷، الاعراف، آیت ۱۹۹)

تشریح:۔ ذہنی صلاحیت ہر ایک کی یکساں نہیں ہوتی۔ کوئی صاحب علم و دانش ہوتا ہے، کوئی سادہ طبیعت اور کوئی کھود کرید اور بحث و مباحثہ کا شوقین ہوتا ہے۔ ان آیات کا اشارہ یہ ہے کہ داعی الی اللہ کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ مخاطب کی ذہنیت کو پرکھے، اگر وہ صاحبِ علم و دانش ہے تو اس کو عالمانہ اور دانشمندانہ دلائل (حکمت) سے سمجھائے۔ عوام کے لئے ہمدردانہ نصیحت اور وعظ و پند سے کام لے۔ اور بحث کے شوقین سے بحث بھی کرسکتا ہے، مگر اس طرح کہ پہلے مخاطب کو سمجھے پھر وہ انداز اختیار کرے جو حق بات کے سمجھنے اور سمجھانے کا ہوتا ہے، جس سے مخاطب میں یقین پیدا ہو۔ اس کے دل کی گرہ کھلے، ایسی کوئی بات نہ ہو جس سے اُس کا دل دُکھے۔ اپنی حق پرستی کا زعم اور گھمنڈ اور اس کی باطل پرستی کی تحقیر و تذلیل کا انداز ہرگز نہ ہو۔ دل پر خوفِ خدا غالب رہے کہ دلوں کا حال اللہ ہی کو معلوم ہے۔ گمراہ اور ہدایت یافتہ کو وہی خوب پہچانتا ہے۔ اپنے انجام کی خبر کسی کو نہیں۔ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کس کا انجام کیا ہوگا۔ داعی الی اللہ کے لئے یہ بھی درست نہیں کہ وہ مخالف کی مخالفانہ حرکتوں سے دل تنگ ہو۔ اُس کے مزاج میں جھونجل بھی نہ آنی چاہیئے۔ اگر مخالف کی طرف سے زیادتی ہوئی ہے تو اجازت

ہے کہ اس کا جواب دے سکتے ہو مگر نپا تُلا کہ اس میں داعی اور مبلغ کی طرف سے کوئی زیادتی نہ ہو مگر صرف یہ اجازت ہے ۔ داعی کی شان یہ نہیں کہ وہ بدلہ لے ۔ اس کا کام ہے عفو، درگذر اور ضبط و تحمل، صبر، اس کا یہ صبر اللہ کے لئے ہے اور اللہ کی مدد سے ہے۔ لہٰذا داعی کا فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا رہے کہ اس کے ظرف میں وسعت، نگاہ میں بلندی عطا فرما کر اُس کی مدد کرے ۔ اس کو یقین رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ احتیاط اور تقوے سے کام لے رہا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہے، اس کا حامی اور مددگار ہے ۔

(۳)

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ (تا) عَزْمِ الْاُمُوْرِ (سورۂ آل عمران ع ۱۹)

ترجمہ : "ایسا ضرور ہونا ہے کہ تم جان و مال کی آزمائشوں میں ڈالے جاؤ ۔ یہ بھی ضرور ہونا ہے کہ اہلِ کتاب اور مشرکین کی طرف سے تمہیں دُکھ پہونچانے والی باتیں بہت کچھ سُننی پڑیں ، اگر تم صبر (ضبط و تحمل) سے کام لو اور پرہیزگاری کرو ۔ (تقوے سے کام لو ، احکامِ حق کی نافرمانی سے بچو) تو یہ ہیں ہمت کے کام ۔"

(سورہ ۳ آل عمران آیت ۱۸۵)

داعی کے اوصاف و خصائل کے سلسلہ میں تیسری ہدایت گذر چکی ہے ۔ دَعْ اذاھم "نظر انداز کردے اُن کی ایذا رسانی کو ۔"

سوال یہ ہوسکتا ہے کہ نظر انداز کب تک کرتا رہے، اس کا جواب اس آیت سے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کب تک کی کوئی حد ہی نہیں ۔

چاہتے ہو کہ حق کا بول بالا ہو تو یہ تمنا آسان نہیں ہے ۔ باطل تمہارے مقابلہ میں ضرور آئے گا ۔ پُوری قوت سے آئے گا، اور آتا رہے گا ۔ جب تک دنیا میں نور و ظلمت اندھیری اور اُجالا ہے، حق و باطل کی جنگ بھی جاری ہے اور پیروانِ دعوتِ حق کے لئے

یہ امتحانات بھی باقی ہیں۔ داعی الی اللہ کی کامیابی یہی ہے کہ ان امتحانات میں وہ کامیاب ہو۔ ہدایت دینا اور بھٹکے ہوؤں کو راہِ راست پر لانا خدا کا کام ہے۔ السّعی منّی والاتمام من اللہ۔

(۴)

دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو دعوت اور طریقہ دعوت

اہلِ کتاب | قُلْ یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ (تا) مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔

ترجمہ: "اے نبی! تم اہلِ کتاب سے (یہود اور نصاریٰ) سے کہدو:
اے اہلِ کتاب (اختلاف و نزاع کی ساری باتیں چھوڑ دو) اُس بات (اصول) کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے دونوں کے لئے یکساں طور پر تسلیم شدہ ہے یعنی یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں کسی کی ہستی کو اُس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ ہم میں سے ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرے گویا خدا کو چھوڑ کر اسے اپنا پروردگار بنالیا ہے۔" (سورۂ آل عمران، آیت ۶۴)

وجہ اختلاف | وَلِکُلِّ اُمَّۃٍ جَعَلْنَا مَنْسَکًا (تا) بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

(سورہ ۲۲، الحج، رکوع ۹)

"(اے نبی) ہم نے ہر اُمّت کے لئے عبادت کا ایک طور طریقہ ٹھہرا دیا ہے جس پر وہ چل رہی ہے۔ بس لوگوں کو اس معاملہ میں (یعنی اسلام کے طور طریق میں) تجھ سے جھگڑنے کی کوئی وجہ نہیں، تو اپنے پروردگار کی طرف لوگوں کو دعوت دے (کہ اصل دین یہی ہے) یقیناً تو ہدایت کے سیدھے راستہ پر چل رہا ہے۔ اگر (اس پر بھی) لوگ تجھ سے جھگڑا کریں تو کہدے کہ

اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔ تم جن باتوں میں آپس میں اختلاف کر رہے ہو، قیامت کے دن وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرکے حقیقتِ حال آشکارا کر دیگا۔" (سورہ ۲۲، الحج، آیت ۶۶ تا ۶۸)

تشریح: ان آیتوں کا اشارہ یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کا اسلوب اور طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ

(الف) ان باتوں کو مقدم رکھا جائے جن کو مخاطب بھی مانتے ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ ہونی چاہیئے غیر اللہ کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرنا چاہیے کہ معلوم ہو کہ خدا کو چھوڑ کر ان کو معبود مان لیا ہے۔ اس کو اہل کتاب بھی مانتے ہیں۔ لہٰذا پہلے اسی پر زور دیا جائے۔

(ب) یہ سمجھایا جائے کہ اللہ ایک ہے تو اس کا دین بھی ایک ہی ہے، اس کی بنیادی باتیں بھی ایک ہی ہیں۔ عبادت کا حکم ہمیشہ رہا، اختلاف اس کے طور وطریق میں ہوا، کیونکہ ہر ایک عہد اور ہر ایک دَور اور ہر ایک قوم کی حالت یکساں نہیں تھی جس کی جیسی حالت اور جیسی صلاحیت اور قابلیت تھی اس کے مطابق اس کو طور طریق دیا گیا جو ہر دور میں ترقی کرتا اور آگے بڑھتا رہا۔ بس یہ اختلاف فطری اور قدرتی تھا جو واقع ہوا۔[۱]

(ج) دعوت دینے والے کے دل میں دوسرے مذہب کے طریقوں کا یہ احترام ہو کہ وہ سمجھے کہ بنیادی طور پر وہ من جانب اللہ تھے تو اس سے اس کے اندازِ دعوت میں لامحالہ لچک ہوگی، دوسری طرف جن کو دعوت دی جا رہی ہے اُن کو بھی اس دعوت سے وحشت نہ ہوگی کیونکہ وہ سمجھے گا کہ یہ دعوت پہلی بنیادوں کو اکھاڑ نہیں رہی بلکہ اُن کو اپنی جگہ تسلیم کرتے ہوئے تعمیر میں اضافہ کر رہی ہے۔

(د) ان حقیقتوں کو ذہن نشین کرانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مخاطب یہ اثر لیں گے کہ جب سابق اُمتوں میں اُن کی صلاحیتوں کے بموجب عبادت کے قواعد و قوانین میں فرق ہوتا

---

[۱] اس سلسلہ میں ملاحظہ فرمائیے انسان اور انسانیت منزل بمنزل (دیباچہ سیرتِ مبارکہ)

رہا ہے تو ترقی یافتہ حالات کے مطابق اگر کوئی طریقہ معین کیا گیا — جو مکمل اور آخری طریقہ ہے، تو وہ بھی قابل تسلیم ہونا چاہیئے اس سے وحشت نہ کرنی چاہیئے۔

(ہ) بس تقاضائے انصاف یہ ہے کہ سابق اُمّتوں کے لوگ (اہل کتاب) اس دعوت کو اختلاف اور نزاع کا نشانہ نہ بنائیں بلکہ اس کو پرکھیں، حقیقت پسندی سے کام لیں اور صداقت کو تسلیم کریں۔

(و) لیکن اگر مخاطب لوگ تمام حقیقتوں کو پس پشت ڈال کر نزاع کرنا اور جھگڑنا ہی پسند کریں تو داعی الی اللہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ بھی ان کی طرح ضد، عناد اور نزاع میں پڑے بلکہ وہ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ[1] کہہ کر الگ ہو جائے اور اُن کا معاملہ خدا کے حوالے کر دے کہ قیامت کے دن وہی ان نزاعات کا فیصلہ کرے گا۔ (واللہ اعلم)

اہل شرک اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ (تا) بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

ترجمہ: "(اے نبی!) تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تم پر وحی کی گئی ہے، تم اُس کی پیروی کرو کہ کوئی معبود نہیں ہے، مگر صرف اسی کی ذات۔ اور کنارہ کرو مشرکین سے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو (وہ اس کی قدرت رکھتا ہے کہ انسان کو اس طرح بنا دیتا کہ سب ایک ہی راہ پر چلنے والے ہوتے اور) یہ لوگ شرک نہ کرتے (لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ مشیت خداوندی کا یہی فیصلہ ہوا کہ ہر انسان) اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی راہ رکھے۔ پس تمہارا کام یہی ہے کہ سچائی کی راہ دکھا دو۔ (اُنہیں جبراً اپنی راہ پر چلانا تمہارا کام نہیں ہے) ہم نے تمہیں نہ تو اُن پر پاسبان بنایا ہے (کہ ان کی رائے اور عمل کی نگرانی کرو) اور نہ تمہارے حوالہ ان کی ذمّہ داری ہے (کہ ان کے نہ ماننے کا کوئی الزام تم پر آئے)۔

---

[1] تمہارے عمل کو جو تم کر رہے ہو خدا خوب جانتا ہے۔

اور (مسلمانو!) جو لوگ خدا کے سوا دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں
تم اُن کے معبودوں کے متعلق بدکلامی نہ کرو کہ پھر وہ بھی حد سے بڑھ کر،
بے سوچے سمجھے خدا کو بُرا بھلا کہنے لگیں۔ ہم نے اسی طرح ہر قوم کیلئے اسکے کاموں
کو خوش نما بنا دیا (کہ ہر قوم اپنی راہ رکھتی ہے اور اپنی ہی راہ اُسے
اچھی دکھائی دیتی ہے) پھر آخر سب کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے۔
اس وقت وہ ان سب پر ان کے کاموں کی حقیقت کھول دیگا جو وہ (دنیا
میں) کرتے رہے ہیں۔" (سورہ ۶ الانعام آیت ۱۰۵ تا ۱۰۷)

تشریح: یعنی یہ تو حقیقت ہے کہ شرک ظلم عظیم ہے[1]۔ شرک کرنے والا خدا پر ظلم نہیں کرتا بلکہ خود اپنے اوپر بہت بڑا ظلم کرتا ہے کہ اپنی عظمت اور اپنی خودداری کو خود ہی پامال کرتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بلندی پر ہو پھر خود اپنے آپ کو پستی کے گڑھے میں گرا دے۔ جہاں اس کو مُردار خور پرندے تکّا بوٹی کر دیں یا ہواؤں کے جھونکوں کی لپیٹ میں آکر برباد ہو جائے[2]۔ اس ظلم عظیم کا نتیجہ لامحالہ یہ ہے کہ شرک کے لئے بخشش کی گنجائش نہیں[3] اور مشرک کا جنت میں داخل ہونا ایسا ہی ہے جیسے اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا[4]۔ لیکن ان تمام قباحتوں اور نفرت انگیز خرابیوں کے باوجود داعی الی اللہ کے انداز میں نفرت اور تحقیر و تذلیل کی جھلک نہ ہونی چاہیئے وہ جب دعوت دے تو اس کی نظر اس پر ہونی چاہیئے کہ اس کائنات میں رنگ برنگی اس کے خالق اور پروردگار کی حکمت و قدرت کاملہ کا تقاضہ ہے۔ اس چمن کی رونق ہی گلہار رنگارنگ سے ہے۔ اور اس کی زیبائش نہیں نکھرتی جب تک اس میں خاردار درخت اور پودے نہ ہوں۔ پھر ظاہر ہے کہ پھول پھول ہے۔ کانٹا کانٹا ہے۔ پھول کا جو مقام ہے وہ کانٹے کو میسر نہیں ہو سکتا۔ مگر چمن کی کیاریوں میں جس طرح پھول کا پودا۔ اپنی تازگی میں

---

[1] سورہ ۳۱ لقمان آیت ۱۳ [2] سورہ ۲۲ الحج، آیت ۳۱
[3] سورہ ۴ نساء آیت ۱۱۵ [4] سورہ ۷ الاعراف آیت ۳۹

مست ہے۔ کانٹے کا جھاڑ بھی مگن ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ سارا چمن اسی کا ہے اور اسی کیلئے ہے اس جھاڑ سے اگر پوچھا جائے تو اسے اس کا احساس نہیں کہ وہ کانٹا ہے اور دنیا کی نگاہوں میں ذلیل ہے اسے اگر اس کا احساس ہوتا تو وہ چمن کی کیاری کے پاس بھی نہ جاتا، بلکہ اس کی نظر میں کچھ اپنی خوبیاں ہیں۔ اس کو احساس ان خوبیوں کا ہے اسی لئے وہ چمن کی کیاری میں پھول کے پودے سے زیادہ سینہ زور ہے اور اپنی آن میں مست ہے۔ پس داعی الی اللہ کا فرض ہے کہ دعوت اور تبلیغ کے وقت وہ اس فلسفۂ قدرت کو سامنے رکھے۔ اگر وہ کانٹے کی اصلاح چاہتا ہے تو اس کو خار ہونے کا طعن دیکر اصلاح نہیں کر سکتا، بلکہ اس کی اصلاح جب ہوگی جب اس ذہنیت کی اصلاح ہو کہ وہ کانٹا ہے، مگر اپنے آپ کو پھول کا ہمدوش سمجھتا ہے بلکہ خیابان پر پھول سے زیادہ اپنا حق جتاتا ہے۔

آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو انسان کو بھی حیوانات کی طرح بنا دیتا کہ سب اپنی حالت میں ایک ہی طرح کے ہوتے لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں چاہا۔ اُس نے انسان کی طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ہر گروہ اپنی اپنی رائے اور اپنی اپنی پسند رکھتا ہے اور ہر گروہ کی نظر میں وہی کام اچھا ہے جو وہ کر رہا ہے، تمہاری نظر میں اس کی راہ کتنی ہی بُری ہو لیکن اس کی نظر میں وہ ایسی ہی اچھی ہے جیسی تمہاری راہ تمہاری نظر میں پس ضروری ہے کہ اس بارے میں برداشت اور رواداری سے کام لو۔ جو لوگ شرک و بُت پرستی میں مبتلا ہیں تم انھیں دعوتِ حق دو، مگر بُرا بھلا نہ کہو۔ اگر تم اُن کے بتوں کو بُرا بھلا کہو گے تو وہ بھی خدا کو بُرا بھلا کہیں گے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم انھیں گالیاں دو گے وہ تمہیں دیں گے۔ طلب حق کی بات نہیں رہے گی، گالی گلوچ کی بات ہو جائے گی۔

لامذہب، عقل پرست اور خدا کے منکر (معاذ اللہ)	هُوَ الَّذِیۡ یُسَیِّرُکُمۡ فِی الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ (تا) تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۳﴾

ترجمہ: "وہی ہے جس نے تمہارے لئے سطح زمین پر اور سمندر میں

سیر و سیاحت کا سامان کر دیا ہے۔ پھر جب ایسا ہوتا ہے کہ تم جہاز میں سوار ہوتے ہو اور جہاز موافق ہوا پاکر تم کو لے اڑتے ہیں، مسافر خوش ہوتے ہیں (کیسی اچھی ہوا چل رہی ہے) پھر اچانک ہوائے تند کے جھونکے آپہونچتے ہیں اور ہر طرف سے موجیں اٹھ اٹھ کر گھیر لیتی ہیں، اور مسافر خیال کرتے ہیں کہ بس اب ان میں گھر گئے (اور بچنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی) تو اس وقت انھیں (خدا یاد آتا ہے) وہ دین کے اخلاص کے ساتھ اُسے پکارنے لگتے ہیں: اے خدا اگر اس مصیبت سے نجات دیدے تو ہم ضرور تیرے شکر گذار ہوں گے پھر (دیکھو) جب اللہ انھیں نجات دیدیتا ہے تو اچانک (اپنا عہد و پیمان بھول جاتے ہیں اور) ناحق ملک میں سرکشی اور فساد کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو تمہاری سرکشی کا وبال خود تمہاری جانوں پر پڑنے والا ہے۔ یہ دنیا (چند روزہ) زندگی کے فائدے ہیں اٹھالو پھر تمہیں ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اس وقت ہم تمہیں بتائیں گے کہ جو کچھ دنیا میں کرتے رہے، اُس کی حقیقت کیا تھی۔"

(سورہ یونس، آیت ۲۱ و ۲۲)

تشریح: یہ ایک ایسی مثال ہے، اس طرح کی صورتیں انسان کو زندگی کے اتار چڑھاؤ میں اکثر پیش آتی رہتی ہیں کہ تمام ذرائع اور وسائل ختم ہو جاتے ہیں، کوئی سہارا باقی نہیں رہتا۔ فطرتِ انسان اس وقت بیدار ہوتی ہے۔ وہ لامحالہ ایک بِن دیکھی ہستی کی طرف متوجہ ہوتی ہے جس کو وہ قادر، کارساز اور بگڑی کا بنانے والا سمجھتی ہے، وہی خدا ہے۔
قرآن شریف کا تقریباً ایک تہائی حصہ اس طرح کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے، جن میں خود انسان کے مشاہدات، تجربات اور خود اس کے وجدانی جذبات کو پیش کر کے خداوند عالم

کے وجود اور اس کی صفاتِ قدسیہ کو ثابت کیا گیا ہے اور داعی الی اللہ کے لئے نا قابل تردید دلائل کا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے۔ مثلاً بحری سفر ہی کی ایک مثال دوسرے عنوان سے سورۃ بنی اسرائیل میں دی گئی ہے۔ ترجمہ یہ ہے:

"(اے لوگو) تمہارا رب وہ ہے جو تمہاری کاربرآریوں کے لئے سمندر میں جہاز چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو (بحری راستوں سے فائدے اٹھاؤ) بلاشبہ وہ تم پر بڑی ہی رحمت کرنے والا ہے۔ اور جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم سمندر میں ہوتے ہو اور مصیبت آلگتی ہے تو اس وقت وہ تمام ہستیاں تم سے کھو جاتی ہیں جنھیں تم پکارا کرتے ہو، صرف ایک اللہ ہی کی یاد باقی رہ جاتی ہے، پھر جب وہ تمہیں مصیبت سے نجات دیدیتا اور خشکی پر پہونچا دیتا ہے تو اس سے گردن موڑ لیتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ پھر کیا تمہیں اس سے امن مل گیا ہے کہ وہ تمہیں خشکی کے کسی گوشے میں دھنسا دے، یا تم پر پتھر برسانے والی آندھیاں بھیج دے، اور تم اس حالت میں کسی کو اپنا مددگار نہ پاؤ، یا تم اس بات سے بے خوف ہوگئے ہو کہ اللہ تمہیں دوبارہ ویسی ہی مصیبت میں ڈال دے اور ہوا کا ایک سخت طوفان بھیجدے اور تمہاری ناشکری کی پاداش میں تمہیں غرق کر دے، پھر کسی کو نہ پاؤ جو اس کے لئے ہم پر دعویٰ کرنے والا ہو۔ اور البتہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور خشکی اور تری دونوں کی قوتیں اس کے تابع کر دیں کہ اسے اٹھائے پھرتی ہیں۔ اور اچھی چیزیں اس کی روزی کے لئے مہیا کر دیں۔ نیز جو مخلوقات ہم نے پیدا کی ہے ان میں اکثر پر اُسے برتری دیدی، پوری برتری جیسی کہ ہونی چاہیئے۔" (آیت ۶۵ تا ۷۰، سورہ ۱۷ بنی اسرائیل)

طرزِ عمل

(الف) لَآ اِکْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (سورۂ بقرہ، رکوع ۳۴ آیت ۲۵۵)

"نہیں کوئی زور (جبر و قہر یا زبردستی) دین کی بات[1] میں"۔ کیونکہ دین کا مدار[2] اس پر ہے کہ دل مان[3] لے۔ اور تسلیم کر لے[4] جبر و قہر سے زبانی اقرار کرایا

---

[1] ترجمہ حضرت شاہ عبد القادر رحمہ اللہ۔

[2] اذ الاکراہ الزام الغیر فعلاً لا یرضی بہ الفاعل وذا لا یتصور الا فی افعال الجوارح اما الایمان فھو عقد القلب وانقیادہ لا یوجد بالاکراہ (تفسیر مظہری) وغیرہ۔

[3] ایک مسلمان اگر اسلام سے برگشتہ ہو کر معاذ اللہ کفر اختیار کرتا ہے تو اس کی وہ سزا ہے جو باغی کی ہوتی ہے یعنی وہ واجب القتل ہے لیکن ایسا شخص جس سے جبراً قہراً اقرار کرا لیا گیا وہ اگر اسلام سے منحرف ہوتا ہے تو کتب فقہ میں صراحت کر دی گئی ہے کہ اس کو قتل نہیں کیا جائیگا۔ ہدایہ اخیرین میں ہے ولو اکرہ علی الاسلام حتی حکم بالاسلام ثم رجع لم یقتل (کتاب الاکراہ) یعنی اگر مجبور کر کے مسلمان بنا لیا گیا یہاں تک کہ اسلام کے احکام اس پر جاری ہوگئے (مثلاً مسلمان رشتہ دار کا ترکہ اس کو مل گیا یا کسی مسلمان عورت سے اس کا نکاح کرا دیا گیا وغیرہ) پھر اس نے اسلام سے رجوع کر لیا اور عدالت میں بھی یہی بیان دیدیا کہ اس کو جبراً مسلمان بنایا گیا تھا تو مرتد کی سزا (قتل) اس کو نہیں دی جائے گی۔ شرح سیر کبیر میں یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے۔ اقرار المکرہ باطل سواء کان الاکراہ بالحبس او القتل (شرح سیر کبیر ص ۲۰۲) یعنی جس سے زبردستی کچھ کہلوا لیا گیا اس کا یہ اقرار باطل (قطعاً ناقابل اعتبار ہے) خواہ اس کو قید کی دھمکی دی گئی ہو یا قتل کی۔ [4] حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ قبیلہ بنی سالم بن عوف کے ایک انصاری صاحب جن کا اسم گرامی حصینؓ تھا ان کے دو لڑکے مسلمان نہیں ہوئے تھے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ وہ اپنے لڑکوں کو مجبور کریں کہ وہ اسلام لے آئیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی: لَآ اِکْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (تفسیر مظہری وغیرہ) "دین کی بات میں زور زبردستی نہیں"۔

جا سکتا ہے۔ دل سے منوایا نہیں جا سکتا۔ کوشش یہ کرو کہ دل کی آنکھیں کھلیں۔ گمراہی کو گمراہی اور ہدایت کو ہدایت سمجھنے لگے۔

(ب) اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (تا) وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (سورۂ ۴۱ حٰم السجدہ ع ۵ آیت ۳۴)

"برائی کا جواب دو ایسی صورت میں کہ وہی صورت سب سے اچھی (اخلاقاً سب سے زیادہ موثر) ہو تو تم دیکھو گے کہ جس سے تمہاری دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائیگا جیسے مخلص دوست (سرگرم محبت) آیت ۳۴ سورہ ۴۱

(ج) وَاِنْ عَاقَبْتُمْ (تا) لِّلصّٰبِرِیْنَ (سورہ ۱۶ نحل رکوع ۱۶ آیت ۱۲۶)

"اور اگر مخالفوں کی سختی کے جواب میں سختی کرو تو چاہیئے کہ ویسی ہی اور اتنی ہی کرو جیسی تمہارے ساتھ کی گئی۔ اور اگر تم نے صبر کیا (جھیل گئے اور سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا) تو بلاشبہ صبر کرنے والوں کے لئے صبر ہی بہتر ہے۔"

تشریح: (۱) قانون یہ ہے:

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (آیت ۴۰ سورہ ۴۲ شوریٰ)

"برائی کی سزا اُسی جیسی برائی ہے۔"

(۲) داعی الی اللہ اگر اس ضابطہ پر عمل کرتے ہوئے سختی کے جواب میں بالکل اتنی ہی اور اس جیسی ہی سختی کرے تو اس کے جواز سے انکار نہیں ہے مگر اس سے برائی اور سختی کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ کیونکہ جواب میں جو چیز وجود میں آ رہی ہے وہ بھی سختی اور برائی ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ابتداءً نہیں ہے جوابًا ہے۔

(۳) جب کوئی شخص مقام دعوت اپنائے ہوئے ہے تو یہ ناپ تول اس کی شان کے شایان نہیں ہے اس کی شایان شان یہ ہے کہ وہ ضبط و تحمل اور صبر سے کام لے اور جواب وہ دے

جو اس کی شان کے لحاظ سے بہت ہی بہتر ہو۔

(۴) داعی الی اللہ کا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ایسی صورت اختیار کرے اور اس کی کوشش کرے کہ برائی کا سلسلہ ختم ہو، جس کی شکل مثلاً یہ ہے کہ جو دشمن ہیں وہ سرگرم محبت دوست بن جائیں۔

(۵) "یہ بات بہت اونچی ہے۔ ہر شخص اس درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس اونچے درجے کو وہی حاصل کر سکتا ہے جو بڑا صاحب نصیب ہو۔" (آیت ۳۵، سورہ ۴۱ حٰم سجدہ)

بدی را بدی سہل باشد جزا ÷ اگر مردی احسن الی من اسا

خلاصہ

(۱) داعی جس بات کی دعوت دے ضروری ہے کہ اس کے متعلق اس کو پورا یقین ہو، جیسے مشاہدہ کرنے والے کو اپنے مشاہدہ کا یقین ہوتا ہے اور وہ اس پر شاہد ہوتا ہے۔

(۲) ضروری ہے کہ داعی کی فطرت با احساس ہو، ہمدرد اور غم خوار ہو، اس کے اندر شفقت ہو، درد ہو، سوز ہو، گداز ہو۔ وہ شمع یا چراغ کی طرح ہو۔

(۳) دعوت اس کے درد کا فغان ہو، اس کے سوز دروں کا شعلہ ہو۔

(۴) داعی مشفق طبیب کی طرح ہو، اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ داعی اس شفقت اور اس ہمدردی اور خیر خواہی کا پیکر اور مجسمہ ہو جو شفقت و ہمدردی باپ کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔

(۵) باپ کی تمنائیں اچھی ہی ہوتی ہیں۔ وہ اپنی اچھی تمناؤں کا خواب دیکھتا ہے تو اولاد کو بشارت بھی دیتا ہے کہ یہ کرلوگے تو اعلیٰ درجہ پالوگے اور یہ بات بہت ہی درد اور دکھ کی ہوتی ہے کہ اولاد ناہنجار اور بدکار ہو۔ یہ اس کی بدکاری کو دیکھ کر گھٹے، رنجیدہ ہو اور اولاد کو اس کی بدکاری کے خطرناک نتائج پر بار بار آگاہ اور متنبہ کرے۔

پس باپ اپنی فطری تمناؤں کے لحاظ سے پہلے مبشر ہوتا ہے اور نذیر مجبوراً ہوتا ہے۔ یہی شان داعی کی بھی ہوگی۔ وہ پہلے مبشر ہوگا اور نذیر بدرجہ مجبوری ہوگا۔

(۶) دعوت کا انداز سنجیدہ اور دانش مندانہ ہو۔ وہ مخاطب کو جانچے، تولے، پرکھے،

پھر اُس کی صلاحیت کے بموجب دعوت کا طرز اختیار کرے۔ اہلِ دانش سے دانش مندانہ، عوام سے اُن کے حال کے بموجب وعظ و پند اور خیر خواہانہ نصیحت کا اسلوب اختیار کرے۔ اور جو بحث کے شوقین ہوں اُن سے گفتگو مدلّل ہو۔

(۷) مخاطب کے مذہب کے لحاظ سے بھی دعوت کا انداز جدا جدا ہوگا۔ اہلِ کتاب کو دعوت اور طرح دی جائے گی، مشرک کو اس کے بموجب، اور منکرینِ خدا، عقل پرستوں سے افہام و تفہیم کا طرز و انداز جدا ہوگا۔[1]

(۸) داعی کے مزاج میں ضبط و تحمل ہو۔ وہ گستاخیوں اور سختیوں کو برداشت کرے، کڑوی بات کا جواب میٹھے بول سے دے۔ مخالف کو موافق اور دشمن کو دوست بنائے۔

(۹) داعی الی اللہ کا تعلق اپنے رب سے (جس کی طرف وہ دعوت دے رہا ہے) مضبوط ہو، اس کا اعتماد اور بھروسہ خدا پر ہو۔ وہ دعوت کو اپنا ایک فریضہ سمجھے جس کی ادائیگی اس کے ذمہ ہے۔ نتیجہ خدا کے حوالے کر دے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داعی اعظم بلکہ تمام داعیانِ حق کے امام و مقتدا تھے۔ قرآن پاک کی مندرجہ بالا آیتیں اور اس طرح کی بہت سی آیتیں شہادت دے رہی ہیں کہ داعی الی اللہ کے جملہ اوصاف و خصوصیات بدرجہ اَتم و اکمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر موجود تھے۔

---

[1] نمبر ۶، ۷ پر عمل جب ہی ہو سکے گا جب مخاطب کے مذہب سے واقفیت ہو۔ دعوت و تبلیغ کا نظام قائم کرنا اجتماعی فریضہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک داعی جملہ مذاہب سے واقف ہو۔ لیکن جس حلقہ کو دعوت کے لئے منتخب کیا جائے اُس کے لئے داعی معین ہوں۔ اور وہ اس حلقہ کے مذہبی رجحانات، معاشرتی رسومات و میلانات اور جذبات سے واقف ہوں۔

"کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْآن" عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

بلکہ حق یہ ہے کہ آپ کی ذاتِ باجود
منبع اور مرکز تھی۔ اوصاف داعی اور خصوصیات
دعوت اس سے اخذ کئے جاتے ہیں۔

حضرت حق جل مجدہٗ نے جب آپ کو تمام اُمتوں اور پوری کائنات انسانی کے لئے داعی بنایا تو ہر ایک فرد اور ہر ایک گروہ سے خطاب کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔ قرآن حکیم ان سب کا مجموعہ ہے۔ چند مثالیں اوپر گذر چکی ہیں۔

دعوت الی اللہ کی دشوارگذار گھاٹی

جہاد فی سبیل اللہ

یقیناً دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں کوئی جبر و قہر اور کوئی زبردستی نہ ہونی چاہیئے۔

بے شک داعیِ حق کا کام صرف یہ ہے کہ دلوں کے دروازوں پر دستک دیدے۔ اگر کوئی نہیں کھولتا تو بلاشبہ اس کو حق نہیں کہ کسی دروازے کو زبردستی کھولے یا کسی دریچے کو توڑے۔

یہ بھی درست ہے کہ داعی الی اللہ کو صبر و تحمل اور مسلسل برداشت سے کام لینا چاہیئے۔ لوہے کے کنگھے سے اس کا گوشت کھرچا جائے، اس کی بوٹیاں نوچی جائیں، اس کو کھولتے ہوئے کڑھائے میں ڈال دیا جائے، اس کے سر پر آرہ رکھ کر پورا بدن چیر کر دو ٹکڑے کر دیئے جائیں، تو اس کا کمال یہی ہے کہ وہ ضبط و تحمل، صبر اور برداشت سے کام لے۔ ظالم کے حق میں یہی دعا کرے: اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِي فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (اے اللہ میری قوم کو سیدھا راستہ دکھادے، وہ مجھے جانتے نہیں ہیں)۔ لیکن اگر شکل یہ ہو کہ مخلوقِ خدا ظلم کی چکّی میں پیسی جا رہی ہو، رائے کی آزادی سلب کر لی گئی ہو۔ پیٹ کو اگرچہ آسودگی میسّر ہو، مگر ضمیر کی آزادی پر تالے پڑے ہوئے ہوں، طائرِ فکر کو آہنی قفس میں گھونٹ دیا گیا ہو۔ ایک شخص کا ضمیر ایک بات کو حق سمجھتا ہو، وہ مضطرب اور بے چین ہو کہ اس حق کو قبول کرلے، مگر اس کو مجبور کیا جا رہا ہو کہ وہ اپنے ضمیر کے فیصلہ پر عمل نہ کرے، وہ حق کو حق نہ سمجھے بلکہ غلط اور باطل کو حق سمجھے۔ اگر وہ اپنے ضمیر کے فیصلہ پر عمل کرے اور باطل کے دائرے سے نکلنا چاہے تو پہلے اپنی جان سے ہاتھ دھولے، پہلے پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالے، پھر قدم بڑھانے کا ارادہ کرے۔

اگر صورتِ حال یہ ہو تو کیا داعیِ حق کا فرض اب بھی یہی ہوگا کہ وہ ظلم کے شعلوں کو

بھڑکتا ہوا دیکھتا رہے اور ان کو بجھانے کی کوشش نہ کرے۔ وہ مظلوموں کو جھلستا ہوا دیکھے، اُن کی آہیں سُنے اور اپنی جگہ سمٹا ہوا بیٹھا رہے، ظالم کا ہاتھ روکنے کی کوشش نہ کرے۔ اگر اس وحشت انگیز صورتِ حال کو ختم کرنے کے لئے داعی کے پاس کوئی چارہ کار نہیں ہے تو اس کی دعوت کا پروگرام ناقص ہے، ادھورا ہے، ناقابلِ قبول ہے۔

اگر داعی کی دعوت کا تعلق کسی خاص گروہ سے ہے اور وہ اسی گروہ کے نجات دہندہ کی حیثیت سے ظہور پذیر ہوا ہے تب بھی ممکن ہے کہ اس گروہ کے علاوہ باقی مخلوق سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو۔ کوئی ظالم ہو یا مظلوم، لیکن اگر داعی سارے جہان کا درد اپنے دل میں لے کر آیا ہے ـــــ اس کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا رشتہ پوری نوع انسان اور نوع انسان کے ہر طبقہ سے جڑا ہوا ہے۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ تمام دنیا جہان کے لئے رحمت ہو، ہر ایک کے درد کا درماں اور ہر ایک کے دکھ کا علاج ہو، تو لامحالہ اس کا فرض ہوگا کہ وہ ظلم کی اس چیرہ دستی کو ختم کرے اور مظلوموں کی آہ و بکا اور گریہ و زاری کو قلبِ مضطر کے کانوں سے سُنے، وہ ان کی فریاد رسی کے لئے اُٹھے اور اس عزم کے ساتھ اُٹھے کہ

یا جاں رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

یہی وہ جدوجہد ہے جو داعی پر بحیثیت داعی فرض ہے اور جس کو اسلام جہاد فی سبیل اللہ کہتا ہے۔

تمام جہانوں کا رب اور ساری مخلوق کا پروردگار اہلِ ایمان کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ (تا) نَصِيرًا ﴿۷۵﴾ (سورۂ نساء ع، آیت ۷۵)

"اور (مسلمانو!) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد ہیں، کتنی ہی عورتیں ہیں، کتنے ہی بچے ہیں (جو ظالموں کے ظلم سے عاجز آکر) فریاد کر رہے ہیں، خدایا! ہمیں

اس بستی[1] سے جہاں کے باشندوں نے ظلم پر کمر باندھ لی ہے نجات دلا،
اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کارساز بنادے اور کسی کو مددگاری کے لئے
کھڑا کردے۔"

یہ ہے جہاد فی سبیل اللہ۔ کیا اس کو دعوت الی اللہ کا ایک نہایت ضروری شعبہ نہیں کہا جائیگا
اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ دعوت الی اللہ بے دست و پا رہے گی جب تک اس میں قوتِ
مقابلہ نہ ہو جو ظالم کے ہاتھ روک سکے اور مظلوموں کو نجات دلانے کے لئے اقدام بھی کر سکے۔

---

[1] نزول آیت کے وقت یہ حالت مکہ کی تھی کہ وہاں بہت سے مسلمان مشرکین مکہ کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے۔ ابوجہل کے حقیقی بھائی حضرت سلمؓ اُن کے ماں شریک بھائی عیاش بن ابی ربیعہؓ۔ اور مکہ کے رئیس اعظم ولید بن مغیرہ کے لڑکے کہ ان کا نام بھی ولید ہی تھا (ولید ابن الولید) مسلمان ہوگئے تھے۔ اُن کو باندھ کر ڈال دیا گیا تھا کہ ہجرت نہ کر سکیں۔ اس طرح اور بھی عورتیں اور مرد تھے جو مجبور و مقہور تھے اور مکہ سے نکل نہیں سکتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں اُن کے لئے دُعا کیا کرتے تھے (بخاری شریف ص۱۱۰ و ص۱۳۶ ص۹۴۲ وغیرہ) لیکن ظاہر ہے آیت میں مکہ کی قید نہیں۔ جب بھی اور جہاں بھی یہ صورتِ حال ہو تو مسلمانوں کو جہاد کی ہدایت کی گئی ہے۔ بیشک دورِ حاضر کا بین الاقوامی قانون یہ ہے کہ کسی مملکت کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا کسی دوسرے ملک کو حق نہیں ہے) مگر ظاہر ہے یہ بین الاقوامی قانون انسانی ہمدردی اور خلقِ خدا کے فلاح و بہبود کے جذبہ سے نا آشنا ہے، کیونکہ دورِ حاضر کی حکمراں قوموں کا نصب العین صرف یہ ہے کہ ان کا اقتدار باقی رہے اور عظمت کے جس مینارہ پر وہ رونق افروز ہیں اس میں جنبش نہ آئے۔ بیشک ان قوموں کے افراد میں خلق خدا کی ہمدردی کا جذبہ موجود ہے اور اسی جذبہ کی بنا پر اُن کے یہاں بہت سے خیراتی ادارے اور بڑے بڑے خیراتی فنڈ قائم ہیں، مگر ان کی حکومتوں کا نصب العین نہ خلقِ خدا کی خدمت ہے، نہ انسانی ہمدردی، نہ کوئی اخلاقی اور روحانی دعوت اُن کے مقاصد میں داخل ہے۔ یہی سبب ہے کہ ممالک کی اندرونی تحریکات خواہ کتنی ہی انسانیت کش اور ہلاکت انگیز ہوں مگر بین الاقوامی پنچایت کوئی مداخلت نہیں کرتی۔ اسلام اس سنگدلی کو برداشت نہیں کرتا۔

یہ جہاد کب تک رہے گا؟ ربّ العالمین نے اس کی یہ حد بیان فرمائی ہے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۔

(سورۂ ۸ الانفال، رکوع ۵، آیت ۳۸)

"ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ ظلم و فساد[1] باقی نہ رہے اور دین کا سارا معاملہ اللہ[2] ہی کے لئے ہو جائے (انسان کا ظلم اس میں[3] مداخلت نہ کر سکے)۔"

---

[1] آیت میں لفظ فتنہ ہے۔ یعنی لڑتے رہو جب تک فتنہ نہ رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر یہ فرمائی: کان الاسلام قلیلا کان الرجل یفتن فی دینه اما قتلوہ واما یعذبوہ حتی کثر الاسلام فلم تکن فتنته - بخاری شریف ص۶۴۸ - یعنی مسلمان تھوڑے تھے، جو شخص مسلمان ہوتا وہ اپنے دین کے بارے میں مصیبت میں مبتلا ہو جاتا تھا یا اس کو قتل کر دیتے تھے یا عذاب میں مبتلا کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ اسلام کی کثرت ہو گئی تو یہ فتنہ نہ رہا۔ یعنی مخالفین دین کا ظلم و فساد نہیں رہا۔ [2] یعنی اعتقاد کی آزادی حاصل ہو جائے اور دین کا معاملہ جس کا تعلق صرف اللہ سے ہے خدا اور انسان کا باہمی معاملہ ہو جائے، انسان کے ظلم و تشدد کی مداخلت باقی نہ رہے۔

[3] اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ ملک جہاں اس طرح کا بیجا دباؤ اور ظلم و زیادتی ہو وہ اسلامی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے باجگذار ہو جائے یا وہ افراد جو اس طرح کے ظلم میں شریک اور اس کے معاون و مددگار ہیں اسلامی حکومت کے تحت میں آکر حفاظتی ٹیکس (جزیہ) ادا کرنے لگیں حکومت ان کی جان و مال کی عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ دار ہو جائے۔ سورہ ۹ توبہ آیت ۲۸ میں اس کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔

خطابات و عمومی ارشادات

مکہ معظمہ سے تشریف لاکر چند روز قبا میں قیام رہا، پھر جمعہ کے روز قبا سے روانہ ہوئے تو قبیلۂ بنی سالم بن عوف کے میدان[1] میں جمعہ کی نماز[2] پڑھی - پھر آپ مدینہ منورہ میں رونق افروز ہوئے - ان مقامات پر آپؐ نے جو تقریریں فرمائیں مؤرخین نے اُن کو جمع کیا ہے - دو تقریریں ابن اسحاق نے نقل کی ہیں[3] - ان کا ترجمہ یہاں پیش کیا جارہا ہے:

(۱)

"ایّہا النّاس! (اے لوگو) خوب سمجھ لو، کچھ پہلے سے بھیجدو، جو خود تمہارے کام آئے گا - خدا کی قسم یقیناً ایسا ہوگا کہ ہر شخص پر (قیامت کی) بے ہوشی طاری ہوگی (جس کے پاس جو کچھ ہے یہیں رہ جائے گا) بکریوں والا بکریاں چھوڑ جائے گا اُن کا کوئی گلہ بان نہ ہوگا - وہ اپنے رب کے سامنے کھڑا ہوگا یقیناً ایسا ہوگا کہ اس کا پروردگار براہِ راست اس سے خطاب فرمائے گا، نہ کوئی بیچ میں ترجمان ہوگا نہ کوئی رکاوٹ کی چیز درمیان میں حائل ہوگی (جو اُس کے لئے آڑ بن سکے) اُس کا پروردگار کہے گا: کیا میرے رسول نے تمہارے پاس پہونچکر تبلیغ نہیں کی تھی! کیا یہ تمام باتیں تمہیں نہیں بتادی تھیں، کیا میں نے تجھ کو مال نہیں دیا تھا -

---

[1] اس میدان کا نام وادی رانوانا ہے - البدایہ والنہایہ صفحہ ۲۱۲ ج ۳

[2] اس موقع پر جو آپؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا حافظ ابن کثیر نے ابن جریر کے حوالہ سے اس کو نقل کیا ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۲۱۳ البدایہ والنہایہ جلد ۳ یہ طویل خطبہ ہے اس کے کچھ حصے خطبات ماثورہ میں بھی دیئے گئے ہیں

[3] سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۳۰۰ و صفحہ ۳۰۱ ج ۱

کیا تیرے اوپر میں نے اپنا فضل نہیں کیا تھا، پس بتا تو خود اپنے لئے کیا لے کر آیا ہے۔ یہ شخص اپنے دائیں دیکھیگا، اپنے بائیں دیکھے گا، اس کی دولت کا کہیں نام ونشان نہ ہوگا۔ وہ آگے کی طرف نظر ڈالے گا، وہاں دہکتے ہوئے جہنّم کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ بس دیکھو! دوزخ کی آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ جو کچھ امکان میں ہو خرچ کرو اور اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ کچھ نہ ہو چھوارے کا ایک ریزہ ہو، وہی خرچ کرو، جس کے پاس یہ بھی نہ ہو وہ میٹھے بول، اچھی بات سے غریبوں کی دلداری کرے۔ اس کا بھی اس کو ثواب ملے گا۔ نیکی کا ثواب دس گُنے سے شروع ہوتا ہے۔ اور سات سو گُنے تک پہونچتا ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔"

(۲)

" بیشک تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ میں اس کی حمد کرتا ہوں اس سے مدد مانگتا ہوں، ہم اپنے نفسوں کی شرارت سے اور اپنے اعمال بد کے شر سے خدا کی پناہ لیتے ہیں، جس پر اللہ تعالیٰ ہدایت کے راستے کھول دے، پھر کوئی اس کو گمراہ نہیں کرسکتا۔ اور جس کو بھٹکا دے تو کوئی نہیں ہے جو اس کو سیدھی راہ پر لگا سکے۔

میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، وہ اکیلا ہے اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے۔ بیشک سب سے اچھا کلام کتاب اللہ ہے۔ یقیناً وہ شخص کامیاب ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ اپنے کلام کو سجادے اور جس کو اللہ تعالیٰ کفر سے ہٹا کر اسلام میں داخل کردے۔ یقیناً وہ شخص کامیاب ہے جس نے انسانوں کے کلام اور اُن کے قصّوں کے مقابلے میں اللہ کے کلام کو منتخب

کیا ہو، کیونکہ کلام اللہ ہی سب سے بہتر بات، سب سے بہتر کلام، اور سب سے بلیغ قصہ ہے۔

(دیکھو) اس سے محبت کرو، جو اللہ سے محبت کرتا ہے۔ (دیکھو) خدا سے محبت کرو، دل کی گہرائی سے، اپنے دلوں کو اسی میں لگادو۔ اللہ کے کلام اور اللہ کے ذکر سے نہ اکتاؤ۔ تمہارے دلوں میں یہ سختی ہرگز نہ ہو کہ تم اس کی یاد سے غافل ہو جاؤ۔

(یاد رکھو اور سمجھ لو) اللہ تعالیٰ جو مخلوق پیدا کرتا ہے اس میں سے کچھ کو منتخب کر کے اپنے لئے مخصوص کر لیتا ہے۔ جو اعمال اس کو پسند ہیں، جن بندوں کو وہ پسند کرتا ہے، جو بات اس کو پسند ہے، اس نے نام لیکر ان کو بتا دیا ہے اور معین کر دیا ہے (تم بھی اسی کو پسند کرو) اس نے حلال اور حرام کو کھول کر بتا دیا ہے۔ بس اللہ کی عبادت کرو، کسی کو اس کا شریک نہ گردانو۔ پورا پورا تقویٰ کرو۔ تمہاری زبان سے جو باتیں نکلتی ہیں ان میں خوبی پیدا کرو کہ ان سے اللہ تعالیٰ کی تصدیق ہو۔ وہ اس کی مرضی کے مطابق ہوں۔ اللہ کی بھیجی ہوئی روح (ذات اقدس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے درمیان ہے، اس سے پوری پوری محبت کرو۔ تمہاری فطرت اپنے رب سے ایک عہد کئے ہوئے ہے (کہ رب وہی ہے اس کے سوا کوئی رب نہیں ہے) اس عہد کو پورا کرو۔ اللہ تعالیٰ کا غضب اس پر نازل ہوتا ہے کہ اس عہد و پیمان کو توڑا جائے، جو فطرت انسان اپنے رب سے کئے ہوئے ہے۔"

مدینہ طیبہ میں سب سے پہلا خطبۂ جمعہ

حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ نے ابن جریر کے حوالے سے وہ پورا خطبہ نقل کیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی سالم بن عمرو بن عوف میں نماز جمعہ کے وقت ارشاد فرمایا تھا۔ ہم اس خطبہ کو تبرکاً پورا نقل کرتے ہیں اس کے بعد ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے۔ ائمہ صاحبان جمعہ کے روز یہ خطبہ پڑھیں تو نورٌ علیٰ نور و سعادت بالا سعادت کا مصداق ہو:

خطبة التقوىٰ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَحْمَدُهٗ وَاَسْتَعِيْنُهٗ وَاَسْتَغْفِرُهٗ وَاَسْتَهْدِيْهِ
وَاُؤْمِنُ بِهٖ وَلَا اَكْفُرُهٗ وَاُعَادِيْ مَنْ يَّكْفُرُ بِهٖ وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ
اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ
وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ وَالنُّوْرِ وَالْمَوْعِظَةِ
وَالْحِكْمَةِ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ وَقِلَّةٍ مِّنَ الْعِلْمِ وَضَلَالَةٍ
مِّنَ النَّاسِ وَانْقِطَاعٍ مِّنَ الزَّمَانِ وَدُنُوٍّ مِّنَ السَّاعَةِ وَقُرْبٍ
مِّنَ الْاَجَلِ، مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ رَشَدَ وَمَنْ يَّعْصِ
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ غَوٰى وَفَرَّطَ وَضَلَّ ضَلَالًا بَعِيْدًا،
اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ فَاِنَّهٗ خَيْرُ مَا اَوْصٰى بِهِ الْمُسْلِمُ الْمُسْلِمَ
اَنْ يَّحُضَّهٗ عَلَى الْاٰخِرَةِ وَاَنْ يَّاْمُرَهٗ بِتَقْوَى اللّٰهِ فَاحْذَرُوْا
مَا حَذَّرَكُمُ اللّٰهُ مِنْ نَّفْسِهٖ، وَاِنَّ تَقْوَى اللّٰهِ لِمَنْ عَمِلَ بِهٖ عَلٰى
وَجَلٍ وَّمَخَافَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ عَوْنٌ وَّصِدْقٌ عَلٰى مَا تَبْتَغُوْنَ مِنَ
الْاٰخِرَةِ، وَمَنْ يُّصْلِحِ الَّذِيْ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اللّٰهِ مِنْ اَمْرِهٖ فِي السِّرِّ
وَالْعَلَانِيَةِ لَا يَنْوِيْ بِهٖ اِلَّا وَجْهَ اللّٰهِ يَكُنْ لَّهٗ ذِكْرًا فِيْ
عَاجِلِ اَمْرِهٖ وَذُخْرًا فِيْمَا بَعْدَ الْمَوْتِ حِيْنَ يَفْتَقِرُ الْمَرْءُ اِلٰى
مَا قَدَّمَ وَمَا كَانَ مِمَّا سِوٰى ذٰلِكَ يَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهٗ اَمَدًا بَعِيْدًا،
وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ، وَهُوَ الَّذِيْ صَدَقَ

قَوْلُهٗ وَاَنْجَزَ وَعْدَهٗ لَا خُلْفَ لِذٰلِكَ وَاِنَّهٗ يَقُوْلُ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ

لَدَيَّ وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ فِيْ عَاجِلِ اَمْرِكُمْ

وَاٰجِلِهٖ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ فَاِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ تُوُقِّيَ مَقْتَهٗ

وَتُوُقِّيَ عُقُوْبَتَهٗ وَسَخَطَهٗ وَاِنَّ تَقْوَى اللّٰهِ تُبَيِّضُ الْوُجُوْهَ وَتُرْضِي

الرَّبَّ وَتَرْفَعُ الدَّرَجَةَ فَخُذُوْا بِحَظِّكُمْ وَلَا تُفَرِّطُوْا فِيْ جَنْبِ

اللّٰهِ فَقَدْ عَلَّمَكُمْ بِكِتَابِهٖ وَنَهَجَ لَكُمْ سَبِيْلَهٗ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ

صَدَقُوْا وَيَعْلَمَ الْكَاذِبِيْنَ فَاَحْسِنُوْا كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ

وَعَادُوْا اَعْدَاۤئَهٗ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ

وَسَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ

حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ فَاَكْثِرُوْا ذِكْرَ اللّٰهِ

وَاعْمَلُوْا لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ فَاِنَّهٗ مَنْ يُّصْلِحْ مَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اللّٰهِ

يَكْفِهِ اللّٰهُ مَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ النَّاسِ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يَقْضِيْ عَلَى

النَّاسِ وَلَا يَقْضُوْنَ عَلَيْهِ وَيَمْلِكُ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَمْلِكُوْنَ

مِنْهُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ

(تاریخ طبری صفحہ ۲۵۵ ج ۲ والبدایہ والنہایہ صفحہ ۲۱۳ ج ۳)

ترجمہ: میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں، اس سے مدد کی درخواست کرتا ہوں۔ گناہوں کی مغفرت چاہتا ہوں اور نیک ہدایت کی التجا کرتا ہوں۔ میں اس پر ایمان لاتا ہوں۔ میں اس ذاتِ برحق کا منکر نہیں ہوں۔ میں اس کا دشمن ہوں جو اس ذاتِ برحق کا انکار کرے میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ جو یکتا اور تنہا ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے، اس خدا کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں ہے اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس رسول۔ محمد

---

[1] اپنے رسول اور نبی ہونے پر یقین رکھنا نبی اور رسول کو بھی ضروری ہے۔ گورنر فرائض منصبی جب ہی ادا کر سکتا ہے جب اس کو اپنے گورنر ہونے کا یقین ہو اور خود بھی اپنے آپ کو گورنر مانتا ہو۔ اس کے بغیر اپنے فرائض کا احساس نہیں کر سکتا۔ یہ تکبر نہیں ہے بلکہ اعتراف ہے۔

کو ہدایت، دین حق نور کامل اور پند و نصیحت اور حکمت و دانش کی نعمتیں سپرد کر کے ایسے وقت مبعوث فرمایا کہ صدیاں گذر گئی تھیں۔ سلسلہ رسالت منقطع ہو چکا تھا، علم مولیٰ ناپید اور مفقود تھا، گمراہی کی گرم بازاری تھی، نور ہدایت پر اندھیری چھائی ہوئی تھی۔ (دوسری طرف حالت یہ ہے کہ) یہ دنیا جس کو زمانہ کہتے ہیں اس کا سلسلۂ ازل سے چل رہا ہے، اب ٹوٹنے کے قریب ہے۔ قیامت سر پر ہے اور اس عالم کی آخری میعاد ختم ہو رہی ہے (اب اللہ تعالیٰ کا کوئی اور پیغام آنے والا نہیں ہے) اب جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے ہدایت اور کامیابی حاصل کر لی اور جو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت سے روگردانی کر رہا ہے، وہ گمراہ ہے اپنا فرض ادا کرنے میں حد سے زیادہ کوتاہی کر رہا ہے۔ اور صحیح راستہ سے بہت دور بھٹک رہا ہے۔

اے لوگو! میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنے کی وصیت[1] کرتا ہوں۔ اور دیکھو سب سے بہتر نصیحت جو ایک مسلمان دوسرے کو کرے یہی ہے کہ اس کو آخرت پر آمادہ کرے (یعنی ایسے کاموں کا شوق دلائے جو مرنے کے بعد کارآمد ہوں) اور یہ کہ خدا ترسی کی ہدایت کرتا رہے اور تاکید کرتا رہے کہ پرہیزگاری اور پارسائی کی زندگی اختیار کریں۔

اے لوگو! ان باتوں سے پرہیز کرو جن سے بچنا اور پرہیز کرنا اتنا ضروری ہے کہ خود اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ نے ان سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ اس سے افضل کوئی نصیحت ہو سکتی ہے اور نہ کوئی تذکیر

---

[1] یعنی دردمندانہ نصیحت جس میں وہ اخلاص ہو جو ایک مرنے والے کے قول میں ہو سکتا ہے جب آخری منزل میں ہوتا ہے اور عقوبت کا نظارہ اس کے سامنے ہوتا ہے۔

اور یاد دہانی، اس سے زیادہ ضروری اور مفید ہو سکتی ہے۔

دیکھو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنا اور اس طرح تقویٰ کرنا کہ دل لرز رہا ہو اور خوفِ خدا ذہن و دماغ پر چھایا ہوا ہو۔ یہ تقویٰ ایک عمل کرنے والے کے لئے بہت بڑا معاون اور بہت بڑا مددگار اور نہایت مخلص رفیق ہے۔

اور جو شخص ظاہر و باطن میں اپنا معاملہ اللہ سے درست کر لے، جس سے مقصود محض رضاءِ خداوندی ہو، کوئی دنیاوی غرض اور مصلحت پیشِ نظر نہ ہو، تو یہ ظاہر و باطن کی مخلصانہ اصلاح دنیا میں اس کے لئے باعزت یادگار، اور ما بعد الموت کے لئے بہترین ذخیرہ ہے۔ جس وقت انسان ان اعمال کا سب سے زیادہ ضرورت مند ہوگا جو اس نے پہلے سے بھیجے ہوں۔

(دیکھو) (خدا ترسی اور ظاہر و باطن کی اصلاح کی کوشش کارآمد چیزیں یہی ہیں جو مرنے کے بعد انسان کی بہترین رفیق ہوں گی) ان کے علاوہ جو بھی ہے وہ انسان کے لئے یہاں تک بے کار ہے کہ قیامت کے روز انسان تمنا کرے گا کہ کاش اس عمل کے اور میرے درمیان مدّت دراز کی مسافت ہوتی۔

یاد رکھو! اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے اس کی بے انتہا مہربانی اور اس کے بے پایاں رحم و کرم ہی کا تقاضا ہے کہ وہ خود اپنی ذات کا تم کو خوف دلا رہا ہے (کہ تم غافل، لاابالی نفس پرست نہ بنو کہ اللہ کے عذاب کے مستحق ہو جاؤ کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہوتا ہے۔ اس کی طاقت بھی بے پایاں ہے جس کو عذاب دینا چاہے تو کوئی نہیں جو اس کے عذاب کو روک سکے)۔

اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے کہ اس کا قول حق ہے، جو کچھ کہتا ہے سچ کہتا ہے، جو وعدہ کرتا ہے پورا کرتا ہے اس میں خلاف نہیں ہوتا۔ اس کا ارشاد

ہے کہ اس کی بات پلٹی نہیں جاتی اور وہ بندوں پر ظلم بھی نہیں کرتا۔

پھر وہی بات ہے، اللہ سے تقویٰ کرو، موجودہ وقت اور حالت میں بھی اور مستقبل میں بھی، پوشیدہ بھی اور علانیہ بھی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ فرماتا ہے اور اُس کے اجر کو بڑھاتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرے وہ کامیاب، پورا پورا کامیاب، بہت بڑی کامیابی کے ساتھ کامیاب۔

غرض یہ ہے کہ بہرصورت خوفِ خدا کو سامنے رکھو۔ خوفِ خدا وہ اکسیر ہے جو عذابِ خدا سے بچاتا ہے اُس کی سزا اور اس کی ناراضی سے محفوظ رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے تقویٰ کرنا اور خوفِ خدا وہ تریاق ہے جو چہرہ کو روشن کر دیتا ہے، رَب کو راضی کرتا ہے اور درجہ کو بلند کرتا ہے۔ پس جہاں تک ممکن ہو تقویٰ کا حصّہ پُورا پورا حاصل کرو۔ اور دیکھو بارگاہ ربّ العزت کے حق میں کوتاہی مت کرو۔ اللہ تعالیٰ کے اس احسانِ عظیم کی قدر کرو کہ اُس نے اپنی کتاب میں تمہیں کامل و مکمل تعلیم دی ہے۔ تمہارے لئے واضح طور پر راستہ مقرر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لئے کر دیا کہ جھوٹے اور سچے کُھل کر سامنے آجائیں۔ پس جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان فرمایا ہے، تم بھی احسان کرو۔ تمہارا احسان یہ ہے کہ خود اپنے افعال اور اعمال کو درست کرو۔ اللہ تعالیٰ کے دوستوں سے دوستی رکھو، اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن جانو۔ اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں پرجوش اور سرگرم جدوجہد پُوری طرح کرتے رہو۔ وہی ربّ العزّت ہے، وہی مولا برحق ہے جس نے تمہیں اپنے دینِ کامل کے لئے منتخب فرمایا۔ تمہارا نام "مُسلم" رکھا تا کہ جو برباد ہو تو اس حالت میں برباد ہو کہ کھلی ہوئی حجّت اس کے سامنے ہو —— اُس کو یہ عذر نہ رہے کہ اُس کے سامنے بات واضح نہ ہو سکی اور جو زندہ رہے تو اس طرح زندہ

رہے تو اس طرح زندہ رہے کہ اپنے زندہ رہنے کی دلیل اور حجت اس کے پاس ہو۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ ۔ (" اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر ہماری نہ کوئی فکری طاقت ہے نہ عملی قوت")

دیکھو مختصر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو۔ اور مابعد الموت کے لئے عمل کرتے رہو۔ (اور پوری طرح سمجھ لو) کہ جو بندہ اس رشتہ کو درست کر لیتا ہے جو اس کے اور اس کے پروردگار کے مابین ہے تو خود اللہ تعالیٰ ذمہ دار بن جاتا ہے کہ اُن معاملات کو درست کردے جو اس بندے اور دوسرے انسانوں کے درمیان ہیں۔

(بات صاف ہے) اللہ تعالیٰ کی حکومت ہے۔ وہ انسانوں پر حکومت کرتا ہے اور انسانوں کے حق میں اپنے فیصلے نافذ کرتا ہے۔ انسان اپنے پروردگار کے مالک نہیں ہیں، نہ انھیں خالق ارض و سما کی کسی بات پر کوئی قابو ہے۔ کبریائی اور عظمت صرف اللہ کے لئے ہے۔ ہم میں نہ کوئی طاقت ہے نہ قوت ہے' جو کچھ قدرت و طاقت ہے' وہ خدا کی مہربانی اور اس کی مدد سے ہے جو بلند و بالا اور بہت بڑی شان والا ہے۔"

مقام فکر اور دلیلِ صداقت

اِن تمام خطبوں پر ایک دفعہ اور نظر ڈالئے۔ موضوع خطاب کیا ہے، بار بار زور کس بات پر دیا جا رہا ہے۔

خدا کا خوف۔ اللہ سے ظاہر و باطن ہر طرح سے ڈرتے رہنا، ظاہر و باطن کی اصلاح، اللہ کو یاد رکھنا اور کثرت سے یاد کرنا۔

غور فرمایئے یہ خطبے کب دیئے جا رہے ہیں؟ یہ خطبے خاص اس وقت جب مخالفین تحریک اور دشمنانِ اسلام کی منصوبہ بند کوششوں سے جان بچا کر سانس لینے کا پہلا موقعہ ملا ہے جبکہ آپ کا

سرقلم کرنے والوں یا گرفتار کرنے والوں کے لئے بڑے سے بڑے انعام کا اعلان فضا میں گونج رہا ہے۔

اوّل سے آخر تک خطبوں کے ایک ایک حرف پر نظر ڈال لیجئے۔ کیا کہیں کوئی ایک لفظ، کوئی اشارہ، کوئی کنایہ بھی ان دشمنوں کی طرف ہے؟

ان تیرہ سالہ زندگی کی بے پناہ اور مسلسل مصیبتوں کا جو خود اپنے عزیزوں اور اہل قبیلہ کی طرف سے ڈالی گئی تھیں کیا کوئی ذکر ہے؟

غور فرمایئے! وسعتِ ظرف، علو حوصلہ، بلندی ہمت۔

سوچئے! کیا ایسی ذات بابرکات کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس نے خدا کے نام پر جھوٹ بولا۔ (معاذ اللہ)

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے

نئے میدانِ عمل میں پہلے کام

(۱)
تعمیرِ مساجد واقامتِ صلوٰۃ

(۱) لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝

(سورہ ۹ توبہ ع ۱۳، آیت ۱۰۸)

"البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول دن[1] سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے، اس کی پوری پوری حقدار ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو (اور بندگان الٰہی تمہارے پیچھے نماز پڑھیں) اس میں ایسے لوگ (آتے) ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ پاک صاف رہیں اور اللہ تعالیٰ (بھی) پاک صاف رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔"

(۲) اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ

---

[1] اوّل یوم کے معنی یہی کئے گئے ہیں کہ اوّل یوم وجودہ یا اوّل یوم بناءہ — یعنی وجود میں آنے کے پہلے دن سے یا تعمیر کے پہلے دن سے۔ لیکن یہاں یہ نکتہ بھی نظر انداز نہ ہونا چاہیے کہ یوم کے معنی دَور کے بھی آتے ہیں۔ کما فی قولہ تعالیٰ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ (المفردات فی غریب القرآن) یعنی ہجرت کے بعد جو دور شروع ہوا اُس کے آغاز میں۔ اور یہی سبب ہے کہ اس اول یوم کو تاریخ، یعنی سنہ ہجری کا پہلا دن مانا گیا۔ افاد السھیلی ان الصحابۃ رضی اللہ عنھم اخذوا التاریخ من قولہ تعالیٰ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ۔ (وفاء الوفاء ص۱۸۱ ج۱) یعنی صحابہ کرام نے لمسجد اسس علی التقوٰی من اوّل یوم سے ہی استدلال کرتے ہوئے سنہ ہجری کا آغاز اس دن سے کیا ہے۔

وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ (سورہ ۹ توبہ ع ۳، آیت ۱۸)

"فی الحقیقت مسجدوں کو آباد کرنے والا تو صرف وہ ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے، نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے اور اللہ کے سوا اور کسی کا ڈر نہ مانے۔ جو لوگ ایسے ہیں انھیں سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ہدایت یاب (سعادت اور کامیابی کی راہ پانے والے) ہوں گے۔"

(۲) وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝

(سورہ ۲ بقرہ ع ۵، آیت ۴۲)

"نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور سر نیاز خم کرو ان کے ساتھ جو اللہ کی بارگاہ میں سر جھکا رہے ہیں۔"

مسجدِ قبا قبا کا قیام عارضی تھا مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی لمحہ اس فرض کی انجام دہی میں صرف نہ ہوتا جس کے لئے وہ خدا کے رسول اور پیغامبر بنائے گئے تھے۔

اقامتہ دین[۱]، جو انبیاء علیہم السلام کا نصب العین ہوتا ہے اس کا پہلا کام ہے اقامۃ الصلوٰۃ یعنی ایسا ماحول بنانا اور ایسی جماعت تیار کرنا جس کی آنکھوں کی ٹھنڈک نماز اور جس کے دل کا چین ذکر اللہ ہو۔

قبا پہونچ کر سب سے پہلے آپ نے اس فرض کو انجام دیا۔ اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے جو نمبر اول میں تحریر کی گئی ہے۔

---

[۱] یعنی دین کے منشاء اور مقصد کو صحیح طور سے سمجھنا اس کے تمام پہلوؤں کا خیال رکھنا اور پوری مستعدی سے اس کو جامۂ عمل پہنانا۔

جماعت

خدا پرستی یعنی خدا ر واحد کی عبادت آپ کی فطرت تھی۔ شب معراج میں خاص نوعیت کی تعلیم دی گئی اور اگلے روز حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نازل ہوکر پانچوں وقت کی نمازوں کی عملی تعلیم بھی دیدی۔ دو روز تک پانچوں وقت کی نمازیں پڑھا کر جس طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ارکان اور اوقات نماز کی تعلیم دی۔ جماعت اور نماز باجماعت کا طریقہ بھی بتادیا، لیکن جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں رہے تسلسل کے ساتھ نماز باجماعت کا موقع نہیں مل سکا، جہاں اسلام کا نام لینا ہی مشکل تھا وہاں جماعت کا سلسلہ کس طرح قائم ہوسکتا تھا۔ مدینہ کے حضرات اسلام سے مشرف ہوئے۔ اُن کی تعلیم کے لئے خاص خاص حضرات کو بھیجا گیا، یہاں کچھ حلقے مسلمانوں کے قائم ہوئے تو نمازوں کی جماعتوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔

پھر ان حضرات نے اپنے ہی اجتہاد سے ہفتہ میں ایک روز عمومی جماعت کے لئے بھی مقرر کرلیا اور سرور کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ معظمہ میں تھے کہ نماز جمعہ کی فرضیت بھی نازل ہوگئی، جس نے حضرات صحابہؓ کے اجتہاد کی تصدیق کردی۔ صحابہ کرام کا یہ اجتہاد وہ تھا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فخر کیا کرتے تھے کہ یہود اور نصاریٰ نے ہفتہ میں ایک دن عمومی اجتماع کے لئے مقرر کیا مگر وہ منشار خداوندی کے مطابق نہیں تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اُس نے ہمیں اس دن کی توفیق بخشی جو منشار خداوندی کے عین[1] مطابق تھا۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کوئی مسجد تعمیر نہیں ہوئی تھی اور تاریخ اسلام اب تک بجز ایک مسجد کے جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مکہ معظمہ میں اپنے مکان کے سامنے میدان[2] میں بنالی تھی کسی اور مسجد کی تعمیر سے ناآشنا تھی، کوئی مکان کوئی میدان یا کسی میدان

[1] ھذا یومھم الذی فرض علیھم فاختلفوا فیہ فھدانا اللہ ۔ الحدیث (بخاری شریف باب فرض الجمعہ ص۱۲۰)

ھذا یومھم الذی فرض علیھم یعنی الفرد المنتشر الصادق بالجمعہ فی حقنا وبالسبت والاحد فی حقھم (فاختلفوا فیہ فھدانا اللہ لہ) ای لھذا الیوم کما ھو عند اللہ۔ (حجۃ اللہ البالغہ ص۲۶ ج۲)

[2] بخاری شریف ص۵۵۳

کا کوئی حصّہ نماز کے لئے مقرر کر لیا جاتا تھا، وہاں لوگ نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ عموماً بکریوں کے باڑے[1] میں کسی حصّہ کو نماز کے لئے مخصوص کر لیا کرتے تھے، ورنہ جہاں وقت آتا نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔

قبا کا قیام عارضی تھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ کتنے روز قیام رہا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ صرف تین روز قیام رہا، مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس عارضی قیام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کی بنیاد ڈالدی[2]۔ کلثوم بن ہدم جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے میزبان تھے انھیں کا ایک میدان تھا جس میں کھجور سکھائے جاتے تھے۔ اسی میدان میں یہ مسجد تعمیر کی گئی۔ سب سے پہلے آپ نے پتھر رکھا۔ دوسرا پتھر حضرت صدیق اکبر اور تیسرا فاروق اعظم سے رکھوایا (رضی اللہ عنہم) پھر جملہ صحابہ نے حصّہ لیا۔ خود ہی مزدور تھے اور خود ہی معمار، مزدوروں میں خود آقا، دو جہاںؐ بھی شامل رہے۔ بھاری بھاری پتھر اُٹھاتے وقت جسم مبارک خم ہو جاتا۔ مٹّی بدن اطہر پر پڑتی۔ کوئی صحابی آگے بڑھ کر پتھّر لے لیتا تو آپ دوسرا اُٹھا لیتے تھے[3]۔

مسجد کی تعمیر کے ساتھ آدابِ معاشرت اور اخلاق کی تعمیر بھی ہوئی حتیٰ کہ کلام اللہ شریف میں جب مسجد کا تذکرہ فرمایا تو ساتھ ساتھ اہل مسجد کی بھی تحسین فرمائی: فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا، ''اس میں وہ لوگ ہیں جو محبّت کرتے ہیں اس بات سے کہ پاک صاف رہیں''۔ پھر ان کو شرف لازوال اور فخر دائم یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کا پروانہ بھی عطا ہو گیا: وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ ۝ (''اللہ تعالیٰ محبّت فرماتے ہیں پاک صاف رہنے والوں سے'')۔

---

[1] یہ باڑے رہائشی مکانوں کے قریب ہوتے تھے اور عام لوگ انھیں باڑوں میں رہا بھی کرتے تھے۔

[2] واسس المسجد الذی اُسّس علی التقویٰ۔ بخاری شریف ص۵۵۵ وفاء الوفاء کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل بعد میں ہوئی۔ مدینہ میں قیام فرمانے کے بعد آپؐ صحابہ کرامؓ کے ساتھ قبا تشریف لائے اور مسجد کی تعمیر کرائی۔ وفاء الوفاء ص۱۷۹ ج۱ [3] وفاء الوفاء ص۱۸۰ ج۱

مسجد مدینہ (مسجد النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام)

قبا سے مدینہ تشریف آوری ہوئی تو جس جگہ ناقہ بیٹھا تھا، وہی جگہ مسجد کے لئے منتخب کی گئی۔

یہ جگہ ایک میدان کے کنارہ پر تھی۔ قبیلہ بنی نجار کے حضرات یہاں نماز[1] پڑھا کرتے تھے۔ زمین کے مالک یہاں کھجوریں بھی سکھایا کرتے تھے۔ میدان کے باقی حصہ میں کھجور کے درخت کھڑے تھے۔ کچھ پرانی قبریں اور کچھ مکانوں کے کھنڈر تھے۔ ایک طرف کچھ نشیب تھا وہاں پانی بھر جاتا تھا۔ اس خرابہ کی قسمت جاگی۔ سیدالانبیا صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کو مسجد کے لئے منتخب فرمایا۔ یہ طول وعرض میں سو سو گز سے کچھ زائد[2] تھا۔

سہلؓ اور سہیلؓ کے والد رافع بن ابی عمرو کا انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت اسعد بن زرارہؓ ان کے مربّی تھے۔ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ میدان ان ہی یتیموں کا تھا۔ انھوں نے چاہا کہ بلا کسی معاوضہ کے مسجد کے لئے پیش کردیں، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح[3] کی پیشکش بڑے آدمیوں سے بھی منظور نہیں فرمایا کرتے تھے، یتیم بچوں سے کیسے منظور فرمالیتے۔ آپ کے اصرار کرنے پر یہ مالک ہبہ کرنے کے بجائے فروخت کرنے پر راضی ہوئے۔ دس دینار قیمت تجویز کی گئی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ قیمت ادا کرکے زمین مسجد کے لئے وقف کردی[4]۔ (رضی اللہ عنہم)

[1] حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے یہاں ایک دیوار بیت المقدس کے رُخ پر بنادی تھی۔ یہیں جمعہ کی نماز بھی پڑھایا کرتے تھے۔ سایہ کی کوئی چیز دیوار پر نہیں تھی۔ ابن سعد ص۲ ج۲ ہماری اصطلاح میں ایسی مسجد کو فناتی مسجد کہتے ہیں۔ عیدگاہیں عموماً ایسی ہی ہوتی ہیں۔

[2] ابن سعد ص۲ ج۲ [3] یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ضرورت ظاہر فرماتے اس پر بطور ہدیہ وہ چیز آپ کو پیش کی جاتی تو بطور ہدیہ اس کو منظور نہیں فرماتے تھے بلکہ قیمت ادا فرماتے تھے، جیسے کہ مکہ معظمہ سے روانگی کے وقت حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک ناقہ پیش کیا تو آپ نے قیمتاً منظور فرمایا۔ البتہ بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طلب کے کوئی ہدیہ پیش کیا جاتا تو اس کو منظور فرمالیتے تھے [4] ابن سعد ص۲ ج۲ غزوہ خیبر کے بعد جب مسجد بڑھائی گئی تو اس کے لئے جو زمین خریدی گئی تھی اس کی قیمت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ادا فرمائی ترمذی شریف مناقب عثمان ص۲۱۲ ج۲ مگر اب زمین کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی اس ٹکڑے کی قیمت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دس ہزار اور ایک روایت ہے کہ پچیس ہزار ادا کی ہے وفاء الوفاء ص۲۴۱ ج۱

زمین ہموار کی گئی، پانی سینچ دیا گیا۔ قبروں سے ہڈیاں نکلیں اُن کو الگ دبا دیا گیا۔ درخت کٹوائے گئے۔ بنیاد کھودی گئی، تعمیر شروع ہوئی۔ یہاں بھی صحابہ کرامؓ ہی مزدور تھے وہ ہی معمار۔ سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بھی برابر کے شریک تھے۔

عجیب وغریب پُرتقدس جذبہ سے کام ہو رہا تھا۔ پتھر اُٹھائے جاتے تو یہ رجز پڑھا جاتا تھا:

هٰذا الحمال لاحمال خيبر هٰذا ابرّ ربّنا و اطهر

"خیبر (جو کھجوروں کی منڈی ہے) وہاں سے بھی بوجھ اُٹھایا جاتا ہے اور لادا جاتا ہے یہ بوجھ اُس جیسا نہیں ہے (بلکہ) اے ہمارے رب تو جانتا ہے یہ اُس سے بہت اچھا نیکی والا اور بہت پاکیزہ ہے۔"

کبھی یہ رجز پڑھا جاتا اور سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک بھی ساتھ ساتھ ترنم فرما ہوتی تھی[1]

اللّٰهم[2] لاخير الّا خير الأخرة فانصر الانصار والمُهاجرة

کبھی اس میں یہ ترمیم فرما لیتے:

اَللّٰهم[3] اِنّ الاجر اجر الأخرة فارحم الانصار والمهاجرة

یہ مسجد اگرچہ دوسری ہے۔ مگر اس لحاظ سے اوّلیت اس کو ہی حاصل ہے کہ جو آبادی مستقل قیام کے لئے طے فرمائی گئی اُس میں پہلی مسجد یہی ہے۔ اس بناء پر حسب ارشاد رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ کا اصل مصداق یہی ہے کیونکہ قبا صرف نزول گاہ تھا اور جو مستقل قیام گاہ اور قبۃ الاسلام تھا وہ یہی مقام ہے جہاں

---

[1] بخاری شریف ص۵۵۵ وابن سعد ص۲ج۱ [2] اے اللہ صرف آخرت کی بھلائی ہی بھلائی ہے، پس مدد فرما انصار کی اور مہاجرین کی۔ [3] "اے اللہ حقیقت یہ ہے کہ آخرت کا اجر ہی اجر ہے، جو مقصود و مطلوب ہونا چاہیئے، پس رحم فرما انصار اور مہاجرین پر۔"

ناقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گردن پھیلادی تھی اور جہاں تبع یمن[1] نے سیکڑوں سال پہلے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نزول گاہ تعمیر کردیا تھا۔ بس مسجد النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اولیت قیام گاہ مستقل کی اولیت[2] ہے۔ اور مسجد قبا کی اولیت عارضی قیام گاہ کی اولیت، عارضی اور مستقل میں جو فرق ہونا چاہیئے وہ یہاں بھی کارفرما ہے۔

تعمیر اس وقت بیت المقدس کی جانب نماز پڑھی جاتی تھی۔ لہٰذا قبلہ اسی طرف یعنی شمال کی جانب رکھا گیا۔ اس طرف کی دیوار ستر ہاتھ لانبی بنائی گئی

---

[1] تبع بن الاقرن۔ یمن کا بادشاہ تھا۔ اس کی اولاد میں جو بادشاہ ہوئے ان کو تبع ہی کہا گیا۔ انہیں میں سے ایک تبع ایک فوجی مہم کے سلسلہ میں "یثرب" بھی پہونچا۔ وہ یہاں قتل عام کرکے اس آبادی کو ختم کرنا چاہتا تھا کہ اہلِ علم نے اس کو خبر دی کہ "نبی آخرالزماں" کا یہ دارالہجرۃ ہوگا۔ وہ متاثر ہوا۔ برباد کرنے کے ارادہ کو ملتوی کیا اور یہاں ایک مکان تعمیر کرادیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائیں تو یہاں قیام فرمائیں اور ایک تحریر بھی لکھ کر دیدی۔ جو نسلاً بعد نسلٍ محفوظ رہی اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک پہونچی۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس تبع کا نام اَسعَد تھا۔ کنیت ابوکرب۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں دو شعر بھی کہے تھے:

شهدت على احمد أنه رسول من الله بارى النسم

فلو مد عمرى الى عمره لكنت وزيرا له وابن عم

(ترجمہ) "میں شہادت دیتا ہوں کہ احمد اس خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہوں گے جو جانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ اگر میری عمر اُن کے زمانہ تک دراز ہوگئی تو میں ان کا وزیر بھی ہوں گا۔ (سلسلہ نسب کے لحاظ سے) ابن عم بھی"۔ معارف ابن قتیبہ ص۲۱ و وفاء الوفاء ص۱۳۴ ج۱

[2] ایک توجیہہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ آغاز کے لحاظ سے اگرچہ مسجد قبا اولیٰ ہے کہ اس کی تعمیر پہلے شروع ہوئی لیکن تکمیل کے لحاظ سے مسجد مدینہ مقدم ہے۔ ملاحظہ ہو وفاء الوفاء ص۱۷۹ ج۱

دوسری جانب ساٹھ ہاتھ۔[1]

بنیادیں پتھروں سے بھری گئیں۔ تین ہاتھ کی اونچائی تک دیواریں بھی اسی پتھر سے چُنی گئیں۔ اُن کے اوپر کچی[2] اینٹوں کی تعمیر کی گئی۔ البتہ دروازوں کے بازو پتھروں کے رہے۔[3] ساٹھ ہاتھ (تیس گز) چوڑی چھت کے سہارے کے لئے بیچ بیچ میں کھمبے (ستون) کھڑے کئے۔ تین تین کھمبوں کی دولائنیں ایک طرف (شرقی جانب میں) اور دو لائنیں غربی جانب میں، دونوں لائنوں کے بیچ کا حصہ وسیع رکھا گیا۔[4] میدان میں سے جو کھجور کاٹے گئے تھے ان کے کھمبے اگلی لائن میں لگائے گئے جو قبلہ کی جانب تھی۔ چھت میں نیچے بَلّیاں رکھ کر اُن کے اوپر کھجور کے پٹھے (شاخیں جن پر پتّے ہوتے ہیں) پتّوں سمیت بچھا دیئے گئے۔ ان کے اوپر ہلکی ہلکی مٹی پھیلادی گئی، اور چھپّر کی طرح ڈھلوان رکھی گئی، مگر پھر بھی بارش ہوتی تو ٹپکتی تھی۔ نیچے

---

[1] یعنی جنوب اور شمال کی دیواریں ستّر ستّر ہاتھ اور مشرق و مغرب کی دیواریں ساٹھ ساٹھ۔ (وفاء الوفا، ص ۲۳۸ ج ۱ و ص ۲۴۳ ج ۱) ایک ہاتھ دو بالشت (وفاء الوفا ص ۲۴۳ ج ۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دورِ مسعود ہی میں غزوۂ خیبر کے بعد مسجد میں توسیع فرمائی تو طول و عرض تقریباً سو سو ہاتھ ہو گیا اور عمارت مربع ہو گئی۔ (وفاء الوفا ص ۲۴۳ ج ۱ و ص ۲۵۱ ج ۱ و ص ۲۵۳ ج ۱) اور اس توسیع کے لئے زمین کی ضرورت تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک اعلان فرمایا کہ کوئی بندۂ خدا اس زمین کو خریدتا ہے اس معاوضہ پر کہ اس کو جنّت میں اس سے اچھا مکان ملے گا۔ یہ سعادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی اور انھوں نے فوراً اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ چنانچہ اس کی قیمت دس ہزار اور ایک روایت کے بموجب پچیس ہزار اپنے پاس سے ادا کی۔ (ترمذی شریف ص ۲۱۱ ج ۲ و وفاء الوفا ص ۲۴۳ ج ۱) [2] طبقات ابن سعد ص ۲ ج ۲

[3] بخاری شریف ص ۶۱ وفاء الوفا ص ۲۳۳ [4] وفاء ص ۲۳۸ ج ۱، ص ۲۵۲ ج ۱، ص ۲۴۸ ج ۱

[5] بخاری شریف ص ۶۱، وفاء ص ۲۳۳ ج ۱ [6] وفاء الوفاء ص ۲۴۲ ج ۱، اس عمارت کے لئے کوئی چندہ نہیں کیا گیا۔ حضرات صحابہؓ نے پیش کرنا چاہا اور درخواست کی کہ باقاعدہ چھت ڈلوادی جائے۔ فرمایا نہیں۔ عریش کعریش موسیٰ خشیبات وثمام والشان اعجل۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام (باقی صفحہ آئندہ)

پختہ فرش نہیں تھا صرف ہموار زمین تھی۔ پانی ٹپکتا تو کیچ ہو جاتی تھی [۱] اسی لئے کچھ دنوں بعد چھت پر مٹی زیادہ کردی گئی اور فرش پر بھی کسنکریاں بچھادی گئیں [۲] چھت کی اونچائی سات [۳] ہاتھ (ساڑھے تین گز یعنی ۱۰½ فٹ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے چھپر کی طرح (یہ چھت ہوگی) کہ نیچے لکڑیاں (بلیاں) ان کے اوپر پھونس، (پھر فرمایا) "انسان کا معاملہ تو اس سے بھی زیادہ عجلت لئے ہوئے (نازک) ہے۔" (ابن سعد ص۲ ج۲ وفاء الوفاء ص۲۴۲ ج۱)

[۱] عن ابن شہاب کانت سواری المسجد فی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جذوعًا من جذوع النخل وکان سقفه جریدًا وخوصًا لیس علی السقف کثیر طین اذا کان المطر امتلأ المسجد طینًا انما ھو کھیئة العریش۔ (وفاء ص۲۴۲ وابن سعد ص۲ ج۲)

[۱] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سال شب قدر کے متعلق فرمایا کہ میں نے دیکھا ہے کہ میں پانی اور کیچڑ میں سجدہ کر رہا ہوں۔ اس وقت بادل کا نام ونشان نہ تھا۔ مگر دفعۃً رات کو بارش ہوئی تو واقعی صبح کو پانی اور کیچڑ میں سجدہ کرنا پڑا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک پر بھی مٹی لگی ہوئی تھی۔ بخاری شریف ص۲۷ وفاء الوفاء ص۲۴۲ [۲] وفاء الوفاء ص۲۴۲ ج۱ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب اپنے دور خلافت میں مسجد کی تعمیر کرائی تو فرش باقاعدہ کنکریوں کا کرا دیا۔ وفاء ص۲۴۳ ج۱ [۳] وفاء الوفاء ص۲۳۹ ج۱ اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ اونچائی صرف پانچ ہاتھ تھی یعنی ڈھائی گز۔ اس کی تائید حسن بصری رحمہ اللہ کے قول سے ہوتی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "عریش موسیٰ (موسیٰ علیہ السلام کے چھپر) کی بلندی اتنی تھی کہ اگر کھڑے ہو کر ہاتھ اونچا کرتے تو چھپر کو لگ جاتا تھا۔" وفاء ص۲۴۲ مگر بظاہر سات ہاتھ والی روایت زیادہ صحیح ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ تعلیم کی غرض سے منبر پر کھڑے ہو کر نماز پڑھی تھی (بخاری شریف ص۵۵ وص۱۲۵) صرف پانچ ہاتھ کی بلندی پر اس طرح نماز پڑھنا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ اسی مسجد میں کھجور کے گچھے (خوشے) بھی اصحاب صفہ کے لئے لٹکا دیئے جاتے تھے۔ (بخاری شریف ص۶۰ وفتح الباری ونسائی قولہ عز وجل ولا تیمموا الخبیث منه ص۳۴۵ مجتبائی) اس سے بھی سات ہاتھ کی بلندی کی تائید ہوتی (باقی آئندہ صفحہ پر)

تین طرف دروازے رکھے گئے۔ قبلہ کی طرف کوئی دروازہ نہیں تھا۔ جنوب اور مشرق و مغرب کی جانب دروازے تھے [۱] کچھ دنوں بعد جب بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا (جو مدینہ سے جنوب کی جانب ہے) تو اس طرف کی دیوار کا دروازہ بند کر دیا گیا اور جانب شمال کی دیوار جو پہلے دیوار قبلہ تھی اس طرف دروازہ کھول دیا گیا [۲] اور اسی دیوار [۳] سے متصل وہ سائبان بنا دیا گیا جو صُفّہ کہلاتا تھا، جو اُن صحابہ کا مسکن تھا جن کے اہل و عیال نہیں ہوتے تھے اور تعلیم، روحانی تربیت، نیز رضاکارانہ خدمات کی غرض سے یہاں رہا کرتے تھے۔ معاش کے لئے دن کو لکڑیاں چُن لیتے تھے مگر رات کی تاریکی میں تلاوت قرآن اور نوافل کے قندیل روشن رکھتے تھے [۴]

ابتدا میں منبر نہیں تھا تو ایک ستون کی برابر میں مٹی کی چوکی (چبوترہ) بنا دی گئی تھی۔ آقائے دوجہان صلی اللہ علیہ وسلم اسی پر رونق افروز ہوکر خطاب فرمایا کرتے تھے اور ستون پر سہارا لگا لیا کرتے تھے [۵]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہے۔ باقی عریش موسیٰ کی تشبیہ کا مقصد یہ ہے کہ چھت عام قاعدہ کے مطابق نہیں تھی بہت نیچی تھی اور حقیقت یہی ہے کہ اتنے طویل و عریض ہال کے لئے سات ہاتھ کی چھت بہت نیچی مانی جاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[۱] وفاء الوفاء ص۲۴۰ ج۱ و ابن سعد ص۲ ج۲ [۲] ایضاً وفاء ص۲۴۰ ج۱ [۳] وفاء الوفاء ص۲۶۲ ج۱ ان حضرات کو مسجد ہی میں سونے کی اجازت تھی۔ ابن سعد ص۱۳ ج۲ و بخاری ص۶۳ [۴] بخاری شریف ص۵۸۶ [۵] منبر من طین۔ وفاء الوفاء ص۲۸۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ میں بلا امتیاز کے تشریف فرما ہوتے تھے کوئی اجنبی آتا تو اس کو معلوم نہ ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں تو ہم نے چاہا کہ آپ کے لئے ایک نشست کی جگہ بنا دیں کہ کوئی اجنبی بھی آئے تو اسے معلوم ہو جائے لہٰذا ہم نے ایک دکان (چبوترہ) بنا دیا مٹی کا، آپ اس پر تشریف رکھا کرتے تھے۔ (فتح الباری ص۹۵ تحت قولہ بارزانی، حدیث جبرائیل باب سوال جبریل۔) [۶] ایک خاتون نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا غلام بڑھئی (نجار) ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے ایسی چیز بنوا دوں جس پر آپ آرام سے تشریف رکھیں۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

گریہ حنانہ وہ کھجور کا تنہ (کھمبا) جس کی برابر مٹی کی چبوتری پر تشریف فرما ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطاب فرمایا کرتے تھے۔ سیدالانبیاء محبوب رب العالمین (تعالیٰ شانہ) نے جب اس سے الگ منبر پر رونق افروز ہوکر خطاب فرمایا۔ اور اس وجہ سے وہ کھمبا آپ کے پر تقدس قرب اور ذکر اللہ کی روح پرور و جاں بخش آواز سے محروم ہوگیا تو قدرت کے ایک عجیب و غریب کرشمہ نے اہل ایمان کو تازہ اور عقل پرستوں کے توہمات کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) پیچھے تکیہ بھی لگالیں اور خطاب کے وقت زحمت نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اس عرضداشت پر کوئی التفات نہیں فرمایا لیکن جب مجمع زیادہ ہونے لگا تو حضرات صحابہ نے بھی محسوس کیا کہ اس طرح خطاب فرمانے میں زحمت ہوتی ہے تو کوئی ایسی چیز بنوادی جائے کہ آپ اس پر تکیہ بھی لگا سکیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صحابہ کا مشورہ منظور فرمایا (وفاء الوفاء ص۲۷۴ ج۱) تو اسی خاتون سے فرمائش کی (بخاری ص۶۲۴ و ص۱۲۵) چنانچہ جنگل سے جو غابہ کے نام سے مشہور تھا۔ جھاؤ کی لکڑی لائی گئی اور یہ چیز بنوائی گئی جس کو منبر کہا گیا، جس کے کل تین درجے تھے یعنی دو سیڑھیاں جو ایک ایک بالشت گہری تھیں، تیسرا حصہ جس سے پیٹھ لگائی جا سکتی تھی دو بالشت تھا۔ اس طرح کل طول چار بالشت تھا (دو ہاتھ) اور چوڑائی میں سوا دو بالشت۔ (وفاء الوفاء ص۲۸۲ ج۱)

اس منبر کو دیوار قبلہ سے کچھ ہٹا کر رکھا گیا کہ دیوار اور منبر کے درمیان سے بکری گذر سکتی تھی۔ (بخاری ص۷۱) یعنی ایک ہاتھ سے کچھ زائد کہ آدمی بھی آڑا ہوکر نکل سکتا تھا (وفاء الوفاء ص۲۹ ج۱) اس طرح منبر کے کنارے سے لے کر دیوار تک تقریباً سوا تین ہاتھ (ڈیڑھ گز) کا فاصلہ ہوتا تھا۔ یہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا کرتے تھے۔ یعنی آپ کے مصلے شریف کا طول تقریباً سوا تین ہاتھ تھا (جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ خانہ کعبہ کے اندر نفلیں پڑھی تھیں تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی روایت یہ ہے کہ آپ کے سامنے کی دیوار سے تقریباً تین ہاتھ کے فاصلہ پر کھڑے ہوئے تھے۔ وفاء الوفاء ص۲۷ ج۱ و بخاری شریف ص۷۲) چنانچہ علماء نے یہی مستحب قرار دیا ہے کہ سترہ یا دیوار، اور نمازی کے قدموں کے درمیان صرف اتنا ہی فاصلہ رہنا چاہیے کہ سجدہ ہوسکے۔ (ابوداؤد شریف۔ باب الدنو من السترہ) یعنی تقریباً ڈیڑھ گز۔

حیرت زدہ کر دیا۔

حضرات صحابہ نے اسی بے حس و حرکت اور بے جان سوکھے کھمبے سے ایک رقت انگیز آواز سنی جس سے کلیجہ پھٹا جاتا تھا (بخاری ص ۲۸۱) کچھ ایسی آواز تھی جیسے اونٹنی اپنے بچہ کی یاد میں بلبلاتی ہے۔ (بخاری ص ۵۰۶) رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ستون کا یہ درد انگیز گریہ سنا تو منبر سے اتر کر کھمبے کے پاس تشریف لائے اس پر دست مبارک رکھا، تب یہ کھمبا بچوں کی طرح ہچکیاں لیتا ہوا آہستہ آہستہ خاموش ہوا۔ (بخاری ص ۲۸۱ و ص ۱۲۵) رحمت عالم جان جہاں نے اس سوختہ دل فراق زدہ کی مزید دلداری فرماتے ہوئے فرمایا: کیا چاہتے ہو۔؟ اس مسجد میں اسی جگہ تم پھلدار ہو جاؤ یا جنت کا حصہ چاہتے ہو، جہاں تمہارا پھل اہل جنت تناول کریں۔ اس نے دار البقاء کو دار فنا پر ترجیح دی۔ گویا اس بے زبان نے زبان درد سے عرض کیا: ان الدار الآخرۃ ھی خیر و ابقیٰ۔ چنانچہ اس کھمبہ کو مسجد کے فرش خام میں منبر کے قریب اس جگہ دبا دیا گیا، جس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مابین منبری وقبری روض من ریاض الجنۃ۔

(ماخوذ از وفاء الوفا ص ۱۷۶ وخصائص الکبریٰ باب حنین الجذع ص ۷۵ ج ۲)

حجرات امہات المؤمنین مسجد کی تعمیر سے فراغت ہوئی تو مسجد سے متصل ہی ازواج مطہرات کے لئے مکان بنوائے۔ اس وقت تک حضرت سودہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نکاح میں آ چکی تھیں۔ اس لئے دو ہی حجرے بنوائے۔ جب اور ازواج مطہرات آتی گئیں تو اور مکانات بنتے گئے [۱]

مسجد سے متصل حضرت حارثہ بن نعمانؓ کی جائداد تھی ہر ایک مکان کے لئے وہی اپنی جائداد کا ٹکڑا پیش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ تمام جائداد محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے نذر کر دی۔[۲] مسجد کی طرح چار حجرے بھی کچی اینٹوں کے تھے، اوپر کھجور کے ٹہنیوں اور پتوں کی چھت چھوٹے سے صحن کے گرد کھجور کی کھپچیوں (ٹہنیوں) کی دیواریں جن پر مٹی طہیس[۳] دی گئی تھی۔ حضرت عائشہ

---

[۱] وفاء الوفاء ص ۳۲۵ ج ۱ [۲] وفاء الوفاء ص ۳۲۲ ج ۱ روایت میں منزل کا لفظ ہے۔ کانت لحارثۃ بن نعمان منازل قرب المسجد (کہ حضرت حارثہ کے مکانات مسجد کے قریب تھے اور جب ضرورت پیش آتی تو حضرت حارثہؓ ایک مکان نذر کر دیا کرتے تھے) مگر چونکہ یہ بھی ثابت ہے کہ ہر ایک زوجہ کے لئے حجرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوایا تو منزل سے مراد منزل کی جگہ ہوگی بنا بنایا مکان مراد نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

[۳] کانت بیوتاً من لبن ولھا حجر من جرید مطرورۃ بالطین ابن سعد ص ۱۸۱ الجزء الاول من القسم الثانی طبقات ابن سعد۔

صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرہ کا ایک کواڑ تھا[1]۔ باقی کے دروازوں پر ٹٹیاں تھیں۔ پانچ حجرے ایسے بنائے گئے کہ ان میں کچی اینٹیں بھی نہیں لگائی گئیں بلکہ ٹٹیاں کھڑی کر کے اُن پر مٹی طلیس دی گئی اور اوپر کھجور کے پٹھوں اور پتّوں کی ہلکی سی چھت ڈالدی گئی۔ ان کے دروازوں پر نہ ٹٹیاں تھیں نہ کواڑ، بلکہ ٹاٹ یا کمبل کے پردے پڑے رہتے تھے جو طول میں تین ہاتھ اور عرض میں ایک ہاتھ سے کچھ زائد تھے[2]، چھتیں ایسی نیچی کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ کا بیان ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا دور تھا، جب میں ذرا بڑا ہوگیا تھا میں ان حجروں میں جاتا تو کھڑے ہوکر ان حجروں کی چھتوں کو ہاتھ لگا لیا کرتا تھا[3]۔ رات کو گھروں میں چراغ جلانے کا رواج نہیں تھا، لہٰذا ان حجروں میں رات کو صرف نورِ حق کی روشنی رہتی تھی[4]۔

۸۸ھ[5] میں اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک نے مسجد نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کی توسیع کی تو ان مبارک حجروں کو مسجد میں شامل کرلیا۔

ابوامامہ حضرت سہیل بن حنیف فرمایا کرتے تھے: کاش ان حجروں[6] کو اسی طرح چھوڑ دیا جاتا تاکہ

---

[1] عرعر یا سال کی لکڑی کا۔ وفاء الوفاء ص۳۲۶ ج۱ [2] طبقات الجزء الاول من القسم الثانی ص۱۸۱ [3] ایضاً طبقات ص۱۸۲ [4] بخاری شریف ص۵۶ ج۱ [5] متوفی ۹۶ھ ظالم خلیفہ مانا گیا ہے مگر ابن ابی عبلہ کہا کرتے تھے اللہ تعالیٰ ولید پر رحم فرمائے اس کے کچھ کارنامے بہت شاندار ہیں، مثلاً مسجد نبوی کی توسیع نیز جامع دمشق کی تعمیر۔ اسی کے زمانہ میں اندلس (اسپین) فتح ہوا، نیز ہندوستان میں فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ دیبل (موجودہ کراچی) اسی کے زمانہ میں فتح ہوا۔ مجھے وہ چاندی کے بادیئے دیا کرتا تھا کہ میں بیت المقدس کے فقیروں میں جاکر تقسیم کردوں۔ (تاریخ الخلفاء ص۱۵۶) [6] ان جھونپڑیوں اور چھپروں کے تنکوں کو اہل مدینہ رگِ جان سمجھتے تھے جب ولید کا حکم پہونچا کہ ان کو مسجد میں شامل کیا جائے تو اہلِ مدینہ بیتاب ہوگئے اور کچھ اس طرح تڑپ کر روئے کہ کبھی کسی کو اس طرح روتے ہوئے نہیں دیکھا گیا تھا نہ کبھی اتنے زیادہ لوگوں کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔

(ابن سعد ص۱۸۱ ج۲ و وفاء ص۳۲۶ ج۱)

لوگ دیکھتے کہ جس نبی کے دستِ مبارک پر تمام خزانوں کی کنجیاں رکھ دی گئی تھیں اُس نے خود اپنے لئے کیا پسند کیا تھا۔[۱]

صُفّہ و اصحابِ صُفّہ

پہلے گذر چکا ہے کہ تبدیلی قبلہ کے بعد جب نماز جنوب کی جانب رُخ کرکے پڑھی جانے لگی تو اس طرف کی دیوار میں جو دروازہ تھا وہ بند کر دیا گیا اور پہلی دیوار قبلہ (شمالی دیوار) میں دروازہ کھول دیا گیا۔ اس سے متصل چبوترہ بنا دیا گیا اور اس پر سائبان ڈال دیا گیا۔ اسی کو صفہ کہا جاتا تھا۔[۲] نادار مسلمان جن کے اہل و عیال نہیں ہوتے تھے اُن کا مسکن یہی ہوتا تھا، توکّل اُن کا سرمایہ ہوتا تھا۔ سوال کرنا ممنوع[۳]۔ تعلیم، رُوحانی تربیت اور رضاکارانہ خدمات اُن کے فرائض اور مشاغل ہوتے تھے۔

---

[۱] ابن سعد ج۱ ص۱۸۴ و وفاء الوفاء ج۱ ص۳۲۴ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور دوسرے اکابر تابعین نے بھی اسی جذبہ کا اظہار فرمایا۔ [۲] قال عیاض الصفہ بضم الصاد وتشدید الفاء ظلّۃ فی مؤخر مسجد النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم یأوی الیہا المساکین - وفاء الوفاء ج۱ ص۳۲۱

[۳] اس سلسلہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ایک دلچسپ واقعہ بیان فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا: قسم ہے اُس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کہ میں بھوک کی وجہ سے اپنے جگر کو زمین پر ٹیک دیا کرتا تھا (پیٹ کو زمین سے چپٹا دیا کرتا تھا) اور میں بھوک کی وجہ سے پتھر پیٹ پر باندھ لیا کرتا تھا۔ ایک روز سرِ راہ جاکر بیٹھ گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس طرف سے گذرے (سوال کرنا ممنوع تھا تو میں نے (ایک لطیف طریقہ اختیار کیا کہ) ایک آیت دریافت کرلی (کہ جب میری طرف متوجہ ہوں تو شاید میرے فاقہ کا بھی اُن کو اندازہ ہو جائے اور) مجھے لیجاکر کھانا کھلا دیں مگر حضرت ابوبکر رض نے وہ آیت بتا دی اور تشریف لے گئے۔ پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ تشریف لائے میں نے ان سے بھی آیت دریافت کی۔ حضرت عمر رض نے بھی آیت بتا دی اور روانہ ہوگئے۔ اس کے بعد وہ آئے جن کی کنیت ابوالقاسم تھی (جن کی شان یہ بھی کہ وہ خیر و برکت کے قاسم (تقسیم کرنے والے) (فطرت انسان کے نبض شناس تھے) آپ نے جیسے ہی نظر ڈالی، آپ پہچان گئے۔ مجھ سے فرمایا ساتھ آؤ۔ میں ساتھ ہولیا۔ آپ مکان پر (باقی بر صفحۂ آئندہ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ستر اصحاب صفہ کو دیکھا کہ ان کے پاس چادر تک نہ تھی فقط تہبند تھا یا صرف کمبل جس کو اپنی گردنوں میں باندھ لیتے تھے۔ کمبل بھی اس قدر چھوٹا کہ کسی کی آدھی پنڈلیوں تک پہونچتا کسی کے ٹخنوں تک۔ نماز میں ستر کھلنے کا خطرہ رہتا تو ہاتھ سے تھامے رکھتے تھے[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھانے کی چیز صدقہ میں آتی تو ان کو دیدیتے، خود تناول نہیں فرماتے تھے کیونکہ صدقہ آپ کے لئے حرام تھا۔ جو چیز بطور ہدیہ آتی تو ان کو بلا لیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے[2]

یہ حضرات فاقہ سے نہیں گھبراتے تھے کیونکہ خود اپنے آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھتے کہ کئی کئی وقت گذر جاتے اور فاقہ نہیں ٹوٹتا — بھوک سے کبھی اتنا ضعف ہو جاتا کہ نماز کی حالت میں گر پڑتے، لوگوں کو خیال ہوتا کہ دورہ پڑ گیا ہے، حالانکہ دورہ فاقہ کا ہوتا تھا[3]

کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو انصار پر تقسیم فرما دیتے کہ اپنے مقدور کے بموجب ہر شخص ایک ایک دو دو کو لیجائے اور اپنے ساتھ ان کو کھانا کھلائے[4]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تشریف لے گئے وہاں ایک قدح (بادیہ) میں دودھ رکھا ہوا تھا، جو کسی نے ہدیہ میں بھیجا تھا۔ آپ نے فرمایا: ابوہریرہ! اصحاب صفہ کو بلاؤ — آپ کا یہ حکم میرے نفس پر شاق گذرا کہ تھوڑا سا دودھ جس کو میں تنہا پی سکتا ہوں اس کے لئے اصحاب صفہ کو بلایا جا رہا ہے، پھر مجھ سے ہی کہا جائے گا کہ پلاؤ۔ یہ وسوسہ ذہن میں آرہا تھا، مگر مجبور تھا تعمیل حکم کرنی تھی۔ چنانچہ اصحاب صفہ آئے، مجھے حکم ہوا۔ میں نے یکے بعد دیگرے ہر ایک کو دودھ پلایا۔ جب سب کو پلا چکا تو مجھے حکم ہوا کہ تم پیو میں نے پیا، فرمایا اور پیو پھر پیا فرمایا اور پیو تب عرض کیا: یارسول اللہ اب بالکل گنجائش نہیں رہی۔ تب آپ نے یہ بادیہ خود لیا اور بسم اللہ پڑھ کر باقی کو نوش فرمایا۔ بخاری شریف ص۹۵۵ [1] بخاری شریف ص۶۳ و فتح الباری ص۴۲۶ ج۱ [2] ص۹۵۵ [3] ترمذی شریف باب فی معیشت اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص۵۹ ج۲ [4] یہ بھی صورت ہوتی کہ آپ فرما دیتے کہ جن کے یہاں دو کھانے والے ہوں وہ تیسرے کو لیجائے اور جس کے یہاں کھانے والے چار ہوں وہ دو کو (باقی برصفحہ آئندہ)

مسجد مبارک کے دو ستونوں میں ایک رسی بندھی رہتی تھی۔ کھجوروں کے موسم میں حضرات انصار کھجوروں کے گچھے (خوشے) اپنے باغات سے لاکر لٹکا دیتے تھے جو کھجور پک جاتا اس کو لکڑی سے جھاڑ کر کھالیا کرتے تھے[1] ان بہادر وجاں باز فقراء اور درویشان باوقار کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بشارت دیا کرتے تھے:

لو تعلمون ما لکم عند اللہ لَاَحببتم ان تزدادوا فقرًا وحاجةً [2]

"اگر تم جان جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہارے لئے کیا تیار ہے تو تم آرزو کرو کہ ہمارا یہ فقر وفاقہ اور بڑھ جائے۔"

ان حضرات کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔[3]

نماز جنازہ کی جگہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرماکر مدینہ تشریف لائے تو جس کسی بیمار کی نزعی کیفیت ہوتی (مرنے کے قریب ہوتا) تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی جاتی۔ آپ تشریف لاتے اس کے لئے دعا فرماتے۔ وہ شخص وفات پا جاتا تو اکثر ایسا ہوتا کہ تجہیز وتکفین آپ کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) لیجائے اور ساتھ کھانا کھلائے۔ ایک روز آپ نے اسی طرح اصحاب صفہ کو تقسیم فرمادیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے یہاں چار کھانے والے تھے۔ خود حضرت ابوبکر، ان کے صاحبزادے اور اہلیہ اور ایک خادم مگر آپ اپنے ساتھ تین کو لے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سات اصحاب کو لے گئے (بخاری شریف ص ۸۴ و ص ۵۰۶ وغیرہ)

[1] وفاء الوفاء ص ۳۲۴ ج ۱ [2] ایضاً ص ۳۲۲ ج ۱ وترمذی شریف باب فی معیشۃ اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۵۹ ج ۲

[3] عارف سہروردی نے عوارف میں لکھا ہے کہ اصحاب صفہ کی تعداد چار سو تک پہنچتی ہے۔ حافظ ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں سب کا تذکرہ کردیا ہے۔ فتح الباری ص ۲۱۵ ج ۱۱۔ علامہ شاطبی نے بہت دلچسپ بحث کی ہے کہ صفہ سے خانقاہ پر استدلال نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ان حضرات کا یہ قیام اور یہ قیام گاہ ضرورت کی بنا پر تھا، یہ کوئی مستقل ادارہ نہیں تھا۔ (الاعتصام)

سامنے ہی ہوتی اور آپ دفن کے وقت تک وہاں رہتے۔ اس میں آپ کو بہت دیر ہو جاتی تھی۔ اس کا ہمیں احساس ہوا تو ہم نے یہ کر لیا کہ وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دیتے۔ آپ تشریف لاتے، نماز جنازہ پڑھاتے پھر کبھی واپس تشریف لے جاتے اور کبھی دفن ہونے تک وہاں تشریف رکھتے۔ پھر ہمیں محسوس ہوا کہ آپ کو اس میں بھی زحمت ہوتی ہے تو یہ طے کر لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف نہ دی جائے گی بلکہ جنازہ لے کر خود آپ کی خدمت میں پہونچ جایا کریں گے۔ چنانچہ اس پر عمل ہوا۔ جب جنازہ لیکر کاشانۂ نبوت پر پہونچتے تو قریب ہی ایک جگہ تھی وہاں آپ نماز پڑھاتے۔ پھر یہی معمول ہو گیا کہ اسی خاص جگہ پر نمازِ جنازہ پڑھائی جاتی تھی حتی کہ اس جگہ کا نام ہی موضع الجنائز پڑ گیا۔[1]

---

[1] طبقات ابن سعد ص۱۰ جلد اول قسم ثانی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہی تھا کہ موضع الجنائز میں نماز پڑھایا کرتے تھے جیسا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے جو امام بخاری رحمۃ اللہ نے باب الصلوٰۃ علی الجنائز بالمصلّٰی والمسجد میں پیش کی ہیں ص۱۷۷ مگر بعض مرتبہ کسی عارض کی وجہ سے مسجد میں بھی نماز پڑھ لی ہے۔ (فتح الباری ص۱۵۵ ج۳ باب مذکور) اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کا مذہب یہ ہے کہ کسی خاص ضرورت کے بغیر مسجد میں نماز جنازہ مکروہ ہے۔ البتہ امام شافعی رحمۃ اللہ جائز قرار دیتے ہیں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

نماز باجماعت

عبادت، عربی لفظ ہے، جس کا ترجمہ پُوجا کیا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت ہے غایۃ التذلل یعنی انتہا درجہ عاجزی، بے چارگی، بے بسی۔ اسی کے اظہار کو عبودیت کہتے ہیں۔ اپنے مالک اور خالق کے سامنے اپنی بے بسی اور عاجزی کے اظہار کے لئے جماعت کی ضرورت نہیں بلکہ گوشۂ خلوت کی ضرورت ہے، کیونکہ پُرکیف اور پُرخلوص وہ عاجزی ہوتی ہے جو تنہائی میں ہو، جہاں بندہ تصوّرِ معبود میں غرق ہو۔ معبود اور مالک کے سوا کسی کا وجود تو کیا کسی کا تصوّر بھی نہ ہو۔ اسلام نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ[1] کا ارشاد ہے:

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۝ (سورہ ۷ الاعراف آیت ۵۴)

"پکارو اپنے رب کو عاجزی کرتے ہوئے (گڑگڑاتے ہوئے)

پوشیدہ طور پر۔"

دوسرے موقع پر ارشاد ہے:

---

[1] فرائض کے علاوہ نوافل میں سنت یہی ہے کہ اپنے مکان میں پڑھی جائیں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سیّد الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ افضل کیا ہے، مکان میں یا مسجد میں۔ ارشاد ہوا۔ تم دیکھتے ہو میرا مکان مسجد سے کتنا قریب ہے اس کے باوجود اپنے مکان میں نماز پڑھوں یہ مجھے زیادہ محبوب ہے بمقابلہ مسجد میں نماز پڑھنے کے۔ اِلّا یہ کہ فرض نماز ہو۔ (ابن ماجہ) ارشاد ہوا مکان میں نماز پڑھنا نور ہے لہٰذا اپنے مکانات کو منور کرو۔ (ابن خزیمہ) ارشاد ہوا کچھ نمازیں (نفلیں) گھروں میں پڑھا کرو۔ اپنے مکانات کو قبریں نہ بنالو۔ (بخاری شریف وغیرہ) ایک ارشاد یہ ہے کہ جہاں لوگ نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں (مثلاً مسجد) ایسی جگہ نماز پڑھی جائے۔ اس کے مقابلہ میں گھر میں نماز پڑھنے کی وہی فضیلت ہے جو فرض نماز کی فضیلت نفل نماز پر ہے۔ ترغیب ترہیب (بحوالہ بیہقی)

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِیْ نَفْسِكَ (تا) الْغٰفِلِیْنَ (سورۂ الاعراف آیت)

"یاد کر اپنے رب کو دل ہی دل میں عاجزی اور نیازمندی
کے ساتھ ڈرتے ڈرتے اور زبان سے بھی آہستہ آہستہ
بغیر پکارے صبح شام اور ایسا نہ ہو کہ تم ان میں ہو جاؤ
جو غافل رہتے ہیں۔"

لیکن جس طرح اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے عبادت کو مکمل کیا۔ مثلاً پہلی امتوں میں کسی اُمت کی نماز میں صرف سجدہ ہوتا تھا۔ رکوع نہیں ہوتا تھا۔ کسی اُمت کی نماز میں صرف رکوع، اور کسی اُمت کی نماز میں صرف قیام ہوتا تھا۔ کھڑے کھڑے دعائیں پڑھا کرتے تھے، نہ سجدہ کرتے نہ رکوع، مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جس نماز کی تعلیم دی گئی اس میں قیام اور قعدہ بھی ہے اور سجدہ اور رکوع بھی۔ پھر جس طرح ظاہری ارکان کے لحاظ سے مکمل ہے، معنیٰ کے لحاظ سے بھی مکمل ہے کہ سب سے پہلے اللہ اکبر کہا جاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور عظمت کا اقرار ——— پھر اس کی حمد و ثنا[1] ——— اور اس

---

[1] سورۂ فاتحہ کا پڑھنا فرض یا واجب ہے جس کے شروع میں ہے: ——— اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۙ اور اس سورت کی اہمیت یہ ہے کہ حدیث میں اس سورت کو نماز سے تعبیر کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصفا نصف تقسیم کر دیا ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو وہ مانگتا ہے۔ (تقسیم کی تفصیل یہ ہے) کہ بندہ کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندہ نے میری حمد کی، پھر بندہ پڑھتا ہے اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے میری ثنا کی، پھر بندہ کہتا ہے: مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۙ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے میری عظمت بیان کی، پھر بندہ کہتا ہے: اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے (باقی صفحہ آئندہ پر)

کے ارشادات[1] اور آیات الٰہیہ کی تذکیر، پھر جملہ نقائص سے اس کی پاکی اور عظمت[2]۔ اس کی پروردگاری اور بلندی و برتری کا اعتراف، اور اس[3] بات کا اظہار کہ وہ حمد کرنے والوں کی حمد سنتا ہے۔ پھر بارگاہ رب ذوالجلال میں جملہ تعظیمات[4] کی پیش کش۔ اس کے رسول پر درود وسلام۔ پھر اپنے لئے دعا۔

اس ظاہری اور معنوی تکمیل کے ساتھ ایک خصوصیت یہ ہے کہ انفرادی عمل کو اجتماعی عمل بنا یا گیا اور جو کام الگ الگ کرنے کا تھا اس میں سب کی شرکت لازم کردی گئی۔ یعنی پانچ وقت کی نمازیں جن کا پڑھنا ہر ایک عاقل بالغ مسلمان کے لئے ہر حالت[5] میں ضروری ہے جن کو فرض کہا جاتا ہے ان کے متعلق نہایت تاکید[6] سے حکم ہوا کہ سب مل کر ایک ساتھ پڑھیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور بندہ کی درخواست منظور ہے۔ پھر بندہ کہتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ بندے نے اپنے لئے درخواست کی ہے اس کی درخواست منظور ہو گی۔ مسلم شریف ص ۱۷۰

[1] سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن پاک کا کچھ حصہ پڑھنا ضروری ہے۔ قرآن پاک میں احکام بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور توحید و رسالت کے دلائل بھی۔ مشاہدات یا تاریخی واقعات کے ذریعہ پیش کئے گئے ہیں۔ [2] سبحان ربی العظیم رکوع میں ——— سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ [3] رکوع سے کھڑے ہوتے ہوئے، سمع اللہ لمن حمدہ (وہ اس کی سنتا ہے جو اس کی حمد کرتا ہے۔ [4] التحیات للہ والصلوٰت والطیبات۔ [5] مسافر ہو یا مقیم، بیمار ہو یا تندرست۔ [6] اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات آگے آئیں گے (انشاء اللہ) یہاں قرآن پاک کے اسلوب سے سبق لیجئے۔ قرآن پاک میں جہاں نماز کا حکم ہوا ہے عموماً جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ۝ (سورہ بقرہ آیت ۲۳۸)۔ أَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ (سورہ ۷ اعراف آیت ۲۸) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا (سورہ ۲۲ حج آیت ۷۷) وغیر ذلک نیز صلّوا (نماز پڑھو) کے بجائے جگہ جگہ اقیموا الصلوٰۃ ارشاد ہوا ہے۔ اقامۃ الصلوٰۃ یہی ہے کہ نماز ایسی شان سے پڑھی جائے کہ دینداری اور خدا پرستی کی فضا بنے، کلمۃ اللہ سربلند ہو، شان حق نمایاں ہو۔

ایک پڑھانے والا ہو (امام) باقی سب اس کی پیروی کرنے والے (مقتدی)۔

اس جماعت کا ایک مرکز[1] ہونا چاہیئے جس کو "مسجد" کہا جاتا ہے۔ پنج وقتہ نمازوں میں ایک مخصوص اور محدود حلقہ (مثلاً محلّہ) کے خدا پرستوں کا اجتماع ہونا چاہیئے۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ اس سے وسیع پیمانہ پر اور اسلامی تہوار یعنی عید بقرعید کے موقع پر اس علاقہ کے تمام حلقوں کا مشترک اجتماع، آبادی سے باہر کسی وسیع مقام پر ہونا چاہیئے۔

جماعت کے فوائد بیشک بندہ اور خدا کے درمیان جو تعلق اور رشتہ ہے اس کے تسلیم کرنے اور اس کو بروئے کار لانے کے لئے مظاہرہ کی ضرورت نہیں ہے مگر یہ تو ضروری ہے کہ بندگانِ خدا میں یادِ خدا کا جذبہ پیدا ہو، خدا پرستی کا رواج ہو، پرستش حق کی فضا بنے۔ اللہ تعالیٰ کا نام کھلّم کھلّا لیا جائے۔ اس کی عظمت و معبودیت کی شان دکھائی جائے تاکہ جو خدا کو بھولے ہوئے ہیں انہیں اللہ یاد آئے، جو اپنے رب سے ٹوٹے ہوئے ہیں وہ اپنا رشتہ رب سے جوڑیں۔ ظاہر ہے یہ مبارک مقاصد اجتماع[2] کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔

تعلیم و تبلیغ اور اصلاح کے نقطۂ نظر سے فائدہ یہ ہے کہ دوسروں کو ترغیب ہوتی ہے، شہری زندگی میں خدا پرستی کا رواج ہوتا ہے اس کا شوق بڑھتا ہے۔ معاشی اور سماجی لحاظ سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مل جل کر کام کرنے کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ تعاون اور اشتراک عمل

---

[1] قرآن حکیم نے اس مرکز کو یہ اہمیت دی کہ ستر پوشی کا حکم دیا تو نماز کو مسجد سے تعبیر کیا۔ ارشاد ہے:
خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (سورہ عٰ الاعراف، آیت ۳۰) "لے لو اپنی آراستگی مسجد کے وقت (یعنی ہر نماز کے وقت)" یعنی باقاعدہ نماز وہی ہے جو اس طرح ہو کہ آپ آراستہ ہو کر مسجد میں جائیں۔

[2] امام ابو حنیفہؒ نے اس اجتماع میں ایک وحدت تسلیم کی کہ امام کو اصل قرار دیا اور مقتدیوں کو اس کا تابع۔ قرأتِ فاتحہ اور قرأتِ قرآن کا فریضہ امام ادا کرے گا۔ اس کی قرأت سب کی قرأت ہوگی: من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قراءۃ۔ (الحدیث)

کی رسم پڑتی ہے اور جب " ایک ہی صف میں کھڑے ہوجاتے ہیں محمود و ایاز " تو اُخوت اور مساوات بھی نظریہ کی حد سے آگے بڑھ کر میدانِ عمل میں جلوہ گر ہوتی ہے اور جب ایک صف میں کندھے[1] سے کندھا ملا کر سیدھے کھڑے ہوتے ہیں کہ نہ کوئی آگے نکلا ہوا ہو نہ کوئی پیچھے ہٹا ہو، ہر ایک کا ٹخنہ دوسرے کے ٹخنہ کی سیدھ میں ہو۔ اور یہ سب خواہ ان کی تعداد لاکھوں ہو، ایک ہی امام کی آواز پر کبھی ہاتھ کانوں تک اُٹھائیں، کبھی ہاتھ باندھ لیں، کبھی سیدھے کھڑے ہوں، کبھی ایک ساتھ جھک جائیں، کبھی زمین پر ماتھے رکھ دیں، کبھی دوزانو بیٹھ جائیں تو ایک عسکری ترتیب اور فوجی نظم و ضبط کی شکل رونما ہوتی ہے۔ غرض اس طرح کے بہت سے فائدے، وجود پذیر اور ظہور فرما ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جب مدینہ میں آزاد فضا میسر آئی اور یہ موقع ملا کہ اللہ کا نام کھلم کھلا لیا جائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کو لازم[2] قرار دیا۔ یہاں تک کہ حضرات صحابہ کا عام مذاق یہی بن گیا کہ جماعت کے بغیر وہ نماز کو جائز ہی نہیں سمجھتے[3] تھے۔ بیمار آدمی بھی ساتھیوں کے سہارے مسجد میں آتا اور جماعت میں شریک ہوتا تھا اور سستی

---

[1] ارشادِ خداوندی ہے: إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ (تا) مَرْصُوصٌ (سورہ صف) اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے اُن سے جو راہِ خدا میں اس طرح صف باندھ کر مقابلہ کرتے ہیں جیسے وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو۔ میدانِ جنگ میں یہ مقابلہ ظاہری دشمن سے ہوتا ہے اور نماز میں یہ مقابلہ باطنی دشمن یعنی شیطان اور شیطانی جذبات سے ہوتا ہے۔

[2] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں نے ارادہ کیا کہ میں لکڑیاں جمع کراؤں، پھر نماز پڑھنے کے لئے نماز کی اذان دیدی جائے تو کسی کو کہدوں کہ وہ نماز پڑھائے پھر میں اُن کے یہاں جاؤں جو جماعت میں حاضر نہ ہوں اور اُن کے گھروں کو آگ لگا دوں۔ (بخاری شریف ص۸۹) اندازہ فرمایئے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم (جو اہلِ ایمان کے حق میں ایسے رؤف رحیم ہیں کہ جو باتیں اُن کو شاق ہوتی ہے جو مسلمانوں کے لئے پریشانی کا سبب بنے) ترک جماعت پر اتنے ناراض ہوں تو جماعت کتنی ضروری ہوگی۔

[3] قد روی عن غیر واحد من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہم قالوا من سمع النداء فلم یجب فلا صلوٰۃ له۔ (ترمذی شریف ص۳۰)

وہی کرتا تھا جس کے دل میں نفاق ہوتا تھا۔[1] پھر شہر یا آبادی ہی نہیں بلکہ جہاں بھی تین مسلمان ہوں اُن کے لئے یہی حکم ہوا کہ اگر وہ جماعت سے نماز نہیں پڑھتے تو اُن پر شیطان مسلّط ہو جاتا ہے[2] (کہ اُن کے مذہبی معاملات درہم برہم ہو جاتے ہیں اُن کا صحیح نظم قائم نہیں ہوتا)

اذان

اسلام یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ مسلمان سب کاروبار چھوڑ کر نماز اور مسجد کے لئے وقف ہو جائیں۔ وہ جس طرح عبادت فرض کرتا ہے، ذرائع معیشت کی فراہمی کو بھی فریضہ قرار دیتا ہے۔ اُس نے جس طرح اہل و عیال کا نفقہ مربّی پر لازم اور واجب کیا ہے ایسے ہی زکوٰۃ کو اسلام کا ایک رکن قرار دیکر آمدنی بڑھانے اور پس انداز کرنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے، مگر جب ذرائع معیشت کے لئے کاروبار میں مشغولیت ضروری ہے تو نمازوں کی جماعتوں کے لئے کوئی ایسی صورت ہونی چاہیئے کہ معین وقت پر سب جمع ہو جائیں تاکہ اللہ کا فرض بھی ادا ہو اور دنیا کے کام بھی اطمینان سے ہوتے رہیں۔ صحابہ کرام اگرچہ اندازہ لگا کر جماعت کے وقت خود جمع ہو جاتے تھے، مگر ظاہر ہے یہ جذبہ اور یہ شوق آئندہ نسلوں میں باقی رہنے والا نہیں تھا۔[3] چنانچہ جب جماعت کا سلسلہ شروع ہوا تو کچھ دنوں بعد یہ سوال سامنے آیا۔ حضرات صحابہ نے مختلف تجویزیں پیش کیں۔ کسی نے ناقوس[4] کا ذکر کیا، کسی نے بُوق[5] کا۔ ایک صاحب نے تجویز پیش کی

---

[1] مسلم شریف صفحہ ۲۳۲ [2] نسائی شریف باب التشدید فی ترک الجماعۃ [3] بخاری شریف صفحہ ۸۵

[4] لوہے کی لین لٹکا دی جاتی ہے۔ اس کو مونگری سے بجایا جاتا ہے، یہی ناقوس ہے۔ لوہے کے بجائے لکڑی کو اسی طرح استعمال کیا کرتے تھے۔ اس کی جگہ گھنٹہ نے لے لی ہے۔ اب گھنٹہ کو بھی ناقوس کہا جاتا ہے (المنجد)۔

[5] بگل یا بگل کی طرح کا باجا۔

کہ آگ روشن کردی جایا کرے۔ ناقوس کا رواج نصاریٰ میں تھا، بوق (بگل) کا یہود میں، اور آگ روشن کرنے کا مجوس (آتش پرستوں) میں۔ یہ چیزیں علامت بن سکتی تھیں مگر ان میں یادِ خدا، اور عبادت کی معنویت نہیں تھی۔ پھر ان سب فرقوں کی عبادتوں میں تحریف اور من مانی تبدیلی کے علاوہ شرک کی آمیزش بھی ہو چکی تھی، یہ مناسب نہیں تھا کہ وہ عبادت (نماز) جو تنہا خدا واحد کے لئے مخصوص ہوائس کا اعلان مشرکانہ طرز پر ہو۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی تجویز بھی منظور نہیں فرمائی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رائے دی کہ بلند آواز سے پکار دیا جایا کرے: اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ۔ اس وقت یہ تجویز منظور کرلی گئی۔ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا کہ اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ پکار دیا کریں[1]۔ لیکن یہ آخری یا قطعی فیصلہ نہیں تھا[2]۔

---

[1] بخاری شریف ص۸۵ فتح الباری ص۶۲ ج ۲

[2] علامہ شبلی مرحوم نے اسی کو آخری فیصلہ سمجھا اور خواب کا واقعہ جو آگے آرہا ہے اس کی تردید کردی صرف اس بنا پر کہ اس کو بخاری نے بیان نہیں کیا، ہمیں نہایت ادب سے یہ عرض کرنا ہے کہ علامہ موصوف جیسے بلندپایہ ادیب اور مورخ تھے کاش اسی درجہ کے محدث بھی ہوتے تو یہ جرأت نہ کرتے کہ جس حدیث کو ترمذی، ابوداؤد، دارمی وغیرہ اصحاب سنن نے بیان کیا ہے اس کو اس کمزور اور رکیک علت کی بنا پر رد کردیتے کہ بخاری نے بیان نہیں کیا۔ بخاری کا بیان کرنا تو حجت ہوتا ہے، نہ بیان کرنا محدثین کے نزدیک حجت نہیں ہے۔ علامہ فرماتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کی رائے کو پسند کیا اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ اذان دیں، حالانکہ بخاری میں اذان کا لفظ نہیں ہے۔ بخاری کے الفاظ یہ ہیں: فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: قم یا بلال فناد بالصلوٰۃ۔ ص۸۵ ــــــــــــ (ترجمہ) "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلال! کھڑے ہو جاؤ نماز کی آواز لگا دو"۔ نماز کی آواز لگانے یا نماز کے لئے ندا کا طریقہ خود بخاری نے یہ بیان کیا ہے کہ الصلوٰۃ جامعۃ کہا جاتا تھا۔ چنانچہ جب ایک مرتبہ سورج گہن ہوا تو "الصلوٰۃ جامعۃ" پکار کر ہی لوگوں کو نماز کے لئے جمع کیا گیا تھا (بخاری ص۱۴۲) پس یہاں بھی ناد بالصلوٰۃ کے معنی یہی ہیں کہ الصلوٰۃ جامعۃٌ پکار دو۔ یہ شرف اللہ تعالیٰ نے حضرت الاستاذ علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ کو عطا فرمایا تھا کہ آپ مورخ بھی تھے اور بلند پایہ محدث بھی۔ آپ نے واقعات کی ترتیب اس طرح بیان فرمائی کہ وہ تمام تعارض ختم ہو گیا، جس نے علامہ شبلی کو یہاں تک پریشان کردیا تھا کہ آپ نے صحاح کی حدیث کا انکار کردیا۔

صحابہ کرام جن کے دینی جذبات میں اُمنگ تھی اور یہی اُمنگ اُن کے تمام جذبات پر غالب آچکی تھی اُن کی طلب پوری نہیں ہوئی۔ اعلان نماز کے لئے مناسب طریقہ کی جستجو باقی رہی تو ایک شب میں متعدد[1] صحابہ نے ایک خواب دیکھا۔ ان میں سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ کو یہ توفیق بخشی کہ وہ فوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی خواب بیان کی کہ کوئی شخص ناقوس بیچ رہا ہے میں نے اس سے قیمت معلوم کی۔ اُس نے کہا کس کام کے لئے خریدتے ہو۔ میں نے کہا کہ جماعت کا اعلان کیا کریں گے۔ اس سبز پوش شخص نے کہا میں تمہیں اس سے بہتر صورت بتاتا ہوں، جب نماز کا وقت ہو کوئی ایک شخص اس طرح پکارا کرے[2]:

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ[3]	۱ مرتبہ	اللہ بہت بڑا ہے اللہ سب سے بڑا ہے
اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ	۱ مرتبہ	اللہ سب سے بڑا ہے اللہ بہت بڑا ہے
اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ	۲ مرتبہ	میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں
اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ	۲ مرتبہ	میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں
حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ	۲ مرتبہ	آؤ نماز کے لئے آؤ
حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ	۲ مرتبہ	آؤ فلاح حاصل کرنے کے لئے
اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ	۱ مرتبہ	اللہ بہت بڑا ہے اللہ سب سے بڑا ہے
لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ	۱ مرتبہ	نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے

اس شخص نے یہ کلمات بتائے پھر فرمایا کہ تھوڑی دیر بعد جب جماعت شروع ہونے لگے تب بھی یہی کلمات کوئی ایک شخص[1] پکارے اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ کے بعد دو مرتبہ یہ کلمات بھی کہے "قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خواب کو "رؤیاء حق" فرمایا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ بلند آواز تھے۔ ان کو حکم فرمایا کہ اذان پڑھیں اور حضرت عبداللہ بن زید کو فرمایا کہ وہ

---

[1] فتح الباری ص۶۲ج۲ [2] ابوداؤد و ترمذی، دارمی وغیرہ [3] ان کلمات کی ادائیگی خود عبادت ہے کیونکہ اللہ اور رسول کا ذکر اور شہادت حق ہے یا نماز اور فلاح کی طرف بلاوا ہے۔ اچھے کام اور ابدی کامیابی کے لئے (باقی صفحہ آئندہ پر)

بتاتے رہیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اذان کی آواز سنی تو وہ دوڑے آئے۔ یا رسول اللہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے، یہی کلمات خواب[۱] میں میں نے بھی سُنے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:[۲]

فللہ الحمد فذلك اثبت[۳]۔ الحمد للہ۔ اس سے اور زیادہ ثبوت مل گیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بلانا بھی عبادت اور ثواب کا کام ہے۔ معنیٰ اور مفہوم کے لحاظ سے یہ چند کلمات اسلام کے تمام بنیادی عقائد پر مشتمل ہیں سب سے پہلے اللہ کی ذات وصفات، پھر توحید، پھر مسئلہ رسالت نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت، پھر الصلوٰۃ یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت خاص طرز پر اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت کے بعد اطاعت مخصوصہ (الصلوٰۃ) اور الفلاح کا ذکر ہے تو اس طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ اطاعت وعبادت اسی طرز پر ہو جو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے۔ اسی صورت میں فلاح یعنی ابدی کامیابی حاصل ہوسکتی ہے۔ (واللہ اعلم)

[۴] بہتر ہے کہ موذن ہی تکبیر پڑھے (ترمذی شریف) [۵] اذان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت بھی ہے تو کلمات اذان کی تلقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نہیں ہوئی، حالانکہ شب معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ کلمات سُن چکے تھے (فتح الباری وغیرہ) بلکہ صحابہ کرام کے رویاء صادقہ کو تلقین کا ذریعہ بنایا گیا اور اُن کی زبان سے کہلوایا گیا: اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ یہ جو قرآن حکیم میں ہے رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (سورہ ۹۴ الانشراح) ("ہم نے آپ کی خاطر آپ کا آوازہ بلند کیا") تو اس سے زیادہ اور اس سے بہتر اس کا شاہدہ کہاں ہوسکتا تھا:

خوش تر آں باشد کہ سرِ دلبراں   گفتہ آید در حدیث دیگراں

[۱] صحابہ کرام کی خوابیں اصولاً شورہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اذان کی مشروعیت ومسنونیت ان خوابوں سے نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد اور آپ کی تصدیق سے ثابت ہوئی۔ واللہ اعلم بالصواب

[۲] ترمذی شریف ص۲۶ ج۱

دار الہجرت اور حضرات مہاجرین کیلئے دعا

درستی آب وھوا اور حفظان صحت کے لئے پیغمبرانہ تدبیر

یثرب کے بجائے مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝ (سورہ ۱۶ النحل آیت ۴۱-۴۲ ع ۶)

"جن لوگوں پر (ان کے ایمان لانے کی وجہ سے) ظلم ہوا اور ظلم سہنے کے بعد انھوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی تو ہم ضرور انہیں دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا بدلہ تو کہیں بڑھ کر ہے۔ کاش یہ لوگ علم سے کام لیتے یہ (مہاجرین (وہ ہیں) جو ہر طرح کی مصیبتوں میں ثابت قدم رہے اور جو اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔"

مکہ جو حضرات مہاجرین کا وطن تھا۔ نہایت خشک اور گرم مقام تھا۔ نیچے ریت اور کنکریاں اوپر گرم پہاڑ جن میں شادابی کا نام نہیں تھا۔ اس کے برخلاف یثرب شاداب باغوں کے بیچ میں ایک کھلی ہوئی آبادی ہر طرف کھیت اور سبزہ اس کی ایک وادی[1] جس کا

---

[1] اس طرح کے میدان جن میں سیلاب آتا تھا۔ علاقہ یثرب میں تین تھے: العقیق، بطحان، قناۃ۔ (معجم البلدان)

نام بطحان تھا گویا گندے پانی کی جھیل تھی، جہاں سڑا ہوا پانی ہمیشہ بہتا رہتا تھا، جس کی وجہ سے پورے یثرب کی آب و ہوا مرطوب رہتی تھی[۱] کہ جیسے گرم اور خشک مقام کے آدمی یہاں آتے تو بیمار پڑ جاتے تھے اسی وجہ سے یہاں کا بخار 'حمی یثرب' پورے عرب میں مشہور تھا۔ چنانچہ حضرات مہاجرین یہاں پہونچے تو مزاج خراب ہو گئے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو نہایت تیز بخار۔ وہ بحرانی کیفیت میں یہ شعر پڑھتے تھے:

کل امرء مصبح فی اهله

والموت ادنی من شراك نعله

"لوگ اپنے اہل وعیال میں رہتے ہیں تو صبح صبح اُن کو دعا دی جاتی ہے انعم صباحًا[۲] اور حال یہ ہے کہ موت جوتی کے تسمہ سے بھی زیادہ قریب ہے۔"

حضرت بلال رضی اللہ عنہ اگرچہ حبشی[۳] تھے، مگر عمر گذری تھی مکہ کی گلیوں اور اس کی وادیوں میں۔ اُن کو بخار ہوا تو وہ بخار کی گھبراہٹ میں یہ اشعار پڑھتے تھے:

الا لیت شعری هل ابیتنّ لیلة ۔۔۔ بوادٍ وحولی اذخر وجلیل

وهل اردن یوما میاه مجنة ۔۔۔ وهل یبدون لی شامة وطفیل

---

[۱] بقول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا: اوباء ارض اللّٰہ "اللہ کی زمین میں سب سے زیادہ وبا والی سرزمین"۔ بخاری شریف ص۲۵۲ [۲] یہ اہلِ مکہ کی تہذیب تھی۔ صبح اُٹھتے ہی ایک دوسرے کو کہتے تھے انعم صباحًا۔ "آپ کی صبح بہت اچھی"۔ شعر کہنے والے کا مقصد بظاہر یہ ہے کہ میں یہاں اپنے اہل وعیال سے دور اس دعا کے سننے سے محروم ہوں۔ [۳] یہ قطعی بات نہیں ہے کہ پیدائش مکہ میں ہوئی تھی، اس میں اختلاف ہے۔ (الاستیعاب) حضرت ابوبکرؓ نے ان کو منہ مانگی قیمت پر خرید کر آزاد کر دیا۔ آزاد ہونے کے بعد حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا حساب کتاب بھی انہیں کے پاس رہتا تھا۔ پھر مؤذنِ رسول اللہ ہونے کی سعادت حصہ میں آئی۔ کان خازنًا لابی بکر ومؤذنا لرسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ (الاستیعاب)

کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ کیا میں کوئی رات وادی (مکہ) میں اس حالت میں گذار سکوں گا کہ میرے گرد (گیاہ) اذخر[1] اور گیاہ جلیل ہو اور کیا کسی روز مجنۃ[2] کے چشموں پر میرا ورود ہو سکے گا اور کیا کوہ شامہ[3] اور کوہ طفیل مجھے سامنے نظر آئینگے۔"

پھر اُن کے لئے بد دعا بھی کرتے تھے جن[4] کے ظلم و ستم نے ان کو ہجرت پر مجبور کیا تھا، کہ "اے اللہ ان لوگوں نے ہمیں اپنے وطن سے نکال کر اس وبا والی سرزمین میں پہونچایا۔ اے اللہ ان پر لعنت کر (ان کو اپنی رحمت سے محروم کر دے۔")

صحابہ کرام کی یہ حالت ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی:

"اے اللہ ہمیں "مدینہ" بھی ایسا ہی محبوب بنادے جیسے مکہ محبوب تھا یا مکہ سے بھی زیادہ ہمیں مدینہ کی محبت دیدے۔ اے اللہ مدینہ کے صاع میں مدینہ کے مُدّ میں ہمارے لئے برکت عطا فرما۔ خدا وندا ہمارے لئے اس کی آب و ہوا کو صحت بخش کر دے۔ اور اس کے بخار کو یہاں سے منتقل کر کے جحفہ پہونچا دے[5]۔"

---

[1] اذخر ایک گھاس کا نام ہے۔ چھتوں اور چھپروں میں لگائی جاتی ہے۔ (بخاری ص۲۲۲) [2] ایک پہاڑ کا نام ہے وقیل مجنۃ بلد علی امیال من مکہ وقیل جبل (معجم البلدان) [3] شامہ اور طفیل پاس پاس دو[2] پہاڑ ہیں۔ جو مکہ سے پچیس[25] تیس[30] میل کے فاصلہ پر ہیں۔ (معجم البلدان) [4] شیبہ بن ربیعہ عتبہ بن ربیعہ امیہ بن خلف۔ بخاری شریف ص۲۵۳ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی دعا قبول ہوئی۔ اگلے سال یہ سب غزوۂ بدر میں مارے گئے۔ [5] مکہ معظمہ سے چار منزل تقریباً اسّی میل کے فاصلہ پر مدینہ کے راستہ میں ایک سیلاب زدہ مقام تھا۔ پہلے اس کا نام "مہیعہ" تھا اس وقت ایک بڑا شہر تھا۔ پھر اس طرف سیلاب آنے لگے تو یہ تباہ ہو گیا اور اس تباہی اور بربادی کے سبب سے ہی اس کو جحفہ کہا گیا (معجم البلدان) جحف کے معنے چھیل ڈالنا جحفہ، قشرہ، جاءہم سیل حجات فاجتحفہم فسمیت الجحفۃ۔ (قاموس) رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علاقہ کو بخار منتقل کرنے کے لئے نامزد فرمایا۔ یہ خود اس علاقہ کی بربادی کی دلیل ہے (باقی صفحہ آئندہ پر)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول ہوئی۔ اس قبولیت کے آثار آج تک نمایاں ہیں کہ مدینہ منورہ کی آب و ہوا نہایت معتدل اور خوشگوار ہے۔ دولت و ثروت مدینہ میں نہیں ہے مگر ہر چیز میں برکت ہے۔ عموماً اہلِ مدینہ اس برکت کو دولت و ثروت سے بہتر سمجھتے ہیں۔

پھر اس دار الہجرت کی جو محبت دلوں میں ڈالی گئی اُس کا ادنیٰ نتیجہ یہ ہے کہ اس یثرب کو یثرب کے بجائے اپنے محبوب نبی کی طرف منسوب کر کے مدینۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کہا جانے لگا۔ پھر اسی ایک نام پر بس نہیں ہوئی بلکہ اربابِ ذوق نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق نام رکھے جو سَو سے زائد ہو گئے۔ ان میں سے چورانوے[۹۴] نام علامہ سمہودی نے وفاء الوفاء باخبار دار المصطفٰے میں شمار کرائے ہیں۔ (ص۸ تا ص۱۹ ج۱)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کب گوارا کر سکتے تھے کہ کسی آباد علاقہ کو وبا کے لئے منتخب فرمائیں باقی یہ کہ منتقل کرنے کے بجائے سرے سے اس مرض کو ختم کرنے کی دعا کیوں نہیں فرمائی تو حقیقت یہ ہے کہ جس طرح مزاجوں کی تبدیلی تقاضاء فطرت ہے ایسے ہی بخار بھی فطرت کا تقاضا ہے۔ جو صاحب کمال قدرت کے اسرار و رموز اور قضاء و قدر کی حکمتوں اور مصلحتوں کا مزاج شناس ہو وہ تبدیلی فطرت کی دعا نہیں کر سکتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مواخات

مہاجرین اور انصار (رضی اللہ عنہم) میں بھائی چارہ

(۱)

پچاس کے قریب صحابہ کرامؓ مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ آچکے ہیں۔ باقی آرہے ہیں۔ آنے والوں میں وہ بھی ہیں جو مکہ میں صاحب حیثیت تھے، جائدادوں اور کاروبار کے مالک تھے، مگر اب یہ سب قرآن پاک کے الفاظ[1] میں "الفقراء" ہیں۔ کیونکہ نہ صرف جائدادوں پر بلکہ اُن کے مال و متاع اور سامان و اسباب پر بھی دوسروں کا قبضہ ہو چکا ہے۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے رعب داب اور دھاک کے آدمی چند ہی تھے جنھوں نے کھلم کھلا ہجرت کی۔ باقی سب وہ تھے جو چھپتے چھپاتے خالی ہاتھ بمشکل تمام مدینہ پہونچے تھے، اُن کے بدن کے کپڑے بھی سالم نہیں تھے (کسی قدر تفصیل گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے)۔

(۲)

پوری دنیا میں صرف مٹھی بھر جاں نثار ان پردیسی فقراء اور تہیدستوں کے مددگار تھے جنھوں نے بیعت عقبہ کے موقع پر ان کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تھی، مگر یہ کتنے تھے؟ اُن کے ذرائع کیا تھے؟ صرف تہتر[2] یا پچھتر جب کہ اُن میں دو عورتیں بھی تھیں۔

(۳)

یثرب اول تو کاروباری قصبہ نہیں تھا اور جو کاروبار تھا اُس پر یہودیوں کا قبضہ تھا۔ قبیلہ اوس اور خزرج کے لوگ جن سے حضرات انصار کا تعلق تھا وہ کاشتکار تھے۔ کسی کے پاس

---

[1] سورہ ۵۹ حشر، آیت ۸ [2] جو حضرات بیعت کے موقع پر حاضر نہیں ہوسکے اور مسلمان ہو چکے تھے اُن کی تعداد بھی اس سے زیادہ نہ ہوگی۔

اپنی زمین تھی کوئی دوسروں کی زمین میں بٹائی پر کاشت کرتا تھا جن کی زمینیں اپنی تھیں، اقتصادی ڈھانچہ اُن کا بھی بگڑا ہوا تھا جس کے پاس جو کچھ پس انداز تھا، وہ "اوس" اور "خزرج" کی آپس کی لڑائی میں ختم ہو چکا تھا جن کا سلسلہ تقریباً ایک سو بیس سال کے بعد تین چار سال پہلے ختم ہوا تھا۔

عموماً بیع سَلَم[1] (بدھنی) کی شکل میں یا سود پر پیشگی رقم لے لی جاتی تھی اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ پوری پیداوار اس سَلَم یا سود کی نذر ہو جاتی تھی۔

ان قبیلوں کے کچھ لوگ ان حالات سے مستثنیٰ تھے مگر ان میں سے چند کے سوا باقی سب صاحبِ جائداد، بڑے لوگ اپنے سابق مذہب پر قائم تھے۔

(۴)

اللہ کے گھر (مسجد مبارک) کی تعمیر شروع ہوئی تو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان درماندہ پردیسی مہاجرین کی بود و باش کا مسئلہ بھی تھا کہ اگر ان کے رہنے کا ٹھکانا ہو جائے تو دارالھجرت میں وطن کی کچھ آسائش میسر آسکے اور پراگندہ حالی ختم ہو۔

ممکن تھا اُن کے لئے الگ محلہ آباد کر دیا جاتا۔ معاشرت کا جو فرق تھا کہ اہل مدینہ کاشتکار اور زمیندار تھے اور مہاجرین تاجر پیشہ، شہری زندگی کے عادی، اس کا بھی تقاضا یہی ہونا چاہیئے تھا کہ اُن کی آبادی الگ ہوتی۔ نئی آبادی کے لئے مالی مشکلات کا حل وہ باہمی تعاون تھا جس نے بلا کسی غیر معمولی خرچ کے مسجد مبارک اور ازواج مطہرات کے حجرات کی تعمیر کرا دی تھی لیکن علیحدہ آبادی سے مہاجرین اور انصار میں شیر و شکر جیسی یگانگت نہیں پیدا ہو سکتی تھی اور باہمی اُنسیت والفت کی وہ نعمت جو اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو عطا فرمائی تھی (جس کو کلامِ پاک میں خاص طور پر نمایاں فرمایا گیا تھا[2]) وہ مشاہدہ بن کر سامنے نہیں آسکتی تھی۔

---

[1] بخاری شریف ص۲۹۸ [2] هُوَ الَّذِيٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ (۲) عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (الانفال، آیت ۶۲ و ۶۳)

جن کو مساوات، اشتراک عمل اور ایک دوسرے کے لئے ایثار واخلاص کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرنا تھا۔ علیحدہ آبادی نہ اُن کے لئے مناسب تھی نہ وہ خود یہ علیحدگی برداشت کر سکتے تھے جو اسلامی معاشرہ میں اونچ نیچ کی بنیاد بن جاتی۔

اس کے علاوہ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے جس مساوی سطح کی ضرورت تھی علیحدہ آبادی اُس کے لئے خلیج بن جاتی۔

حضرات مہاجرین کم و بیش دس بارہ سال تک برکات نبوت سے فیضیاب ہو کر تربیت یافتہ عالم و فاضل بن چکے تھے۔ حضرات انصار کی مخلصانہ ذہانت اگرچہ اُن کے لئے رہنما ہوتی تھی، مگر اس ذہانت میں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم "رؤف رحیم" کا رنگ بھرنے اور حضرات انصار کو مہاجرین کی سطح پر لانے کے لئے جس تواصی[1] بالحق، باہمی احتساب، افادہ اور استفادہ، تعلیم و تعلّم کی ضرورت تھی، الگ آبادی کی صورت میں وہ پوری نہیں ہو سکتی تھی۔

(۵)

عرب میں عقد موالات کا طریقہ رائج تھا۔ غیر قبیلہ کا آدمی کسی بھی قبیلہ میں پہونچتا، اور ایک معاہدہ کرکے اس قبیلہ میں داخل ہو جاتا، اب اسی قبیلہ کی طرف منسوب ہوتا۔ معاہدات صلح و جنگ میں شریک رہتا اور مرنے کے بعد اس کا ترکہ بھی اسی قبیلہ میں تقسیم کیا جاتا حضرات مہاجرین اور انصار میں یہ عقد ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ عقد موالات کچھ روایتیں رکھتا تھا۔ ان میں ایسی روایات[2] بھی تھیں جن کو اسلام برداشت نہیں کر سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو

---

[1] ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے اور اس پر عمل کرنے کی نصیحت کرنا۔

[2] ہمارے زمانہ کا سیاسی گٹھ جوڑ اور پارٹی بندی اس کا نمونہ ہے کہ حق و انصاف کا نام لینا بھی جرم ہوتا ہے۔ جا بیجا، جائز و ناجائز پارٹی کی حمایت کی جاتی ہے اور اسی کو تدبّر اور دانش مندی کہا جاتا ہے۔

بد بودار فرمایا[1] اور قرآن حکیم نے ان کی مخالفت اور متضاد بنیادوں[2] پر اسلامی تہذیب و اخلاق کی عمارت بلند کی۔ اب یہ پیغمبرانہ تدبر تھا کہ عقد موالات کے بجائے آپ نے عقد مواخات کی بنیاد ڈالی۔

(۶)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے مکان میں حضرات مہاجرین و انصار (رضی اللہ عنہم اجمعین) کا اجتماع ہوا۔ یہ کل نوے حضرات تھے۔ پینتالیس مہاجرین، پینتالیس انصار۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صوابدید کے بموجب ان میں سے ایک ایک انصاری کو ایک ایک مہاجر کا نام بنام بھائی قرار دے دیا۔ یہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ فراست اور مردم شناسی تھی کہ جن کو آپ نے بھائی بنایا فطری طور پر اُن کے مزاج برادرانہ تھے۔ وہ حقیقی بھائیوں سے بھی زیادہ

---

[1] دعوها فانها منتنه۔ بخاری شریف ص۷۲۲ [2] زمانہ جاہلیت میں اس تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی کہ حق پر کون ہے اور تقاضا را انصاف کیا ہے۔ صرف یہ معاہدہ (عقد موالات) ہی دلیل ہوتا تھا یعنی چونکہ ہمارا حلیف میدان جنگ میں ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم بھی اس کی حمایت میں میدانِ جنگ میں ہوں، اسلام نے اس قسم کے معاہدہ ہی کو حرام قرار دیا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے لاحلف فی الاسلام اور مسلمانوں کیلئے قرآن پاک کی خاص ہدایت یہ ہے: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ (الآیۃ) (ترجمہ) "مسلمانو! ایسے ہو جاؤ کہ انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے یہ اللہ کے لئے گواہی (سچی گواہی)، خواہ خود تمہارے خلاف ہو یا ماں باپ اور قرابت والوں کے خلاف ہو" (سورہ ۴ نساء، آیت ۱۳۲) نیز ارشاد ہے: "اگر کسی قوم سے کسی بنا پر ناراضگی بغض اور غصہ ہے تو ہرگز ہرگز ایسا نہ ہو کہ یہ بغض تمہیں اُبھار دے، اس بات پر کہ اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ ہر حال میں انصاف کرو۔ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے" (سورۂ مائدہ، رکوع ۲، آیت ۸) "اور ایک گروہ نے اگر تمہیں خانہ کعبہ میں جانے سے روک دیا ہے جس سے تمہیں غم و غصہ ہے تو اس کا یہ اثر ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ یہ غم و غصہ تمہیں اس بات پر اُبھار دے کہ تم زیادتی کرنے لگو (تمہارا دستور، تو یہ ہونا چاہیئے کہ نیکی اور پرہیزگاری کے کام میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم کے کام میں مدد نہ کرو" (سورہ ۵ مائدہ آیت ۲)

ایک دوسرے کے ہمدرد اور مددگار بن گئے اور مزاجوں کی موافقت کے ساتھ جب حضرات مہاجرینؓ سے اور اعلیٰ اخلاق کا بھی ظہور ہوا تو حضرات انصار کے اخلاص نے عقیدت کی شان اختیار کرلی۔

اُمّ العلاءؓ ایک انصاری خاتون تھیں جن کے گھرانے کے حصہ میں حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ آئے تھے، وہ اپنے مہمان کی اتنی معتقد ہوگئیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو ام العلاءؓ نے بڑے وثوق سے کہا: شہادتی علیك لقد اکرمك اللہ یعنی میں قسم کھاکر کہتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے یقیناً آپ کو بخشدیا ہے[1]

رشتۂ اخوت اور حضرات انصار کا ایثار

وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۔

(سورۂ نساء، آیت ۳۳)

"اور جن سے اقرار باندھا تم نے اُن کو پہنچاؤ اُن کا حصہ"

(شاہ عبدالقادرؒ)

عرب میں عقد موالات کا اثر مرنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مولیٰ (جس سے یہ معاملہ ہوتا تھا) وہ چھٹے حصے کا مستحق ہوا کرتا تھا۔ مندرجہ بالا آیت کے بموجب رشتۂ اخوت کا اثر وفات کے بعد ظاہر ہونا چاہئے تھا کہ ایک دوسرے کا وارث ہوتا۔ مگر حضرات انصار نے بیعت عقبہ کے سلسلہ میں جب دعوت دی تھی تو امداد کا وعدہ بھی کیا تھا۔ آقائے دوجہاں صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جب رشتۂ اخوت قائم فرمایا تو حضرات انصار کی مخلصانہ اور ایثار شیوہ ذہانت نے اس کے معنیٰ یہ

---

[1] آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس طرح وثوق کر لینے اور قسم کھانے کو پسند نہیں فرمایا، کیونکہ کسی کو معلوم نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ آپ نے تعلیم دی کہ یہ کہنا چاہئے کہ اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بخشدیا ہوگا (بخاری شریف ص۱۶۸) مگر حضرت ام العلاءؓ کا یہ وثوق اور یقین اس بنا پر تھا کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے غیر معمولی تقویٰ اور آپ کے اعلیٰ اخلاق نے ان کو گرویدہ اور معتقد بنا دیا تھا۔

سمجھے کہ امداد کا طریقہ برادرانہ ہونا چاہیے۔

امداد کرنے کے لئے جائداد تقسیم نہیں کی جاتی، مگر برادر زندگی میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ لہٰذا حضرات انصار نے فیصلہ فرمایا کہ مہاجر بھائیوں کو اپنی زندگیوں میں برابر کا شریک بنالیں، چنانچہ دربار رسالت میں درخواست پیش کردی:

اَقْسِمْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ اِخْوَانِنَا النَّخِيْلَ۔ [1]

"ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان باغات تقسیم فرما دیجئے۔"

منصوبہ یہ تھا کہ بھائیوں کا حصہ بھائیوں کے قبضہ میں دیدیا جائے۔ وہ اس کو اپنی ملک سمجھیں، اپنی صوابدید کے بموجب اس میں تصرف کریں اور فائدہ اٹھائیں لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت نے یہ منظور نہیں فرمایا کہ حضرات انصار کی جائدادوں سے ان کی ملکیت ختم ہو۔ دوسری طرف دشواری یہ تھی کہ خود حضرات انصار کا جو مقصد تھا وہ اس پیشکش سے پورا نہیں ہوتا تھا۔ حضرات انصار کا مقصد تو یہ تھا کہ مہاجرین کی مالی مشکلات ختم ہوں لیکن اس طرح تقسیم کے بعد حضرات مہاجرین صاحب جائیداد ضرور ہوجاتے مگر یہ حضرات تاجر پیشہ کاشتکاری اور زراعت سے ناواقف تھے وہ ان جائیدادوں سے پیداوار کرکے وہ امداد حاصل نہیں کرسکتے تھے جس کے لئے حضرات انصار نے یہ ایثار کیا تھا۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات انصار کو اس دشواری کی طرف توجہ دلائی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امداد کی صورت یہ ہے کہ زمین اور باغ کے بجائے پیداوار کا حصہ مہاجرین کو دو۔

باغات کی خدمت اور زمین میں کاشت کی ذمہ داری آپ صاحبان لیں اور پیداوار مہاجرین کو دیدیں۔ [2]

---

[1] بخاری شریف ص ۳۱۲ و ص ۵۳۴

[2] البدایہ والنہایہ ص ۲۲۹ ج ۳ و ص ۲۲۸ ج ۳

حضرات مہاجرین نے بھی یہی فرمائش کی: کام کی ذمہ داری آپ لیں اور پیداوار میں ہمیں شریک کرلیں۔[1]

حضرات انصار نے جیسے ہی یہ تجویزیں سنیں، دفعۃً اُن کے جذبات کی صدا بلند ہوئی: سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (ہم نے سُن لیا ہے ہم پوری پوری تعمیل کریں گے) —— دنیا نے بہت سے انقلاب دیکھے مگر اس انقلاب کی کوئی مثال چشمِ عالم کے سامنے نہیں آئی کہ مالک خود اپنی مرضی سے کاشتکار اور اجنبی لوگ پردیس سے آئے ہوئے خود بخود زمیندار بن گئے۔[2]

---

[1] عام طور پر یہی صورت ہوئی اگرچہ بعض حضرات نے یہ بھی کیا کہ زمینیں اور باغ لے لیا اور خود کام کیا۔ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کو جو درخت دیئے گئے تھے وہ ان پر مالکانہ تصرف کرتی رہیں اور اپنی ملک ہی سمجھتی رہیں۔ حتیٰ کہ جب ان سے واپس کرنے کو کہا گیا تو تیار نہ ہوئیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریباً دس گنی جائداد دیکر ان کو واپس کرنے پر راضی کیا (صفحہ ۲۰۹ ج ۴ البدایہ والنہایہ بحوالہ مسند احمد)۔ علامہ علی بن برہان الدین حلبیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرات انصار کی پیش کش اگرچہ یکساں تھی کہ وہ اپنی نصف جائدادیں دینا چاہتے تھے۔ مگر حضرات مہاجرین میں سے بعض نے تو اس کو اس صورت سے منظور کیا کہ حضرات انصار ہی کام کریں گے اور ان کی پیداوار مہاجرین حضرات کو دیتے رہیں گے اور بعض نے ان آراضی کو بطور بٹائی منظور کیا کہ وہ خود کام کریں گے اور نصف حصہ انصار کو دیتے رہیں گے۔ (سیرۃ حلبیہ صفحہ ۲۹ ج ۲) مگر اس دوسری صورت میں کوئی خاص ایثار نہیں ہے حالانکہ حضرات انصار کا ایثار اتنا تھا کہ مہاجرین حضرات کو یہ فکر ہوگیا کہ تمام اجر و ثواب یہ سمیٹ لیں گے ہم تہی دامن رہ جائیں گے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

[2] حضرات انصار رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تصور یہی تھا۔ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منظور نہیں فرمایا۔ حضرات مہاجرین کی حیثیت کو عارضی قرار دیا۔ چنانچہ جب حضرات مہاجرین کو جائدادیں مل گئیں تو حضرات انصار کی جائدادیں واپس کردی گئیں۔

یہ ایثار کیوں تھا؟

قرآن شریف میں ہم بھی پڑھتے ہیں:

اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۫ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ (سورہ ۴۰ المومن آیت ۳۹)

"یہ دنیا (موجودہ زندگی) صرف چند دن کام چلانا ہے اور برت لینا ہے۔ بیشک آخرت ہی ٹھیراؤ (اور مستقل قیام) کا مقام[1] ہے۔"

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (سورہ ۲۹ العنکبوت۔ آیت ۶۴)

"بیشک اصل زندگی عالم آخرت ہے۔"

وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا (سورہ ۷۳ مزمل، آیت ۲۰)

"اور جو نیک عمل اپنے لئے آگے بھیجو گے اس کو اللہ کے پاس پہونچ کر اس سے اچھا اور ثواب میں بڑا پاؤ گے۔"

ہمارا عقیدہ یہی ہے اور بلاشبہ ان آیتوں پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن ہمارے ایمان و عقیدہ کو یقین کا وہ درجہ حاصل نہیں ہے جو مشاہدہ کی شان رکھتا ہو۔ پھر مشاہدہ بھی غلطی کر جاتا ہے۔ ہماری آنکھیں آفتاب کو گردش کرتا ہوا دیکھتی ہیں۔ ہر صبح و شام کا طلوع وغروب ہمارا مشاہدہ ہے۔ لیکن سائنس کے ماہرین کہتے ہیں کہ یہ مشاہدہ غلط ہے۔ آفتاب گردش نہیں کرتا زمین گھومتی ہے۔ جب مشاہدہ بھی غلط ہو جاتا ہے تو یقین کا کوئی اور درجہ بھی ہو سکتا ہے جو مشاہدہ سے بالا ہو، جو سراسر یقین ہی یقین ہو۔ اس میں کسی طرح بھی شک و

[1] "یہ جو زندگی ہے دنیا کی سو برت لینا ہے اور وہ گھر جو پچھلا ہے وہی ہے ٹھیراؤ کا گھر۔"

(حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ)

شبہ یا کسی قسم کے احتمال کی گنجائش نہ ہو، جس کو اصطلاحاً عین الیقین[1] کہتے ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یقین کا یہی درجہ[2] حاصل تھا۔ اسی یقین کی بنا پر حضرات انصار اپنی جائدادیں تقسیم کرنے پر خوش تھے کہ ہم نے آخرت کی حقیقی زندگی کے لئے بہت بڑا سرمایہ حاصل کر لیا اور جس کو راہِ خدا میں اپنی ملک سے نکالا۔ اس پر ابدی اور لازوال ملک کی مہر لگ گئی جو کبھی مٹنے والی نہیں ہے۔ دوسری طرف اسی یقین اور عین الیقین نے ان حضرات مہاجرین کے پاک دلوں میں ایک اضطراب پیدا کر دیا جو مفت میں صاحب جائیداد اور زمیندار بن گئے تھے۔

اضطراب اس پر تھا کہ حضرات انصار کے اس ایثار کا ثمرہ یہ ہوگا کہ اجر و ثواب کا ہر ایک درجہ حضرات انصار ہی حاصل کر لیں گے۔ (رضی اللہ عنہم اجمعین) ہم ان درجات تک نہیں پہونچ سکیں گے۔

چنانچہ حضرات مہاجرین نے اپنے آقا کی خدمت میں (صلی اللہ علیہ وسلم) عرض کیا:

"یا رسول اللہ جن لوگوں میں ہم آکر اترے ہیں، ہماری چشم بصیرت نے ان جیسے ہمدرد و غمگسار نہیں دیکھے۔ تنگی ہو یا فراخی ان کی ہمدردی میں فرق نہیں آتا — اپنی جائدادیں ہمیں دیں، پھر کام کی ذمہ داری بھی خود لے لی۔ محنت وہ خود کریں گے اور نفع میں ہمارا حصہ لگائیں گے، پس سارا اجر و ثواب وہی سمیٹ لیں گے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات مہاجرین کو اطمینان دلایا کہ:

---

[1] مشاہدہ آتش یقین پیدا کر دیتا ہے کہ یہ آگ ہے اور یہ جلاتی ہے، لیکن جو یقین آتش سوزاں میں بھسم ہونے والے کو ہو سکتا ہے وہ صرف مشاہدہ کرنے والے یا تاپنے والے کو نہیں ہو سکتا۔ جلنے اور خاکستر ہونے والے کا یقین ہی ہے عین الیقین۔ [2] یہی عین الیقین صحابہ کرام کی افضلیت کا سبب ہے کیونکہ امت میں یہ درجہ کسی کو بھی حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ اُمت میں کسی کو بھی یہ شرف حاصل نہیں ہے کہ صادق مصدوق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بالمشافہ کوئی ارشاد سنا ہو جس سے یقین کا آفتاب روشن ہوا ہو۔

"اگر تم ان کا احسان[1] مانو اور ان کے لئے دل سے دعا کرتے رہو تو تمہارا ثواب بھی کم نہ ہوگا[2]"

حضرات انصار کے اسی یقین کا یہ اثر تھا کہ جو ایثار کر چکے تھے اس پر وہ قانع نہیں تھے۔ چنانچہ جائیداد کے اس بٹوارہ کے بعد بھی ان کا دست کرم کوتاہ نہیں ہوا، وہ ان کی طرف بھی بڑھتا رہا جنھیں جائیداد نہیں ملی تھی جو گھرستی اور صاحب اہل و عیال نہیں تھے، یہ اصحاب صفّہ تھے ان کی خدمت بھی وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔

اصحاب صُفّہ کے لئے سوال کرنا حرام تھا۔ فاقہ سے بیہوش ہو کر اُن کو گر جانا آسان تھا، مگر سوال کرنا محال۔ اُن کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اُن کے چہروں سے بھی اُن کے فاقہ کا راز فاش نہ ہو۔ حضرات انصار کی مزاج شناسی نے ان قناعت پسندوں کے لئے ایک نئی راہ تجویز کی۔ ان حضرات نے مسجد کے ستونوں میں رسّیاں باندھ دیں۔ کھجوروں کے موسم میں وہ کھجور کے خوشے جن

---

[1] ہمارے ایک بزرگ تحریر فرماتے ہیں: "دعا کا احسان درہم و دینار کے احسان سے کم نہیں ہے۔ پھر فرماتے ہیں: اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے یہاں جب کوئی سائل آتا اور دعائیں دیتا جیسا کہ سائلوں کا طریقہ ہے تو ام المومنین[رض] بھی اس فقیر کو دعائیں دیتیں اور بعد میں خیرات دیتیں۔ کسی نے کہا: اے ام المومنین آپ سائل کو صدقہ بھی دیتی ہیں اور جس طرح وہ آپ کو دعا دیتا ہے آپ بھی دعا دیتی ہیں، فرمایا: میں اگر اس کو دعا نہ دوں اور فقط صدقہ دوں تو اس کا احسان مجھ پر زیادہ رہے گا، کیونکہ دعا، صدقہ سے کہیں بہتر ہے اس لئے دعا کی مکافات دعا سے کر دیتی ہوں تاکہ میرا صدقہ خالص رہے دُعا کے مقابلہ میں نہ ہو۔ کذا فی المفاتیح شرح المصابیح۔ لہٰذا جو شخص دراہم معدودہ دیکر مخلصانہ دعاؤں کا سودا کر سکتا ہے وہ کبھی نہ چوکے اور اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دے دعا، ضرور حاصل کرے۔

جادے چند دادم جاں خریدم بحمد اللہ زہے ارزاں خریدم"

سیرۃ المصطفیٰ از حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی صفحہ ۳۳۱/۱ [2] البدایہ والنہایہ صفحہ ۲۲۸/۱

میں گدرے کھجور ہوتے تھے، درختوں سے کاٹ کر لاتے اور ان رسیوں میں لٹکا دیتے تھے[1] - کھجور پک کر گر جاتے یا یہ حضرات توڑ لیتے اور ان سے فاقہ کشائی کرتے رہتے تھے۔ بظاہر یہ نفل ہوتا تھا مگر درحقیقت سدِ رمق کا ذریعہ تھا، فاقہ زدہ کمریں سیدھی ہو سکتی تھیں۔

ایثار و اخلاص کی مثالیں

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ (سورہ ۵۹ حشر آیت)

"اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ اُن پر فاقہ ہی ہو۔"

اس آیت میں حضرات انصار کی جو خصوصیت بیان فرمائی گئی، اس کی مثال[2] حضرت ابوطلحہؓ کا واقعہ ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ:

ایک فاقہ زدہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا کہ یا رسول اللہؐ میں سخت بھوکا ہوں[3]۔ آپ نے گھر والوں سے دریافت کرایا کچھ کھانے کو ہے؟ ہر ایک گھر سے جواب آیا: صرف پانی ہے۔ آپ نے حاضرین سے فرمایا: کوئی صاحب ان کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ حضرت ابوطلحہؓ نے عرض کیا: میں حاضر ہوں۔ غرض وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ گھر میں جا کر بیوی سے کہا: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مہمان کی عزت کرو (ادب و احترام سے مدارات کرو)۔ اہلیہ محترمہ نے کہا، صرف بچوں کے سہارے کا کھانا موجود ہے۔ حضرت ابوطلحہؓ نے فرمایا، جو کچھ ہے

---

[1] وفاء الوفاء ص ۳۲۲ ج ۱

[2] ایک اور مثال بھی بیان کی گئی ہے کہ ایک صاحب کو بکری کی سری پیش کی گئی۔ انھوں نے کہا فلاں صاحب اور ان کے بچے زیادہ ضرورت مند ہیں چنانچہ یہ سری ان کے یہاں بھیجی گئی انھوں نے ایک دوسرے صاحب کا نام لیا اور اُن کی ضروریات ظاہر کر کے ان کے یہاں بھجوا دی۔ اسی طرح سات آدمیوں میں گھوم کر پہلے شخص کے پاس آئی۔ ہر ایک دوسرے کو اپنے سے مقدم رکھتا رہا۔ (ص ۹۵ ج ۸ فتح الباری بحوالہ ابن مردویہ)

[3] فتح الباری ص ۹۶ ج ۸

تیار کرو، چراغ[1] روشن کرلو بچوں کو بہلا کر سُلا دو۔ محترم خاتون نے ایسا ہی کیا۔ کھانا تیار کیا، چراغ جلایا۔ جب کھانے بیٹھے تو یہ خاتون اُٹھیں بظاہر اس لئے کہ چراغ کی بتّی بڑھا دیں (تو تیز کردیں) مگر بڑھانے کے بجائے میاں بیوی کی آپس کی تجویز کے مطابق) چراغ بجھا دیا۔ اندھیری میں کھانا شروع[2] کیا۔ میاں بیوی صرف ہاتھ اور مونھ چلاتے رہے گویا کھا رہے ہیں، کھایا کچھ نہیں۔ بھوکے پیٹ رات گذاری[3]۔

یہ تھا ایثار۔ اب اخلاص ملاحظہ فرمایئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر فرما دیا تھا کہ سیاسی اقتدار میں حضرات انصار کا حصّہ نہیں ہوگا۔ اُن کے مقابلہ میں دوسروں کو بڑھایا جائیگا مگر ان حضرات کو نہ اپنے لئے اقتدار کی طلب تھی، نہ اولاد کے لئے۔ وہ خود بھی عشق مولا میں گم تھے اسی عشق کا متوالا اپنی اولاد کو دیکھنا چاہتے تھے۔ اُن کو اپنے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی مطلوب تھی اور اس آقا کی خوشنودی کے ذریعہ تمام آقاؤں کے آقا حضرت حق جلّ مجدہٗ کی رضا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اُن کو اس پر ناز تھا کہ جہاں یہ پیشین گوئی کی جاتی تھی:

اِنکم ستلقون بعدی اثرۃ

"تم میرے بعد دیکھو گے کہ دوسروں کو تم پر ترجیح دیجائیگی،

ان کو بڑھایا جائے گا تم کو نظر انداز کیا جائے گا۔"

وہاں بشارت بھی ساتھ ساتھ دی جاتی تھی:

فَاصْبِرُوْا حَتّٰی تَلْقَوْنِیْ وَمَوْعِدُکُمُ الْحَوْضُ[4]

"صبر کرنا یہاں تک کہ تمھاری میری ملاقات ہو اور ملاقات کا مقام حوض کوثر ہوگا، اسی کا وعدہ ہے۔"

---

[1] گویا مہمان کے اعزاز میں، کیونکہ کسی ضرورت سے ہی چراغ جلایا جاتا تھا، ورنہ عام طور پر گھر میں چراغ جلانے کا دستور نہیں تھا۔ بخاری شریف ص۵۶ [2] عام عادت تھی اس لئے دوبارہ چراغ جلانے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ [3] بخاری شریف ص۵۳۵ و ص۵۳۶ [4] بخاری شریف ص۵۳۵

اور جب ان حضرات کے ایثار و اخلاص کا یہ عالم ہے تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ جس کی ایک نظر نے پوری جماعت میں یہ اخلاص و ایثار پیدا کیا وہ خود اخلاص و ایثار سے تہی دامن ہو (معاذ اللہ) اور کیا محمد رسول اللہ کے ایثار، اخلاص اور آپ کی صداقت و حقانیت کی یہ کھلی ہوئی دلیل نہیں ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

صلوات اللہ علیہ وعلیٰ اصحابہ الکرام واتباعہ اجمعین۔ آمین

اخلاص وللّٰہیت کی انتہا

جو آپ کے کام آئے وہ بہتر ہے اس سے جو ہمارے پاس رہے۔

وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى

يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا (سورہ ۵۹ حشر آیت)

"محبت کرتے ہیں ان سے جو وطن چھوڑ کر آئے ان کے پاس اور نہیں پاتے اپنے دلوں میں کوئی رشک اس سے جو دیا جائے مہاجرین کو۔"[1]

سکۂ میں قبیلہ بنی نضیر کے یہودیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ان کے شر سے محفوظ رکھا۔ مگر ظاہر ہے ان کے اس منصوبہ سے وہ معاہدہ ختم ہو گیا جو بقاء باہم کے متعلق سلہ ہجری میں ہوا تھا۔ (تفصیل آگے آئے گی) لامحالہ ان کو وہ سزا دی گئی جو از روئے معاہدہ لازم تھی، یعنی ان کو اس علاقہ سے خارج کر دیا گیا، ان کی جائدادیں اسلامی محروسہ میں داخل ہوئیں۔

چونکہ یہ علاقہ جنگ کے بغیر قبضہ میں آیا تھا تو اس کو مجاہدین پر تقسیم نہیں کیا گیا بلکہ وحیٔ الٰہی نے

---

[1] سورہ ۵۹ الحشر آیت ۹

اس کو خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق قرار دیا[1]۔

رسول خدا رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سب سے پہلے حضرات صحابہ کی مشکلات تھیں۔ آپ نے حضرات انصار کو جمع فرما کر استصواب فرمایا کہ اس علاقہ کی آراضی انصار اور مہاجرین دونوں کو دی جائیں یا صرف حضرات مہاجرین کو دی جائیں تاکہ وہ حضرات انصار کی جائیدادیں واپس کر دیں اور اُن کے مکانات خالی کر دیں ؟

ارشاد گرامی کا جواب دینے کے لئے قبیلہ اَوس اور خزرج کے دونوں سردار سعد بن عبادہ (خزرج)، سعد بن معاذ (اوس) کھڑے ہوئے۔ عرض کیا یا رسول اللہ جو کچھ آپ تقسیم فرمائیں حضرات مہاجرین کو تقسیم فرما دیں۔ ہمیں نہ اپنے مکانات کی ضرورت ہے نہ جائیدادوں کی۔ بلکہ ہم بہت خوش ہوں گے اگر ہماری جائیدادوں اور ملکیتوں میں سے کچھ اور ان مہاجرین کو عنایت فرما دیں، جو راہِ خدا میں وطن سے بے وطن ہوئے، گھروں سے اُجڑے، جائیدادوں سے محروم ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حوصلہ مندانہ جواب سُنا تو مطمئن ہوئے اور دعا دی:

اَللّٰھُمَّ[2] ارْحَمِ الانصار وابناء الانصار اور بعض دوسری روایتوں میں تیسرا لفظ

---

[1] اس وقت تک مملکت کی ضرورتیں بھی غیر معمولی تھیں کہ ایک مملکت کی بنیاد رکھی جا رہی تھی اور حضرات مہاجرین و انصار میں اگرچہ ایسے صاحب استطاعت بھی تھے جو ضروریات زندگی فراہم کر سکتے تھے۔ مگر کچھ ایسے تہی دست بھی تھے کہ فاقہ کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں تھا تو اگر یہ جائداد مجاہدین پر مساویانہ تقسیم کر دی جاتی تو نہ مملکت کی بنیادی ضرورتیں پوری ہو سکتی تھیں نہ فاقہ زدہ انصار و مہاجرین کو قابل اعتماد امداد مل سکتی تھی۔ اب قرآن پاک کے الفاظ میں ان جائدادوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تسلط تسلیم کرایا گیا:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ (حشر آیت ۶) یعنی تمام جائداد پر آپ کا اختیار تمیزی تسلیم کیا گیا تو آپ نے مساویانہ تقسیم کے بجائے ایسا بندوبست فرمایا کہ افراد کی ضرورتیں بھی پوری ہوئیں اور جماعت کی اقتصادی اور جنگی ضرورتوں کو بھی مدد مل سکی واللہ اعلم۔

[2] "اے اللہ رحم فرما انصار پر اور انصار کی اولاد پر"

ایثار ایثار الانصار بھی ہے۔

اب آپ نے اس علاقہ کا ایک حصہ حضرات مہاجرین کو عنایت فرمایا۔ حضرات انصار میں سے دو صاحب بہت ضرورت مند تھے۔ حضرت ابودجانہؓ اور حضرت سہل بن حنیفؓ ان کو کچھ جائداد عطا فرمائی، باقی علاقہ اپنے پاس رکھا، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کاشت[1] ہوتی تھی اور اس کی آمدنی میں سے ازواج مطہرات کا نفقہ ادا فرماتے تھے۔ باقی تمام آمدنی مسلمانوں کی جماعتی[2] اور انفرادی خصوصاً جہاد کی ضرورتوں میں صرف کردیتے تھے۔

بہرحال حضرات انصار نے نہ صرف یہ کہ اس جائداد میں حصہ لینے سے معذرت کردی بلکہ اپنی باقی جائیدادوں کے متعلق بھی پیش کش کردی۔ یہ ہے ایک عملی مثال اس بلند حوصلہ اور وسعت قلب کی جس کو زیب عنوان آیت میں سراہا گیا ہے۔

چند سال بعد بحرین کا علاقہ محروسہ اسلامیہ میں داخل ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ حضرات انصار کو کچھ جاگیریں عطا فرمادیں مگر حضرات انصار نے اُن کے لینے سے صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ بضد ہوگئے کہ جتنی جاگیریں ہمیں عطا فرمائی ہیں اتنی ہی حضرات مہاجرین کو بھی عنایت فرمادیں اتنی گنجائش نہیں تھی۔ ارشاد ہوا:

اَمّا لا فاصبروا حتّٰی تلقونی انه سیصیبکم اثرة (بخاری شریف ص۵۳۵)

اگر آپ صاحبان منظور نہیں کرتے تو صبر سے کام لو یہاں تک کہ تم (حوض کوثر پر) مجھ سے ملوگے (یعنی اس ایثار کے جواب میں۔ ایثار نہیں ہوگا) بلکہ تمہیں ترجیحات سے واسطہ پڑے گا کہ دوسروں کو تم پر مقدم رکھا جائیگا، تمہارے حقوق کا لحاظ نہیں رکھا جائے گا۔

---

[1] السیرۃ الحلبیہ ص۲۹۶ ج ۲

[2] فیجعله مجعل مال اللہ۔ بخاری شریف ص۵۷۵ وغیرہ فی السلاح والکراع عدۃ فی سبیل اللہ (ص۴۲۵ بخاری شریف و قسطلانی)

اسمائے گرامی برادران مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم

رجسٹروں کو اس وقت توفیق نہیں ہوئی تھی کہ حضرات صحابہ کے اسمائے گرامی اپنے صفحات میں محفوظ کریں اور بھائی بننے والوں کو لکھاوٹ کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ تاہم راوی حضرات کے سینوں نے جو نام محفوظ رکھے عیون الاثر فتح الباری و سیرۃ ابن ہشام کے حوالے سے یہاں درج کئے جاتے ہیں:

حضرات مہاجرین	حضرات انصار	حضرات مہاجرین	حضرات انصار
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ	حاطب بن بلتعہ رضی اللہ عنہ	عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ
عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ	عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ	ابو مرثد رضی اللہ عنہ	عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ
ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ	سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ	عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ	عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ
عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ	سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ	عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ	ابو دجانہ رضی اللہ عنہ
زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ	سلامہ بن سلامہ بن وقش رضی اللہ عنہ	ابو سلمہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہ	سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہ
عثمان بن عفان رضی اللہ	اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ	عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ	ابو الہیثم بن تیہان رضی اللہ عنہ
طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ	کعب بن مالک رضی اللہ عنہ	عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ	عمیر بن الحمام رضی اللہ عنہ
سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ	ابی بن کعب رضی اللہ عنہ	طفیل بن الحارث رضی اللہ عنہ	سفیان نسر خزرجی رضی اللہ عنہ
مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ	ابو ایوب خالد بن زید انصاری رضی اللہ عنہ	صفوان بن بیضا رضی اللہ عنہ	رافع بن معلی رضی اللہ عنہ
ابو حذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہ	عباد بن بشر رضی اللہ عنہ	مقداد رضی اللہ عنہ	عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ
عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ	حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ	ذو الشمالین رضی اللہ عنہ	یزید بن الحارث رضی اللہ عنہ
ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ	منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ	ارقم رضی اللہ عنہ	طلحہ بن زید رضی اللہ عنہ
سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ	ابو الدرداء عویمر بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ	زید بن الخطاب رضی اللہ	معن بن عدی رضی اللہ عنہ
بلال رضی اللہ عنہ	ابو رویحہ عبداللہ بن عبدالرحمن رضی اللہ عنہ	عمرو بن سراقہ رضی اللہ	سعد بن زید رضی اللہ عنہ

حضرات مہاجرین	حضرات انصار	حضرات مہاجرین	حضرات انصار
عاقل بن بکیر رضی اللہ عنہ	بشر بن عبدالمنذر رضی اللہ	عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ	مجذر بن دمار رضی اللہ عنہ
خنیس بن حذافہ رضی اللہ عنہ	منذر بن محمد رضی اللہ عنہ	عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ	حارث بن صمہ رضی اللہ عنہ
سرہ بن ابی رہم رضی اللہ عنہ	عبادہ بن الخشخاش رضی اللہ عنہ	مہجع مولیٰ عمر بن الخطاب	سراقہ بن عمرو بن عطیہ رضی اللہ عنہم
سطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ	زید بن المزین رضی اللہ عنہ		

مواخات قبل ہجرت

تعاون وتناصر اور افادہ واستفادہ کی ضرورت جیسی مدینہ طیبہ میں تھی ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں بھی تھی، کیونکہ اس سے بے سہاروں کو سہارا ملجا تا تھا اور بے پناہوں کو پناہ۔ چنانچہ بقول علامہ حافظ ابن عبدالبر: مکہ میں بھی رشتۂ اخوت مواخات کے ذریعہ مضبوط کیا گیا تھا۔ یہ برادران مہاجرین ۱۸ تھے۔ ان کے مبارک اسماء گرامی سے اس صفحہ کو آراستہ کیا جا رہا ہے:

۱۔ سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	حضرت علی کرم اللہ وجہہ
۲۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ
۳۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ	عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ
۴۔ حمزہ رضی اللہ عنہ	زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ
۵۔ زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ	عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ
۶۔ عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ	بلال بن رباح رضی اللہ عنہ
۷۔ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ	سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ
۸۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ	سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ
۹۔ سعید بن زید رضی اللہ عنہ	طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ

(ماخوذ از عیون الاثر ص ۱۹۹ ج ۱، حافظ ابن سید الناس)

مسجد اور حجرات کی تعمیر اور مواخات پر دوبارہ نظر

اقتصادی تعمیر، بنیادی نظریہ، طریقۂ تعمیر اور دورِ حاضر کی اقتصادی تحریکات

محمد رسول اللہ (فداہ روحی) صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات مہاجرین جو مسجد کی اور پھر حجروں (ازواج مطہرات کے بیوت) کی تعمیر کر رہے ہیں، اس شہر کے رہنے والے ہیں جو ملکِ عرب کا مرکزی شہر ہے، جو اپنے تمدن میں دنیا کے متمدن شہروں سے پیچھے نہیں ہے۔ جس کی آبادی باقاعدہ ہے۔ مختلف محلوں میں بٹی ہوئی، بیچ میں سڑکیں، بازار پُر رونق، مکانات پختہ، ہر طرح کی آرائش سے آراستہ۔ ایک امکان وہ بھی ہے جس کو "دار القواریر" کہا جاتا تھا (شیش محل)[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مہاجر رفقا نے انھیں محلوں میں پرورش پائی تھی، انہیں گلیوں اور کوچوں میں کھیلے تھے، انہیں سڑکوں پر دوڑے اور چلے تھے۔ پھر تاجر بن کر انھیں بازاروں میں خرید و فروخت کرتے رہے تھے۔

دار الہجرت (مدینہ طیبہ) میں جب یہ حضرات خود مزدور اور معمار بن کر کچی اینٹوں، چھوٹے بڑے ناہموار پتھروں، کھجور کی ٹہنیوں اور کھجور کے پٹھوں اور پتوں سے مسجد مبارک اور حجروں کی تعمیر کر رہے تھے، تو اپنے خاندانی مکانات اور مکہ کے محلات کا نقشہ ان کے ذہنوں سے محو نہیں ہوا تھا۔

نبوت کے ابتدائی تین سال میں جو تربیت دی گئی تھی اس کا نصاب اور طریقۂ تربیت پہلے گذر چکا ہے۔ یہ تربیت صرف تین سال تک ہی نہیں رہی بلکہ قیام مکہ کی پوری مدت میں اس کا سلسلہ جاری رہا، اور وہ رنگ جو پہلے تین سال میں کِھلا تھا وہ پختہ اور نیا پختہ ہوتا رہا۔ بلاشبہ یہ اسی تربیت کا نتیجہ ہے کہ تمدن کے تمام نقشوں کو چھوڑ کر جفاکش زاہدانہ اور درویشانہ زندگی کا نقشہ جمایا جا رہا ہے۔

مگر قرآن پاک میں حضرت حق جل مجدہ کا ارشاد تو یہ ہے:

---

[1] معجم البلدان

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ (سورہ ۷۔ الاعراف آیت ۳۲)

"تو کہہ! کس نے منع کیا ہے رونق اللہ کی جو پیدا کی اُس نے اپنے بندوں کے واسطے اور ستھری چیزیں کھانے کی۔ تو کہہ وہ ہے ایمان والوں کے واسطے دنیا کی زندگی میں نری (مخصوص طور پر) اُن کی ہیں قیامت کے دن" (الاعراف آیت ۳۲)

پھر زینت سے یہ اجتناب کیوں؟

آپ کو فراموش نہ ہونا چاہیئے کہ حضرات صحابہ نے اس دور کو تعمیر ملت کا دور اوّل قرار دیا تھا۔ چنانچہ اسی سال کو اسلامی سنہ (سنہ ہجری کا پہلا سال) مانا گیا۔ کلام الٰہی نے بھی "مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ"[1] کا لفظ استعمال کر کے صحابہ کرام کے اس تخیل کی تائید فرمائی۔

آج ہر طرف پس ماندہ قوموں کو ترقی دینے کا شور ہے۔ لیکن جب اُن کی ہمدردی کے دعویدار سیاسی رہنما مساوات اور سوشلزم کا نام لیکر کہتے ہیں "معیارِ زندگی بلند کرو" تو مسجد مبارک اور تعمیر حجرات کا سادہ نقشہ خاموشی سے اشارہ کرتا ہے کہ قوم کی تعمیر ایسے نعرے سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس طرح کے عمل سے ہوتی ہے۔ ہمدردی یہ نہیں کہ آپ اپنی کوٹھی کی سب سے اونچی منزل پر رونق افروز ہو کر خاک نشین غریبوں کو حکم دیدیں کہ ایسی ہی کوٹھی تم بھی بناؤ تاکہ مساوات اور برابری رونما ہو۔ اس کو ہمدردی نہیں کہا جا سکتا، یہ ستم ظریفی ہے، اس نعرے سے آپ اپنے کردار کو مشتبہ کر دیتے ہیں کہ آپ اس نمائشی نعرے سے غریبوں کو سبز باغ دکھا کر اپنی عیش پرستی کے لئے وجہ جواز[2]

---

[1] لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ (سورہ توبہ) [2] یعنی جب معیار زندگی بلند کرنا نصب العین قرار دیا گیا تو جس کا معیار بلند ہو گیا ہے وہ قابل اعتراض نہیں۔ گویا وہ منزل پر پہلے پہنچ گیا ہے۔

نکالتے ہیں۔

ہمدردی یہ ہے کہ آپ قصرِ معلیٰ کی سطح بالا سے نیچے اُتریں، غریبوں کی ٹوٹی چٹائی پر ان کی برابر بیٹھیں، پھر اُن کو ساتھ لے کر آگے بڑھیں۔ یعنی پہلا مرحلہ یہ ہے کہ بلند کرنے کے بجائے آپ معیارِ زندگی کو برابر کریں۔ سیرتِ مبارکہ کا ایک روشن باب یہ ہے کہ آپؐ نے اقتصادی تعمیر و ترقی کیلئے یہی اسلوب اختیار فرمایا، چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

(۱) اُم المومنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ ٹٹیوں کا تھا۔ ٹٹیوں میں سوراخ ہوگئے تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ دومۃ الجندل میں تشریف لے گئے تو حضرت اُم سلمہؓ نے اس غیوبت میں حجرے کی دیواریں کچی اینٹوں کی بنوالیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ سے واپس ہوئے تو سب سے پہلے انھیں کے یہاں تشریف لے گئے۔ دریافت کیا: یہ تعمیر کیسی۔ حضرت ام سلمہؓ نے معذرت کی کہ دیوار اس لئے بنوالی ہے کہ پردہ ہوجائے۔ کسی کی نظر نہ پڑسکے فرمایا: اُم سلمہ۔ مال کا بدترین مصرف یہ تعمیر ہے[۲]۔

حاصل یہ ہے کہ آپ نے (صلی اللہ علیہ وسلم) عذر قبول فرمایا، مگر اس عمل کی تائید اور حمایت نہیں فرمائی جس سے ایک امتیاز پیدا ہورہا تھا۔

(۲) اسی دور کا یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ وسلم نے ایک راستے کے کنارے پر ایک مکان دیکھا جو حال میں تعمیر ہوا تھا۔ اس کا پھاٹک شاندار بنایا گیا تھا اور پھاٹک پر قبہ نما محراب بھی رکھی گئی تھی۔ دریافت فرمایا: یہ مکان کس کا ہے۔ ایک انصاری کا نام بتایا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہوگئے۔ اگلے روز یہ انصاری دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے تو خلافِ معمول آقائے دوجہان (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رُخ پلٹا ہوا پایا۔ حاضرینِ مجلس سے اس بے التفاتی کی وجہ معلوم کی

---

[۱] یعنی کرایہ کے لئے مکانات بنوانا بھی ایک قسم کی زمینداری ہے جو پسند نہیں ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

[۲] طبقات ابن سعد ص۱۸۱/ج۲ (الجزء الاول من القسم الثانی)

تو کوئی خاص سبب کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ البتہ کل کے واقعہ کا تذکرہ کیا گیا کہ جب حضرت والا (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے مکان کی طرف سے گذرے تھے تو قبہ دار پھاٹک کو دیکھ کر دریافت فرمایا تھا کہ یہ پھاٹک کس کا ہے۔ انصاری جاں نثار نے یہ بات سنی۔ واپس مکان پر پہنچے اور پورے پھاٹک کو منہدم کرا کر زمین کی برابر کر دیا[1]

(۳) یمن کا ایک قبیلہ بنو اشعر تھا۔ اس قبیلہ کے جو خاندان مسلمان ہو گئے تھے وہ مدینہ میں رہتے تھے اور فوجی خدمات (جہاد) میں حصہ لیا کرتے تھے۔ ہر ایک خاندان اپنے آمد و خرچ کا خود ذمہ دار تھا۔ لیکن اُن کا یہ بھی دستور تھا کہ اگر کسی کی آمدنی میں کمی ہو جاتی (مثلاً موسم کے ختم پر نئی فصل سے پہلے تنگی ہو جاتی یا سفر میں کسی کا توشہ ختم ہو جاتا) تو ایسا کرتے تھے کہ تمام خاندانوں میں جس کے یہاں جو کچھ غلہ یا توشہ ہوتا وہ سب ایک جگہ اکٹھا کر لیتے تھے، پھر سب کو برابر تقسیم کر دیتے یہ آپس کی ہمدردی اور باہمی اتفاق کی صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی پسند تھی کہ مجمع میں اس کی تعریف فرماتے ہوئے یہاں تک فرماتے:

هُمْ مِنِّيْ وَاَنَا مِنْهُمْ ۔ "وہ میرے ہیں میں اُن کا" (بخاری شریف ص۳۳۸)

(۴) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن سے بہت زیادہ تعلقِ خاطر تھا۔ جب آپ سفر پر تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں اُن سے رخصت ہوتے اور جب سفر سے واپس ہوتے تو سب سے پہلے ان کے یہاں تشریف لے جاتے۔ ایک مرتبہ آپ سفر سے واپس ہوئے اور حسب معمول اُن کے یہاں

---

[1] اخلاص کی انتہا یہ ہے کہ منہدم کر دینے کی اطلاع بھی نہیں دی کچھ دنوں بعد جب دوبارہ اس طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ہوا تو خود آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس پھاٹک کا نام و نشان بھی نہیں تھا تب آپ نے فرمایا اما ان کل بناء وبال علی صاحبہ الا مالا۔ الا مالا۔ الا مالا۔ "ہر ایک تعمیر اس کے بانی کے حق میں وبال ہے مگر وہ جو ضروری ہو' بہت ضروری ہو۔ جس کے بغیر چارہ نہ ہو"

[2] ابوداؤد شریف باب فی البناء ص۳۲۶ مجتبائی

تشریف لے گئے مگر حجرہ (کمرہ) کے اندر نہیں داخل ہوئے، دروازہ سے ہی واپس تشریف لے آئے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس مرتبہ نئی بات یہ کی تھی کہ حجرے کے دروازے پر کپڑے کا پردہ آراستہ کر دیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت موجود نہیں تھے۔ واپس ہوئے تو حضرت فاطمہ غمگین بیٹھی تھیں۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ غمگین اس لئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے اور خلاف معمول باہر سے ہی واپس ہو گئے تو خدمت مبارک میں حاضر ہو کر کبیدگی کا سبب دریافت کیا۔ ارشاد ہوا " دروازہ پر کپڑے کا پردہ سجا رکھا ہے۔ مجھے ایسے تکلّفات سے کیا واسطہ۔

اب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ناراضگی کا سبب معلوم ہوا تو معافی چاہی اور عرض کیا جو حکم ہو اس کی تعمیل کروں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غریب عیالدار کا نام لیا اور فرمایا کہ یہ کپڑا ان کے یہاں پہنچا دو۔[1]

(۵) حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت اسماء بنت یزیدؓ وغیرہما کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو سونے کے زیورات سے منع کیا۔ یہاں تک فرما دیا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے محبوب کو آگ کا کنگن پہنائے وہ اس کو سونے کا کنگن پہنا دے۔[2]

(علماء کا اتفاق ہے کہ یہ ممانعت ابتدا میں تھی اس کے بعد عورتوں کو سونے کے زیورات کی اجازت دی گئی، البتہ یہ ضروری قرار دیا گیا کہ ہر سال ان کی زکوٰۃ بلا ناغہ پوری پوری ادا ہوتی رہے)

---

[1] ابوداؤد شریف باب فی اتخاذ الستور

[2] ابوداؤد شریف باب ماجاء فی الذہب۔ للنساء صفحہ ۲۳/۲ مجتبائی

سلسلۂ مواخات اور سیاسی رہنماؤں کیلئے ایک سبق

يُزَكِّيهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ[1] (آل عمران آیت ۱۶۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں قیام فرما ہوئے تو آپ کی حیثیت سیاسی سربراہ (امیر) کی بھی تھی (تفصیل آگے آئے گی) آپ مہاجرین کی آبادکاری کے لئے کوئی قانون بنا سکتے تھے مگر سیرۃ مبارکہ کا سبق یہ ہے کہ قانون بنانا کارگر نہیں، دلوں کو بنانا چاہیئے۔ سیاسی یا اقتصادی انقلاب کے بجائے دلوں کی دنیا میں انقلاب برپا کرو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بہت مشہور[2] ارشاد ہے جس کا مفہوم یہ ہے:

"جسم انسان میں ایک پارچہ گوشت ہے۔ اگر وہ ٹھیک ہے تو بدن کی پوری عمارت آباد۔ اگر وہ خراب ہے تو بدن کی پوری عمارت ویران۔ یاد رکھو۔ وہ قلب ہے۔"

کلام اللہ شریف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ بیان فرمائی تھی:

"تمہارا (اہل ایمان کا) رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق (سخت ناگوار) گذرتا ہے۔ تمہاری بھلائی کا حریص (بہت خواہشمند) ہے وہ مومنوں کے لئے شفقت رکھنے والا رحمت والا ہے[3]" وہ ان کو (اہل ایمان کو) اللہ کی آیتیں

---

[1] "ان کو (اہل ایمان کو) پاک صاف کرتے ہیں (سنوارتے ہیں) اور ان کو کتاب اور حکمت (دانش و بینش) کی تعلیم دیتے ہیں"۔ سورہ ۳ آیت ۱۶۴ [2] بخاری شریف وغیرہ صحاح

[3] سورہ ۹ توبہ آیت ۱۲۸

سناتا ہے اور اُن کو سنوارتا ہے (ہر طرح کی برائیوں
سے انھیں پاک کرتا ہے)[۱]"

قانون کے سامنے چار وناچار گردنیں جھک جاتی ہیں مگر دل نہیں سنورتے۔

یہ نبی رحمت۔ رؤف رحیم کی نظر کیمیا اثر کی برکت تھی کہ حضرات انصار کے دل ایسے سنورے بخل اور حبِ مال کی بُرائی ختم ہوکر ایثار، فدائیت اور سخاوت کے وہ بے پناہ جذبات ان میں موج زن ہوئے کہ جیسے ہی رشتۂ اخوت قائم ہوا انھوں نے خود درخواست پیش کردی،

اَقْسِمْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ اِخْوَانِنَا النَّخِیْلَ۔[۲]

"ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان باغات تقسیم کردیجئے۔"

حضرات انصار کا اصرار یہ تھا کہ حضرات مہاجرین کو ان جائدادوں کا مالک بنا دیا جائے لیکن رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم جیسے غریب اور پردیسی مہاجرین کے حق میں مشفق ومحسن تھے اسی طرح آپ کا دامنِ رحمت انصار پر بھی پھیلا ہوا تھا اُن کے حق میں بھی آپ رؤف رحیم تھے آپ نے ملکیت کی تقسیم منظور نہیں فرمائی صرف پیداوار کی تقسیم کا فیصلہ فرمایا۔ (تفصیل پہلے گذر چکی ہے)۔

(یہ ہونی چاہیئے شان سیاسی سربراہ اور رہنما ر قوم کی)

---

[۱] سورہ ۳ آل عمران آیت ۱۶۴ [۲] بخاری شریف ص۳۱۲ و ص۵۳۴

سیرت مبارکہ کے اشارات

اور

تحریکات دورِ حاضر کے نظریات میں بنیادی فرق

وَ بِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْاَشْيَاءُ

سیرتِ مبارکہ کے پر تقدس سلسلہ میں سوشلزم کیونزم وغیرہ دورِ حاضر کی تحریکات کا ذکر کرنا سوءِ ادب اور گستاخی ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْاَشْيَاءُ۔ (یعنی کسی حقیقت کی پوری وضاحت جب ہوتی ہے جب اس کی مقابل اور برعکس چیز کو سامنے رکھا جائے۔)

نورِ آفتاب کی قدر اسی وقت ہوتی ہے جب ظلمتِ شب کی مصیبت جھیلی ہو۔ لہٰذا ان تحریکات کے بنیادی نظریات کا کسی قدر تذکرہ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سیرتِ مبارکہ کے ان اشارات کی وضاحت ہو سکے جن کا تعلق اقتصادیات سے ہے اور انصاف پسند اہلِ بصیرت ان کی قدر و منزلت معلوم کر سکیں۔ اس کے علاوہ واقعہ یہ ہے کہ تحریکاتِ حاضرہ کے متوالوں میں ایسے بھی ہیں جو ان تحریکات کا پیوند دامنِ اسلام سے جوڑنا چاہتے ہیں اور اس کو اسلام پر ایک احسان سمجھتے ہیں۔ لہٰذا بنیادی فرق کی وضاحت اس لئے بھی ضروری ہے کہ ایسے محسنین اسلام کے سامنے حقیقت جلوہ گر ہو سکے۔

(۱)

سب سے پہلا فرق یہ ہے کہ ان تحریکات کے بانیوں نے اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جس کا سمجھنا سب سے پہلے ضروری تھا۔

ان تحریکات کا منشا اگر انسانی سماج کی فلاح و بہبود ہے تو سب سے پہلا فرض یہ ہے

کہ انسان کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ انسان کیا ہے۔ انسانیت کیا ہے، تاکہ انسان کی فلاح و بہبود کے معنیٰ اور ترقی کا معیار معین ہو سکے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ تحریکات دور حاضر کی پیداوار ہیں اور اس سے پہلے انسان کے دماغ پر تالے پڑے ہوئے تھے۔ ان تالوں کی کنجیاں بیسویں صدی عیسوی میں انسان کے ہاتھ آئی ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ صرف ڈیزائن اور نقشہ بدلا ہے ورنہ ان تحریکات کی بنیادیں بہت قدیم ہیں اور اس طرح کے انقلابات سے دنیا ہمیشہ دوچار ہوتی رہتی[1] ہے۔

موجودہ تحریکات اور ان کی ہم جنس سابق تحریکات کی مشترکہ کوتاہی یہ ہے کہ ان کی بنیاد صرف خدا فراموشی پر نہیں ہے بلکہ خود فراموشی بھی ان کی بنیادوں کا کنکریٹ اور اینٹ گارا ہے۔

انسان کیا ہے، کیوں پیدا ہوا، اس کا مستقبل کیا ہے۔ اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے، موت کی حقیقت کیا ہے؟ وہ فنا ہے یا انتقال (یعنی حالت کی تبدیلی اور ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہو جانا)؟

اگر موت انتقال ہے اور انسان موت کے بعد بھی باقی رہنے والی حقیقت ہے تو ما بعد الموت کا تعلق موجودہ زندگی سے کیا ہے؟

قول و عمل اگر باقی رہنے والی حقیقتیں ہیں تو کس طرح؟ اور ان کا کچھ اثر ما بعد الموت ہوگا یا نہیں۔ عاقبت اندیش انسان کا فرض ہے کہ میدانِ عمل میں قدم رکھنے سے پہلے ان سوالات کو حل کرلے۔ ان سوالات سے غفلت خود فراموشی ہے جس کا نتیجہ خدا فراموشی ہوتا ہے۔ مَنْ لَّمْ یَعْرِفْ نَفْسَہٗ لَمْ یَعْرِفْ رَبَّہٗ۔

---

[1] فارسی زبان اور تاریخ ایران سے دلچسپی رکھنے والے مزدک سے واقف ہیں جس نے تقریباً پانچویں صدی عیسوی میں تحریک چلائی تھی کہ زر، زن اور زمین سب کے لئے مشترک ہے۔ زنان را خلاص گردانید و اموال را مباح داشت و ہمہ مردمان را در خواستہ زن شریک ساخت چنانکہ در آتش و آب و علف انباز ند (دبستان مذاہب ملل و نحل ج۲ ص۲)۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو احقر کی تصنیف اقتصادی تحریکات اور اسلامی تعلیم کے اشارات۔

(۲)

انسان ایک جاندار ہے۔ جو اپنے اندر غور و فکر اور تحقیق و تنقید کی طاقت رکھتا ہے، جس کی بنا پر اس نے خاص طرح کی زندگی اختیار کی، جس نے درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے موجودہ تمدن کی صورت اختیار کر لی، جس کے بہت سے شعبوں میں سے ایک شعبہ وہ بھی ہے جس کو سائنس اور فلسفہ کہا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ کائنات کی آخری سرحد تک پرواز کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کو کچھ ایسے ضابطوں اور قوانین کی ضرورت ہے جو اس زندگی کو محفوظ رکھ سکیں اور اس کو خوشگوار بنا سکیں۔ چنانچہ وہ یہ ضابطے بناتا ہے اور ان کو رائج کرتا ہے۔

یہ ہیں وہ انکشافات جو تحریکات کے بانی صاحبان کو حقیقت انسان کے متعلق خود بخود یا اس سائنس اور فلسفہ کے ذریعے سے ہو گئے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ ہر چیز کی حقیقت سے واقف ہے۔ لیکن اس کائنات میں انسان کی حیثیت کیا ہے اس کا جواب سائنس اور فلسفہ نے بھی نہیں دیا۔

اس کے برعکس قرآن حکیم کے شروع ہی میں چند تمہیدی فقروں کے بعد سب سے پہلے انسان کی وہ خصوصیت بیان کی گئی ہے جو اس کو باقی تمام مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ ساتھ ساتھ اس کی وہ حیثیت واضح کی گئی ہے جو اس کو پوری کائنات یعنی عالم مخلوقات میں حاصل ہے۔

(۳)

صرف اسلام ہی نہیں بلکہ جملہ مذاہب اس پر متفق ہیں کہ (۱) انسان کا خاتمہ موت پر نہیں ہو جاتا بلکہ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ موت کی حقیقت فنا ہو جانا نہیں ہے بلکہ موت ایک تبدیلی اور انتقال ہے یعنی عالم مشاہدہ سے ایک ایسے عالم کی طرف منتقل ہو جانا جو ہمارے مشاہدہ سے بالا ہے۔

(۲) اور یہ کہ انسان کا حقیقی اور دائمی مستقبل وہ ہے جس کا آغاز اس انتقال اور اس تبدیلی کے بعد ہوگا جس کو موت کہا جاتا ہے۔

لیکن اگر حقیقی مستقبل اور حقیقی زندگی وہ ہے جو موت کی گھاٹی کو پار کرنے کے بعد سامنے

سامنے آئے گی تو موجودہ زندگی کا تعلق اس سے کیا ہوگا؟ اس زندگی کا آغاز از سر نو ہوگا یعنی نیست سے ہست اور عدم کی جگہ ایک وجود کا آغاز ہوگا یا وہ زندگی موجودہ زندگی کا نتیجہ اور ثمرہ ہوئی۔ گویا آج ہم بو رہے ہیں اور مرنے کے بعد اس کو کاٹیں گے یا وہ ایک قدرتی ارتقا ہوگا یعنی جس طرح انسان کا موجودہ وجود ایک ارتقائی[1] درجہ ہے جو تخلیق کے بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد ظہور پذیر ہوا ہے۔ ایسے ہی مابعد الموت بھی ایک ارتقائی درجہ ہوگا۔ سائنس نے اس کا جواب نہیں دیا۔ مذہب اس کا جواب دیتا ہے اور قرآن حکیم اسی جواب کو سامنے رکھ کر نہ صرف اقتصادیات و سیاسیات بلکہ انسان کی پوری زندگی کے لئے ضابطۂ حیات مقرر کرتا ہے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرۃ مبارکہ جو قرآن کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہے اس کی عکاسی کرتی ہے۔

(۴)

خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اس کو مانے، انسان کو ضرورت ہے کہ اپنے آپ کو باہوش ثابت کرنے کے لئے خدا کو مانے اس شخص کو باہوش نہیں کہا جا سکتا جس کا دعویٰ یہ ہو کہ تاج محل خود بخود وجود میں آگیا۔

یہ شخص اگر اسی کور باطنی کے ساتھ تاج محل کی سیر کرتا ہے تو نہ صرف یہ کہ وہ بانی اور معمار[2]

---

[1] ڈاروِن کا نظریہ ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔ ہمارے پیشِ نظر قرآنی آیات ہیں جن میں یہ ترتیب قائم کی گئی ہے کہ انسان کی سرشت مٹی سے ہوئی۔ پھر ہر انسان کے مراتب تولید میں نطفہ۔ پھر علقہ (خون بستہ) پھر گوشت کا لوتھڑا، پھر انسانی شکل، پھر نفخ روح، پھر ولادت، پھر بچپن، جوانی، کہولت، پھر بڑھاپا۔ پس جس طرح نفخ روح (جان پڑ جانے کے بعد) بطن مادر میں رہا اور وہاں سے اس عالم میں آیا۔ یہ بھی ایک انتقال ہے۔ اسی طرح موجودہ عالم بطن گیتی ہے جہاں وہ اپنے اوصاف و خصائل اور اپنے کردار و عمل کے ساتھ نشو و نما پا رہا ہے اور مرنے کے معنیٰ کہ وہ بطن گیتی سے دوسرے عالم میں منتقل ہوگا اور جس طرح ماں باپ کی خصلتیں اور ان کے امراض عموماً بچّہ میں سرایت کر جاتے ہیں، انسان کے اعمال و کردار کے اچھے برے اثرات بھی انسان میں اثر کر جائیں گے۔ دوسرے عالم میں ان کے اثرات ظاہر ہوں گے۔

کی قدر نہیں کرے گا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ سنگ تراشی نقش سازی، ڈیزائن سازی اور انجینئرنگ وغیرہ کے تصورات سے بھی محروم رہے گا۔ اُس کے ذہن میں بھی نہیں آئے گا کہ ڈیزائن سازی بھی کوئی خاص فن ہے۔ سنگِ خارا اور سنگِ مرمر پر پھول اور بوٹیاں بنانا پھر اُن میں رنگ بھرنا اور ایسے مسالے تیار کرنا کہ صدہا سال کی سیکڑوں برساتیں اُن پر کوئی اثر نہ کرسکیں۔ عمارت کے طول وعرض، بلندی وغیرہ کو موزوں رکھنا بھی قابل قدر ہُنر ہیں۔

یہ ظالم تاج محل کو خود رومان کر اُن تمام فنون اور اُن کے ماہرین پر ظلم کرتا ہے۔ اُن فنون کے ایجاد کرنے اور ترقی دینے کا کوئی سوال اُس کے سامنے نہیں آتا۔ وہ خود اپنے اوپر بھی ظلم کرتا ہے اور اپنی ظالمانہ فطرت سے ان تمام فنون کو بھی مجروح اور مفلوج کردیتا ہے۔ ایسے کور باطنوں کو اگر اقتدار کی باگ ڈور دیدی جائے تو کیا تمدن ایک قدم بھی آگے بڑھ سکے گا۔

کائنات کے اس تاج محل میں جو حسن اور خوبیاں ہیں ان کو صحیح طور پر وہی پہچان سکتا ہے جو اس کے پیدا کرنے والے کو پہچانے۔ اسی کو "معرفتِ حق" کہا جاتا ہے۔ معرفتِ حق حقیقت پسندی اور خدا پرستی کی بنیاد ہے۔ اس کو مضبوط کرنے اور ترقی دینے کا نام رُوحانیت ہے۔

(۵)

انسان کی حیثیت

انسان کی حیثیت اگر یہ ہے کہ وہ ایک جاندار ہے جس کو عقل کی نعمت دیدی گئی ہے۔ تو اس سے اعلیٰ اخلاق۔ شرافت اور رُوحانیت کا مطالبہ خاص وزن نہیں رکھتا۔ اگر وزن رکھتا ہے تو صرف اتنا جو تقاضاء عقل ضروری ہو مگر اسلام نے انسان کی حیثیت بہت بلند قرار دی ہے۔ وہ کمالات تخلیق کا بہترین[1] نمونہ اور نظامِ قدرت کا شاہکار ہے جس کو یہ عزت[2] اور عظمت دی گئی ہے کہ وہ اس پوری کائنات

---

[1] لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (سورہ والتین)

[2] وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (سورہ ۱۷ بنی اسرائیل آیت ۷۰)

میں خالقِ کائنات کا خلیفہ[1] ہے ۔ کائنات کی بڑی سے بڑی مخلوق حتیٰ کہ چاند سورج اور زمین و آسمان کو بھی خالق و قادر ذوالجلال نے اس کے لئے مسخر[2] کر دیا ہے ۔ وہ ہر ایک پر حکم چلا سکتا ہے جس کو چاہے اپنے کام میں لا سکتا ہے ۔

یہ ہے انسان کی حیثیت اسلام کی نظر میں اور خود فراموشی یہ ہے کہ انسان اپنی اس حیثیت سے اور اس حیثیت کے بموجب جو اس کے فرائض ہیں ان سے غافل ہو ۔

فرائض خلافت و نیابت کے منصب جلیل کا جس طرح یہ تقاضا ہے کہ خلیفہ اپنے آقا کا فرمانبردار اور وفادار ہو ۔ ایسے ہی اس کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے آقا کے کمالات کا مظہر ہو اور ان نقائص سے پاک ہو جو کمالات کی ضد ہیں اور عیب سمجھے جاتے ہیں ۔ قرآن حکیم نے سب سے پہلے فقروں میں خالقِ کائنات کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے ۔

۱ ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝	بہت رحم کرنے والا ۔ بہت مہربان
۲ ۔ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝	تمام جہانوں کا پالنے والا
۳ ۔ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝	مالک انصاف کے دن کا

(۱) سب سے پہلے ضروری ہے کہ انسان میں رحم ہو ۔ شفقت اور مہربانی ہو ۔

(۲) اس کی فطرت میں تربیت ہو (یعنی پرورش کرنا ، سکھانا ، سدھانا ، ضرورتمندوں کی ضرورتیں پوری کرنا) سخاوت بخشش اور سیر چشمی جیسے صفات سے وہ آراستہ ہو ۔

ربّ العالمین خود نہیں کھاتا دوسروں کو کھلاتا ہے ۔ وہ بھوک پیاس سے بھی بے نیاز ہے لیکن انسان (جو کھانے پینے کا محتاج ہے) اگر بھوکوں کی ضرورت کو اپنی بھوک سے مقدم رکھے تو اس کا نام ایثار اور قربانی ہے ۔

---

[1] اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (سورہ ۲ بقرہ آیت ۳۰) [2] سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَیْنِ، وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ (سورہ ۱۴ ابراہیم آیت ۳۳) وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ (سورہ ۴۵ جاثیہ آیت ۱۳)

(۳) رب العالمین سب سے بڑا منصف ہے اس کے خلیفہ کو بھی عدل وانصاف کا پیکر ہونا چاہیئے۔

(۴) خالق کائنات رب العالمین عٰلِمُ غَیْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[1] ہے۔ یَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ[2] اس کی صفت ہے۔ اُس کے خلیفہ اور نائب کو بھی ذی علم ہونا چاہیئے وہ عالم غیب السمٰوٰت والارض اور عالم مَا فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ نہیں ہو سکتا، مگر اس کا فرض ہے کہ اپنے علم کو زیادہ سے زیادہ وسعت دے اور دعا کرتا رہے۔ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا[3]

(۵) رب العالمین صرف خالق ہی نہیں بلکہ اس کی صفت ہے: بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ[4] "نئی طرح بنانے والا (ایجاد کرنے والا) زمینوں اور آسمانوں کا۔"
فکر انسان کو بھی چاہیئے کہ تخلیق وایجاد کی باریکیوں کی تلاش کرنے میں مصروف رہے۔ وہ نیست کو ہست اور معدوم کو موجود تو نہیں کر سکتا۔ یہ تو وہی کر سکتا ہے جس کے ایک حکم کُنْ[5] پر نیست ہست بن جائے اور عدم محض جامہ وجود سے آراستہ ہو جائے۔ البتہ وہ یہ ضرور کر سکتا ہے کہ موجودات کی پوشیدہ صلاحیتوں کا کھوج لگائے اور مخفی طاقتوں کے اسباب و ذرائع معلوم کر کے جدید ایجادات کو بروئے کار لائے۔

مختصر یہ کہ یہ اوصاف کمال کا سلسلہ ہے۔ ان کے برعکس اوصاف نقص ہیں۔ رحم، مہربانی اور شفقت کے مقابلہ میں سخت مزاجی، سنگ دلی، جبر و قہر، سخاوت اور سیر چشمی کے مقابلہ میں بخل، تنگ دلی اور کنجوسی ۔ حاجت روائی اور کارسازی کے مقابلہ میں خود غرضی اور نفع اندوزی

---

[1] ان تمام باتوں کا جاننے والا جو پردۂ آسمان میں یا سینۂ زمین میں چھپی ہوئی ہیں۔ [2] ان تمام باتوں اور ان تمام طاقتوں کو جانتا ہے جو سمندر یا خشکی میں ودیعت ہیں [3] سورہ ۲۰ طٰہٰ آیت ۱۱۴ [4] سورہ ۶ الانعام آیت ۱۰۱ [5] ہو جا۔ یعنی عالم کون وہست میں آ جا۔ عالم وجود میں آ جا۔

ایثار کے مقابلہ میں، حرص طمع، رشوت ستانی اور ذخیرہ اندوزی، عدل و انصاف کے مقابلہ میں ظلم، علم کے مقابلہ میں جہل و سفاہت، تحقیق و تنقید کے مقابلہ میں اندھی تقلید۔

انسان میں قدرت نے دونوں صلاحیتیں رکھی ہیں۔ وہ اوصاف و کمال کو اپنا کر کامل و مکمل بھی بن سکتا ہے اور اوصاف نقص کو اختیار کر کے، ذلیل، کمینہ اور شیطان اخرس بھی بن سکتا ہے۔

شریعت کا مطالبہ یہ[1] ہے کہ انسان اوصاف نقص سے پاک ہو کر اوصاف کمال اختیار کرے، اسی کو تقدس کہا جاتا ہے۔ اس مطالبہ کو پورا کرنے کی کوشش تزکیہ ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اہم مقصد اور آپ کی زندگی کا اہم ترین کارنامہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ دورِ حاضر کی تحریکات کا مقصد یہ ہے کہ ملک کا ہر ایک باشندہ خوش حال ہو زندگی کی ضرورتیں اس کو میسر ہوں، باشندگان ملک اطمینان کی زندگی گذار سکیں۔ یہ مقصد بہت مبارک ہے۔ لیکن جب تک انسان بری خصلتوں سے پاک نہ ہو، کیا یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

یہ دوسرا فرق ہے جو سیرت مبارکہ کی تعلیمات کو موجودہ تحریکات سے ممتاز کرتا ہے کہ سوشلزم نیشنلزم وغیرہ کا اسکول تزکیہ اور اصلاح اخلاق کے مفہوم سے ناآشنا بلکہ اس کے ماحول میں یہ الفاظ قطعاً بے جوڑ اور مضحکہ انگیز ہیں جبکہ سیرۃ مبارکہ کی تعلیمات۔ تزکیہ کو ایسا محور قرار دیتی ہیں کہ ہر ایک نظام اسی کے گرد گھومتا ہے اور اسی کی درگاہ سے سندِ جواز حاصل کرتا ہے۔ کوئی بھی نظام ہو، اگر اس کی بنیاد تزکیہ پر نہیں ہے تو وہ باطل اور فاسد ہے، کیونکہ سیرت مبارکہ کی تعلیمات کا مطمح نظر صرف حیوانی زندگی نہیں جو چند روزہ عارضی ہے بلکہ اس کا مطمح نظر وہ حقیقی زندگی ہے جو ابدی اور دائمی ہوگی جس کی خوش گواری تزکیہ پر موقوف ہے۔

(۶)

ٹیکس کی عربی ضریبہ ہے۔ آپ پورے قرآن شریف کا مطالعہ کر لیجئے آپ کو کہیں کوئی ایسا لفظ نہیں ملے گا جو مالی نظام کے سلسلہ میں ٹیکس اور ضریبہ کے مفہوم کو ادا کرتا ہو کیونکہ

---

[1] اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ الٰی قولہ تعالٰی اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ سورہ ۳۳ الاحزاب آیت ۷۲

ٹیکس کی تہ میں جبر اور قہر ہوتا ہے۔ قانون کے بنانے والے اگرچہ عوام کے نمائندے ہوتے ہیں مگر اُس کے نفاذ کی پشت پر حکومت کی مسلح طاقت ہوتی ہے۔ اس طرح استحصال تو ہو سکتا ہے کہ حکومت کو رقم مل جائے اور اس کے بجٹ کا خسارہ پُورا ہو جائے۔ مگر ادا کرنے والوں کے اخلاق کی اصلاح اور دلوں کا تزکیہ نہیں ہو سکتا۔ بخل، طمع، حرص جیسے امراض بدستور رہتے ہیں اور آرڈی نینس یا قانون کی بھیانک طاقت ان امراض میں نفرت، غصہ، بغض اور عداوت جیسی بیماریوں کا اضافہ کر دیتی ہے۔

جاگیرداری نظام، سرمایہ داری، زمینداری، انتہا یہ کہ فردی ملکیت ختم کر دی جائے تو بہت سے محشر تو برپا ہو سکتے ہیں مگر دلوں کی پاکی اور اخلاق کی اصلاح نہیں ہو سکتی بلکہ خاتمہ ملکیت سے عائلی نظام[1] درہم برہم ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ[2] وہ نفرت انگیز انارکی ہوتا ہے جو دامن عصمت و عفت کے بھی تار و پود بکھیر دیتا ہے۔

جس مالی نظام کی قرآن حکیم رہنمائی کرتا ہے اس کا نتیجہ اگرچہ یہ ہو سکتا ہے کہ سرمایہ داری جاگیرداری حتیٰ کہ ملکیت بھی ختم ہو[3] جائے۔ مگر یہ خاتمہ اس طرح ہوگا کہ دلوں کی دنیا بھی بدل جائیگی

---

[1] صاحب خانہ کا اثر اور دباؤ نہ رہے تو ظاہر ہے گھر کا نظام درہم برہم اور اثر اور دباؤ صرف اس بنا پر نہیں کہ بیوی کا شوہر یا بچوں کا باپ ہے، بلکہ دباؤ اور اثر اس لئے ہوتا ہے کہ وہ مالک و قابض ہے۔ بے دست و پا صاحب خانہ کا اثر صرف اخلاقی مطالبہ ہوتا ہے اور جب باپ کا دباؤ نہ ہو تو کیا اولاد با اخلاق بن سکتی ہے؟

[2] خانگی نظام ختم ہونے کے بعد جب سرکاری پرورش گاہوں میں بچے پرورش پائیں گے تو ایک طرف قرابت اور رشتہ داری کے مجملہ حقوق ختم بلکہ رشتہ داروں کو پہچاننا مشکل بھی ہوگا اور بے کار بھی۔ دوسری جانب جنسی تعلقات کے لئے سلسلہ ازدواج بے معنیٰ ہو جائے گا۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمایئے احقر کی تصنیف "دورِ حاضر کے سیاسی اور اقتصادی مسائل" اور "اسلامی تعلیم کے اشارات"۔

[3] انسان اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے تو ہر چیز کا اصل مالک اللہ ہے۔ بندہ کی ملکیت صرف نیابت ہے۔ جو مالک حقیقی کی منشا اور اس کی مصلحت کے تحت اور اس کے احکام کے تابع ہوگی۔ (باقی صفحہ آئندہ پر)

خارجی طاقت یعنی آرڈی نینس یا قانون کی شورا شوری ۔ اہل ثروت اور ارباب دولت کو سراسیمہ اور پریشان نہیں کرے گی بلکہ خود اپنے اندرونی جذبات کی سوزش ان کی نظر میں اس دولت کو وبالِ جان اور راس کے خرچ کرنے کو راحت واطمینان بنادے گی۔

مالی نظام کے سلسلہ میں جو الفاظ قرآن حکیم یا سنتِ نبویہ نے استعمال فرمائے اُن پر نظر ڈالئے ۔ وہ سب انقلاب انگیز ہیں ۔ مگر بجٹ کے خسارہ کو پورا کرنے کے لئے نہیں بلکہ دلوں کی بیماریوں کو دُور کرنے کے لئے ۔

سب سے پہلا اور سب سے مشہور لفظ زکوٰۃ ہے جس کے مفہوم میں ' تزکیہ ' داخل ہے ۔ زکوٰۃ کے معنیٰ پاکی ہیں اور تزکیہ کے معنیٰ پاک کردینا ۔ یعنی زکوٰۃ اس لئے فرض ہوتی ہے کہ دلوں کو پاک کردے ۔ بخل وہ ناپاکی ہے جو دلوں کو ہی نہیں بلکہ اُس ملکیت کو بھی ناپاک کردیتی ہے جو اس کے زیر اثر ہو ۔ زکوٰۃ دل کو بخل سے پاک کرتی ہے تو ساتھ ساتھ دولت کو بھی پاک کردیتی ہے ۔ دوسرا لفظ صدقہ ہے ۔ جو صدق سے ماخوذ ہے ۔ یعنی صدقہ اس بات کی عملی دلیل ہے کہ ملی ضرورتوں کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) پھر اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے ۔ اپنے بندوں کا محافظ ۔ مشکلات کو حل کرنے والا ۔ حاجتوں کو پُورا کرنے والا (حل المشکلات قاضی الحاجات) پس جب بھی پرورش ، حفاظت ، تعلیم و تربیت وغیرہ کی ضرورتیں پیش آئیں گی ' انسان بحیثیت نائب و خلیفہ ان ضرورتوں کو پُورا کرنا ضروری ہوگا انفرادی ضرورتیں افراد سے پوری ہوں گی ۔ زکوٰۃ و صدقات اسی لئے ہیں کہ ضرورت مند افراد کی انفرادی ضرورتیں پوری کی جائیں ۔ لہٰذا ان کی ادائیگی کے لئے حکومت کا توسط ضروری نہیں ہے وہ وہاں بھی لازم ہیں جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے ۔ صاحب استطاعت کا فرض ہے کہ وہ ضرورت مندوں کی ضرورتیں پُوری کرے ۔ اسی لئے ان میں تملیک بھی ضروری ہے یعنی ضرورت مند کو محض اجازت دیدینا کافی نہیں بلکہ مالک بنانا بھی ضروری ہوتا ہے ۔ البتہ اجتماعی ضرورتیں ہیئت اجتماعیہ یعنی خلافت کے ذریعہ پوری ہوں گی یہ اجتماعی ہیئت ' خلافتِ الٰہیہ کی حیثیت سے افراد پر اقتدار رکھتی ہے اور افراد کی مملوکات پر بھی وہ کسی کی ملک چھین نہیں سکتی ، مگر پابندی لگاسکتی ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے " دورِ حاضر کے سیاسی و اقتصادی مسائل "۔

احساس یا غریبوں اور فقیروں کی ہمدردی کا دعویٰ ایک سچی حقیقت ہے۔ محض نمائش اور بناوٹ نہیں۔

یہ دو مد لازمی ہیں۔ ان کے مصارف بھی معیّن ہیں۔ یہ ضرورت مند افراد کی امداد کے لئے مخصوص ہیں۔ ان دو مدوں کے ذریعہ قوم کی غریبی دور ہو سکتی ہے۔ ان کے لئے حکومت کا واسطہ بھی ضروری نہیں براہ راست صاحب دولت پر فرض ہے کہ اتنی مقدار اپنی ملک سے نکالے اور ضرورتمند کی ملکیت میں دیدے۔ مملکت یا ملّت کی اجتماعی ضرورتوں پر زکوٰۃ وصدقات واجبہ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی۔ اِن ضرورتوں کے لئے قرآن حکیم نے قرض یا انفاق فی سبیل اللہ کا لفظ استعمال کیاہے:

اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۔ (سورۂ مزمل)

"قرض دو اللہ کو اچھی طرح قرض دینا۔"

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ

(سورہ ۲ بقرہ آیت ۱۹۴)

"اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور (خرچ کو بند کرکے۔ یعنی بخل کر کے) مت ڈالو اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں)

فرض کیجئے اسلامی مملکت کی مخالف حکومتیں اپنی جنگی طاقتیں زیادہ سے زیادہ مضبوط کر رہی ہیں۔ اسلامی مملکت کی آمدنی کے عام ذرائع دفاعی ضرورتیں نہیں پوری کرسکتے۔ ہنگامی امداد کی ضرورت ہوتی ہے، حکومتیں ایسی صورتوں میں قومی قرض[1] یا قرضہ جنگ کی اپیل کرتی ہیں۔ مگر

---

[1] بہت ممکن ہے حکومتوں نے قرض کی اصطلاح بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن سے ہی سیکھی ہو۔ لیکن اگر یہ اصطلاح قرآن سے سیکھی ہے تو محض الفاظ قرآن کے ہیں، رُوح قطعاً غیر قرآنی ہے۔ قرآن صاحب دولت سے اُس تعلق کی بنا پر دولت لیتا ہے جو اس کا خدا کے ساتھ ہے اور حکومتیں سود کے لالچ دیکر قرض لیتی ہیں۔ قرآن والے قرض سے دولت کی محبّت کم ہوتی ہے، بخل کے مرض میں تخفیف ہوتی ہے اور سرکاری قرض سے ان امراض میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا ہے اور سب سے زیادہ یہ ہے کہ قرآنی قرض کا بار صرف صاحب دولت پر پڑتا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھ کر قرض لیتا ہے کہ اس کا اجر دنیا میں کچھ نہیں ملے گا اللہ کے یہاں ملے گا اور سرکاری قرض کا بار غریبوں پر پڑتا ہے کیونکہ سود کی ادائگی نئے ٹیکس لگا کر یا ٹیکسوں میں اضافہ کرکے کی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں غریب کی غریبی میں اضافہ ہوتا ہے اور دولتمند اور زیادہ دولتمند ہوجاتا ہے۔

قرآن حکیم یہ قرض اللہ کے لئے طلب کرتا ہے۔ انفاق یعنی خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ بھی " فی سبیل اللہ" یعنی پہلے انسان کا رشتہ اللہ سے جوڑتا ہے، غیر اللہ سے اس کے دل کو پاک کرتا ہے۔ مال دولت اور ہر چیز کے مقابلہ میں اللہ کی محبّت بڑھاتا ہے اور ایمان کا معیار یہ قرار دیتا ہے کہ: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (سورہ ۲ بقرہ آیت ۱۶۵)

("جو ایمان لائے وہ بہت بڑھے ہوئے ہیں اللہ کی محبّت میں۔")

اسی محبّت کے نتیجہ میں وہ اس سے مالی قربانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ ہے تزکیۂ قلب۔

(۷)

تزکیہ کِس طرح ہوتا ہے

تزکیہ کا آغاز خود اپنے نفس سے ہوتا ہے۔ پہلے خود اپنی اصلاح کرے۔ اپنے نفس کو بخل، طمع، حُبِّ مال جیسی آلودگیوں سے پاک کرے۔ تب درجہ بدرجہ دوسروں سے اصلاح قبول کرلینے کی توقع کر سکتا ہے۔

اس سلسلہ تحریر کا تعلق جناب رسالت مآب حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت مبارکہ سے ہے، لہٰذا وہی مثالیں پیش کی جارہی ہیں جن کا تعلق خود ذاتِ اقدس سے ہو (صلی اللہ علیہ وسلم)

دولت پرستی اور حُبِّ مال سے قلب کو پاک کرنے کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ نے (صلی اللہ علیہ وسلم) طے فرمالیا کہ جو کچھ آمد ہو وہ شام تک خرچ کر دی جائے، کاشانۂ نبوّت میں رات کو کوئی ایک حبّہ بھی باقی نہ رہ سکے۔

گردنوں کو پھاند کر گذرنا خلافِ ادب ہے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔ ہاں کسی مجبوری کی صورت میں یہ بے ادبی معاف سمجھی جائے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک روز خود ایسا کرنا پڑا۔ آپ عصر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ آپ کو خیال آیا کہ فلاں زوجہ مطہرہ کے یہاں آپ کی کچھ چاندی رکھی ہوئی ہے۔ جیسے ہی آپ نے سلام پھیرا، بڑی پھرتی سے آپ کھڑے ہوئے اور اُن زوجہ مطہرہ کے یہاں تشریف لے گئے۔ فوراً ہی واپس تشریف لے آئے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ لوگ حیران ہیں۔ کیا ماجرا ہے؟ خلافِ معمول اس طرح تیزی سے کیوں تشریف لے گئے

ابھی کوئی دریافت نہیں کرنے پایا تھا کہ آپ نے خود ہی فرمادیا: مجھے نماز پڑھتے ہوئے یاد آیا[1] کہ کچھ چاندی رکھی ہوئی ہے۔ مجھے گوارا نہیں کہ شام کا وقت ہو اور چاندی میرے پاس رہے (ایک روایت میں یہ ہے کہ چاندی میرے گھر میں رات گذارے) لہذا میں کہہ آیا ہوں کہ اس کو تقسیم کردیں۔[2]

یہ احساس لطیف کی نزاکت ہے کہ عصر کا وقت ہے[3]۔ شام ہونے اور رات آنے میں کافی دیر ہے مگر یہ دیر بھی دیر نہیں معلوم ہوئی۔ گویا دولت کی آلودگی سے جس قدر جلد ممکن ہو دامن پاک ہو جائے۔

یہ تھوڑی سی چاندی کا معاملہ تھا۔ ممکن ہے دو تین تولہ ہی ہو مگر دولت کے بڑے سے بڑے انبار کے متعلق بھی آپ کا جذبہ یہی تھا۔

ایک دن کا واقعہ ہے۔ رات کی چاندنی میں آپ تشریف لے جارہے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے۔ سامنے اُحد کا پہاڑ تھا۔ آپ نے فرمایا۔ اگر احد پہاڑ کی برابر سونا میرے پاس ہو تو میری خوشی یہ ہوگی کہ تین راتیں نہ گذرنے پائیں کہ وہ سب راہِ خدا میں خرچ ہوجائے ایک دینار بھی میرے پاس باقی نہ رہے بجز اس دینار کے جو کسی مطالبہ کو ادا کرنے کے لئے محفوظ رکھنا پڑے۔[5]

---

[1] نماز میں کسی بات کا یاد آجانا غیر اختیاری ہے اور یہ بھی فطری بات ہے کہ انسان کا ذہن اور دماغ ہر وقت کام کرتا رہتا ہے لہذا فطری اور غیر اختیاری پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ البتہ نماز سے غافل ہوکر خیال میں معروف اور مشغول نہ ہوجانا چاہیئے۔ اس خیال کو ہٹا کر نماز ہی کی طرف دھیان لگا لینا چاہیئے۔ سنّتِ مبارکہ کی تعلیم یہی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب [2] ضرورت مند اور مستحق لوگوں کی کمی نہیں تھی [3] بخاری شریف ص۱۶۳ و ص۱۱

[4] مسلک احناف کے بموجب گرمیوں میں تقریبًا دو گھنٹے اور حضرات شوافع کے مسلک کے بموجب دوسرے مثل ہی میں عصر کی نماز پڑھی گئی تھی تو ابھی تقریبًا ایک تہائی دن باقی تھا، مگر الفاظ حدیث ذکرت ان یمسی او یبیت عندنا۔ بخاری شریف ص۱۶۳) سے وہی متبادر ہے جس سے مسلک احناف کی تائید ہوتی ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

[5] بخاری شریف ص۹۵۲ و ص۳۲۱ وغیرہ۔

زندگی بھر درہم و دینار کو یہ سعادت میسر نہ ہوئی کہ کاشانۂ نبوت میں رات گذار سکے۔ بعد وفات کے لئے ارشاد ہوا:

لا تقتسم ورثتی دینارًا ولا درھمًا۔ ماترکت بعد نفقۃ نسائی ومؤنۃ عاملی فھو صدقۃ۔ [۱]

"(یعنی) یہ تو ہوگا ہی نہیں کہ میرے وارث دینار یا درہم تقسیم کرسکیں (البتہ کچھ جائیدادیں میری تحویل میں ہیں۔ تو) ازواج کے نفقہ اور کارندے کے حق المحنت کے علاوہ جو کچھ میرا ترکہ ہو وہ صدقہ ہے۔"

استحصال کی بندش

تزکیہ کا مطلب صرف یہی نہیں رہا کہ اکتناز نہ ہو۔ یعنی حاصل شدہ درہم و دینار کو شب باشی کا موقع نہ ملے (شام سے پہلے ہی خرچ کر دیا جائے) بلکہ تزکیہ کا دوسرا رُخ یہ تھا کہ آمدنی صرف وہ ہو جو ہر طرح مقدس، طیب اور پاک ہو۔ پھر اس پاک میں بھی یہ پابندی کہ زکوٰۃ یا صدقہ نہ ہو۔ یہ پابندی نہ صرف اپنے لئے بلکہ

(الف) نسلاً بعد نسل اپنی تمام اولاد کے لئے۔

(ب) تمام خاندان کے لئے جو آل ہاشم کہلاتا تھا (انتہا یہ کہ)

(ج) اپنے خاندان کے تمام آزاد کردہ [۲] غلاموں کے لئے

پھر لطف یہ کہ (۱) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام تر ترکہ صدقہ۔ آپ کے وارثوں کو یہ حق نہیں کہ اس کو تقسیم کرسکیں (مگر صدقہ یا زکوٰۃ کی یہ مجال نہیں کہ وہ آل ہاشم کا دامن

---

[۱] بخاری شریف ص ۳۹۹ [۲] جن کو موالی کہا جاتا ہے، کیونکہ عربوں کا حوصلہ یہ تھا کہ وہ اپنے موالی کو بھی اپنے خاندان کا فرد سمجھا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موالی کو یہی حیثیت دی ہے۔

ارشاد ہے: ان الصدقۃ لاتحل لنا وان موالی القوم من انفسھم۔ ترمذی شریف ص ۸۳ ج ۱

ابوداؤد شریف ص ۲۳۴ ج ۱ وھکذا فی النسائی ص ۳۶۶ ج ۱

چھو سکے۔

(۲) پوری اُمت کے لئے یہ ضابطہ کہ

تؤخذ من اغنیاء هم و ترد علی فقراء هم

یعنی جس قوم یا گروہ کے دولت مندوں سے زکوٰۃ لی جائے وہ اسی گروہ یا قوم کے ضرورتمندوں کو دیدی جائے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کے لئے اس میں یہ ترمیم کہ اس ضابطہ کا جزو اول تو واجب العمل کہ اگر دولت مند ہوں تو عام مسلمانوں کی طرح اُن سے بھی زکوٰۃ و صدقہ لیا جائے لیکن دوسرا جزو (کہ ان کے ضرورت مندوں کو دیا جائے) حرام۔ یعنی آل ہاشم کے دولت مند یہ نہیں کر سکتے کہ عام دستور کے بموجب وہ اپنی زکوٰۃ کی رقم یا صدقہ نظر اپنے کسی ہاشمی رشتہ دار یا اُس کے آزاد غلام کو دے دیں یہ رقم لامحالہ کسی غیر ہاشمی مسلمان کو ہی دینی ہوگی۔

صدقہ کے کھجور آئے ہوئے پڑے تھے۔ جگر گوشۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن رضی اللہ عنہ بچے[1] تھے۔ اُنھوں نے ایک کھجور منہ میں رکھ لیا، جیسے ہی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر پڑی لختِ جگر کو تنبیہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوا:

کخ۔ کخ۔ اما شعرت انا لا ناکل الصدقۃ

"اخ تھو - اخ تھو - تمہیں اتنی تمیز نہیں کہ ہم صدقہ[2] نہیں کھایا کرتے۔"

رازدرون پردہ (گذران کی کیفیت) ان تمام پابندیوں اور احتیاطوں کے بعد اندرون نشیمن کیا حالت رہا کرتی تھی۔ ذرا جھانک کر دیکھو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔ جب بھی میں کھانا کھانے بیٹھتی ہوں، طبیعت ایسی بھر آتی ہے کہ اگر چاہوں تو خوب رو سکتی ہوں۔ مجھے وہ حالت یاد آجاتی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں رہی۔ یہاں تک کہ ایسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔ خدا کی قسم کبھی بھی ایسا

---

[1] پیدائش نصف رمضان ۳ھ (تاریخ الخلفاء) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تقریباً ساڑھے چھ سال عمر تھی [2] بخاری شریف ص۲۰۲۔ و فتح الباری ... فتوے لکھا ہے اگرچہ یہی بتاتا ہے کہ سید کی زکوۃ سید لے سکتا ہے۔

نہیں ہوا کہ دونوں وقت آپ روٹی اور گوشت سے شکم سیر ہوئے ہوں [۱]

میدہ آپ نے عمر بھر نہیں دیکھا۔ کبھی آپ کے لئے چپاتی نہیں پکائی گئی۔ جَو کا آٹا بھی بے چھنا پکتا تھا یہی خوراک تھی۔ اس پر بھی دو دو ماہ گذر جاتے تھے کہ چولھے میں آگ نہیں جلتی تھی۔ دو کالی چیزیں یعنی کھجور اور پانی غذا ہوا کرتی تھیں البتہ انصاری پڑوسی دودھ بھیجدیا کرتے تھے[۲]۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص) فرماتے ہیں۔ گھر کے[۳] آدمی نو تھے، دن رات کے خرچ کیلئے ان سب کے واسطے صرف ایک صاع[۴] ہوتا تھا اور ایسا بھی ہوا کہ آپ نے یہودی کے یہاں زرہ رہن رکھ کر جو منگوائے اور ایسا بھی ہوا ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جَو کی روٹی اور باسی چربی لے گیا[۵]۔ اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔

بچھانے کا گدا چمڑے کا تھا، جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی[۶]۔ اکثر کھرے چارپائی پر آرام فرماتے تھے۔ چٹائی کے پٹھے جسم مبارک میں گڑ جایا کرتے تھے[۷]۔

وفات ہوئی تو زرہ ایک یہودی کے یہاں[۸] تیس صاع جَو کے عوض میں رہن تھی[۹]

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک موٹا کمبل پیوند لگا ہوا۔ اور ایک موٹے کپڑے کی لنگی نکال کر ہمیں دکھائی اور فرمایا ان دو کپڑوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوح قبض ہوئی[۱۰]

وفات کے بعد ترکہ یہ تھا: (ضروری) اسلحہ، ایک خچر، قطعہ آراضی جس کو صدقہ کر دیا تھا[۱۱]

---

[۱] ترمذی شریف ص ۵۸/۲۷ [۲] بخاری شریف ص ۹۵۶ [۳] ازواج مطہرات۔ دسویں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم [۴] ایک صاع کا وزن دو سو ستر تولہ (تین سیر چھ چھٹانک (تقریباً ۳ کیلو چھ سو گرام)

[۵] بخاری شریف ص ۲۷۸ [۶] بخاری شریف ص ۹۵۶ [۷] بخاری شریف ص ۳۳۵

[۸] تیس صاع تقریباً ڈھائی من [۹] بخاری شریف ص ۴۰۹ وشمائل ترمذی شریف

[۱۰] بخاری شریف ص ۲۰۶ ترمذی شریف ص ۸۶۵ ۱۲

[۱۱] شمائل ترمذی شریف ص ۲۹

ایک معمہ .... | سنہ ۷ھ میں خیبر فتح ہوا۔ اس کے بعد ازواج مطہرات کے نفقے مقرر کر دیئے گئے۔ ہر ایک خاتون کا سالانہ نفقہ، اسّی وسق کھجور اور بیس وسق جَو۔[1] ایک وسق[2] کا وزن پانچ من ڈھائی سیر۔ اس حساب سے اسّی وسق کھجور چار سو پانچ من اور بیس وسق جَو ایک سو ایک من دس سیر۔ کھجور اور جو کا جو بھی نرخ مانا جائے۔ جب ایک شخص کی خوراک کے لئے مہینہ میں ایک من اور سال بھر میں بارہ من جو یا کھجور بہت کافی ہوتے ہیں تو یہ کئی سو من کی مقدار فاضل ہی تھی۔ اس کے ذریعہ زندگی بہت خوش حال بن سکتی تھی۔ پھر یہ تنگی کیوں تھی۔

جواب | کوئی حساب داں اس معمہ کو حل نہیں کر سکتا۔ قرآن حکیم نے اس کا جواب دیا ہے جب صحابہ کرام کی شان یہ بیان فرمائی:

یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ (سورہ حشر ۵۹)

"(ضرورتمندوں کو) اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں باوجودیکہ خود ان کو شدید ضرورت ہوتی ہے۔"

اور اللہ کے پاک بندوں کی یہ شان بیان فرمائی:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ (الدھر)

"اور کھلاتے ہیں کھانا اس کی محبت پر (جب کھانا خود ان کو بھی محبوب ہوتا ہے اور وہ خود بھی ضرورت مند ہوتے ہیں) مسکین کو، یتیم کو اور قیدی کو۔"

ان آیات کو سامنے رکھتے ہوئے اگر عوام کی اقتصادی حالت معلوم ہو جائے تو معمہ حل ہو جائے گا۔

عوام کی حالت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا تو آپ کا مع اہل و عیال یومیہ وظیفہ

---

[1] بخاری شریف ص۳۱۳ [2] ایک وسق ساٹھ صاع کا اور ایک صاع ۳ سیر چھ چھٹانک (۲۷۰ تولہ)۔

نصف بکریؓ مقرر کیا گیا تھا، کیونکہ متوسط درجہ کے مہاجر کی یومیہ آمدنی کا اوسط یہی تھا۔ یہ آمدنی فی کس نہیں بلکہ فی گھر تھی۔

اور جب متوسط درجہ کے مہاجرین کی یہ آمدنی تھی تو غریبوں کی آمدنی کا اوسط تو فی گھر اس سے بھی کم ہوگا، جس کا لازمی تقاضا عمومی افلاس تھا۔ پس عمومی افلاس اور عوام کی خستہ حالی اس معمہ کا حل ہے۔ اس کی وضاحت حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے اس واقعہ سے ہوتی ہے:

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں جب از سرِ نو وظائف مقرر کئے تو ہر ایک زوجہ مطہرہ کا سالانہ وظیفہ دس ہزار درہم مقرر کیا۔ ام المومنین حضرت زینب بنت جحش (رضی اللہ عنہا) کے یہاں یہ رقم پہلی مرتبہ پہنچی تو فرمایا اللہ تعالیٰ امیر المومنین پر رحم فرمائے۔ یہ

لہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عروہ بارقی رضی اللہ عنہ کو بکری خریدنے کے لئے بھیجا تو آپ نے ایک دینار اُن کو دیا تھا۔ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کی کمال ہوشیاری تھی کہ آپ نے ایک دینار کی دو بکریاں خرید لیں (بظاہر آپ کسی گلہ میں یا کسی کے مکان پر پہونچ گئے) پھر بازار میں لاکر ایک بکری ایک دینار میں فروخت کردی، دوسری بکری اور ایک دینار آقاء دوجہان (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں پیش کردیا آپ نے ان کو دعا دی۔ (بخاری شریف ص۵۱۳)۔ بہرحال اگرچہ حضرت عروہؓ نے ایک دینار میں دو بکریاں خرید لی تھیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ایک دینار اسی لئے دیا تھا کہ عام طور پر قیمت ایک دینار کے قریب ہوتی تھی۔ پھر بازار میں ایک بکری کو ایک دینار میں فروخت کردینا اور خریدار کا ایک بکری کو بلا تکلف ایک دینار میں خرید لینا بھی یہی بتاتا ہے کہ بازار میں عام قیمت تقریباً ایک دینار ہی ہوتی تھی اس صورت میں نصف بکری کا وظیفہ مقرر کرنے کا مفہوم یہ ہوا کہ نصف دینار یومیہ حضرت ابوبکرؓ کے گھر کے خرچ کے لئے مقرر کیا گیا۔ دینار کی قیمت عام طور پر دس درہم ہوتی تھی۔ (فتح القدیر باب الجزیہ) اس کے بعد نصف بکری یومیہ کے بجائے دو ہزار درہم اور جب آپ نے عیالداری کی ضرورتیں پیش کرکے اضافہ کی فرمائش کی تو ڈھائی ہزار درہم (تقریباً سات درہم یومیہ) (تاریخ الخلفاء ص۵۸) ایک درہم ساڑھے تین ماشہ کا مانا جائے تو دو تولہ چھ ماشہ چاندی یومیہ۔ حضرت صدیقؓ اور اُن کے اہل و عیال کے لئے مقرر کئے گئے۔ لہ تاریخ الخلفاء ص۵۸ مجتبائی بحوالہ طبقات ابن سعد۔

رقم میرے پاس بھیجی حالانکہ میری سہیلیوں میں ایسی ہیں جو مجھ سے زیادہ باہمت ہیں وہ زیادہ مستعدی سے اس رقم کو تقسیم کر سکتی تھیں۔

جب پیش کرنے والوں نے کہا: محترمہ! یہ تقسیم کرنے کے لئے نہیں ہیں یہ تو آپ کے جیب خرچ کے لئے ہیں تو فرمایا: اچھا۔ یہاں ڈال دو۔ ان کو رکھوا کر ان پر کپڑا ڈلوا دیا اور اپنی خادمہ سے فرمایا: کپڑے کے نیچے ہاتھ ڈال کر فلاں خاندان کے لئے رقم نکالو۔ فلاں خاندان کے لئے نکالو۔ اسی طرح خاندان شمار کراتی رہیں اور ان کے لئے رقومات علیحدہ کراتی رہیں۔ خادمہ نے کہا: سیّدہ میں بھی تو حاضر ہوں۔ کچھ میرے لئے بھی فرمایا: جو کچھ کپڑے کے نیچے رہ گیا ہے وہ تمہارا ہے۔

خادمہ نے کپڑا اُٹھایا تو صرف پچاسی درہم باقی تھے۔ وہ اُس کو عطا فرما دیئے[2]

یہ تھا اسلامی سوشلزم۔ اگر اس کو سوشلزم کہا جا سکتا ہے جو تقسیم دولت کا قانون نہیں ہوتا بلکہ دلوں میں دولت سے نفرت اور غریبوں کی ہمدردی کا وہ جذبہ بھر دیتا ہے کہ اُن کو اطمینان جب ہی ہوتا ہے جب پوری دولت تقسیم ہو جائے اور امیری غریب کی سطح پر آجائے، اسی کو تزکیہ کہا جاتا ہے کہ بخل، حُبِّ مال اور حرص و طمع کے جراثیم سے وہ پارۂ گوشت پاک و صاف ہو جائے جس کو دل کہا جاتا ہے۔

نتیجہ: یہ بحث بظاہر بے محل ہے مگر جب شروع ہو گئی تو اب یہ بھی ملاحظہ فرمایئے کہ یہ اقتصادی نظام جس کی بنا مساوات پر رکھی گئی تھی جس کے لئے دولت مند غریب کی سطح پر آئے تھے وہ کتنی جلد کامیاب ہوا اور کیسا کامیاب ہوا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا وظیفہ یومیہ نصف بکری معین کیا گیا تھا یعنی پانچ درہم یومیہ۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دو سالہ دورِ خلافت میں درج رجسٹر مسلمانوں کے وظائف مقرر کئے تو اسی نسبت سے یعنی فی کس پانچ درہم یومیہ۔[1]

---

[1] کتاب الخراج الامام ابی یوسف رح ص۴۵ [2] کتاب الاموال لابی عبید حدیث ۶۶۲ ص۲۶۳

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ: فضائل، خدمات اور مناصب کا لحاظ کرتے ہوئے وظائف مقرر فرمائے جو بارہ ہزار درہم[1] سالانہ تک تھے۔ جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق تھا تو یہ ضابطہ مقرر کر دیا کہ جیسے ہی بچّہ پیدا ہو اس کا وظیفہ جاری کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ یمن کا علاقہ زرخیز تھا تو وہاں یہ حالت ہو گئی کہ ایسے ضرورت مند نہ رہے جن کو زکوٰۃ دی جا سکے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ یمن کے والی (گورنر) تھے انھوں نے جو زکوٰۃ و صدقات کی رقمیں وصول کیں ان کا ایک تہائی مرکزی بیت المال (مدینہ) میں بھیجا۔ مگر بجائے مبارکباد کے حضرت فاروق اعظمؓ کی جانب سے تنبیہہ نامہ پہنچا:

"آپ کو یمن اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ وہاں سے چندہ یا جزیہ وصول کر کے یہاں بھیجیں آپ کو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ وہاں کے اہل استطاعت سے زکوٰۃ و صدقات وصول کریں اور اسی علاقہ کے ضرورت مندوں پر تقسیم کر دیں۔ پھر آپ نے یہ رقم کیسے بھیجی۔"

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا:

"سب کو دیدیا گیا جب یہاں کوئی لینے والا نہ رہا تو یہ فاضل رقم بھیج دی۔"

اگلے سال حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے نصف اور تیسرے سال زکوٰۃ کی پوری رقم مرکزی بیت المال میں بھیجدی۔ اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مرتبہ بھی اتنی سختی سے لکھا تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا دو لفظی جواب یہ تھا:

---

[1] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارہ ہزار درہم سالانہ باقی تمام ازواج کے دس دس ہزار، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور تمام مہاجرین کے جو غزوہ بدر میں شریک تھے پانچ پانچ ہزار۔ حضرات انصار جو بدر میں شریک تھے اُن کے چار چار ہزار۔ (کتاب الاموال لابی عبید حدیث ۵۴۹، صفحہ ۲۲۴)

ما وجدت احداً یاخذ منی شیئاً

"کوئی نہیں ملا جو مجھ سے کچھ لے لے"[1]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دور شروع ہوا تو مدینہ کی یہ حالت ہو گئی کہ لوگ زکوٰۃ کی رقم لئے پھرتے تھے اور کوئی شخص ایسا نہیں ملتا تھا جو اسے قبول کرلے۔

سنہ میں خیبر فتح ہوا تھا۔ اس وقت سے اسلامی مملکت اس قابل ہوئی تھی کہ کسی درجہ پر مالی نظام قائم ہو سکا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دور خلافت ۳۵ھ سے شروع ہوا اس سولہ سال کے عرصہ میں پوری مملکت کی یہ حالت ہو گئی کہ غریبی کا نام ونشان نہیں رہا[2]۔ ساتھ

---

[1] کتاب الاموال لابی عبید حدیث ۱۹۱۱ صفحہ ۵۹۶ [2] اس نظام کی بنیادیں اتنی مضبوط تھیں کہ شدید خانہ جنگی کے باوجود خوش حالی کا دور دورہ رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت یعنی خلافت راشدہ کے تیس سال ختم ہونے کے بعد اگرچہ وصول اور خرچ کے بارہ میں وہ احتیاط باقی نہیں رہی تھی مگر جو اقتصادی ساکھ قائم ہو چکی تھی وہ قائم رہی، جس کی ایک مثال یہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے تقریباً ساٹھ سال بعد جب حضرت عمر بن عبدالعزیز (المتوفی رجب ۱۰۱ھ) نے نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لیا تو آپ نے عبدالحمید بن عبدالرحمٰن (گورنر عراق) کو حکم بھیجا کہ وظائف مقررہ ادا کر دیں۔ گورنر صاحب نے تعمیل حکم کے بعد رپورٹ بھیجی کہ تمام وظائف ادا کئے جا چکے ہیں تب بھی کافی رقم باقی ہے۔ دربار خلافت سے حکم صادر ہوا آپ کے صوبہ میں جتنے مقروض ہیں اُن کا جائزہ لو اور اُن سب کے قرض ادا کر دو جو فضول خرچی کی بنا پر مقروض نہ ہوئے ہوں۔ گورنر صاحب نے تعمیل کے بعد رپورٹ بھیجی کہ سب مقروضوں کے قرض ادا کئے جا چکے ہیں تب بھی رقم باقی ہے۔ حکم صادر ہوا جن نوجوانوں کے نکاح نہیں ہوئے اُن کے نکاح کرا دیجئے اور مہر اس رقم سے ادا کر دیجئے۔ گورنر صاحب نے اس حکم کی تعمیل کے بعد بھی یہی رپورٹ بھیجی کہ رقم باقی ہے۔ حکم صادر ہوا جو غیر مسلم کاشتکار جزیہ ادا کرتے ہیں اُن کا جائزہ لیجئے۔ اُن کو تقاوی کی ضرورت ہو تو اُن کی تقاوی دیدیجئے کہ وہ آسانی اور سہولت کے ساتھ زمین بو سکیں۔ (کتاب الاموال لابی عبید صفحہ ۲۵۱ حدیث ۶۲۱)

ساتھ تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا تو وہی مدینہ جس میں قبہ دار پھاٹک ناپسند فرمایا گیا تھا اب اس کی تعمیرات محدود علاقہ سے آگے بڑھ کر کوہ سلع تک پہنچ گئیں۔ جو احد کے قریب مدینہ سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر ہے۔

تیسرا کام

قریش و اہل یثرب کا معاہدہ۔ یہود سے مصالحت

(۱)

یثرب و مضافات یثرب (مدینہ) اُس عرب کا ایک علاقہ تھا جہاں نہ کوئی حکومت و سلطنت تھی، نہ فوج اور پولیس۔ پورا عرب آزاد و خودسر قبائل کا ایک وسیع جنگل تھا۔ وہاں صرف معاہدات کا ایک نظام تھا۔ وہی قبائل کو جوڑتا تھا اور وہی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ دو قبیلوں میں اگر جنگ ہوگئی تو وہ ان قبیلوں تک ہی نہیں رہتی تھی بلکہ اُن کے حلیف اور معاہد قبیلے میدان میں اُتر آتے تھے۔ اس طرح دو قبیلوں کی لڑائی دو نظاموں (دو قبائلی گروپوں) کی لڑائی بن جاتی تھی۔

یثرب کے دو قبیلے اوس و خزرج کے افراد مسلمان ہوئے تھے اُن کے بھی معاہدات تھے۔ یثرب کے قریب (بنو قریظہ، بنو نضیر وغیرہ) یہود کے جو قبائل آباد تھے ان معاہدات میں شریک تھے۔ بنو قریظہ، قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔

ان معاہدات میں جس طرح دفاع کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ حملہ آور کا مقابلہ آپس کی متحدہ طاقت سے کریں گے اسی طرح یہ بھی ہوتا تھا کہ اگر حلیف قبیلہ کا کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو اس کی تلافی کی کیا صورت ہوگی۔

پنچایتی قسم کے کچھ قاعدے اصول متعارفہ کے طور پر رائج تھے جو عام طور پر تسلیم کئے جاتے تھے۔ ان کے بموجب قتل کی بعض صورتوں میں "قصاص" ہوتا تھا یعنی جان کے بدلے جان — بعض صورتوں میں جان کے بدلے میں جان نہیں بلکہ دِیَتْ لازم ہوتی تھی۔ دِیت کے سو اونٹ مقرر تھے۔ دیت اور بعض صورتوں میں "خون بہا" صرف قاتل یا قاتل کے اہل خانہ سے وصول نہیں کیا جاتا تھا بلکہ قاتل کی سوسائٹی سے وصول کیا جاتا تھا، جس کو عاقلہ کہتے تھے۔ اس کی حدود ہوتی تھیں۔ اس میں (سوسائٹی میں) قاتل کے قبیلے کے آدمی بھی ہوتے تھے۔ حلیف قبیلوں کو بھی اس میں شریک ہونا پڑتا تھا اور معاہدات میں یہ طے ہوتا تھا کہ اگر دیت لازم ہو تو کس قبیلہ کو کتنا دیت میں کتنا حصہ لینا ہوگا۔ ان شرائط کو جو قصاص، خون بہا اور دیت کے متعلق ہوا کرتی تھیں، ان کو "معاقل" کہا جاتا تھا۔

(۲)

قریشی حضرات جو ہجرت کرکے مدینہ آئے تھے ایک نیا عنصر تھے۔ اگرچہ حضرات انصار نے اُن کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا اور اس طرح مکی اور مدنی مسلمانوں کا ایک گروپ بن سکتا تھا، جو ایک نئی سیاسی اور مذہبی پارٹی کی حیثیت میں رونما ہوتا؟ مگر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صورت اختیار نہیں فرمائی۔

یہ گروپ ایک وزن رکھتا تھا اور اگر صرف سیاسی انقلاب مقصود ہوتا تو یہ گروپ کارآمد ہوسکتا تھا لیکن جس کا نصب العین دعوت الی اللہ تھا وہ اس جتھہ بندی کو پسند نہیں کرسکتا تھا۔

حضرات انصار۔ یعنی قبیلہ اوس اور قبیلہ خزرج کے جو افراد مسلمان ہوئے تھے، اُن کے بڑے قبیلے اور کنبے (بطن) مسلمان نہیں ہوئے تھے اور بہت سے وہ تھے کہ اُن کے گھر کے بھی سب آدمی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ وہ سابق مذہب پر قائم تھے۔ اس طرح کی جتھہ بندی آپس میں تصادم اور مقابلہ کی شکل پیدا کردیتی جس کا نتیجہ فساد فی الارض اور قطع ارحام ہوتا جو اسلام میں بدترین جرم ہے۔

جتھہ بندی اور علیحدگی کے برخلاف رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتفاق و اتحاد اور میل ملاپ کا راستہ اختیار کیا۔ آپ نے اس علاقہ کے تمام باشندوں میں خیر سگالی اور تعاون و امدادِ باہمی کی روح پیدا کرنی چاہی۔ مواخات جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے اس کی پہلی کڑی تھی جس سے آپ نے مہاجرین اور انصار میں نہ صرف تعاون اور خیر سگالی کا رشتہ قائم کیا' بلکہ انصار اور مہاجرین کو بھائی بھائی بنا دیا۔

یثرب میں ایک فرقہ مشرکین کا تھا جو قریش مکہ کا ہم مذہب تھا اور قریش مکہ اس کو آسانی سے اپنا آلۂ کار بنا سکتے تھے۔ دوسرا فرقہ یثرب کے قرب و جوار میں یہود کا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات مہاجرین کا رابطہ اُن سے بھی قائم کر دینا چاہا۔

(۳)

مدینہ میں تشریف لانے کے بعد آپ نے جو کام سب سے پہلے کئے اُن میں تیسرا کام یہ تھا کہ آپ نے مہاجرین اور اُن تمام فرقوں میں بقاء باہم، تعاون اور خیر خواہی اور خیر اندیشی کا رشتہ قائم کرنے کے لئے ایک تحریر مرتب فرمائی اس کو عہد نامہ بھی کہہ سکتے ہیں اور ایک وفاق کا دستور اساسی بھی۔ قریش مکہ کی تمام کوششوں کو ناکام بناتے ہوئے جس کامیابی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات مہاجرین مکہ سے نکل کر مدینہ تشریف لائے تھے اور یہاں ایک مرکز کی بنیاد ڈالدی تھی اس نے جس طرح قریش کو چراغ پا کر دیا تھا حتیٰ کہ اُنھوں نے فوراً ہی[1] اس مرکز کو ختم کرنے کی سازش شروع کر دی تھی اس کا بھی تقاضا تھا کہ حضرات مہاجرین اور باشندگان یثرب و مضافاتِ یثرب کے درمیان تعاون' تحفظ اور بقاء باہم کا عہد و پیمان ہو۔ اس عہد نامہ سے یہ تقاضا بھی پُورا ہو رہا تھا۔

---

[1] چنانچہ اپنے ہم مشرب یعنی مشرکین مدینہ کو خط لکھا کہ مسلمانوں کو نکال دو یا اُن سے جنگ کرو' ورنہ ہم مدینہ پہنچیں گے اور تمہارے جوانوں کو قتل کریں گے' عورتوں کی آبرو خراب کریں گے (ابوداؤد شریف باب خبر النضیر) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عہد زریں جلد اوّل (قریش کی طرف سے یثرب میں مخالف محاذ)۔

(۴)

اس عہد نامہ کا ایک فریق حضرات قریش ہیں جو ایمان و اسلام سے مشرف ہوئے اور ہجرت کر کے مدینہ میں قیام پذیر ہوئے جن کو عہد نامہ میں المؤمنین والمسلمین من قریش) سے تعبیر کیا گیا ہے، دوسرا فریق اہلِ یثرب ہیں (کسی مذہبی فرقہ کی بنا پر نہیں بلکہ باشندۂ یثرب کی حیثیت سے) ان میں حضرات انصار کے علاوہ وہ بھی شامل ہیں جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، اپنے کفر و شرک پر قائم تھے۔ ان میں عبداللہ بن ابی بن سلول جیسے رؤسا بھی تھے جو کھلم کھلا[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی مخالفت کیا کرتے تھے۔

یہود بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع وغیرہ اہلِ یثرب نہیں ہیں۔ یہ قبائل یثرب سے باہر مضافات یثرب میں آباد تھے۔ اہلِ یثرب (اوس اور خزرج) سے اُن کے معاہدات تھے۔ ان معاہدات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر انداز نہیں فرمایا بلکہ ان کو مستحکم اور مضبوط کیا ہے۔ چنانچہ انہیں معاہدات کے واسطہ سے ان کو اس عہد نامہ میں شامل فرمایا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی فریق نہیں[2] ہیں۔ آپ ایک سرپرست ہیں اور اس معاہدہ کے بانی کی حیثیت سے آپ کو مرکزی شخصیت تسلیم کیا گیا ہے اور یہ طے کیا گیا ہے کہ باہمی نزاعات میں آپ کی ذات پاک مرجع ہوگی اور آپ کا فیصلہ آخری ہوگا۔

آپ کی یہ مرکزی حیثیت کسی مادی طاقت کی بنیاد پر نہیں ہے۔ انصار و مہاجرین کی مٹھی بھر جماعت جو آپ کے ساتھ تھی یہ طاقت نہیں رکھتی تھی کہ مشرکین یثرب اور قبائل یہود کو اس پر مجبور کر دے کہ وہ آپ کو مرکز اور مرجع تسلیم کریں۔ یہ آپ کی پُر تقدس شخصیت کا اعجاز تھا کہ مخالفین کے قلوب بھی اس اعتراف پر مجبور ہو گئے کہ آپ سے صرف سچائی، انصاف اور ہمدردی و خیر خواہی کی توقع

---

[1] ملاحظہ ہو بخاری شریف ص۶۵۶ و ص۹۱۶ و ص۹۲۴ وغیرہ حدیث اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ جس میں تذکرہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجمع کو خطاب فرمانا چاہا تو عبداللہ بن اُبَی بن سلول نے توہین آمیز انداز سے مخالفت کی۔

[2] جو تمام جہانوں کے لئے رحمت بن کر آیا وہ تو سب کا تھا۔ وہ کسی ایک کا کیسے ہو سکتا تھا۔

کی جا سکتی ہے۔ آپ جیسا شخص کاذب و ظالم نہیں ہو سکتا۔ آپ کی اسی مقبولیت نے جو چند روز میں حاصل ہو گئی تھی آپ کو مرجع اور مرکز بنایا اور آپ کی اسی مقبولیت نے اُن کا بھی وزن بڑھا دیا جو آپ کے جاں نثار تھے۔ پھر اس معاہدہ کے ایک ایک لفظ پر نظر ڈالئے کوئی بات بھی ایسی نہیں، جس کا انکار کیا جا سکے۔ سچائی، تقویٰ اور نیک کرداری کی تاکید بار بار کی گئی ہے جس سے انکار کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔

سرپرستانہ حیثیت کے علاوہ (جو نزاع کے وقت مرجع بنے گی) اور کوئی اختیار آپ نے اپنے لئے منظور نہیں کرایا۔

دنیا کی تاریخ نے اس عہد نامہ کو یہ اہمیت دی ہے کہ اس کو "اقدم دستور مسجل فی العالم" (دنیا میں بنیادی حقوق کی سب سے پہلی باقاعدہ دستاویز) بھی کہا گیا۔ لہٰذا ہم اس کو بجنسہٖ نقل کرتے ہیں۔ اُردو داں حضرات کی آسانی کے لئے ہر ایک فقرہ کے سامنے اس کا ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ فقروں کے شروع میں نمبر عہد نامہ میں نہیں ہیں۔ یہ مترجم کا اضافہ ہے تاکہ منشا اور مفہوم پوری طرح واضح ہو جائے۔ اس عہد نامہ کی حیثیت ابن ہشام نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

قال ابن اسحاق وکتب رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کتابًا بین المهاجرین والانصار وادع فیہ یهود وعاھدھم و اقرهم علی دینهم واموالهم علیهم وشرط واشترط لهم۔

(ترجمہ) فن مغازی کے امام علامہ ابن اسحاق نے بیان فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کتاب (تحریر) لکھی۔ مہاجرین اور انصار کے درمیان اس تحریر میں یہود سے بھی مصالحت کی صورت اختیار کی، اُن سے معاہدہ کیا اور ان کو اپنے دین پر قائم رکھا اور جو جائدادیں ان کی تھیں اُن پر قائم رکھا کچھ شرطیں اُن پر لگائیں اور کچھ شرطیں ان کے لئے تسلیم کیں۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
(۱) هٰذا كتاب من محمد النبی رسول اللہ بین المؤمنین والمسلمین من قریش واهل یثرب ومن تبعهم فلحق بهم وجاهد معهم	(۱) "یہ تحریر ہے محمد اللہ کے نبی کی طرف سے جو اللہ کے رسول ہیں قریش کے مومنین ومسلمین اور اہل یثرب کے درمیان اور جو اُن کے[1] تابع ہیں اور اُن سے الحاق کئے ہوئے ہیں اور کوشش وجدّ وجہد میں اُن کے ساتھ ہیں[2]۔
(۲) اَنَّهُمْ اُمَّةٌ وَّاحِدَةٌ دُوْنَ النَّاس۔	(۲) یہ کہ یہ سب (اپنے ماسوا) تمام انسانوں کے مقابلہ میں ایک اُمّت[3] ہوں گے۔
(۳) المهاجرون من قریش علی ربعتهم[4]۔	(۳) قریش کے وہ افراد جو ہجرت کر کے آئے ہیں وہ اپنے حال پر بدستور رہیں گے (اُن کی آزادی اور اُن کے حقوق بدستور رہیں گے)۔

---

[1] نحوی قاعدہ کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ جو اہل یثرب کے تابع اور اُن کے ساتھ ہیں اسی عہدنامہ کے دوسرے حصّہ میں یہود کا تذکرہ ہے اس میں یہود بنی النجار، یہود بنی الحارث وغیرہ کے الفاظ ہیں جن سے اسی کی تائید ہوتی ہے یعنی بنی النجار کے ساتھ جو یہود ہیں انہیں یہود بنی النجار کہا گیا ہے باقی دوسری صورت کہ یہ معنے لئے جائیں کہ جو یہود مسلمانوں کے تابع ہیں وہ نحوی لحاظ سے بھی صحیح نہیں ہے اور عہدنامہ کے سیاق اور پرداخت کے بھی مخالف ہے۔
علاوہ ازیں جو یہود مسلمانوں کے ساتھ ہوں اُن کو ایک علیحدہ فقرہ (۱۱) میں بیان کیا گیا ہے۔

[2] اس کے معنے یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ جہاد میں اُن کے ساتھ رہے ہیں (مگر اب تک کوئی جہاد نہیں ہوا تھا اور جو لڑائیاں زمانۂ جاہلیت میں ہوئی تھیں وہ جہاد نہیں تھیں خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر مبارک میں تو ان کے لئے جہاد کا لفظ آنا بہت ہی مستبعد اور خلافِ عقل ہے۔ واللہ اعلم)

[3] گروہ، قوم، جماعت۔ یعنی اگر مذہبی آزادی حاصل رہے تو مسلمان دوسری قوم یا گروہ کے ساتھ مل کر اُمۃ واحدۃ ہوسکتے ہیں۔

[4] رَبِعَتِهِمْ. كَعِبَةٍ ای حالة حسنة او امرهم الذی کانوا علیه (قاموس)۔

يتعاقلون بينهم	قصاص (خون بہا اور دیت کے متعلق جو ان کا دستور ہو اور جو ان کے
وهم يفدون عانيهم	معاہدات ہیں وہ بدستور رہیں گے اُن کا کوئی شخص قید ہو گا
بالمعروف والقسط	تو اس کا فدیہ وہ خود ادا کریں گے (کوئی حلیف اس کا ذمّہ دار نہیں ہو گا)
بين المسلمين.	یہ تمام باتیں اس طرح ہوں گی کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی عام دستور کے
	مطابق بھلائی اور انصاف کا معاملہ کیا جائے گا۔
(۴) و بنو عوف على ربعتهم	(۴) بنو عوف کی آزادی اور اُن کے حقوق بدستور رہیں گے۔
يتعاقلون معاقلهم الاولىٰ	قصاص، خون بہا اور دیت کے متعلق جو ان کا دستور ہے
وكل طائفة تفدي	اور جو اُن کے معاہدات ہیں وہ بدستور رہیں گے۔ اُن کا کوئی
عانيها بالمعروف	شخص قید ہو گا تو اس کا فدیہ وہ خود ادا کریں گے۔
والقسط بين	یہ تمام باتیں اس طرح ہوں گی کہ مسلمانوں کے ساتھ عام دستور کے
المؤمنين.	مطابق بھلائی اور انصاف کا معاملہ کیا جائے گا۔

پھر اسی طرح قبائل بنو الحارث، بنو ساعدہ، بنو جشم، بنو النجار، بنو عمرو بن عوف، بنو نبیت، بنو الاوس کے نام لئے گئے ہیں اور ہر ایک قبیلہ کے نام کے ساتھ یہ صراحت کر دی گئی ہے جو مہاجرین اور بنو عوف کے لئے کی گئی ہے کہ اُن کی آزادی اور اُن کے حقوق بدستور رہیں گے۔ قصاص، خون بہا اور دیت کے متعلق جو اُن کا دستور ہے اور جو اُن کے معاہدات ہیں وہ بدستور رہیں گے۔ اُن کا کوئی شخص قید ہو جائے گا تو اس کا فدیہ وہ خود ادا کریں گے۔ یہ تمام باتیں اس طرح ہونگی کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی عام دستور کے مطابق بھلائی اور انصاف کا معاملہ کیا جائے گا۔

(۵) ان المؤمنين لا يتركون	(۵) یہ کہ مسلمان کسی ایسے شخص کو
مفرجًا[1] ان يعطوه	جو قرض میں دبا ہوا کثیر العیال ہو
بالمعروف.	اس بات سے نہیں چھوڑیں گے (محروم نہیں کریں گے)

[1] المفرج المثقل من الدين الكثير والعيال (ابن ہشام صفحہ ۳۰۲ ج ۱)

فی فداء او عقل — کہ اس کو اچھی طرح عطیہ دیں فدیہ یا دیت کے سلسلہ میں[1]

(۶) وان لا یحالف مؤمن مولیٰ مؤمن دونہ۔ — (۶) اور یہ کہ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں ہوگا کہ وہ کسی مسلمان کو نظرانداز کرکے اس کے حلیف سے معاہدہ کرلے (جو مسلمان پہلے سے حلیف ہے اس کو بھی اس معاہدہ اور عہد و پیمان میں شریک رکھنا ہوگا)۔

(۷) وانّ المومنین المتقین ایدیھم علی کل من بغی منھم او ابتغیٰ[2] دسیعۃ ظلم، او اثم او عدوان او فساد بین المؤمنین وانّ ایدیھم علیہ جمیعًا ولو کان ولد احدھم۔ — (۷) اور یہ کہ اہل تقویٰ مومنین سب کی طاقت متحد رہے گی اس شخص کے مقابلہ میں جو ان سے بغاوت کرے (ان پر ظلم و زیادتی کرے) یا ظالمانہ طریقہ پر ان سے وصول کرنا چاہے، یا مسلمانوں کے آپس میں گناہ، ظلم یا فساد پھیلانا چاہے ایسے شخص کے مقابلہ میں ان کی طاقت متحد رہے گی خواہ (وہ ظالم) کسی کا اپنا لڑکا ہی ہو۔

(۸) ولا یقتل مؤمن مؤمنا فی کافر ولا ینصر کافر علی مومن۔ — (۸) یہ کہ کوئی مومن کسی مومن کو کسی کافر کی حمایت[3] میں قتل نہیں کرے گا، نہ کسی کافر کی کسی مومن کے مقابلہ میں مدد کی جائے گی۔

---

[1] یعنی اگر کوئی مقروض اور کثیرالعیال مسلمان ہو اور اس پر کسی سلسلہ میں فدیہ یا دیت لازم ہو جائے تو مسلمانوں کو حق ہوگا کہ وہ اچھی طرح اس کی امداد کریں اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کریں جو عام مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہیں، مسلمانوں کو اس امداد کا حق ہوگا اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا موقع نہیں ہوگا۔ (واللہ اعلم)

[2] ای ابتغیٰ منھم ان یدفعوا الیہ علی وجہ ظلمھم ای کونھم مظلومین (مجمع البحار)

[3] حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ مکہ کے مشہور رئیس، دشمن اسلام امیہ بن خلف سے کاروباری سلسلہ میں معاہدہ کیے ہوئے تھے غزوۂ بدر میں حضرات انصار نے امیہ بن خلف کا تعاقب کیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس کو بچانا چاہا اس میں خود ان کے بھی تلوار لگ گئی اور زخمی ہو گئے مگر (باقی صفحہ آئندہ پر)

(۹) وان ذمة الله واحدة یجیر علیھم ادناھم	یہ کہ اللہ کی ذمہ داری (پناہ) ایک ہے (یعنی اللہ کے نام پر جو ذمہ داری لی جائیگی اُس کا احترام تمام مسلمانوں پر لازم ہوگا) پناہ دے سکتا ہر مسلمانوں کی ذمہ داری پر سب سے معمولی درجہ کا مسلمان بھی۔[1]
(۱۰) وان المومنین بعضھم مولیٰ بعض دون الناس	(۱۰) اور یہ کہ ہر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا ولی ہوگا (معاہدہ صلح وجنگ میں شریک ہوگا) یہ ولایت غیر مسلم کو حاصل نہیں ہوگی۔
(۱۱) وانہ من تبعنا من یھود فان لہ النصر والاسوۃ غیر مظلومین ولا متناصر علیھم۔	(۱۱) اور یہ کہ جو یہودی ہمارے ساتھ ہوں گے ان کی مدد کی جائے گی ان کے ساتھ ہمدردی کی جائے گی وہ مظلوم نہیں ہوں گے نہ اُن کے ساتھ انتقامی[2] کارروائی کی جائے گی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مجاہدین انصار نے اُمیہ کو قتل کر ہی دیا۔ بخاری شریف ص۳۰۸
اب اگر امیہ کے حامی ان انصار سے قتل امیہ کا بدلہ لینا چاہتے (جیساکہ قاعدہ تھا، بلکہ ضروری سمجھا جاتا تھا) اور اس سلسلہ میں معاہدہ کی بنا پر یا کسی اور تعلق کی بنا پر حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے مدد چاہتے تو معاہدہ کی اس دفعہ کے بموجب حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے لئے جائز نہ تھا کہ وہ حامیان امیہ بن خلف کی امداد کرتے اس دفعہ کے معنیٰ یہ بھی لئے گئے ہیں کہ کوئی مسلمان کسی مسلمان کو کسی کافر کے مقابلہ میں قتل کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ مگر اس مفہوم کے لئے لفظ "بکافر" ہونا چاہئے تھا۔ یہاں "فی کافر" ہے "فی کافر" کی صورت میں معنے وہی ہوسکتے ہیں جو ترجمہ میں لکھے گئے۔ علاوہ ازیں میدانِ جنگ یا دارالحرب میں تو بیشک یہی ہے۔ مگر دارالاسلام میں یہ حکم نہیں ہے وہاں اگر مسلمان کسی ذمی کو قتل کردے تو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہی ہے کہ مسلمان کو ذمی کافر کے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

[1] یعنی اگر معمولی درجہ کا مسلمان جو ذمہ دارانہ حیثیت نہیں رکھتا، نہ افسر ہے، نہ عہدہ دار، عام مسلمانوں میں سے ایک ہے وہ بھی کسی غیر مسلم کو پناہ دیدے یا اس سے کوئی معاہدہ کرلے تو تمام مسلمانوں پر اس کی پابندی ضروری ہوگی۔

[2] یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ ان کے برخلاف اُن کے مخالفین کی مدد نہیں کی جائے گی۔

(۱۲) وان سلم المؤمنين واحدة لا يسالم مؤمن دون مؤمن في قتال في سبيل الله الا على سواء وعدل بينهم.

(۱۲) اور یہ کہ مسلمانوں کی صلح ایک ہے کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے بغیر قتال فی سبیل اللہ (راہ خدا میں جنگ) کے سلسلہ میں صلح نہیں کرسکتا مگر اس صورت میں کہ مساوات اور آپس میں پوری طرح انصاف ہو (جب کسی معمولی مسلمان کے عہد و پیمان کو بھی اہمیت ہے کہ وہ سب مسلمانوں کا عہد و پیمان مانا جاتا ہے تو مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ صلح یا عہد و پیمان ایسی صورت سے کرے جس میں حقوق کی مساوات اور سراسر عدل و انصاف ہو۔ اگر اس میں کوتاہی کی ہے تو صرف اپنے حق میں نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے حق میں کوتاہی کی[1] (واللہ اعلم)

(۱۳) وان كل غازية غزت معنا يعقب بعضها بعضا[2].

(۱۳) اور یہ کہ مجاہدین (غازیوں) کی جو جماعت ہمارے ساتھ (ہمارے نظام کے ماتحت) غزوہ کرے گی اس کا غزوہ متوار ہوگا ایک ہی جماعت (فوج) مسلسل نہیں جائے گی بلکہ اگر ایک مرتبہ جا چکی ہے تو اب دوسری جماعت جائے گی۔ اس کے بعد اپنے نمبر پہ جا سکے گی۔

(۱۴) وان المؤمنين يبيئ بعضهم بعضا بما نال دماءهم في سبيل الله.

(۱۴) اور یہ کہ مسلمان ایک دوسرے کے برابر ہوگا اس (امتیاز) کی بنا پر جو پیش آیا ہوگا ان کے خون کو اللہ کی راہ میں۔ یعنی جانی قربانی معیار ہے فرق مراتب اسی معیار پر ہوگا جن کی قربانیاں مساوی ہیں ان کا درجہ بھی مساوی ہوگا۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ قبائل میں جو فرق مراتب پہلے[3] تھا اب وہ قابل تسلیم نہیں ہوگا جب تک قربانیاں بھی اس درجہ کی نہ ہوں

---

[1] اس کے باوجود افسر اعلیٰ کو مسترد کرنے کا حق نہیں ہے وہ مسترد اسی وقت کرسکتا ہے۔ جب ایسا عہد و پیمان ہو جس میں سراسر معصیت ہے۔ کسی حرام کو جائز یا حلال کو حرام قرار دیدیا گیا ہو۔ تفصیلات کتب فقہ میں ہیں۔ [2] ای یکون الغزوۃ بینہم نوبا فاذا خرجت طائفۃ ثم عادت لم تکلف ان تعبد ثانیۃ حتی یعقبہا اخری غیرہا (مجمع البحار تحت کلمۃ عقب) [3] چنانچہ پہلے قبائل بنی تمیم، بنی اسد، بنی عامر افضل مانے جاتے تھے اور ان کے مقابلہ میں قبائل جہینہ، مزینہ، اسلم اور غفار کا درجہ کم تھا۔

(باقی صفحہ آئندہ پر)

(۱۵) وان المؤمنین المتقین علی احسن ھدی واقومہ۔

(۱۵) اور یہ مومن متقی بہت بہتر طور و طریق اور نہایت مضبوط اصول پر قائم رہیں گے (اہل ایمان اور اہل تقویٰ کا فرض ہوگا کہ اُن کے اطوار بہتر اور ان کے اصول و اخلاق مضبوط ہوں)

(۱۶) وانہ لایجیر مشرک مالا لقریش ولا نفسا ولا یحول دونہ علی مؤمن۔

(۱۶) اور یہ کہ کوئی مشرک قریش کے کسی مال کی ذمہ داری نہیں لیگا نہ کسی قریشی کی جان کی ضمانت کریگا (پناہ دیگا)، نہ کسی قریشی کی حمایت میں کسی مسلمان کے آڑے آئے گا۔

(۱۷) وانہ من اعتبط مؤمنا قتلا عن بینۃ فانہ قود بہا الا ان یرضی ولی المقتول بالعقل وان المؤمنین علیہ کافۃ ولا یحل لھم الا قیام علیہ۔

(۱۷) جو شخص کسی بے قصور مسلمان کو قتل کردیگا جس کا بینہ (باقاعدہ شہادت) موجود ہو تو اس کے قصاص میں ماخوذ ہوگا (جان کے بدلہ جان دینا ہوگی) البتہ اگر مقتول کے وارث خون بہا پر راضی ہوجائیں تو خون بہا دینا ہوگا اور تمام مسلمانوں کو جماعتی حیثیت میں اس اصول کو نافذ کرنا ہوگا جب تک اس پر عمل نہ ہوجائے کسی اور کام میں مشغول ہوجانا مسلمانوں کے لئے درست نہ ہوگا۔

(۱۸) انہ لا یحل لمؤمن اقر بما فی ھذہ الصحیفۃ وآمن باللہ والیوم الآخر ان ینصر

(۱۸) اور یہ کہ جائز نہیں ہوگا کسی صاحب ایمان کے لئے جو اس دستاویز کے مضمون کا اقرار کرے اور جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے یہ کہ کسی فتنہ پرداز کی مدد کرے یا کسی فتنہ اٹھانے والے کو پناہ دے (اپنے یہاں ٹھیرائے) اور جو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مگر چونکہ یہ قبائل پہلے ہی اسلام سے مشرف ہوئے اور حضرات انصار و مہاجرین کے ساتھ خدمات انجام دیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ نے ان کی فضیلت بیان فرمائی ارشاد ہوا قریش والانصار وجھینہ ومزینہ واسلم وغفار واشجع میرے مددگار ہیں اور اللہ اور رسول ان کے مددگار ہیں۔ اللہ اور رسول کے علاوہ ان قبائل کا اور کوئی مددگار نہیں ہے۔ بخاری شریف باب ذکر اسلم وغفار ومزینہ وجھینہ واشجع ص۴۹۸

محدثا[1] او یؤویہ وانہ من نصرہ اواواہ علیہ لعنۃ اللہ وغضبہ یوم القیٰمۃ لایؤخذ منہ صرف ولاعدل۔	اور جوانکی مدد کرے گا اور اس کو پناہ دیگا (ٹھیرنے کا موقع دیگا) اس پر اللہ کی لعنت۔ خدا کا غضب۔ قیامت کے روز نہ اس کی توبہ قبول ہو نہ فدیہ (کفارہ[2])۔
(۱۹) وانکم مما اختلفتم فیہ من شیئٍ فان مَرَدَّہٗ الی اللہ والی محمد۔	(۱۹) اور یہ کہ جب کبھی اس عہدنامہ کی کسی بات میں اختلاف کرو تو مرجع اللہ ہوگا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) (اس کا فیصلہ ذاتِ اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ ہوگا جو اس عہد نامہ کے بانی اور معاہدہ کرنے والوں کے سرپرست ہیں۔ اور آپ سے ہی فیصلہ کی اپیل ہوگی۔
(۲۰) وان الیھود ینفقون مع المؤمنین ما داموا محاربین۔	(۲۰) جب تک کسی جنگ کا سلسلہ رہے تو مصارفِ جنگ مسلمانوں کے ساتھ یہود کو بھی برداشت کرنے ہوں گے۔
(۲۱) وان یھود بنی عوف امۃ مع المؤمنین للیھود دینھم وللمسلمین دینھم۔ موالیھم و انفسھم الا من ظلم واثم فانہ لا یوتغ الا نفسہ و	(۲۱) اور یہ کہ بنی عوف کے یہودی اور مسلمان ایک امت ہوں گے یہود کے لئے ان کا دین ہوگا اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین (اپنے اپنے مذہبوں میں آزاد رہتے ہوئے تیسرے کے مقابلہ میں ایک متحدہ طاقت ہونگے) اور جو ان کے موالی ہیں (آزاد کردہ غلام یا ان کے حلیف) اور وہ خود، ان سب کے لئے یہی ہے کہ وہ اپنے دین پر، مگر وہ شخص جو ظلم کرے، کیونکہ ایسا شخص خود اپنے آپ کو اور اپنے اہل بیت (متعلقین) ہی کو برباد کرے گا

[1] محدِثا۔ دال پر زیر جنایت کرنے والا (مجمع البحار) یہ کوئی فتنہ اٹھانے والا، سازش کرنے والا بھی ہوسکتا ہے اور بدعتی یعنی کسی بدعت کا ایجاد کرنے والا بھی ہوسکتا ہے۔ اور اگر دال پر زبر ہو۔ تو مراد فتنہ یا بدعت ہوگی اور یہ مطلب ہوگا کہ کسی صاحب ایمان کے لئے جائز نہیں ہوگا کہ کسی فتنہ کو پسند کرے اور اس کو بڑھنے اور پھیلنے کا موقع دے۔ وایواءہ الرضا عنہ وصبرہ علیہ واقرار فاعلہ (مجمع البحار)۔

[2] یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ اس کی نفل عبادت قبول ہو نہ فرض۔ (مجمع البحار)

اھل بیتہ ۔ (اس بربادی کی ذمہ داری خود اس پر ہوگی)۔

(۲۲) وان لیھود بنی النجار (۲۲) یہود بنی نجار کے لئے بھی وہی شرطیں اور وہی حقوق ہیں
مثل ما لیھود بنی عوف جو یہود بنی عوف کے بیان کئے گئے۔

(۲۳) اس کے بعد یہود بنی الحارث، یہود بنی ساعدہ، یہود بنی جشم، یہود بنی الاوس۔
یہود بنی ثعلبہ کا نام لیا گیا ہے اور ہر ایک کے متعلق یہ الفاظ دہرائے گئے ہیں۔ مثل
ما لیھود بنی عوف۔ ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہود بنی عوف کے حقوق ہیں۔

آخر میں یہ ہے:

الا من ظلم او اثم مگر وہ شخص جو ظلم کرے یا کوئی جرم کرے کیونکہ ایسا شخص خود اپنے
فانہ لا یوتغ الا آپ کو اور اپنے اہل بیت (متعلقین) کو برباد کردیگا، اس بربادی
نفسہ واھل بیتہ۔ کی ذمہ داری خود اس پر ہوگی۔

(۲۴) پھر یہ چند تشریحی اور توضیحی دفعات ہیں:

(الف) وان جفنۃ بطن من ثعلبۃ (الف) یہ کہ جفنہ ثعلبہ کا بطن (ضمنی قبیلہ) ہے۔
(ب) وان لبنی الشطیبۃ (ب) یہ کہ بنی شطنہ کے وہی حقوق ہیں جو یہود بنی عوف کے (تسلیم
مثل ما لیھود بنی عوف و کئے گئے) اور یہ کہ ہر نیکی اور بھلائی نصب العین اور اصول کا
ان البر دون الاثم۔ ہوگا) گناہ اور جرم نہیں۔
(ج) وان موالی ثعلبہ (ج) قبیلہ ثعلبہ کے موالی (حلیف آزاد کردہ غلام) کی
کانفسھم۔ حیثیت خود بنی ثعلبہ جیسی ہوگی۔
(د) وان بطانۃ[1] (د) یہود کے اہل وعیال ان کے خواص اور ماتحت خاندانوں اور
یھود کانفسھم۔ افراد کی حیثیت خود یہود جیسی ہوگی (ان کے وہی حقوق ہونگے
جو یہود کے ہیں)۔

---

[1] بطانۃ الرجل اھلہ وخاصتہ وصاحبہ (قاموس)۔

(۲۴) وانہ لا یخرج منھم احد الا باذن محمد۔

(۲۴) اور یہ کہ جو جس کے ماتحت یا جس کے ساتھ ہے وہ اس سے علیحدہ نہیں ہوگا مگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اجازت سے

(۲۵) وانہ لا ینحجز علے ثار جرح۔

(۲۵) اور یہ کہ نہیں بندش لگائے گا کوئی زخم کے قصاص (زخم کے بدلے میں زخم) پر[1]

(۲۶) و انہ من فتک فبنفسہ واھل بیتہ الا من ظلم وان اللہ علی ابر ھذا۔

(۲۶) جو کسی کو بے خبری میں دھوکے سے مار دے اس کی ذمہ داری خود اس پر ہے اور اس کے اہل بیت پر مگر وہ شخص جس نے ظلم کیا ہو اور ہم اللہ کو حاضر ناظر جان کر عہد کرتے ہیں کہ خوبی اور پوری ذمہ داری کے ساتھ ان شرائط پر عمل کریں گے۔

(۲۷) وان علی الیھود نفقتھم وعلی المسلمین نفقتھم۔

(۲۷) اور یہ کہ یہود اپنے مصارف کے ذمہ دار ہوں گے اور مسلمان اپنے مصارف کے (جو اس عہدنامے کی شرطوں کو پورا کرتے ہیں، کرنے پڑیں گے)۔

(۲۸) وان بینھم النصر علی من حارب اھل ھذہ الصحیفۃ۔

(۲۸) اور یہ کہ جو فریق اس معاہدہ میں شریک ہیں وہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے اُن کے مقابلہ میں جو اِن معاہدہ کرنے والوں سے جنگ کریں گے۔

(۲۹) وان بینھم النصح والنصیحۃ والبر دون الاثم۔

(۲۹) اور یہ کہ اس معاہدہ کے تمام فریق آپس میں ایک دوسرے کی خیرخواہی کریں گے ایک دوسرے کو اچھی باتوں کی ہدایت کریں گے۔ نیک کردار رہیں گے جرم اور گناہ نہیں کریں گے۔

وانہ لا یاثم امرءٌ بحلیفہٖ وان النصر للمظلوم۔

اور یہ کہ کوئی شخص اپنے حلیف کے ساتھ مجرمانہ فعل نہیں کریگا اور یہ کہ مظلوم مستحق مدد ہوگا۔

(۳۰) وان الیھود ینفقون مع المؤمنین ما داموا محاربین

(۳۰) اور یہ کہ جب تک کوئی جنگ ہوگی تو مسلمانوں کے ساتھ یہود بھی خرچہ جنگ برداشت کریں گے۔

---

[1] جب کہ توریت کا حکم تھا کہ زخم کے بدلہ میں اسی جیسا زخم۔ اس اصول کو ختم نہیں کیا جائے گا۔

(۳۱) وان یثرب حرام جوفها لاهل هذه الصحیفة۔

(۳۱) اور یہ کہ وہ پورا علاقہ جو حدود یثرب میں ہے ان سب کے لئے واجب الاحترام (محفوظ علاقہ) ہوگا جو اس عہد نامہ میں شریک ہیں۔

(۳۲) وان الجار کالنفس غیر مضار ولا اثم۔

(۳۲) اور یہ کہ پڑوسی کو خود اپنی جان کی برابر سمجھا جائیگا، نہ اس کو نقصان پہنچایا جا ئیگا نہ اس کے ساتھ کوئی مجرمانہ فعل کیا جائے گا۔

(۳۳) وانه لا تجار حرمة الا باذن اهلها۔

(۳۳) اور یہ کہ نہیں حفاظت اور پناہ میں لیا جائے گا کسی خاتون کو مگر اس کے اہل (ذمہ دار) کی اجازت سے[۱]۔

(۳۴) وانه ما کان بین اهل هذه الصحیفة من حدث او اشتجار یخاف فساده فان مرده الی الله والی محمد رسول الله صلی الله علیه وسلم وان الله علی اتقی ما فی هذه الصحیفة وابره۔

(۳۴) اور یہ کہ اس عہد نامہ کے فریقوں کے درمیان جو کوئی نئی بات پیش آئے یا کوئی نزاع ہو جس سے فساد کا خطرہ ہو تو اس میں اللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا جائے گا اور یہ کہ ہم سب اللہ کو حاضر و ناظر جان کر عہد کرتے ہیں کہ جو کچھ اس عہد نامہ میں ہے اس کی پوری پابندی کریں اور اس کو نیکی اور بھلائی کے ساتھ پورا کریں گے۔

(۳۵) وانه لا تجار قریش ولا من نصرها۔

(۳۵) اور یہ کہ نہ قریش کو پناہ دی جائے گی نہ اس کو جو قریش کی مدد کرے۔

(۳۶) وان بینهم النصر علی من دهم[۲] یثرب۔

(۳۶) اور یہ کہ اس عہد نامہ کے تمام شریک ایک دوسرے کی مدد کریں گے اس کے مقابلہ میں جو یثرب پر چڑھ آئے (حملہ کرے)۔

(۳۷) وانه اذا دعوا الی صلح یصالحونه ویلبسونه فانهم یصالحونه ویلبسونه وانهم اذا دعوا الی مثل ذلك فانه لهم

(۳۷) اور یہ کہ اس عہد نامہ کے جملہ فریق جب (مسلمانوں کی طرف سے) اُن کو کسی کے ساتھ صلح کرنے کی دعوت دی جائے گی وہ صلح کریں گے اور صلح پر عمل کریں گے۔ اور یہ کہ جب مسلمانوں کو اسی جیسی صلح کی دعوت

---

[۱] مکہ کے مشرکین قریش اس معاہدہ میں داخل نہ تھے۔ لہٰذا جب صلح حدیبیہ کے بعد ان کی عورتیں مسلمان ہو کر مدینہ منورہ پہنچیں تو ان کو پناہ میں لے لیا گیا۔ [۲] دهمك غشیك (القاموس)

علی المومنین الا من حارب فی الدین ۔	دی جائے تو وہ بھی صلح کریں گے مسلمانوں پر اس کا حق ہوگا مگر یہ کہ کسی سے دین کے بارے میں جنگ ہو رہی ہو (مذہبی جنگ ہو)۔
(۳۸) علی کل اناس حصتھم من جانبھم الذی قبلھم۔	(۳۸) اور یہ کہ ہر فریق پر اس حصہ کی ذمہ داری ہے جو اس کی جانب میں ہے۔
(۳۹) وان یہود الاوس موالیھم و انفسھم علی مثل ما لاھل ھذہ الصحیفۃ مع البر المحض من اھل ھذہ الصحیفۃ وان البر دون الاثم لا یکسب کاسب الا علی نفسہ وان اللہ علی اصدق ما فی ھذہ الصحیفۃ وابرہ۔	(۳۹) اور یہ کہ قبیلہ اوس کے یہود ان کے موالی (حلیف یا آزاد کردہ غلام) ان کو وہی حقوق ہوں گے جو اس عہد نامہ کے تمام فریقوں کو ہوں گے، پوری نیک کرداری اور مخلصانہ بھلائی کے ساتھ نیک کرداری ہی ہمارا اصل اصول ہوگا۔ مجرمانہ فعل (سے کوئی تعلق نہیں ہوگا)، ہر ایک عمل کرنے والا اپنے عمل کا ذمہ دار ہوگا (اس کے فعل کو کسی دوسرے پر نہیں ڈالا جا سکے گا) اور اللہ تعالیٰ کو ہم حاضر و ناظر جان کر یہ عہد کرتے ہیں کہ جو کچھ اس دستاویز میں لکھا گیا ہے اس پر پوری سچائی سے اور نیک کرداری ساتھ عمل کریں گے۔
(۴۰) وانہ لا یحول ھذا الکتاب دون ظالم واثم وانہ من خرج آمن ومن قعد آمن بالمدینۃ الا من ظلم او اثم۔ وان اللہ جار لمن بر واتقی ومحمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔	(۴۰) اور یہ کہ یہ تحریر کسی ظالم اور مجرم کیلئے آڑ نہیں بنے گی ۔ جو مدینہ سے باہر ہو وہ بھی امن میں اور جو اندر رہے وہ بھی امن میں رہے گا۔ مگر یہ کہ وہ ظلم کرے یا مجرمانہ حرکت کرے، اللہ تعالیٰ اس کا محافظ ہے اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے محافظ ہیں جو نیک کردار رہ کر پوری پابندی کے ساتھ اس پر عمل کرے۔“

تحویلِ قبلہ۔ انقلابِ عظیم

سب سے افضل اُمّت۔ سب سے افضل قبلہ

جھنڈا قوم بناتی ہے۔ کسی قوم کی قومیت جھنڈے سے نہیں بنتی۔ البتہ جھنڈا نشانِ قومیت بن جاتا ہے۔ جھنڈے کے رنگ یا وضع قطع کا کوئی فطری تعلق قوم کی فطرت سے نہیں ہوتا۔ البتہ کچھ روایات کا لحاظ وضع اور رنگ کے انتخاب کے وقت رکھا جاتا ہے۔ پھر وہ جھنڈا خود پیکرِ روایات اور نشانِ عظمت بن جاتا ہے۔ اس کی سربلندی یا سرنگونی قسمت قوم کا فیصلہ سمجھی جانے لگتی ہے۔

تقریباً یہی شان عبادت اور عبادت کرنے کے رُخ "قبلہ" کی ہے۔ عبادت یعنی بندگی، نیازمندی، عاجزی اور فروتنی کا تعلق، اندرونی احساس اور قلب وضمیر سے ہے۔ نہ پورب[1] سے ہے نہ پچھم سے۔ نیکی[2] اور بھلائی شرافت، حسنِ اخلاق اور خوبی کردار کا نام ہے۔ نیکی یہ نہیں ہے کہ مشرق کی طرف مونھ کرلیں یا مغرب کی طرف مگر ہر ایک عبادت گذار (حتیٰ کہ وہ بھی جو مانتا ہے

---

[1] ارشاد خداوندی ہے لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ الآیۃ۔ "اللہ ہی کا ہے پورب اور اللہ ہی کا پچھم، جس طرف بھی رُخ کرلو، وہاں اللہ ہے"۔ آیت ۱۱۴۔ سورہ ۲ بقرہ

[2] لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا (الآیۃ) "یعنی نیکی (اور بھلائی) یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے پھیرلو۔ پورب کی طرف یا پچھم کی طرف ہاں! نیکی اور بھلائی اور حسنِ کردار اسکا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب (وحی الٰہی) پر اور نبیوں پر (پھر اس ایمان کے تقاضے کو پورا کیا کہ جب کہ مال کی ضرورت بھی کہ وہ تندرست تھا، دنیاوی زندگی کا میدان اس کے سامنے تھا، اُس نے اپنی ضرورت کو پس پشت ڈال کر) دیا مال رشتہ داروں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو اور مسافر کو اور سائلین کو اور گردنوں کے (چھڑانے) میں۔ اور برپا کیا نماز کو (پوری شان کے ساتھ نماز با جماعت ادا کی) زکوٰۃ ادا کی اور وہ جو پورا کریں عہد جب عہد کرلیں اور جو صبر کرنے والے ہیں سختی اور شدت میں اور خوف وہراس کے وقت (آیت ۱۷۷ سورہ ۲ بقرہ)"

کہ جس کی وہ عبادت کر رہا ہے وہ کسی ایک رُخ یا کسی ایک جگہ میں نہیں ہے، وہ لامکان ولازمان ہے۔ ہر جگہ ہے اور ہر طرف ہے)، عبادت کے لئے ایک رُخ مقرر کرنا ضروری سمجھتا ہے کیونکہ جس طرح عمل کی پابندی کے لئے وقت کا مقرر کرنا ضروری ہے ایسے ہی دل کے جماؤ اور توجہ کے ٹھیراؤ کے لئے بھی رُخ کا مقرر کرنا ضروری ہے اور افرادِ قوم میں یکجہتی بھی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب سب کی عبادت ایک ہی طرح ایک ہی رُخ پر ہو۔[1]

مکہ کے مشرک اگرچہ سرِ نیاز بتوں کے سامنے خم کرتے تھے، مگر اُن کے تحت الشعور یہ تھا کہ اُن کا قبلہ "کعبہ" ہے جس کی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام نے رکھی تھی، جس کی تجدید حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے فرزند رشید حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کی، جو ہمارے مذہبی پیشوا بھی ہیں اور خاندانی مورثِ اعلیٰ بھی۔

اہلِ شرک اور بُت پرستوں کے بالمقابل اہلِ کتاب (یہودی اور نصرانی) تھے جن کا قبلہ بیت المقدس یا بیت اللحم تھا۔ سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم عبادت کے لئے اُٹھے تو اگرچہ کعبہ کو آپ نے نظر انداز نہیں فرمایا، مگر آپ نے قبلہ اس کو بنایا جو تقریباً ڈھائی ہزار سال سے انبیاء علیہم السلام کا قبلہ چلا آ رہا تھا، حرم کعبہ میں آپ نماز پڑھتے تو کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر رُخ شمال کی طرف کرتے تھے یعنی وہ قبلہ بھی آپ کے سامنے رہتا تھا جو آلِ اسماعیل علیہ السلام کا قبلہ تھا اور وہ قبلہ بھی سامنے ہوتا جو بنی اسرائیل کا قبلہ تھا لیکن جب آپ مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو یہاں یہ اجتماع قبلتین ممکن نہیں تھا، کیونکہ مکہ یہاں سے جنوب میں تھا اور بیت المقدس شمال میں۔ لامحالہ آپ نے انبیاء علیہم السلام کے ڈھائی ہزار سالہ قبلہ ہی کو اختیار فرمایا۔ چنانچہ مسجد کی تعمیر کی تو اسی دیوار کو دیوارِ قبلہ قرار دیا جو بیت المقدس کی جانب تھی (شمالی دیوار)۔

لیکن سوال یہ تھا کہ اس دین کے لئے جو حق و باطل کے لئے فرقانِ عظیم ہے۔ خالص اور نکھری ہوئی توحید جس کی بنیاد ہے، جس کی تعلیم میں یہ قوت ہے کہ کبھی اس کے منسوخ کرنے کی

---

[1] تفسیر فخر الدین رازی رحمۃ اللہ عرف تفسیر کبیر

ضرورت پیش نہیں آسکتی جو ابدالآباد تک باقی رہنے والا کامل و مکمل دین ہے اس کا قبلہ بھی بیت المقدس رہے جو اہل شرک کا قبلہ تو بیشک نہیں ہے، مگر جو اس سے وابستہ ہیں وہ خود اتحاد اور یک جہتی سے محروم دو ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ (یہودی اور عیسائی) ہر ایک ٹکڑا ہی دوسرے کی تردید کررہی ہے اور جہاں تک اخلاق و کردار کا تعلق ہے تو اخلاق و کردار میں اہل شرک کے ہمدوش ہیں، بلکہ کچھ آگے بڑھے ہوئے ہیں کہ قتل انبیاءؑ کے دھبے بھی اُن کے دامن پر نمایاں ہیں۔

اور اگر قبلہ بدلا جاتا ہے تو قبلہ کا مسئلہ صرف ایک رُخ کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک مرکز کا مسئلہ بھی ہے۔ حضرت یعقوب (اسرائیل) علیہ السّلام کے زمانہ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے دور تک حق پرستی، توحید، دعوت الی اللہ، ہدایت وارشاد یعنی مذہبی اور رُوحانی رہنمائی کا فریضہ بنواسرائیل کے سُپرد رہا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بیشمار انعامات اُن پر ہوتے رہے۔ بنواسرائیل کا دینی مرکز بیت المقدس تھا۔ اب سوال یہ بھی تھا کہ دعوت وارشاد کی مرکزیت، جس کو اصطلاحًا امامت، اور خلافتِ الٰہیہ کہا جاتا ہے کیا اسی قوم کے سُپرد رہے گی یا اس میں تبدیلی ہوگی۔ اگر تبدیلی ہوگی تو کیوں۔ اور تبدیلی کے بعد جس قوم کو یہ امامت سپرد ہوگی تو کیا اُس کا قبلہ بھی یہی رہے گا یا اس کو بھی بدلا جائے گا۔ اور اگر بدلا جائے گا تو کیوں؟

ان سوالات کے جوابات عقل و قیاس یا جذبات کی منطق سے نہیں دیئے جا سکتے تھے کیونکہ کسی فرد یا قوم کو امامت نوعِ انسان کا درجہ خدا ہی کی طرف سے سُپرد ہوتا ہے اور یہ کہ خدا پرست پرستش کے وقت اپنا رُخ کس طرف کریں، یہ بھی وہی بتا سکتا ہے جس کی خوشنودی کے لئے پرستش کی جاتی ہے لیکن ایک سربراہ کو انقلاب کے موقع پر جب مختلف سوالات (اور خصوصًا جب ایسے سوالات درپیش ہوں جن کا تعلق خود انقلاب اور مقصدِ انقلاب سے ہو) جو تردد اور تشویش ہوسکتی ہے اس سے کہیں زیادہ تردد اس ہادیٔ اعظم کو درپیش تھا جو اس لئے دنیا میں آیا تھا کہ طالبانِ حق کو ہدایت وارشاد کی آخری منزل طے کرائے اور اُن کے لئے ایسا راستہ معیّن کردے کہ زمانہ کی کوئی بھی گردش اس میں کجی یا ناہمواری پیدا نہ کرسکے۔ اسی لئے وہ بار بار اس سمت کی طرف نظر اٹھاتا

جس سمت سے عقدہ کشائی کی توقع تھی ۔ ہادیٔ برحق کے تردّد کا عکس اُن پر بھی پڑ رہا تھا جو اس کے ساتھ اس لئے وابستہ ہوئے تھے کہ ذہنی تشویش و تردّد کو اطمینان سے بدلیں اور وہ نور حاصل کریں جو نہ صرف دنیا کی تاریکیوں میں بلکہ ظلمات محشر میں بھی اُن کے لئے شمع راہ ہو۔

اشارے

چند سال پہلے محمد رسول اللہ علیہ وسلم کو وہ شرف اعظم حاصل ہو چکا تھا جو نہ صرف نوع انسان بلکہ حق یہ ہے کہ پوری کائنات میں نہ آج تک کسی کو میسّر آیا تھا نہ آئندہ آنے والا تھا ۔ یعنی آپ شب معراج میں اس بلند ترین مقام تک پہنچ چکے تھے جہاں تک نہ کسی نبی مرسل کی رسائی ہوئی تھی نہ کسی مَلَکِ مُقرّب کی ۔ جبرئیل امین علیہ السلام اس سے بہت نیچے درماندہ رہ کر یہ معذرت کر چکے تھے :

اگر یک سر موئے بالا پرم　　　فروغ تجلّی بسوزد پرم

اس عروج و سیر میں آپ نے بیت معمور ملاحظہ فرمایا تھا جس کے گرد ہر روز ستّر ہزار فرشتے مصروف طواف ہوتے ہیں[۲] ۔ وہیں بانی ملّت حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تھی کہ آپ بیت معمور سے تکیہ لگائے بیٹھے ہیں[۳] اسی سیاحت قدسی میں پانچ نمازیں فرض ہوئیں ۔ پھر عرش معلیٰ کی اسی سیاحت سے واپسی میں یہ ہوا تھا کہ جب بیت المقدس میں نزول اجلال ہوا تو تمام انبیاء اور مرسلین صف آراستہ ہوئے اور امامت کے لئے اسی سیدالثقلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آگے بڑھایا گیا[۴] ۔

پنج وقتہ نمازوں کا قبلہ یہ بیت المقدس ہوا جہاں مسجد اقصیٰ ہے جو ایک گذرگاہ ہے ۔ عرش بریں

---

[۱] صحابہ کرام کے تردّد اور انتظار و اشتیاق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تبدیلی قبلہ کی خبر جس کو پہنچی اور جس حالت میں پہونچی فوراً عمل شروع کر دیا ۔ جو صحابہ نماز پڑھ رہے تھے انھوں نے نماز میں خبر سُنی تو فوراً نماز ہی میں اپنا رُخ بلکہ امام سمیت پوری جماعت کا رُخ شمال سے جنوب کو یعنی بیت المقدس کی جانب سے قبلہ کی سمت کو کر لیا ۔ (بخاری شریف وغیرہ) [۲] جن کا دوبارہ کبھی نمبر نہیں آتا ۔ (بخاری و مسلم حدیث معراج [۳] مسلم شریف [۴] البدایہ والنہایہ ص ۱۱۳ ج ۳

پر جانے والے کا، یا وہ کعبہ ہو جو نقطہ محاذات ہے۔ اس[1] بیت معمور کا جس کا طواف ملائک کے جھمگٹ ہر وقت کرتے رہتے ہیں جو تکیہ گاہ ہے ابراہیم خلیل اللہ کا (علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام)۔

اس طرح کے مشاہدات اشارہ کر رہے تھے کہ امام الانبیاء اور اس کی امت خیر الامم کا قبلہ خانۂ کعبہ ہونا چاہیئے۔ مگر جہاں نص صریح اور قطعی فیصلہ کی ضرورت ہو وہاں اشاروں کو کافی نہیں سمجھا جا سکتا۔ البتہ یہ اشارے قطعی فیصلہ اور امر واضح کی توقع ضرور دلا سکتے تھے اور یہ توقع اشتیاق اور یہ اشتیاق اضطراب بن سکتا تھا اگر انتظار طویل ہوتا۔

یہی اشتیاق و انتظار تھا جس کی وجہ سے آپ بار بار اس سمت کو نظر اٹھاتے تھے، جہاں سے مراد پوری ہونے کی توقع تھی۔ بالآخر انتظار ختم ہوا جب ہجرت سے سوا سال بعد فرمانِ خداوندی نازل ہوا:

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ (البقرۃ)

"ہم دیکھ رہے ہیں کہ (حکم الٰہی کے شوق و طلب میں) تمہارا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اٹھ رہا ہے تو یقین کرو ہم عنقریب تمہارا رُخ ایک ایسے قبلہ کی طرف پھیر دینے والے ہیں جو تم چاہتے ہو اور اب (کہ اس معاملہ کے ظہور کا وقت آگیا ہے) تو چاہیئے کہ تم اپنا رُخ مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لو۔ اور جہاں کہیں بھی تم ہو (نماز کے وقت) اسی طرف رُخ پھیر لو۔" (آیت ۱۴۴)

وجوہات رب المشرقین والمغربین، خالق السمٰوات والارض، رب العرش الکریم کے کسی حکم کے متعلق وجہ دریافت کرنا بے ادبی ہے لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ (الانبیاء) ("وہ جو کچھ کرتا ہے اُس پر اس سے

---

[1] طبری و مسند اسحاق۔ فتح الباری ص ۲۳۵ ج ۱

بازپرس نہیں کی جاسکتی") اور جبکہ مشرق ومغرب اسی کا ہے اور ہر جگہ اور ہر سمت میں اس کا جلوہ یکساں ہے تو بلاشبہ اس کو اختیار ہے کہ قبلہ کے لئے جو سمت چاہے مقرر کردے، چون وچرا کی گنجائش کہاں ہوسکتی ہے، لیکن یہ حکم جس کے پانچ کلمے ہیں فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ایک انقلاب انگیز فیصلہ بھی ہے جو تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ کی پوری شان اپنے اندر رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ امامت عظمیٰ اور خلافت الٰہیہ کا منصب جس پر تقریباً ڈھائی ہزار سال سے بنو اسرائیل فائز تھے اب وہ اُن سے چھین کر بنو اسمٰعیل کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ وہی احکم الحاکمین جس کی بارگاہِ عظمت تک کسی بازپرس کی رسائی نہیں ہوسکتی اپنی شان یہ بیان فرماتا ہے کہ " ذرّہ برابر بھی ظلم اس سے صادر نہیں ہوتا"[۱]

ناممکن اور محال ہے کہ جو رب ہے پالنے پوسنے والا ہے وہ اپنے ہی پیدا کئے ہوئے بندوں پر کوئی ظلم کرے[۲]

بلاشبہ اُس کی شان یہ ہے کہ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ "(جس کو تو چاہے عزّت دے اور جس کو تو چاہے ذلّت دے") مگر اس مطلق العنان قدرت کے باوجود اُس نے قوموں اور اُمتوں کی ذلّت وعظمت کے لئے یہ ضابطے مقرر کردیئے ہیں:

(الف) جس قوم کو جو نعمت وہ عطا فرما دیتا ہے وہ اس میں انقلاب اور تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی نہ کرے (آیت ۵۲ سورہ ۸ الانفال) (اور اپنی عظمت آفرین خصوصیات کو ختم نہ کردے) عروج کے بعد زوال اس ضابطہ کے بموجب ہوتا ہے اور ترقی کے لئے ضابطہ یہ ہے:

(ب) جو حالت کسی قوم کی ہوتی ہے وہ قادر ذوالجلال اس میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی نہ کرے۔ (آیت ۱۰ سورہ ۱۳ رعد)

بہرحال ربّ ذوالجلال نے اپنی شان اور اپنے ہی منظور فرمودہ ضابطہ کا یہ احترام فرمایا کہ اس

---

[۱] آیت ۴۰ سورہ ۴ النساء [۲] وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ۝ آیت ۴۶ سورہ ۴۱ حٰمٓ سجدہ

انقلاب آفریں حکم کی وجوہات بیان فرمائیں اور اس تفصیل سے بیان فرمائیں کہ شاید کسی اور حکم کی وجوہات اس تفصیل سے بیان نہیں فرمائیں۔

آپ قرآن مجید کی تلاوت شروع کیجئے۔ سب سے پہلے آپ سورۂ فاتحہ پڑھیں گے جو نرالے رنگ کی حمد و ثنا ہے جس میں بندوں کو نہایت جامع دعا کی تلقین بھی ہے اور عبرت آموز سبق بھی، پھر وہ سورت شروع ہوتی ہے جو قرآن پاک کی سب سے بڑی سورت ہے۔

اس میں مقصد قرآن حکیم کی وضاحت کے بعد ان تین جماعتوں کا ذکر اور اُن کے کردار کا بیان ہے جو کسی بھی تحریک کے برپا ہونے پر ظہور پذیر ہو جاتی ہیں، یعنی (۱) ماننے والے (۲) کھلے ہوئے مخالف اور منکر (۳) وہ اغراض پرست بزدل جن کے دلوں میں انکار بھرا ہوتا ہے اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ وہ موافق اور فرماں بردار ہیں۔ اس کے بعد عبادت رب کی ہدایت ہے اور اس رسول کا ذکر ہے جو طریقہ عبادت کی تعلیم دے رہا ہے جس کی تصدیق کے لئے وہ معجزہ پیش کیا گیا ہے جس کا نام قرآن ہے۔ پھر نوع انسان کی حیثیت بیان فرمائی گئی ہے کہ اس کو زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت عطا ہوئی، اس کی شان ملائک سے بھی بلند ہے۔ اب خلافت اور امامت کا ذکر شروع ہوا تو بنو اسرائیل کو یاد دلایا گیا ہے کہ یہ نعمت عظمیٰ اُن کو عطا ہوئی تھی۔

یہ سورہ بقرہ کی آیت ۴۰ ہے یہاں سے سورہ بقرہ کا پانچواں رکوع شروع ہوتا ہے۔ اس آیت سے لیکر آیت ۱۲۳ تک جو پندرھویں رکوع کے شروع میں ہے، بنو اسرائیل ہی کا تذکرہ ہے[1]۔ ان آیات میں ایک طرف اللہ تعالیٰ کے انعامات شمار کرائے گئے ہیں جو بنو اسرائیل کو وقتاً فوقتاً عطا ہوتے رہے، دوسری جانب اس کا تذکرہ ہے کہ باری تعالیٰ کے ان انعامات کو بنو اسرائیل نے کس طرح (معاذ اللہ) پامال کیا۔ اور کس طرح ان کی دھجیاں بکھیریں۔ ان تمام جرائم کی تفصیل تو بہت طویل ہے یہاں صرف ان جرائم کے عنوان پیش کئے جا رہے ہیں جو اپنے اندر حناص

---

[1] یعنی تراسی آیتوں میں جو دس رکوع میں پھیلی ہوئی ہیں۔

اہمیت رکھتے ہیں جو اِن تراسی آیتوں میں شمار کرائے گئے ہیں۔

(۱) اللہ سے جو عہد[1] کیا تھا۔ اس کو توڑ ڈالا۔ اللہ کی کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا (آیت ۱۰۰ و ۱۰۱)

(۲) حیلہ بازی اور ٹال مٹول۔ (آیت ۶۵، ۶۶)

(۳) قبولِ حق سے گریز اور اُس پر فخر۔ (آیت ۸۷ تا ۹۳)

(۴) سنگ دلی۔ (آیت ۷۴ و ۸۸)

(۵) کج بحثی۔ (آیت ۶۸ و ۶۹)

(۶) نسلی حسد۔ (آیت ۸۹ و ۹۰ و ۱۰۹)

(۷) پوری ڈھٹائی سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پامال کرنا۔ (آیت ۸۴ و ۸۵)

(۸) داعیانِ حق سے عناد (آیت ۸۷) اُن کا مذاق بنانا (آیت ۱۰۴)

(۹) احکام خداوندی کو فروخت کرنا۔ (آیت ۴۱ و ۷۹)

(۱۰) عقائد میں تحریف[2]۔ (آیت ۸۰ و ۱۱۱)

(۱۱) احکامِ خداوندی میں تحریف[3]۔ (آیت ۷۵)

(۱۲) موت سے گریز، دنیاوی زندگی کی شدتِ حرص (آیت ۹۶)

(۱۳) گوسالہ پرستی۔ (آیت ۹۲)

(۱۴) خدا کے بیٹا ماننا[4]۔ (آیت ۱۱۶)

---

[1] طاعت الٰہی اور ایمان بانبیا کا عہد۔ توریت میں بھی اس عہد کا ذکر جا بجا ہے۔ مثلاً تو نے آج کے دن اقرار کیا ہے کہ خداوند امیرا خدا ہے۔ اور میں اس کی راہوں پر چلوں گا اور اس کے شرعون اور اس کے حقوق اور اس کے حکموں کی محافظت کروں گا اور اس کی آواز کا شنوا ہوں گا۔ فقرہ ۱۸ باب ۲۶ (استثناء)

[2] تم نے زندہ خدا رب الافواج کی باتوں کو بگاڑ ڈالا ہے۔ یرمیاہ۔ باب ۲۳ فقرہ ۳۶

[3] جو اپنی زبان استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ فرماتا ہے۔ یرمیاہ باب ۲۳ فقرہ ۳۱ و ۳۲

[4] یہود اور نصاریٰ دونوں ہی نے خدا کا بیٹا مان لیا تھا۔ یہود نے حضرت عزیر کو اور عیسائیوں نے حضرت عیسٰی علیہ السّلام کو۔

(۱۵) انبیاء علیہم السلام کو قتل کر ڈالنا۔ (آیت ۶۱ و ۹۱)

(۱۶) جادو اور کہانت۔ (آیت ۱۰۲ و ۱۰۳)

(۱۷) گروہ بندی اور گروہ بندی کے ساتھ جنت کی ٹھیکہ داری کہ یہود کہتے تھے کہ جب تک انسان یہودی گروہ بندی میں داخل نہ ہو نجات نہیں پا سکتا اور عیسائی کہتے تھے کہ جب تک عیسائی گروہ بندی میں داخل نہ ہو جنت میں نہیں جا سکتا۔ (آیت ۱۱۱)

قرآن پاک کی محوّلہ بالا آیتوں میں ان جرائم کو شمار کرایا گیا ہے۔ پھر ان کی مثالیں اور شواہد پیش کئے گئے ہیں۔

اب ایک قدرتی سوال ہے کہ جس قوم کا یہ کردار ہو چکا ہے کیا وہ اس کی اہل ہے کہ منصب امامت کی حامل رہے اور اس کے قبلہ کو نوع انسان اور دین کامل کا قبلہ قرار دیا جائے اور اس میں تبدیلی نہ کی جائے۔

کلام اللہ کی نظر میں تبدیلی صرف مناسب ہی نہیں ہے بلکہ اتنی ضروری ہے کہ اس پر اعتراض وہی کر سکتے ہیں جو فہم و بصیرت سے محروم اور مضحکہ انگیز نادانی (سفاہت) میں مبتلا ہوں۔ چنانچہ تبدیلی قبلہ کے حکم کی تمہید اس طرح فرمائی گئی ہے:

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا (البقرۃ، آیت ۱۴۲)

"جو لوگ عقل و بصیرت سے محروم ہیں وہ کہیں گے کس بات نے اُن (مسلمانوں) کو ہٹا دیا اُس قبلہ سے جس پر وہ اب تک تھے۔"

حضرت ابراهیمؑ سے ربِ ابراهیم کا وعدہ اور بنو اسرائیل کی محرومی کا سبب

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت اور اسکی عظمت بنو اسرائیل میں بھی مسلّم تھی اور بنو اسمٰعیل میں بھی۔ دونوں[1] اُن کو اپنا مورث اعلیٰ مانتے تھے قرآن حکیم یہود کے جرائم شمار کرانے کے بعد خاتمہ کلام پر پھر یاد دلاتا ہے کہ

---

[1] برہمن جس برہما کی تعظیم کرتے ہیں کیا عجب ہو وہ ابرہم یا ابراہام ہی ہو۔ عربوں نے اگر ابراہام کا ابراہیم کر لیا ہے تو اتنی تبدیلی کا حق تو بھارت کے آریوں کو بھی ہونا چاہئے کہ وہ ابرہم کا برہم اور برہما کر لیں جیسے آرین کو آریہ کر لیا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

"اے بنی اسرائیل یاد کرو میری وہ نعمتیں جو میں نے تم کو بخشیں اور میں نے تم کو دنیا جہان والوں پر فضیلت دی۔ (آیت ۱۲۲)

اس یاددہانی کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا اسم گرامی لیکر وہ بشارت یاد دلاتا ہے۔ جو حضرتِ حق جلّ مجدہٗ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو دی گئی تھی:

اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (آیت ۱۲۴ سورہ ۲ بقرہ)

"میں تمہیں انسانوں کے لئے امام بنانے والا ہوں۔"

پھر یاد دلاتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے یہ دریافت کیا کہ کیا یہ شرف میری اولاد کو بھی میسّر آئے گا۔ تو بتا دیا گیا تھا:

لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ (آیت ۱۲۴) "نہیں پہنچتا میرا اقرار نافرمانوں کو"

(یعنی جو ظلم ومعصیت کی راہ اختیار کریں اُن کا میرے اس عہد میں کوئی حصّہ نہیں ہے)

اس صغریٰ اور کبریٰ کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنو اسرائیل خود اس بشارت کے بموجب جو حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو دی گئی تھی اس کے مستحق ہیں کہ ان کو منصب امامت سے معزول کر دیا جائے کیونکہ وہ ظالم ہیں اور ظالم بھی ایسے کہ ان جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں جن کو گذشتہ ۸۳ آیتوں میں بیان کیا گیا ہے۔

اب مستحق شرف کون

قرآن حکیم یاد دلاتا ہے کہ ایک "بیت" خانہ وہ ہے جس کو شروع ہی سے "مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا (البقرہ)" بنایا گیا ہے "تمام انسانوں کا مرجع اور مرکز۔ امن وحرّیت کا مقام"

اس بیت سے متعلق ہدایت کر دی گئی تھی: واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی (آیت ۱۲۵) "ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بنالو۔"

اس بیت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا تھا اور حضرت ابراہیمؑ اور اُن کے فرزند ارجمند اسمٰعیل کو حکم دیا تھا:

طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾ (آیت ۱۲۵)

"تم دونوں میرے گھر کو پاک صاف رکھو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنیوالوں کے لئے۔"

پھر قرآن حمید یاد دلاتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل (علیہما السّلام) جب اس بیت کی بنیادیں (جو حضرت آدم علیہ السّلام کے زمانہ کی تھیں) بلند کر رہے تھے تو ان کے دلوں کی گہرائیوں سے ان کی زبانوں پر یہ دعا بھی جاری تھی:

"اے پروردگار ہمارا یہ عمل تیرے حضور قبول ہو۔ بلاشبہ تو ہی ہے جو دعاؤں کا سننے والا اور (مصالح عالم) کا جاننے والا ہے۔ اے پروردگار (اپنے فضل وکرم سے) ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم سچے مسلم (تیرے احکام کے فرمانبردار) بن جائیں اور ہماری نسل سے بھی ایسی اُمت پیدا کر جو تیرے حکموں کی فرمانبردار ہو۔ خداوندا ہمیں ہماری عبادت کے طور وطریق بتا دے اور ہماری کوتاہیوں سے درگذر فرما اور اپنی عنایت سے نواز، بلاشبہ تیری ذات ہے جس کے درگذر کرنے کی کوئی انتہا نہیں جو رحم کرنے والی ہے۔" (آیت ۱۲۷-۱۲۸)

اسی سلسلہ میں ان کی دعا یہ بھی تھی:

"اے ہمارے رب (اپنے فضل وکرم سے) ایسا کیجیو کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول پیدا ہو جو انہیں میں سے ہو۔ وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سُنائے، کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور اپنی پیغمبرانہ تربیت سے اُن کے دلوں کو مانجھ دے۔" (آیت ۱۲۹)

اس کے بعد کلام الٰہی تنبیہ کرتا ہے۔ ابراہیم علیہ السّلام کا مسلک تھا:

(۱) توحیدِ خالص، خدا واحد کی پرستش جس میں کسی طرح کے شرک کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ (آیت ۱۳۲)

(۲) سپردگی اور فرمانبرداری۔ یعنی اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دینا اور اس کے احکام کی پوری طرح تعمیل کرنا۔ (آیت ۱۳۱)

یہی توحید خالص اور تسلیم و رضا تھی جس نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو "امام النّاس" بنایا اور یہی نعمت بنو اسرائیل کو عطا ہوئی تھی، جس کی وجہ سے اُن کو عالمین (دنیا جہان) پر فضیلت بخشی گئی تھی۔

ابراہیم علیہ السّلام نے اپنے اسی مسلک کی وصیّت اپنی اولاد کو کی تھی، اُن کی اولاد اور اولاد کی اولاد میں جس قدر نبی آئے سب نے اسی مسلک کو مضبوطی سے اختیار کیا۔ یہ تمہاری دھڑے بندی جس کا نام یہودیت اور نصرانیت ہے ان سب انبیاء (علیہم السّلام) کا دامن اس سے پاک رہا۔ (آیت ۱۴۰) تمہاری اسی دھڑے بندی کا نتیجہ ہے کہ کسی نبی کو مانتے ہو۔ کسی کو نہیں مانا یہاں تک کہ قتل بھی کر دیا۔ اسی دھڑے بندی نے تم کو منصب امامت سے محروم کیا۔ درجۂ افضلیت سے نیچے گرا کر ذلّت و مسکنت کے گڑھے میں ڈالا غضب الٰہی کو تمہاری گردنوں کا طوق بنا دیا۔

آج سب سے افضل وہ ہو جو اس دھڑے بندی سے بالا و برتر ہو کر مسلک ابراہیمی کو مضبوطی سے سنبھالے۔ خدا، واحد کا پرستار حقیقی بن کر اپنے آپ کو خدا کے حوالہ کر دے۔

آج یہ شرف محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کی اُمت کو حاصل ہے لہٰذا وہی افضل النّاس اور اُمّتِ وسط ہے اور اسی افضلیت کی بنا پر یہ فیصلہ بھی کیا جا رہا ہے کہ اس کا قبلہ وہ ہوگا جس کی حرمت و عظمت عہدِ قدیم سے چلی آ رہی ہے جس کے معمار ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السّلام تھے۔

ترجمہ: پس منظر پر آپ نظر ڈال چکے۔ اب ان آیتوں کا مضمون مطالعہ فرمائیے جن میں تحویل قبلہ کا حکم ہے جس کا یہ پس منظر تھا۔

"جو لوگ عقل و بصیرت سے محروم ہیں وہ کہیں گے مسلمان جس قبلہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ کیا بات ہوئی کہ اُن کا رُخ اس سے پھر گیا (اے نبی) تم کہو پُورب ہو یا پچھم سب اللہ ہی کے لئے ہے (وہ کسی خاص مقام یا جہت میں محدود نہیں)

وہ جس کسی کو چاہتا ہے سیدھی راہ چلا دیتا ہے۔

اور (اے مسلمانو! جس طرح یہ بات ہوئی کہ بیت المقدس کی جگہ خانہ کعبہ قبلہ قرار پایا) اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے تمہیں امت وسط (نیک ترین، عادل اور معتدل) اُمت بنا دیا تاکہ تم گواہ رہو لوگوں پر (یعنی ایک بہتر نمونہ اور معیار کہ نوعِ انسان کی اُمت کو اسی سانچہ میں ڈھلنا اور اسی معیار پر اُترنا چاہیئے) اور رسول گواہ رہیں تم پر (وہ تمہارے لئے نمونہ اور معیار ہیں کہ اُمت اسلامیہ کو اس معیار پر پورا ہونا اور اس سانچہ میں ڈھلنا چاہیئے) اور ہم نے تمہیں اس قبلہ پر جس کی طرف تم رُخ کرکے نماز پڑھا کرتے تھے اسی لئے رکھا تھا کہ (وقت پر) معلوم ہوجائے کہ کون لوگ واقعی (اللہ کے) رسول کی پیروی[1] کرتے ہیں اور کون الٹے پاؤں پھر جاتے ہیں۔ یہ حکم بہت گراں (اور سخت آزمائش کا حکم ہے) مگر ان لوگوں کو نہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے راہ دکھادی ہے (اور وہ اطاعت رسول کے ذوقِ سلیم سے بہرہ ور ہیں) اللہ ایسا نہیں کہ ضائع ہوجانے دے تمہارے ایمان کو (کہ جو نمازیں بتقاضائے ایمان باللہ وایمان بالرسول، بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے پڑھیں ان کو بیکار قرار دے)۔

بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑا شفیق ہے (خصوصًا ان پر جنھوں نے اللہ اور رسول کے حکم کی تعمیل میں کوئی کام کیا۔ اور تبدیلی قبلہ کے متعلق اس کا یہ حکم بھی سراسر شفقت ہی ہے)۔

(اے پیغمبر) ہم دیکھ رہے ہیں کہ حکم الٰہی کے شوق وطلب میں تمہارا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اُٹھ اُٹھ جاتا ہے، تو یقین کرو ہم آپ کا رُخ اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس کو آپ چاہتے ہیں (اچھا) اب کیجئے اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف اور تم لوگ (آپ اور آپ کے ساتھی) جہاں بھی ہو، اپنے چہرے پھیر لیا کرو اسی طرف، اور جن لوگوں

---

[1] یعنی سپردگی اور حکم خدا کی تعمیل کے لئے سرتاسر اطاعت بجالانا جو ملّتِ ابراہیمؑ کی خصوصیت ہے کس میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے، کس میں نہیں پائی جاتی۔ (واللہ اعلم)

کو کتاب مل چکی ہے (یہود اور نصاریٰ) وہ یقیناً جانتے ہیں کہ یہ معاملہ اُن کے پروردگار کی طرف سے ایک امرِ حق ہے (کیونکہ اُن کے مقدس نوشتوں میں اُس کی پیشین گوئی موجود ہے۔ اور اللہ بے خبر نہیں ہے اُن کی کارروائیوں سے۔

اور اگر تم اہلِ کتاب کے سامنے (دنیا جہان کی) ساری دلیلیں بھی پیش کر دو جب بھی وہ تمہارے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں، نہ یہ ہو سکتا ہے کہ (علم و بصیرت کی پوری روشنی حاصل ہونے کے بعد تم اُن کے قبلہ کی پیروی کرنے لگو اور نہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے قبلہ کو ماننے والے ہیں (یہود کا قبلہ ہیکل بیت المقدس ہے۔ اور نصاریٰ کسی عمارت یا مکان کو نہیں بلکہ سمتِ مشرق کو قبلہ بنائے ہوئے ہیں (ابن جریر وغیرہ)

(اور دیکھو) اگر تم نے ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کی باوجودیکہ تمہیں اس بارے میں علم حاصل ہو چکا ہے (قبلہ کے متعلق وحی نازل ہو چکی ہے) تو تم بھی ان میں آ جاؤ گے جو (نافرمانی کر کے اپنے اوپر) ظلم کرتے ہیں اور جن لوگوں کو ہم کتاب دے چکے ہیں وہ آپؐ کو ایسا ہی پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو جانتے پہچانتے ہیں۔ لیکن اس پر ایک گروہ ان میں ایسا ہے جو جان بوجھ کر سچائی کو چھپاتا ہے (تحویلِ قبلہ کا یہ معاملہ) تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک امرِ حق ہے، پس ہرگز ایسا نہ ہو کہ تم شک کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔"

عہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ۱۲

نکاح السیّدہ فاطمۃ الزّہراء (رضی اللہ عنہا)

ارشادِ خداوندی ہے: وَاَنْکِحُوا الاَیَامٰی تا وَاسِعٌ عَلِیْمٌ

"نکاح کر دو اُن کا جو تم میں بے نکاح ہوں اور اپنے غلاموں اور باندیوں کا بھی جو اس قابل ہوں۔ اگر وہ مفلس ہوں گے تو خدا تعالیٰ اُن کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے، خوب جاننے والا۔"

(آیت ۳۲، سورہ ۲۴ النور)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خاص طور سے ہدایت فرمائی:

"علی! تین کام ہیں ان میں تاخیر ہرگز نہ کرنا۔ نماز جب اس کا وقت ہو جائے، جنازہ جب آجائے، بے نکاح جب اس کا کفو مل جائے[1]۔"

ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم پہلے "غنا" چاہتے ہیں، پھر نکاح مگر فرمان خداوندی نے نکاح کو مقدم رکھا اور غنا کا خود وعدہ فرمایا۔

اس کی عجیب و غریب مثال حضرت علی اور سیّدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہما کا نکاح ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے والد خواجہ ابوطالب کی وفات کے وقت اگرچہ جوان تھے، تقریباً بیس سال کی عمر تھی، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بچپن ہی سے اپنی تربیت میں لے لیا تھا اور خواجہ ابوطالب کو اُن کی طرف سے بے فکر کر دیا تھا۔

ابوطالب دولت مند نہیں تھے کہ اُن کے وارث اُن کے ترکہ سے دولت مند ہو جائے

---

[1] ترمذی شریف باب ما جاء فی الوقت الاوّل من الفضل ص۲۴

اس کے علاوہ ہجرت کرنے والے بزرگ وہ تھے کہ دولت مند[1] بھی فقیر ہوگئے تھے۔ لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھی جو تھا وہ توکل کا سرمایہ تھا اور بس۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عمر پندرہ سال کے قریب ہوئی تو رشتے آنے شروع ہوگئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی مشورہ دیا گیا کہ وہ بھی خواستگاری پیش کر دیں، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو احساس تھا کہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ یہی آپ نے مشورہ دینے والوں سے بھی کہا۔ مگر تہیدستی اور غربت کا عذر کسی نے بھی قابل التفات نہیں سمجھا۔ مشورہ دینے والوں نے یہی کہا کہ بارگاہِ رسالت میں اس کی ضرورت نہیں کہ تمہارے پاس دولت ہو۔ اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے مشفق مربی ہیں، تمہارا گوشہ خاطر معلوم ہو جائے گا تو وہ خود منظور فرمالیں گے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھ پر مشورہ دینے والوں نے اتنا اصرار کیا کہ بالآخر مجھے تعمیل کرنی پڑی۔ میں نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ خدمت مبارک میں حاضر ہوا، مگر ایک طرف میری شرم و حیا، دوسری طرف ذاتِ اقدس کا رعب و جلال۔ حاضر ہونے کو حاضر ہو گیا مگر زبان بند، طبیعت محجوب۔ خاموش بیٹھ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مربیانہ شفقت ہی کارفرما ہوئی۔ خود دریافت فرمایا: کیسے آئے ہو، کچھ کام ہے۔ اس کے جواب میں بھی میں خاموش ہی تھا، پھر خود ہی فرمایا: فاطمہ سے رشتہ کے لئے آئے ہو۔

میں نے عرض کیا: — "نعم"

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں بھی مواخات (بھائی چارہ) قائم فرمایا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ شرف حاصل ہوا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے ساتھ شامل کیا اور اخ قرار دیا۔ مدینہ منورہ میں جو مہاجرین اور انصار کرام میں مواخات رشتہ اخوت قائم فرمایا اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی نہیں آتا۔ گویا آپ کی وہی مواخات قائم رہی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ معظمہ میں قائم ہوگئی تھی۔ مقصد یہ کہ سلسلہ مواخات سے جو سہولت حضرات مہاجرین کو مل گئی تھی کہ رہنے اور کاشت وغیرہ کا انتظام ہوگیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ سہولت بھی نہیں ملی تھی۔

فرمایا: پھر کیا دوگے۔

میں نے عرض کیا۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔

ارشاد ہوا: میں نے تمہیں زرہ دی تھی وہ کیا ہوئی[1]

جیسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ سمجھ میں آیا' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زرہ بیچنے کی نیت کرلی۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ۴۸۰ درہم میں بیچ کر پوری رقم اپنے مربی و سرپرست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کردی۔ اس میں سے تقریباً ایک تہائی خوشبو پر خرچ ہوئی باقی دوسری ضرورتوں پر۔

آپ نے احباب کو طلب فرمایا۔ اور نکاح پڑھ دیا۔

مکان کا انتظام دلھن کو لانے کے لئے مکان کی ضرورت ہوئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مکان کرایہ پر لیا۔ دلھن کو وہیں اُتارا، پھر مستقل قیام کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا گیا کہ حضرت حارثہ بن نعمان کے مکان خالی پڑے ہیں۔ ان سے ایک مکان لے لو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خودداری نے مکان کی فرمائش کرنی مناسب نہیں سمجھی۔ کسی طرح حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوگیا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ سارے مکان آپ کے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو پسند فرمائیں وہ اس مکان کی خوش بختی ہے۔ میں اسی مکان کو جس کو آپ لیں گے زیادہ محبوب (اور مبارک سمجھوں گا) بمقابلہ اس کے جو آپ کے کام میں نہیں آئے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صدقت بارك الله (آپ نے سچ فرمایا اللہ آپ کو برکت دے) حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ دوسرے مکان میں منتقل ہوگئے اور حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کو اپنے مکان میں لاکر اُتارا۔

---

[1] مشورہ دینے۔ پھر حاضری اور گفتگو کی۔ یہ تمام تفصیل البدایۃ والنہایۃ سے ماخوذ ہے۔

۳۴۶/۳۷

اللہ تعالیٰ اپنے پاکباز مقربین کو کس طرح محفوظ رکھتا ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں اپنی دُلھن (فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو رخصت کرانے کا ارادہ کیا تو میں نے بنی قینقاع کے ایک سنہار کی شرکت سے ایک کام کرنا چاہا۔ خیال یہ تھا کہ نفع ہوگا تو ولیمہ کر سکوں گا۔

صورت یہ تھی کہ غزوۂ بدر کے مالِ غنیمت سے مجھے ایک ناقہ ملی تھی اور ایک اونٹنی مجھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عنایت فرمائی تھی جب میرے پاس دو اونٹ ہوگئے تو میں نے قبیلہ بنی قینقاع کے ایک سنہار سے یہ طے کیا کہ ہم دونوں ان اونٹوں پر جنگل سے اذخر لے آیا کریں گے اور اس کو بازار میں بیچا کریں گے۔ یہ معاملہ نفع ہی کا تھا اس میں نقصان کا سوال ہی نہیں تھا لیکن خدا کو منظور نہیں تھا کہ امام الاولیاء بے فکری سے ولیمہ کریں۔

یہ زمانہ وہ تھا کہ اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔ حضرت علی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جنھوں نے غزوۂ اُحد میں شہید ہو کر سید الشہداء کا خطاب (لسان نبوت سے حاصل کیا) وہ جیسے بہادر تھے ایسے ہی منچلے بھی تھے۔ قیام گاہ پر کچھ احباب اکٹھے تھے۔ شراب کا دَور چل رہا تھا۔ کسی نے کہا شراب کے ساتھ اونٹنیوں کے کوہان کے کباب بھی ہونے چاہئیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ دونوں اونٹنیاں سامنے کھڑی تھیں۔ حضرت حمزہ فوراً اُٹھے اور دونوں اونٹنیوں کے کوہان نکال لئے اور کوکھیں چاک کر کے گردے وغیرہ نکال لئے۔ احباب کی فرمائش پوری کر دی مگر ولیمہ کے متعلق سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا سارا منصوبہ ختم ہوگیا۔[1]

اسی لئے کہتے ہیں۔ "نزدیکاں را بیش بود حیرانی"۔

نکاح سے کچھ عرصہ بعد رخصتی

ایک روایت ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا نکاح پہلے ہو چکا تھا اور رخصتی نو ماہ[2] بعد ہوئی تھی۔ بخاری شریف کی

---

[1] بخاری شریف ص۲۸۰ [2] بخاری شریف ص۳۲۱ و ص۵۴۳ (وغیرہ)

[3] الاستیعاب والبدایۃ والنہایۃ ص۳۴۶ ج ۳

مذکورہ بالا روایت سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

جہیز تاجدار دو عالم شاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لخت جگر سیدہ نساء اہل الجنہ فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کو جو جہیز دیا اس کی فہرست[1] یہ ہے:

لحاف: ایک

چمڑے کا گدا جس میں کسی درخت کی چھال بھری ہوئی تھی: ایک

چکیاں: ۲، مشکیزہ: ایک، مٹی کے گھڑے: دو۔

صلوات اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

---

[1] الاصابہ والترغیب والترہیب، باب الترغیب فی الاذکار بعد الصلوات۔

مقاصد بعثت، فرائض نبوّت اور تکمیل

دعاء اور قبولیتِ دُعا

سیّدنا حضرت ابراہیم علیہ السّلام جب بیت اللہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے تو دل کی تمناؤں کے ترجمان دعائیہ کلمات یہ تھے جو زبانِ مبارک پر جاری تھے :

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ .

(سورہ ۲ البقرہ، آیت ۱۲۹)

" اے ہمارے رب ! اُٹھا اُن میں سے ایک رسول انھیں میں کا - پڑھے اُن پر تیری آیتیں اور سکھادے اُن کو کتاب اور پکی باتیں اور اُن کو سنوارے ۔" (شاہ عبدالقادر رح)

قبولیتِ دُعا

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۚ

(سورہ ۶۲ الجمعہ، آیت ۲)

" وہی ہے جس نے اُٹھایا اَن پڑھوں میں ایک رسول اُنہیں میں کا، پڑھتا اُن پاس اس کی آیتیں اور اُن کو سنوارتا اور سکھاتا کتاب اور عقلمندی ۔" (شاہ عبدالقادر رح)

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ○ (سورہ ۳ آل عمران آیت ۱۶۴)

" اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا اُن میں رسول انھیں
میں کا پڑھتا ہے اُن پر آیتیں اس کی اور سنوارتا ہے اُن کو اور
سکھاتا ہے اُن کو کتاب اور کام کی بات ۔" (شاہ عبدالقادرؒ)
"وے آموزد آن را ۔ کتاب وعلم ۔" (شاہ ولی اللہؒ)

دعا اور قبولیتِ دعا کے الفاظ پر دوبارہ نظر ڈال لیجئے ۔ حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ مبارکہ کے مقاصد یہ تھے :

تلاوت آیات اللہ ، تعلیم کتاب اللہ ، تعلیم الحکمہ ، تزکیہ ۔

تشریح

تلاوت آیات اللہ | یتلوا علیھم کا ترجمہ یہی کیا گیا ہے "پڑھتا ہے اُن پر آیتیں" لیکن پڑھنے ہی کے لئے لفظ قرأت بھی آتا ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ پڑھو تو قرأت کا لفظ ہی لایا گیا : اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ؀ مگر یہاں دعا میں بھی یتلوا ہے اور قبولیت دعا میں بھی "یتلو" ہی ارشاد ہوا ہے ۔ یعنی تلاوت کرتا ہے تو کیا قرأت اور تلاوت میں کچھ فرق ہے ۔ واقعہ یہی ہے ۔ تلاوت اور قرأت میں فرق ہے ۔ تلاوت کے معنے[1] صرف پڑھنے کے نہیں ہیں بلکہ تلاوت میں عمل بھی ملحوظ ہوتا ہے ۔ پھر عمل بھی ایسا کہ تسلسل کے ساتھ ہوتا رہے ۔ یعنی تلاوت میں صرف قول نہیں ہوتا بلکہ "قول مع سعی بہم" یعنی جس طرح آپ آیتیں سنائیں گے ساتھ ساتھ عمل

[1] یہ مقصد نہیں ہے کہ تلاوت قرأت اور پڑھنے کے معنیٰ میں نہیں آتا ۔ قرآن شریف میں بہت جگہ محض پڑھنے کے معنیٰ میں بھی آیا ہے : وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۔ نَتْلُوْا عَلَیْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰی وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ وغیرہ ۔ مگر جب ماخذ کا لحاظ کیا جائے تو صرف قرأت کے معنے نہیں ہوتے بلکہ کچھ اضافہ بھی ہوتا ہے تفصیل دوسرے حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیے [2] تلاوت کا ماخذ "تلو" ہے جس کے معنیٰ ہیں اتباع کرنا ' پیچھے چلنا ۔ اس طرح کہ آپ میں اور جس کے پیچھے چل رہے ہیں اس کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہ ہو ۔ تلاہ ، تبعہ (باقی صفحہ آئندہ پر)

اور عمل کے تسلسل کا بھی مشاہدہ کرادیں گے۔ یعنی جس طرح یہ ایک معجزہ ہے کہ "ایک اُمّی محض" جس نے عمرِ عزیز کے چالیس دور اس طرح گذارے کہ پڑھنے پڑھانے سے ناآشنا تھا اس کو "اقرأ" کا حکم ہو رہا ہے اور وہ قرأت کر رہا ہے اسی طرح اس معجزہ کے ساتھ یہ ایک عجیب وغریب مشاہدہ بھی ہے کہ پڑھ کر سنانے والا جو کچھ پڑھتا ہے وہ خود اس کی عملی تصویر بن جاتا ہے۔ یعنی پڑھنے کے ساتھ ایسا کردار بھی پیش کرتا ہے کہ آپ اس کے عمل سے بھی اس کو پڑھ سکتے ہیں۔

ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

ارشادِ ربّانی ہے:

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ، اِنَّ ۔ تا ۔ مَقَامًا مَّحْمُودًا (سورہ ۱۷، اسراء)

شاہ صاحبان کے الفاظ میں اُردو اور فارسی ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

" کھڑی رکھ نماز، سورج کے[1] ڈھلنے سے، رات کی اندھیری تک اور قرآن پڑھنا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) متابعة ليس بينهم ما ليس منها. وذلك يكون تارةً بالجسم وتارةً بالاقتداء في الحكم ومصدره تلوٌّ وتلو. وتارةً بالقراءة او تدبر المعنى ومصدره تلاوة والقمر اذا تلاها اراد به هٰهنا الاتباع على سبيل الاقتداء والمرتبة وذلك انه يقال ان القمر هو يقتبس النور من الشمس. وهو لها بمنزلة الخليفة (ثم قال) والتلاوة تختص باتباع كتب الله المنزلة تارةً بالقراءة وتارةً بالارتسام لما فيها من امر ونهي وترغيب وترهيب او ما يتوهم فيه ذلك وهو اخص من القراءة فكل تلاوة قراءة وليس كل قراءة تلاوة لا يقال تلوت رقعتك وانما يقال في القرآن في شيء اذا قرأته وجب عليك اتباعه. (المفردات في غريب القرآن)

[1] یعنی کواکب پرستوں کے طریقہ کے برخلاف کواکب پرست طلوعِ آفتاب کے وقت آفتاب کی پوجا کرتے ہیں تو خدا پرستوں کی عبادت طلوعِ آفتاب سے پہلے ہوتی ہے یا زوالِ آفتاب کے بعد۔ واللہ اعلم بالصواب

فجر کا ۔ بیشک قرآن پڑھنا فجر کا ہوتا ہے روبرو[1] ۔ اور کچھ رات جاگتا رہ
اس میں ۔ یہ بڑھتی ہے تجھ کو ۔ شاید کھڑا کرے تجھ کو تیرا رب تعریف
کے مقام[2] میں ۔" (شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ)

"برپا دار نماز را ۔ وقت زوال آفتاب ۔ تا ہجوم تاریکی شب ۔
ولازم گیر قرآن خواندن فجر را ۔ ہرآئینہ قرآن خواندن فجر را حاضر میشوند
فرشتگان ۔ و در بعض شب بیدار باش بقرآن شب خیزی زیادہ شد
برائے تو ۔ نزدیک است کہ ایستادہ کند ترا پروردگار تو بمقام پسندیدہ۔"
(شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ)

وحی الٰہی کے کلمات کو شمار کیجیے جو ان آیتوں میں ہیں، کُل تیئس[3] لفظ ہیں ۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور کردار پر نظر ڈالئے تو دفتر بے پایاں ہے ۔ پانچ فرض ۔ اُن کے اجزاء ترکیبی ۔ قیام ، رکوع ، سجدہ وغیرہ ۔ اُن کے اوقات ، پڑھنے کا انفرادی اور جماعتی طریقہ پھر ہر ایک کے ساتھ سنّتیں ، نفلیں ، اُن کے آداب اور طریقے جو احادیث کے سیکڑوں صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ سب تلاوت کے معنی واضح کر رہے ہیں ۔

فریضہ نماز عام مسلمانوں کے لئے

چار وقت کی وہ نمازیں جن کا سلسلہ آفتاب ڈھلنے کے وقت سے شروع ہو کر اندھیری رات گئے تک رہتا ہے اور پانچویں وقت کی نماز (صبح کی نماز) جس میں قرآن شریف پڑھنے کی خاص تاکید ہے ۔ کیونکہ یہ "مشہود" ہوتا ہے ۔ یعنی اس وقت دن اور رات کے کارگذار فرشتوں کا اجتماع ہوتا ہے ۔ یہ پانچ نمازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح تمام مسلمانوں پر فرض ہیں ۔

---

[1] یعنی دن اور رات کے کارپرداز فرشتے اس وقت جمع ہوتے ہیں وہ قرأت سنتے ہیں کیونکہ وہ خود قرأت نہیں کر سکتے اُن کا وظیفہ تسبیح و تحمید ہوتا ہے (واللہ اعلم) [2] وہ تعریف کا مقام ہے شفاعت کا جب کوئی نہ بول سکے گا آپ حضرت عرض کر کر خلق کو چھڑا دینگے تکلیف سے ۔ (موضح القرآن)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت یہ ہے کہ ــــــــ ان پانچ نمازوں کے علاوہ آپ کے لئے ایک اور حکم بھی ہے" فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ" جس کے معنے حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے یہ کئے ہیں :"کچھ رات جاگتا رہ اس میں (نماز پڑھنے میں) یہ بڑھتی ہے تجھ کو" یعنی یہ خاص طور پر آپ کے حق میں اضافہ ہے ۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ترجمہ کیا ہے :"شب خیزی زیادہ شد برائے تو" گویا نماز تہجد بھی آپ پر فرض ہے ۔ یہ فرض اُمّت[1] پر نہیں ۔ اُمّت کے حق میں صرف سنت ہے ، نہ پڑھیں تو کوئی گناہ نہیں ، مگر آپ کے حق میں فرض[2] ہے ۔

---

[1] امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے وتر کو واجب قرار دیا ہے ۔ یہ بھی تہجد ہی کا حصہ ہے ، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صرف وتروں کے متعلق ہے کہ ان اللہ امدکم بصلوٰۃ ھی خیر لکم من حمر النعم الوتر جعلہ اللہ بین صلوٰۃ العشاء الی ان یطلع الفجر . (ترمذی شریف و ابوداود) "اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک نماز کا ایک اور اضافہ کر دیا ہے ۔ یہ نماز ایسی ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی دولت (حمر النعم) سے بھی بہتر ہے یہ نماز وتر ہے جس کا وقت اللہ تعالیٰ نے نماز عشاء اور نماز فجر کے درمیان مقرر کیا ہے ۔

[2] اس کی مزید تشریح یہ ہے کہ نبوت کے دور اوّل میں جو حکم ہوا تھا قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا (سورہ مزمل) "(باستثناء تھوڑی سی شب کے تمام رات قیام کرو) وہ منسوخ نہیں ہوا کیونکہ اس کی جو علت یا حکمت بیان کی گئی تھی وہ آخر تک باقی رہی ۔ حکمت یا علت یہ تھی کہ اس سے نفس پامال ہوتا ہے ۔ قول اور فعل میں موافقت ہوتی ہے اور دعاء اور ذکر بہت ہی ٹھیک طرح ادا ہوتے ہیں اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا۝ "(بیشک رات کے اٹھنے میں دل اور زبان کا خوب میل ہوتا ہے اور دعا ہو یا قرائت ہر بات خوب ٹھیک نکلتی ہے)" یہ آپ کی حیات مقدس کا وہ جوہری جزو تھا جو ہمیشہ قائم رہنا چاہیے تھا ۔ چنانچہ قائم رہا تو اس کو پیدا کرنے والا عمل یعنی قیام لیل وہ بھی لازم رہا ۔ پھر ارشاد ربانی تهجد به نے اس کو اور پختہ کر دیا ، کیونکہ جب اسی آیت میں بشارت دی گئی کہ آپ کو مقام محمود پر مبعوث کیا جائے گا (عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۝) اور یہ ظاہر کیا گیا کہ تہجد اس کا ذریعہ ہوگا ، تو ایک علت اور حکمت کا

(باقی صفحہ آئندہ پر)

اس خصوصیت کی علت اور حکمت بھی بیان کردی گئی کہ آپ کو مقام محمود[۱] کا منصب عالی عطا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور اضافہ ہوگیا اور مطلب یہ ہوا کہ آپ کی یہ خصوصیات ہیں کہ ہمیشہ نفس پامال (بتعبیر دیگر مطیع اور فرمانبردار) قول اور فعل میں مطابقت، ذکر اور دعا کی نہایت صحیح طرح سے ادائیگی اور مقام محمود پر آپ مبعوث فرمائے جائیں گے۔ یہ تمام خصوصیات قیام لیل پر مرتب ہوں گی۔ لہذا قیام لیل یعنی تہجد مخصوص طور پر آپ پر فرض رہیگا۔

البتہ یہ تخفیف ضرور ہوئی کہ پہلے حکم تھا کہ کم و بیش نصف شب قیام کرو۔ بعد میں یہ سہولت کردی گئی کہ قرأت سہولت کے مطابق کرو فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تہجد اور وتر میں فرق کرتے ہیں۔ وہ تہجد کو عام مسلمانوں کے لئے سنت قرار دیتے ہیں اور صرف وتر کی تین رکعت کو واجب قرار دیتے ہیں۔ امام صاحب کا استدلال احادیث سے بھی ہے جو پہلے حاشیہ میں بیان کی گئیں اور استاد محترم حضرت علامہ انورشاہ رحمہ اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت امام صاحبؒ کی دلیل قرآن پاک کی یہ آیتیں بھی ہیں جن میں قیام لیل کا حکم ہے (قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا) یہ حکم جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رہا۔ اُمت کے لئے بھی رہا منسوخ نہیں ہوا (چنانچہ لفظ جمع کے ساتھ ارشاد ہوا۔ فَاقْرَءُوا... "تم پڑھو جس قدر میسر ہو" البتہ آپ کے لئے یہ تخفیف کی گئی کہ قرأت بقدر سہولت ہو اور اُمت کو مزید سہولت یہ دی گئی کہ آخر شب کو بیدار ہونے کا یقین نہ ہو تو شروع شب میں وتر کی تین رکعتیں پڑھ لیں جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خطرہ ہو کہ آخر شب میں نہیں اُٹھ سکیں گے تو اوّل شب میں وتر پڑھ لیں۔ (مسلم شریف ص۲۵۸ ج۱) بایں ہمہ یہ نظر انداز نہ ہونا چاہئے کہ حضرات علماء کا ایک قول یہ بھی ہے کہ تہجد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نفل کا درجہ ہی رکھتا تھا آپ پر فرض نہیں تھا، مگر یہ صرف علمی نکتہ سنجی ہے، ورنہ عمل کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح پابند رہے جیسے فرائض کے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

[۱] مقام محمود: یحمدہ اہل الجمع کلھم۔ "یعنی میدانِ حشر میں جمع ہونے والی ساری مخلوق آپ کی تعریف کرے گی۔" (بخاری شریف) یہ اس لئے کہ آپ پوری مخلوق کے لئے شفاعت (باقی صفحہ آئندہ پر)

عطا کرتا ہے۔ عَسٰٓی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ۞ (سورہ ۱۷ بنی اسرائیل آیت ۷۹)
(قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہیں ایسے مقام پر پہنچائے جو عالمگیر اور دائمی ستائش کا مقام ہو، جس کی ہر طرح تعریف کی جائے)

جن کے رتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے	یہ ایک عام اصول ہے۔ یہاں یہی ظاہر کرنا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا جس طرح یہ مقامِ عالی ہے کہ "بعد از خدا

بزرگ توئی قصہ مختصر" اسی طرح آپ کے فرائض میں بھی اضافہ[1] ہے اور ایسا اضافہ کہ عام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کریں گے اور آپ کی سفارش قبول ہوگی۔ احادیث میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے کہ میدانِ حشر میں پوری مخلوق جمع ہوگی اور منتظر ہوگی کہ اس کا حساب ہو اور اُن کے حق میں فیصلہ ہو۔ ایک دراز مدّت اس انتظار میں گذر جائے گی۔ اہلِ ایمان کو اس کی درازی اتنی محسوس نہیں ہوگی مگر اہلِ کفر کے لئے یہ درازی خود مصیبت بن جائے گی تو اب کسی ایسے مقرب بارگاہ کی تلاش ہوگی جو حضرت حق جل مجدہ سے سفارش کرے کہ کرحساب کر کے ان کا معاملہ طے کر دیا جائے۔ مخلوق حضرت آدم حضرت ابراہیم اور دیگر اکابر انبیاء (علیہم السلام) کے پاس دوڑے گی کہ وہ شفاعت کریں گے مگر تمام انبیاء (علیہم السّلام) معذرت کر دیں گے اور حضرت خاتم الانبیاء علیہم السّلام کا نام لیں گے۔ تب مخلوق رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرے گی۔ آپ بارگاہِ الٰہی میں حمد و ثناء کرتے ہوئے سجدہ کریں گے اور پوری مخلوق کے لئے سفارش کریں گے تو حساب شروع ہوگا (بخاری و ترمذی شریف وغیرہما) اب ساری مخلوق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سفارش سے بہرہ اندوز ہوگی۔ اس کو شفاعتِ کبریٰ کہا جاتا ہے۔

[1] مگر یہ اضافہ عجیب قسم کا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یا رسول اللہ آپ تو معصوم و مغفور ہیں پھر یہ ریاضت کیوں کہ پائے مبارک پر ورم آجاتا ہے تو آپ نے جواب دیا۔ افلا اکون عبداً شکوراً "کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گذار بندہ نہ بنوں"۔ بخاری شریف ص۱۵۲ یعنی عام اہلِ ایمان کے لئے فرضیت اس لئے ہے کہ گناہوں کا کفارہ ہو اور آپ کے لئے فرضیت بربنائے شکر ہے۔ اسی لئے نفلیں جو شکر ادا کرنے کے لئے ہوتی ہیں وہ آپ کے حق میں فرض ہیں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

انسانوں کو یہ حوصلہ نہیں ہے کہ اس اضافہ کو برداشت کرسکیں۔ یہ حوصلہ بھی ربِّ محمدؐ نے صرف محمدؐ ہی کو عطا فرمایا تھا، جس نے اس اضافہ کو برداشت کیا۔[1] (صلوات اللہ علیہ دائماً ابداً)

بسلسلہ عبادت آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کی خصوصیات نماز کے سلسلہ میں صرف یہی نہیں کہ تہجد آپ پر فرض تھا بلکہ تہجد کے علاوہ بھی اور نوافل آپ کے حق میں فرض کا درجہ رکھتی تھیں۔[2]

---

[1] برداشت کرنے کی صورت ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نیت باندھنے میں آپ نے تین دفعہ اللہ اکبر فرمایا، پھر فرمایا: ذوالملکوت والجبروت والکبریاء والعظمۃ ("مالک ملک، اقتدار اعلیٰ کا مالک، بڑائی اور عظمت والا") پھر قرأت شروع کی تو پوری سورہ بقرہ نہایت اطمینان سے پڑھی، پھر اسی کے مناسب بہت طویل رکوع کیا، پھر اتنا ہی طویل قیام کیا۔ پھر اتنا ہی طویل سجدہ کیا۔ سجدہ کے بعد بڑے اطمینان سے دیر تک بیٹھے رہے، پھر دوسرا سجدہ کرکے کھڑے ہوئے تو سورہ آل عمران پوری پڑھی۔ تیسری رکعت میں سورہ نساء مکمل چوتھی رکعت میں سورۂ مائدہ یا سورہ الانعام پوری پڑھی۔ صحابی کے بعد کے راوی شعبہ کو شک ہے کہ کونسی سورت کا نام لیا تھا (ابوداؤد باب مایقول فی الرکوع) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسا بھی کرتے تھے کہ تین دفعہ میں تہجد پڑھا کرتے تھے۔ یعنی ایک مرتبہ اُٹھے، وضو کیا مسواک کی، نفلیں پڑھیں پھر آرام فرمایا۔ تھوڑی دیر تک سوتے رہے، پھر اُٹھے۔ اس طرح تین دفعہ سوئے پھر اُٹھے اور نوافل پڑھتے تھے (مسلم شریف) ظاہر ہے بار بار اُٹھنا کتنا شاق ہوتا ہے۔ پھر تلاوت کی صورت حضرت عائشہ اور حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہما نے یہ بیان فرمائی کہ ایک ایک حرف الگ الگ کھینچ کر۔ (بخاری شریف، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آخر میں آپ تہجد کی نماز بیٹھ کر ادا فرماتے تھے مگر صورت یہ ہوتی تھی کہ پہلے بیٹھ کر پڑھتے رہتے جب تیس چالیس آیتیں رہ جاتیں تو کھڑے ہو کر پڑھتے، پھر رکوع کیا کرتے تھے۔ (بخاری شریف ص ۱۳۵ و ص ۱۵۱ وغیرہ)

[2] مثلاً ظہر کی سنتیں اگر وقت پر نہ پڑھی جائیں تو اُن کی قضا نہیں ہے۔ (باقی برصفحۂ آئندہ)

روزہ نماز کے علاوہ روزے کے بارے میں خصوصیت یہ تھی کہ چند روز کا مسلسل روزہ کہ بیچ میں افطار قطعاً نہ ہو اُمت کو اس کی اجازت نہیں — مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا۔

ایک مرتبہ صحابہ کرام نے اصرار کر کے اجازت[1] حاصل کی اور مسلسل روزہ رکھنا شروع کیا مگر صرف دو روز بعد ہی اندازہ ہو گیا۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن — کہ جاہا سپر باید انداختن[2]

حضرات علماء نے روزے کے تین درجے قرار دیئے ہیں (۱) عوام کا روزہ یعنی فقہی قاعدہ کے مطابق کھانے پینے وغیرہ سے رکنا۔ اور مکروہات و محرمات یعنی غیبت، جھوٹ، خیانت، حسد، مکر و فریب وغیرہ سے اجتناب و احتیاط۔

(۲) خواص کا روزہ۔ یعنی صرف مکروہات و محرمات سے اجتناب نہیں بلکہ ایسی جائز چیزوں سے بھی احتیاط برتی جائے جو یادِ خدا سے غافل کر دیں۔ مثلاً شعر شاعری یا بیکار وغیرہ۔

(۳) اخص الخواص کا روزہ۔ اللہ کے سوا ہر چیز سے یکسوئی اور برطرفی اور صرف ذات حق جلّ مجدہٗ میں محویت اور اس کی ذات و صفات میں ایسی مشغولیت کہ وہی جملہ توجہات کا محور ہو۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے روزے کی یہی شان ہوتی تھی اور یہ شان نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی تھی جب آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) لیکن ایک مرتبہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کی ظہر کی سنتیں رہ گئیں تو آپ نے نماز عصر کے بعد ان کو پڑھا۔ بخاری شریف ص۱۶۴ و ص۱۶۵۔ پھر ان کو معمول بنالیا۔ بخاری شریف ص۸۳ حالانکہ نماز عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک اور نماز صبح کے بعد سے طلوع آفتاب تک نوافل سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے۔ بخاری شریف ص۸۳ مگر چونکہ آپ کے حق میں نوافل فرض کا درجہ رکھتی تھیں لہذا آپ نے عصر کے بعد یہ نفلیں پڑھیں۔ (واللہ اعلم بالصواب) [1] بخاری شریف ص۲۶۳ باب التنکیل لمن اکثر الوصال۔

[2] ہر جگہ گھوڑے نہیں دوڑائے جا سکتے، بہت سی جگہیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ وہاں سپر ڈال دینا چاہیئے۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے[1]:

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ۔

(ترجمہ) "مخلوق، اللہ کا کنبہ ہے۔ بس خلقِ خدا میں اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب وہ ہے جو اللہ کے عیال پر احسان کرے۔"

عجیب وغریب بات یہ ہوتی تھی کہ جس طرح توجہ الی اللہ اور ذاتِ حق میں انہماک بڑھتا تھا اتنا ہی اس کی مخلوق کے حق میں رحم وکرم اور جود وسخا کا درجہ بڑھتا تھا یعنی پروردگار کی محبت اس کی پروردہ مخلوق پر لطف واحسان کی صورت میں جلوہ گر ہوتی تھی۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شہادت ملاحظہ فرمائیے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجود الناس۔ وکان اجود ما یکون فی رمضان حین یلقاہ جبرئیل وکان یلقاہ فی کل لیلۃ من رمضان فیدارسہ القران فلرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجود بالخیر من الریح المرسلۃ[2]

"(یعنی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ سخی تھے۔ اور آپ کی بے پناہ سخاوت کا زیادہ ظہور رمضان میں ہوتا تھا جب حضرت جبرئیل علیہ السّلام آپ سے ملاقات کیا کرتے تھے اور حضرت جبرئیلؑ کی ملاقات رمضان شریف کی ہر ایک رات میں ہوتی تھی۔ وہ آپ سے قرآن شریف کا دور کیا کرتے تھے۔ بس واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت اور بخشش جو سال بھر نسیم صبح رہتی تھی اس زمانہ میں وہ آندھی سے زیادہ تیز ہوجاتی تھی جس کے جھونکے کسی رکاوٹ کے پابند نہیں ہوتے ہر طرف پہنچتے ہیں اور ہر ایک کو متاثر کرتے ہیں۔

زکوٰۃ اُمت کے لئے ایک نصاب معین کیا گیا کہ اس سے کم پر زکوٰۃ ہی واجب نہیں ہوتی اور جب واجب ہوجاتی ہے تو صرف چالیسواں حصہ دینا ہوتا ہے، باقی سب مال حلال

---

[1] مشکوٰۃ شریف از شعب الایمان للبیہقی باب الشفقہ والرحمۃ علی الخلق۔

[2] بخاری شریف ص۳ و ۲۵۵ وغیرہ

ومباح بلکہ پاکیزہ اور طیّب ۔ مگر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا دستور العمل پہلے گذر چکا ہے کہ آپ نے طے فرمالیا تھا کہ کاشانۂ نبوّت سونے چاندی سے پاک رہے گا۔ دینار تو دینار درہم کی بھی مجال نہیں تھی کہ وہ دولت کدہ پاک میں رات گذار سکے۔[ع]

جہاد کے سلسلہ میں عام مسلمانوں کے لئے زحف عن القتال (یعنی جنگ کے وقت میدانِ جنگ سے بھاگ جانا) حرام ہے ۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ تھی کہ ابھی دولتکدہ سے بھی نہیں نکلے صرف ہتھیار سجائے ہیں۔ اس وقت ہر ایک مسلمان کے لئے جائز ہے کہ وہ اسلحہ اُتار دے اور موقع ہو تو ارادہ جنگ بھی ملتوی کردے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہتھیار سجانے کے بعد جائز نہیں سمجھتے تھے[۱] کہ اسلحہ اُتار دیں جب تک فیصلہ کن جنگ نہ کرلیں۔

غرض یہ کردار تھا جس کو پیش کرتے ہوئے آپ آیات اللہ کی تلاوت فرمایا کرتے تھے جو قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے وہ آپ کے عمل سے آیات اللہ کی تلاوت کیا کرتے تھے۔

خلاصہ کلام تلاوت آیات اللہ کی تشریح کو ہم تبرکاً شہیدِ وفا عبداللہ[۲] بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے اشعار پر ختم کرتے ہیں:

۱۔ وفینا رسول اللہ یتلو کتابہ ۔۔۔ اذا انشق معروف من الفجر ساطع

۲۔ ارانا الھدٰی بعد العمی فقلوبنا بہ ۔۔۔ موقنات ان ما قال واقع

۳۔ یبیت یجافی جنبہٗ عن فراشہ ۔۔۔ اذا استثقلت بالمشرکین المضاجع

(بخاری شریف ص۱۵۵)

ترجمہ (۱) "ہمارے بیچ میں اللہ کے رسول ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کتاب اللہ کی تلاوت اُس وقت کرتے ہیں جب کہ وہ معروف (درجانی پہچانی شئ) جو روشن ہوتی ہے جس کو فجر کہتے ہیں شق ہوتی ہے۔ (پو پھٹتی ہے)"

لہ البدایۃ والنہایہ ص۲۴۳ج۳ ۔ کلہ وہ جاں نثار اور فداکار جو غزوہ موتہ میں شہید ہوئے

ع اس سلسلہ میں مفصل بحث پہلے گذر چکی ہے کہ کس طرح سب کچھ خرچ کرکے فاقہ اختیار کیا جاتا تھا۔ (محمد میاں)

(۲) اس اللہ کے رسول نے ہمیں نابینائی (گمراہی) کے بعد ہدایت کا راستہ دکھایا۔ پس ہمارے قلوب اس کا یقین رکھتے ہیں کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ ہو کر رہے گا۔

(۳) یہ اللہ کے رسول اس طرح رات گذارتے ہیں کہ آپ کا پہلو بستر سے الگ رہتا ہے (خاص) اس وقت جبکہ مشرکین (بستر پر دراز ہوتے ہیں اور بستر ان کے جثوں سے) بوجھل ہوتے ہیں۔

تعلیم الکتاب

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ ہزاروں فتاویٰ اور فیصلے جن سے ملّت اسلامیہ کے اہل علم حضرات فقہاء استدلال کرتے ہیں اور غیر مسلم فضلاء کے لئے شمع بصیرت ہیں وہ انھیں غیر متمدن اور پس ماندہ کاشتکاروں یا چرواہوں کے ارشاد فرمودہ ہیں جن کی پس ماندگی کا شاہِ ایران مذاق اڑایا کرتا تھا اور خود مکہ کے سردار اُن کو حقیر سمجھتے تھے یہاں تک کہ ابوجہل کو جانکنی کے وقت صدمہ تھا تو یہ کہ اس کو مدینہ کے) کسانوں نے مارا۔ یا اُن کے ارشادات فرمودات میں جو مکہ کے معمولی دوکاندار تھے اور تحقیق کی جائے تو اُن میں کچھ وہ بھی تھے جو رہزنی کیا کرتے تھے اور کچھ وہ تھے کہ بقول علامہ حالی:

تعیش تھا، غفلت تھی، دیوانگی تھی غرض ہر طرح اُن کی حالت بُری تھی

ان حضرات نے نہ کسی کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی نہ کسی دار العلوم یا دار الافتاء سے استفادہ کیا تھا۔ اُن کی تعلیم گاہ و تربیت گاہ اُسی ہادیٔ اعظمؐ کی خس پوش مسجد تھی جس کو رب العرش نے تعلیم کتاب کے لئے مبعوث فرمایا تھا۔

پھر ان میں سے ۲۳ سالہ دورِ نبوّت کے رفقاء تو چند ہی تھے جن کی تعداد چالیس بھی نہیں تھی۔ مدینہ طیبہ کا دس سالہ دور بھی سب کو نصیب نہیں ہوا۔ بہت سے[1] وہ تھے جن کو

---

[1] جیسے حضرت ابوہریرہ، ابوموسیٰ اشعری، خالد بن ولید، عمرو بن العاص، عدی بن حاتم رضی اللہ عنہم

دو تین سال اور بعض وہ بھی تھے جن کو چند ماہ ہی میسّر آئے مگر اخذ و استنباط کی وہ غیر معمولی بصیرت نصیب ہو گئی کہ یونیورسٹیوں اور دار العلوموں کے تعلیم یافتہ فضلاء اُن کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔

بصیرت کے ساتھ جو وسعت ذہن میسّر آئی وہ بھی پیغمبرانہ تربیت کی برکت تھی یعنی جس طرح وہ خود اخذ و استنباط سے کام لیتے تھے وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ اسی طرح اخذ و استنباط کا حق دوسرے کو بھی ہے وہ جس طرح اپنی رائے کا احترام کرتے تھے۔ دوسرے کے فیصلہ کا بھی اسی طرح احترام کرتے تھے۔

چنانچہ جن اجتہادی مسائل میں آج اختلاف ہے حضرات صحابہ کے دور میں بھی یہ اختلاف تھا اسی لئے ہر ایک فریق کے پاس جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ہے کسی صحابی کا قول، یا فیصلہ بھی وہ اپنے خزینہ یادداشت میں محفوظ رکھتا ہے مگر باہمی تصادم سے یہ حضرات محفوظ تھے۔ اور سبق آموز بات یہ ہے کہ نہ باہمی رشک و حسد تھا، نہ شوقِ تعلّی نہ جذبۂ برتری۔ تحقیق مسئلہ کے وقت کھلے طور پر تنقید اور جرح، مگر وقتِ نماز آگیا تو جماعت میں سب شریک۔ بسا اوقات امام وہی بنا جو نشانۂ اختلاف تھا۔

مثال ہم فقہ پڑھتے ہیں۔ پڑھاتے ہیں۔ رات دن کے معاملات میں مسائل فقہ پر عمل کرتے ہیں لیکن اگر ایسا اتفاق ہو جائے کہ امام مثلاً صبح کی نماز میں آیت سجدہ پڑھ لے پھر سجدہ کرے تو تقریباً ہر ایک مقتدی وقت انتشار ہو جاتا ہے۔ کوئی سجدہ میں پہونچ جاتا ہے۔ کوئی رکوع میں امام کا انتظار کرتا ہے، لیکن تحویل قبلہ کی آیت نازل ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھی۔ مسجد بنی عبد الاشہل اور اسی طرح مسجد قبا میں جماعتیں ہو رہی تھیں اسی حالت میں خبر دینے والے نے خبر دی تو فوراً پوری پوری صفوں کا رُخ شمال کی جانب سے جنوب کی طرف پھر گیا۔ مردوں کی جگہ عورتوں کی صف پہنچ گئی۔ مگر یہ سب تبدیلی نہایت خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ اس طرح

سلہ جیسے جریر بن عبداللہ بجلی۔ ۵۲ تفسیر مظہری ص ۱۴۴/۱

ہوگئی گویا اُن کو پہلے سے اس کی مشق کرائی جاچکی تھی۔ حالانکہ مشق تو کیا مشق کا کبھی تصوّر بھی نہیں کیا گیا تھا۔

نمازِ صبح کے وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ قرأت کر رہے تھے کہ ایک بدبخت نے خنجر مارا۔ فاروق اعظم نے گرتے گرتے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر مصلّے پر کھڑا کیا۔ حملہ آور کو صفِ اوّل کے لوگوں نے پکڑنے کی کوشش کی۔ ۱۲ آدمی زخمی ہوئے تب اس کو گرفتار کرلیا گیا۔ مگر یہ انتشار جو کچھ بھی ہوا صرف صف اوّل میں امام سے متصل بعد کی صف والوں کو اتنا پتہ چلا کہ نماز پڑھانے والے فاروق اعظم نہیں ہیں کوئی اور شخص نماز پڑھا رہا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے بہت اختصار سے نماز پڑھ کر سلام پھیر دیا۔ تب لوگوں کو صورتِ حال کا علم ہوا[۱]

یہ تھا تعلیم الکتاب کا ایک رُخ اور حضرات صحابہ پر اُس کا اثر۔ دوسری صورت ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) قرآن حکیم میں تغییر خلق اللہ یعنی اللہ کی بنائی ہوئی صورت میں تبدیلی پیدا کرنے کو شیطانی فعل فرمایا گیا ہے[۲]۔ مگر تغییر خلق اللہ کا لفظ عام ہے۔ جس طرح مردوں کا خصی کرنا تغییر خلق اللہ ہے اور حرام ہے ختنہ کرنا بھی تغییر خلق اللہ ہے۔ علیٰ ہذا بدن کے کسی حصہ کے بال منڈوانا یا کٹوانا، یا اُکھاڑنا، ناخون تراشنا یا گدھوانا، یا عورتوں کے سر کے بال مصنوعی طور پر بڑھانا، یا چہرے کے بال نوچنا، دانتوں میں مصنوعی طور پر کشادگی پیدا کرنا ان باتوں میں خدا کی بنائی ہوئی صورت میں تبدیلی ہوتی ہے۔ پس جس کو اللہ تعالیٰ نے تعلیم الکتاب کے لئے مبعوث فرمایا تھا، اُس نے اُن تمام کی تفصیل فرمائی۔ بعض تغیرات کو مستثنیٰ فرمایا۔ مثلاً ارشاد فرمایا:

الفطرۃ خمسٌ، الختان والاستحداد، قص الشارب وتقلیم الاظفار

---

[۱] بخاری شریف ص۵۲۳ [۲] سورہ ۴ نساء آیت ۱۱۹

ونتف الابط ۔ [1]

یعنی یہ پانچ چیزیں (اگرچہ ان میں تغییر خلق اللہ ہے مگر یہ تغییر بتقاضا فطرت ہے، یہ تغییر حرام نہیں ہے بلکہ فطرت ہے ختنہ کرانا، موئے زیر ناف کو صاف کرنا مونچھیں کٹوانا، ناخون کتروانا، بغل کے بال اکھیڑنا۔

اس کے مقابل دوسرا ارشاد یہ ہوا:

خالفوا المشرکین ۔ وَفِّروا اللحی واحفُوا الشوارب۔ [2]

"مشرکین کے خلاف یہ طریقہ اختیار کرو کہ داڑھیں بڑھاؤ اور مونچھوں کو خوب باریک کترواؤ۔"

عورتوں کے متعلق ارشاد ہوا:

لعن اللہ الواشمات والمتوشمات والمتنمصات والمتفلجات للحسن المغیرات خلق اللہ ۔ [3]

ترجمہ: "ان عورتوں پر خدا کی لعنت جو گودتی ہیں جو گدواتی ہیں جو بال نوچتی ہیں جو خوبصورتی پیدا کرنے کے لئے دانتوں میں کشادگی کراتی ہیں جو خدا کی بنائی ہوئی صورت کو بدلتی ہیں۔"

خلاصہ یہ کہ تغییر خلق اللہ کی تفسیر و تشریح کہ بعض کو جائز اور مستحسن قرار دیا اور بعض کو ممنوع اور حرام یہ فریضۂ نبوت تھا جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیا۔

(۲) ارشادِ ربانی ہے: وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ (سورہ ۲ آیت ۲۷۵)

"اللہ تعالیٰ نے خرید و فروخت (تبادلہ) کو حلال قرار دیا اور ربوا (ایسی زیادتی جو بدل سے زیادہ ہو) کو حرام قرار دیا۔"

اب قرض کی صورت میں اگر پانچ روپیہ کے بجائے چھ روپیہ وصول کئے جاتے ہیں تو ظاہر ہے یہ ایک روپیہ بدل سے زائد ہے۔ ربوا یعنی سود ہے لیکن اگر ایک تولہ چاندی کو دو تولہ

---

[1] بخاری شریف ص۸۷۵ [2] بخاری شریف ص۸۷۵ [3] بخاری شریف ص۸۷۹

چاندی، یا ایک سیر گیہوں کو دو سیر گیہوں کے بدلہ میں فروخت کیا جائے، تو کیا یہ بیع جائز ہوگی
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی حرام فرمایا۔ اور نہ صرف چاندی اور گیہوں بلکہ اس طرح[1]
کی اور چیزوں کے متعلق بھی نہایت سختی کے ساتھ ہدایت فرمائی کہ اگر ہم جنس سے تبادلہ ہے
مثلاً سونے کی بیع سونے کی کسی چیز سے ہو رہی ہے تو اس میں بھی مساوات اور نقد ہونا ضروری[2]
ہے، نہ کم وبیش جائز ہے نہ اُدھار۔

ان دو مثالوں میں سے ایک کا تعلق خرید و فروخت سے ہے دوسرے کا تعلق آرائش
بدن سے ہے۔ ان کے علاوہ ہزاروں مسائل ہیں جن کا تعلق عبادات، معاملات، معاشرت،
اقتصاد، امور خانہ داری، آداب مجلس یا ملکی سیاست یا بین الاقوامی تعلقات سے ہے۔
قرآن حکیم نے اُن کے متعلق اصول کی تعلیم دی ہے اور کہیں صرف اشارہ کر دیا ہے۔ ارشادات

---

[1] حدیث میں ایسی چھ چیزیں شمار کی گئی ہیں جن کا تبادلہ اگر ہم جنس سے ہو تو زیادتی اور ادھار حرام ہے
تبادلہ برابر سرابر اور ہاتھ در ہاتھ ہونا چاہیئے۔ چاندی[1]، سونا[2]، گیہوں[3]، جو[4]، کھجور[5]، اور نمک[6]۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اس سے یہ اصول اخذ کیا کہ ایسی تمام چیزیں جو وزن کر کے یا صاع یا رطل
جیسے پیمانہ سے ناپ کر بیچی جائیں اگر ان کا تبادلہ ہم جنس سے کیا جائے تو ان میں مساوات اور ہاتھ در ہاتھ
ہونا ضروری ہے لہذا چاول۔ جوار۔ مکی وغیرہ کا تبادلہ اگر ہم جنس سے کیا جائے مثلاً چاول کی بیع چاول سے
کی جائے تو مساوات اور ہاتھ در ہاتھ ہونا ضروری ہے نہ اضافہ جائز ہے نہ اُدھار کیونکہ یہاں جنس کا بھی
اتحاد ہے اور قدر بھی متحد ہے کہ دونوں وزنی ہیں وزن کر کے بیچی جاتی ہیں۔ واللہ اعلم

[2] پانچ سیر گیہوں کی قیمت ایک روپیہ بھی لگا سکتے ہیں اور ایک ہزار روپیہ بھی۔ یہ بائع اور مشتری کی باہمی رضامندی
پر ہے کہ وہ پانچ سیر گیہوں کو ایک روپیہ کی برابر قرار دیں یا ایک ہزار کی برابر۔ لیکن ہم جنس میں یعنی گیہوں
کی بیع گیہوں سے ہو تو وہاں پانچ سیر گندم کو دس سیر گندم کے برابر قرار دینا غلط ہوگا۔ البتہ جو جنس ایسی ہے
کہ وہ کیل یا وزن کر کے نہیں بیچی جاتی۔ گزوں سے ناپ کر یا مثلاً شمار کر کے بیچی جاتی ہے۔ جیسے کپڑا۔ وہاں امام
ابو حنیفہ کے مسلک کے مطابق یہ جائز ہے کہ ایک گز کپڑے کو ایک ہزار گز کپڑے کے عوض میں بیچا جائے مگر نقد۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کتب حدیث کے ہزاروں صفحات میں محفوظ ہیں، ان کی توضیح اور تشریح کرتے ہیں۔ پھر حضرات ائمہ مجتہدین نے ان سے اصول اخذ کر کے پیش آنے والے معاملات کو ان اصول کے معیار پر جانچ کر احکام مرتب کئے جو کتب فقہ میں منضبط ہیں۔

ارشادات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق حضرت حق جل مجدہٗ نے فرمادی کہ ارشاد ہوا: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوْحٰى ۝ (النجم آیت ۳ و ۴)

"اپنی چاہ اور اپنے نفس کی خواہش پر آپ کچھ نہیں کہتے، آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ وحی ہوتی ہے جو آپ پر نازل کی جاتی ہے۔"

نیز حضرت حق جل مجدہٗ کا ارشاد ہے:

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (سورہ ۵۹ حشر آیت)

"جو کچھ تمہارے سامنے پیش کریں رسول اس کو لے لو اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم اعلیٰ بنا کر بھیجا تو آپ نے دریافت فرمایا:

کوئی مقدمہ آپ کے سامنے آئے گا تو آپ کس طرح فیصلہ کریں گے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: کتاب اللہ کے مطابق اور اگر کتاب اللہ میں اس معاملہ کے متعلق کوئی صراحت نہیں ہوگی تو رسول اللہ کی سنت کے بموجب۔ اور اگر سنت رسول اللہ یعنی آپ کے جو ارشادات یا واقعات میرے علم میں ہیں ان میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہوگی تو اپنے اجتہاد سے کام لوں گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے سینہ پر دست مبارک رکھ کر فرمایا: الحمد لله وفق رسول رسول الله لما يرضى به رسول الله.

"الحمد للہ۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کے رسول (فرستادہ) کو اس کی توفیق فرمائی جس کو

اللہ کا رسول پسند کرتا ہے)

اس ارشاد گرامی نے حضرات مجتہدین کے اجتہاد کی تصویب اور تائید فرما دی۔

تعلیم الحکمۃ

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ | سکھاتے ہیں ان کو (علماء امت کو) کتاب اور حکمت[1] یعنی کتاب اللہ کی تعلیم کے ساتھ آپ ایسے اصول کی تعلیم بھی دیتے ہیں جن پر قانونی عدل اور دستور و آئین کی حسین اور شاندار عمارت سربفلک کی جا سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات ملاحظہ فرمائیے۔ وہ ایسے ہی اصول کا مجموعہ ہیں یہاں خطبات کے علاوہ چند حدیثوں کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے:

ارشاد ہوا[2] — حلال بھی واضح ہے۔ حرام بھی واضح ہے۔ لیکن دونوں کے درمیان کچھ ایسے امور ہیں جن میں کچھ مشابہت حلال کی ہے کچھ مشابہت حرام کی۔ پس جس نے ایسے مشتبہ امور سے

---

[1] قرآن حکیم میں یہ الفاظ تین جگہ آئے ہیں۔ سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورہ جمعہ۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حکمت کا ترجمہ سورہ بقرہ اور آل عمران میں علم کیا ہے اور سورہ جمعہ میں دانش۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے (علی الترتیب) تین ترجمے کئے ہیں: پکی باتیں، کام کی بات، عقلمندی۔ مگر ظاہر ہے یہ سب ترجمے تشریح طلب ہیں۔ احقر نے اپنے الفاظ میں ان کی تشریح کر دی ہے۔ جہاں تک حضرات مفسرین کا تعلق ہے تو اُن کے ارشادات یہ ہیں مایکمل نفوسھم من المعارف والاحکام وقیل ھی السنۃ وقیل ھی القضاء وقیل الفقہ ص۱۳۱ تفسیر مظہری ج ۱۔ الحکمۃ العلوم الحقۃ المستحکمۃ التی یستفیدھا الحکیم من الحکیم بلا توسط کتاب ولا بیان تفسیر مظہری ص۲۶۶/۲۲۶ الحکمۃ الشریعۃ المحکمۃ المطابقۃ بشرائع الانبیاء فی الاصول المشھود علیھا بالکتب السماویۃ بالقبول۔ ایضاً تفسیر مظہری ص۲۴۳/۹۷ اصابۃ الحق بالعلم والعقل تفیہ صادقۃ (المفردات فی غریب القرآن) [2] بخاری شریف ص۱۳

تقویٰ اختیار کیا اور احتیاط برتی۔ اس نے اپنے دین کو بھی اعتراض سے بری کر لیا اور اپنی آبرو بھی بچالی اور جو ان مشتبہ امور میں پڑ گیا اس کی مثال اس چرواہے کی ہے جو اپنے مویشی سرکار کی محفوظ چراگاہ کے پاس چرا رہا ہے قریب ہے کہ وہ مویشی کو اس چراگاہ میں اتار دے۔ یاد رکھو ہر ایک سرکار کی چراگاہ ہوتی ہے۔ یاد رکھو (احکم الحاکمین) اللہ تعالیٰ کی چراگاہ حرام امور ہیں۔ یاد رکھو بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے، وہ ٹھیک رہتا ہے تو بدن ٹھیک رہتا ہے، وہ بگڑ جائے تو بدن بگڑ جاتا ہے۔ یاد رکھو یہ گوشت کا ٹکڑا وہ ہے جس کو "دل" کہا جاتا ہے۔

اس ارشاد گرامی نے بہت سے اصول کی تعلیم دیدی۔ مثلاً یہ کہ[۱] ایسے تمام امور جن کے جواز اور عدم جواز میں کلام ہو۔ تقویٰ یہ ہے کہ ان کو نہ کیا جائے۔ اصطلاح فقہ میں ایسے امور کو مکروہ کہا جاتا ہے، جو درجہ بدرجہ تنزیہی، تحریمی، پھر تحریمی قریب بحرام ہوتا ہے۔ یا مثلاً یہ کہ عقائد و خیالات کی اصلاح سب سے مقدم ہے۔ عقائد خراب ہوتے ہیں تو دل کے جذبات بھی خراب ہوتے ہیں جو عمل کو خراب کر دیتے ہیں۔

(۲) اسی حدیث میں یہ اضافہ[۲] بھی ہے۔

بس جو شخص مشتبہ کام کو چھوڑ دے وہ غیر مشتبہ حرام کو بدرجہ اولیٰ چھوڑ دیگا اور مجرمانہ جرأت کر کے مشتبہ کام کرنے لگے تو وہ عنقریب حرام میں بھی مبتلا ہو جائے گا۔

(۳) حضرت[۳] ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ ہم بھی مجلس مبارک میں حاضر تھے۔ ارشاد ہوا:

اپنے بعد مجھے تمہارے متعلق جس بات کا خطرہ ہے وہ دنیا کی وہ رونق و زینت ہے جو پوری زیبائش کے ساتھ تمہارے سامنے آئے گی۔

---

[۱] اس اصول کو سامنے رکھ کر فاتحہ، سوئم، چہارم، چہلم، برسی، شب برات، بی بی فاطمہ کی صحنک، محفل میلاد، قیام وغیرہ پر نظر ڈالئے۔ [۲] بخاری شریف ص۲۷۵ [۳] بخاری شریف ص۱۹۸

ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ۔ کیا خیر بھی شر کو لاسکتا ہے (یعنی جب یہ رونق و زینت حلال اور جائز راستہ سے آئے گی تو پھر اس سے خطرہ کیوں ہے۔) راوی بیان کرتے ہیں کہ اس سوال پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے خاص توجّہ فرمائی۔ آپ خاموش ہوگئے اور دیر تک خاموش رہے۔ ہمیں خیال ہوا کہ شاید وحی نازل ہو رہی ہے۔ اس کے بعد آپ نے پسینہ پونچھا اور دریافت فرمایا سائل کہاں ہے۔ گویا اس سوال کو آپ نے معقول قرار دیا۔ پھر فرمایا۔ بیشک خیر شر کو نہیں لاتا (بشرطیکہ خیر کے تقاضوں کو پورا کرتے رہو۔ یعنی دولت کی بنا پر جو حقوق ہوتے ہیں اُن کو ادا کرتے رہو) پھر آپ نے مثال دیتے ہوئے فرمایا: دیکھو۔ موسم بہار میں جو سبزہ پیدا ہوتا ہے اگر جانور اس کو کھائے چلا جائے تو وہ سبزہ (جو نہایت عمدہ ہے اور سراسر خیر ہے) جانور کو مار ڈالتا ہے یا نیم جان کر دیتا ہے۔ ہاں وہ جانور جو سبزہ کو کھا کر ساتھ ساتھ ہضم بھی کرتا رہے اور سبزہ سے شکم سیر ہونے کے تقاضے کو پورا کرتا رہے۔ مثلاً یہ کہ بھی مویشی جب سبزہ سے شکم سیر ہو جائے اور اس کی کوکھیں تن جائیں تو گھومے پھرے۔ دھوپ میں بیٹھے۔ پھر فضلہ خارج کرے (اُس کے بعد کھائے تو مفید ہوگا) پھر ارشاد ہوا۔ دیکھو یہ مال ہرا بھرا اور شیریں ہے۔ پس وہ اُس مسلمان کا بہت اچھا دوست ہے جو مسکینوں، یتیموں، مسافروں اور ضرورت مندوں کو فراموش نہ کرے، اُن کو بھی آسودہ کرتا رہے اور دیکھو جو شخص بلا استحقاق کے مال لیتا ہے (مثلاً سوال کرکے) تو اس کی مثال ایسی ہے کھاتا رہتا ہے پیٹ نہیں بھرتا۔

تزکیہ

وَيُزَكِّيهِمْ	اُن کو مانجھتا ہے	(مولانا ابوالکلام آزاد)
	اُن کو سنوارتا ہے	(حضرت شاہ عبدالقادر)

ظاہر ہے دوسرا ترجمہ زیادہ[1] حاوی، جامع اور درواقعہ اور حقیقتِ حال کے زیادہ مطابق ہے

---

[1] لغت سے بھی قریب تر یہی ترجمہ ہے یعنی سنوارتا ہے، کیونکہ لفظ زکوٰۃ کے معنیٰ صرف (باقی صفحہ آئندہ پر)

کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ایمان کو صرف مانجھا ہی نہیں بلکہ اُن کو آراستہ بھی کیا ہے اُن کو حسین اور جمیل بھی بنایا ہے۔ یعنی مانجھنے کے بعد سنوارا بھی ہے۔ جس طرح یہ عمل بہت مشکل ہے کیونکہ یہ ایک کیمیا ہے اور کیمیا بھی وہ جو کانسی یا پیتل کو نہیں بلکہ زیر پا گرد و خس و خاشاک کو سونا بناتا ہے اسی طرح اس کی وسعت بھی اتنی زیادہ ہے کہ ہزاروں صفحات کے دامن بھی اس کو نہیں سمیٹ سکتے۔ کیونکہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جس کو سنوارنے کی ضرورت نہ ہو۔ اور جو حسین و جمیل بننے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔

فرد میں بھی خرابی ہوتی ہے، جماعت میں بھی، ظاہر میں بھی، باطن میں بھی، مرد میں بھی اور عورت میں بھی۔ پھر اندرون خانہ، بیرون خانہ، حلقہ درس و تلقین، محفل طرب و نشاط، بزم شعر و سخن، انجمن خور و نوش، بازار، تجارتی کاروبار، بارگاہ عدل و انصاف یا ایوان سیاست اجتماعی مطالبات اور اُن سے متعلق خواص کے نظریات، عوام کے جذبات، طرح طرح کی تحریکات سیاسی چالیں، شاطرانہ حرکتیں، میدان جنگ، جشن فتح یا صلح کانفرنس وغیرہ۔ قدرتی بات ہے کہ ان میں خرابیاں بھی ہوتی ہیں اور خوبیاں بھی۔ خرابیوں کو دور کرکے خوبیاں پیدا کرنا۔ خرابیوں کے عوامل اور محرکات کو پہچان کر دلوں کو اُن سے پاک کرنا اور اُن کے برخلاف خدا پرستی، صداقت ہمدردی، اخلاص اور اُن کے جذبات کو دلوں کے نہاں خانوں میں جلوہ گر کرنا۔ ان سب کا نام تزکیہ ہے۔

ان تمام وسعتوں کے ساتھ "تزکیہ" کو وظائف نبوت میں شمار کرایا گیا۔ یہ بھی ظاہر کر دیا گیا

(حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ) پاک کرنا نہیں ہیں بلکہ خوشگوار اور تر و تازہ بنانے کے ہیں۔ زکی الرجل صلح وتنعم فہو زکی (قاموس) والزکوٰۃ لغۃ الطھارۃ، والنماء، والبرکۃ المدح (مجمع البحار) اصل الزکوٰۃ النمو الحاصل من برکۃ اللہ تعالیٰ (الیٰ ان قال) وبزکاء النفس وطہارتھا یصیر الانسان بحیث یستحق فی الدنیا الاوصاف المحمودۃ وفی الآخرۃ الاجر المثوبۃ (المفردات فی غریب القرآن)

لہ مثلاً صرف مرض بخل رفع نہیں کیا بلکہ سیر چشمی، وسعت نظر اور جذبات ہمدردی خلق خدا سے اُن کو آراستہ بھی کیا۔ محمد میاں

کہ خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فریضہ کو حسن و خوبی اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔ مگر کس طرح انجام دیا۔ اور آئندہ کے لئے کیا گیا۔ ہدایتیں فرمائیں ان کی تفصیلات کے لئے آپ حدیث، تفسیر، فقہ، سیر و مغازی تہذیب اخلاق، تصوف و احسان کی کتابیں ملاحظہ فرمائیں۔ اس مختصر مجموعہ میں اُن کا مختصر بیان بھی ممکن نہیں ہے۔ یہاں صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان تمام فرائض میں جو پہلے بیان کئے گئے (تلاوت آیات اللہ۔ تعلیم الکتاب تعلیم الحکمۃ) تزکیہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ گویا نصب العین تزکیہ ہی ہے اور تمام امور اس کے مقدمات اور ابتدائی مراحل ہیں۔

تزکیہ کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ نہ صرف عبادات و اخلاق اور احسان و سلوک کی بنیاد تزکیہ پر ہے بلکہ اسلام نے معاشرت، معیشت، سیاسی نظام اور اس کے لئے مالی نظام انتہا یہ کہ جنگ اور صلح کی بنیاد بھی تزکیہ پر ہی رکھی ہے۔ مقاتلہ و مبارزہ، دشمن کو تباہ کرنا، اس کے ملک کو برباد کرنا۔ "جہاد فی سبیل اللہ" اسی وقت ہوگا جب کہ لڑنے والے وہ ہوں جو اپنا تزکیہ کر چکے ہوں۔ تزکیہ کے بغیر یہ قتل و قتال فساد فی الارض ہے۔ یہی تزکیہ ہے۔ جو زندگی کے ہر ایک شعبہ میں کارفرما ہے۔ مثلاً

۱۔ معاشرت اور سماجی زندگی میں سب سے پہلی چیز نکاح اور ازدواج ہے۔ وحی الٰہی کی ہدایت ہے۔ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۚ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ ۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (سورہ ۲۴ نور آیت ۳۰)

"کہہ دیجئے مسلمانوں سے نیچی رکھیں اپنی نگاہیں اور حفاظت کرتے رہیں اپنی شرمگاہوں کی۔ یہ اُن کے لئے زیادہ تزکیہ (صفائی اور پاکی) کی بات ہے بیشک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں۔"

عــہ ملاحظہ فرمایئے آیت ۱۶۴ سورہ آل عمران و آیت ۲ سورہ جمعہ جو قبولیت دعاء کے سلسلہ میں صفحہ ۳۶۹ پر گزری اور اس سے بڑھ کر کامیابی کیا ہوسکتی ہے کہ حضرات صحابہ کو کتاب اللہ نے الرّٰشِدُوْنَ کی سند عطا فرمادی اور انھیں کو رشد و ھدیٰ کا معیار قرار دیا اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً (سورہ حجرات)

اسی تزکیہ کو سامنے رکھ کر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

یامعشر الشباب من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج فانہ اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیہ بالصوم فانہ لہ وجاء۔[۱]

"نوجوانو! جو ازدواجی زندگی کی ضروریات پورا کرنے کی استطاعت اور گنجائش رکھے وہ ازدواجی زندگی اختیار[۲] کرے کیونکہ اس سے نگاہ پوری طرح نیچی ہوتی ہے اور فرج کی پوری حفاظت ہوتی ہے اور جس میں یہ گنجائش نہ ہو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ روزے رکھے جو شہوانی رجحانات کو مفلوج اور مضمحل کر دیتے ہیں۔"

ایک دوسرے کے مکان میں جانے کے لئے وحی الٰہی نے استیذان کو ضروری قرار دیا کہ پہلے اجازت حاصل کرو۔ استیذان کے ساتھ سلام بھی کرو۔ پھر ارشاد ہوا:

وَاِنۡ قِيۡلَ لَـكُمُ ارۡجِعُوۡا فَارۡجِعُوۡا هُوَ اَزۡكٰى لَـكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِيۡمٌ۝ (سورہ ۲۴ نور آیت ۲۸)

"اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس ہو جاؤ تو واپس ہو جایا کرو۔ یہی تمہارے لئے صفائی اور ستھرائی (تزکیہ) کی بات ہے اور جو تم کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے"[۳]

۴۔ معیشت اور کاروبار کے سلسلہ میں تجارت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے لیکن تاجر

---

[۱] بخاری شریف ص۵۰۰ [۲] اسلام تجرد کو پسند نہیں کرتا۔ تجرد رہبانیت ہے اور سادھو پنا ہے جو نصب العین نہیں بن سکتا۔ کیونکہ زندگی کی دلچسپیوں کو ختم کر دیا جائے تو ترقیات کی طرف بڑھنے والے قدم بوجھل ہو جائیں دنیا اپنی رونق کو کھو بیٹھے اور معاشرہ انسانی کی چہل پہل ختم ہو جائے۔ اسلام ارتقاء اور تعمیر کا حامی ہے وہ کسی گوشہ میں بھی تخریب کو پسند نہیں کرتا صرف اس تخریب کو جائز قرار دیتا ہے جو تعمیر کے لئے ہو۔ [۳] شروع سے پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے "اے ایمان والو! مت جایا کرو گھروں میں اپنے گھروں کے سوا جب تک اُن سے اجازت نہ لے لو اور (اجازت لینے سے پہلے (باقی آئندہ پر)

کے لئے ضروری ہے کہ الصادق الامین ("پوری طرح سچا معاملہ کرنے والا امانت دار") ہو[1] خیانت اور غلط بیانی وغیرہ سے تزکیہ کرچکا ہو۔

ہر طرح کے کاروبار کے سلسلہ میں ارشاد ہوا: اللہ تعالیٰ طیّب (پاک صاف ستھرا) ہے وہ پاکی اور ستھرائی کو پسند کرتا ہے اور پاک اور ستھری چیز ہی قبول کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بھی ان باتوں کا حکم فرمایا جن کا حکم انبیاء علیہم السّلام کو فرمایا تھا۔ انبیاء علیہم السّلام کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یٰاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (المؤمنون ۲۳) ("اے گروہ پیغمبران! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو") اسی طرح مسلمانوں کو خطاب فرمایا: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (البقرہ) ("اے ایمان والو! کھاؤ وہ پاکیزہ چیزیں جو ہمنے تم کو دی ہیں") اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کا ذکر کیا جو لمبا سفر کرتا ہے، پراگندہ سر، گرد سے اٹا ہوا اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا کر دعا کرتا ہے: یارب! یارب اور حالت یہ ہے کہ اس کی خوراک حرام، اس کا پانی حرام (ناجائز طریقہ سے حاصل کیا ہوا) اس کا لباس حرام۔ حرام غذا سے اس کا نشو ونما ہوا۔ ایسے شخص کی دعا کیا قبول ہو سکتی ہے؟ (ترمذی شریف تفسیر سورۃ البقرہ ص۱۲۳ ج ۲)

حرص، طمع، خودغرضی، بخل، نفع اندوزی، ناپاک خصلتیں ہیں جن سے تزکیہ ضروری ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو (مثلاً یہ کہو: السّلام علیکم! کیا حاضر ہو سکتا ہوں) یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ توقع ہے کہ تم اس کا پورا خیال رکھو گے۔ پھر اگر ان گھروں میں تم کو کوئی آدمی معلوم نہ ہو، تب بھی ان گھروں میں نہ جاؤ جب تک تم کو اجازت نہ دیدی جائے۔ اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس ہو جاؤ، تو واپس ہو جاؤ۔ یہی تمہارے لئے صفائی ستھرائی کی بات ہے

[1] ایسے تاجر کا حشر انبیاء علیہم السّلام اور صدیقین اور شہداء امت کے ساتھ ہوگا (ترمذی و ابن ماجہ وغیرہ) اس کے برخلاف جو تاجر خیانت کرے (اچھا نمونہ دکھا کر برا مال دے یا ملاوٹ کرے، وغیرہ) اس کو کے متعلق ارشاد ہوا کہ اس کو مسلمان کہنا درست نہیں (من غش فلیس منا۔ ترمذی شریف ص۱۵۰) چور بازاری کرنے والا ملعون ہے (المحتکر ملعون۔ ابن ماجہ وغیرہ)

یہی خصلتیں ربوا اور سود کی علت پیدا کرتی ہیں ۔ لہذا نہ صرف سود حرام ہے بلکہ ہر ایسا کاروبار اور ہر ایسا معاملہ حرام جس میں سود کا شُبہ ہو ۔

سیاسی نظام میں چوٹی کا فرد یعنی سربراہ وہ ہونا چاہیئے جو سب سے زیادہ متقی ہو یعنی تزکیہ نفس میں سب سے بڑھا ہوا ہو ۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ۔ (سورہ حجرات)

" اللہ کے یہاں سب سے زیادہ مستحق احترام وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا ترس اور پرہیزگار ہو "

حکومت کیا ہے اسلام نے نماز اور روزہ کی طرح حفاظت جان و مال، عصمت اور آبرو کی حفاظت تعلیم و تربیت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر۔ یعنی اچھی باتیں بتانا اُن پر عمل کرانا، بُری باتوں سے خود رُکنا اور دوسروں کو روکنا، عدل و انصاف، غریبوں کی پرورش، کمزوروں کی مدد، مظلوموں کی فریاد رسی، بیماروں کی تیمارداری[1] ملک اور قوم کی حفاظت وغیرہ کو بھی افراد کے فرائض قرار دیا ہے ۔ یعنی ہر ایک مسلمان کا خود اپنا فرض ہے کہ اپنی پُوری طاقت و استطاعت ان فرائض کو انجام دینے میں صرف کرے ورنہ وہ عند اللہ جواب دہ ہو گا ۔ لیکن جب تک باہمی تعاون نہ ہو بہت سے فرائض ایسے ہیں جو انجام نہیں پا سکتے ۔ اسی باہمی تعاون کے وسیع نظام کا نام نظامِ[2] حکومت ہے اس کے سربراہ کو خلیفۃ المسلمین

---

[1] مثلاً عدل و انصاف اور مظلوموں کی فریاد رسی کے لئے پنچائتوں یا عدالتوں کا قیام، غریبوں اور کمزوروں کے وظائف، تعلیم و تربیت کے لئے تعلیمی اور اصلاحی ادارے، بیماروں کی تیمارداری کے لئے ہسپتال اور شفا خانے، ملک و قوم کی حفاظت کے لئے قوتِ دفاع یعنی فوج اور سامان جنگ وغیرہ۔

[2] مقصد یہ ہے کہ تمام فرائض جو حکومت کے فرائض قرار دیئے جاتے ہیں اسلام نے ان کو اہل ایمان کے شخصی اور ذاتی فرائض قرار دیا ہے ۔ اسلامی تعلیم کے بموجب اگر ان فرائض کا احساس ہوگا تو اس کا مبارک نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت کوئی ہیئت جابرہ اور جبرہ دست طاقت نہیں ہوگی جو قانون کے ذریعہ اپنی جبرہ دستی کا مظاہرہ کرے بلکہ نظامِ حکومت ذریعہ تعاون اور امداد باہمی کا ایک رابطہ ہوگا جس میں ہر ایک فریق (باقی آئندہ صفحہ پر)

کہا جاتا ہے یعنی تمام مسلمانوں کا نائب اور اُن کا قائم مقام۔

مالی نظام سیرۃ مبارکہ کا دامن اس جبر و قہر سے پاک ہے جو ٹیکسوں کے وصول کرنے کے لئے عمل میں لایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظامِ حکومت کی مالی ضرورتوں کے پُورا کرنے کے لئے جو مالیہ وصول کیا جائے اسلام نے اس کی بنیاد بھی تزکیہ پر رکھی ہے۔

خود غرضی، حرص و طمع، حُبِّ مال اور بخل وہ ناپاک خصلتیں ہیں جن سے نفسِ مومن کا پاک ہونا ضروری ہے۔ یہ نفس کی خباثت ہے کہ دولت و ثروت کی محبّت قومی اور ملّی ضرورتوں سے اس کی آنکھ بند کر دے۔

جس طرح نماز روزہ فرض ہے ایسے ہی جہاد بھی فرض ہے جو مال سے بھی ہوتا ہے اور جان سے بھی جو اسلام اور ایمان کا دعویٰ کرتا ہے، اس کی بیداری یہ ہے کہ مسلسل[۱] جہاد کرتا رہے۔ صاحبِ مال جہاد بالمال بھی کرے گا۔ یہ جہاد درحقیقت خود اپنے نفس سے ہوگا۔ وہ نفس جو بارگاہِ بخل[۲] اور دربارِ حرص و طمع میں ہر وقت حاضر رہتا ہے اس کو مجبور کرنا ہوگا کہ وہ اس ظلمت کدہ سے نکلے۔ خود غرضی کی غلاظت سے اپنا دامن پاک کرے[۳]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دوسرے کا مددگار احسان مند اور دعاگو ہوگا قوم اپنے سربراہ اور اس کے کارپردازوں کی شکر گذار اور احسان مند اس لئے ہوگی کہ اُن کے ذریعہ اس کے ذاتی فرائض حسن و خوبی سے انجام پا رہے ہیں۔ سربراہ اور اس کے عمال قوم کے شکر گذار اس لئے ہوں گے کہ قوم کے تعاون نے اُن کی ذمہ داری کی مشکلات کو آسان کر دیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے جو اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ترجمہ یہ ہے: "تمہارے بہترین سربراہ وہ ہیں کہ تم اُن سے محبّت کرو وہ تم سے محبّت رکھیں۔ تم اُن کو دعائیں دو وہ تم کو دعائیں دیں اور بدترین سربراہ وہ ہوں گے کہ تم اُن سے بغض رکھو وہ تم سے بغض رکھیں۔ تم اُن پر لعنت بھیجو وہ تم پر لعنت بھیجیں (مسلم شریف ص ۱۲۹ ج ۲) [۱] اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ (التوبہ) [۲] وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ (النساء) [۳] وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الحشر)

ہنگامی اور غیر معمولی ضرورتوں کے لیے جو امداد حاصل کی جائے قرآن حکیم نے اس کو انفاق فی سبیل اللہ یا قرض کا عنوان دیا ہے۔ لیکن ایک مقررہ چندہ جو صاحبِ نصاب پر سال بسال فرض ہوتا ہے، اُس کا نام زکوٰۃ ہے کیونکہ اس کا مقصد تزکیہ ہے۔ یعنی نفس مومن کو بخل کی آلودگی سے پاک کرنا۔ اس تمہید کے بعد ارشادِ ربّانی کے مضمرات پر گہری نظر ڈالئے۔

ارشادِ ربّانی ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (سورہ ۹ توبہ آیت ۱۰۳)

(ترجمہ) "(اے رسول) اُن لوگوں کے مال سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو (یہ اس لئے کہ) تم اُن کو (بخل اور حُبِّ مال کی پلیدی سے) پاک کرو اور اُن کا تزکیہ کرو۔ (اُن کو سدھاؤ اور اُن کی تربیت کرو کہ ہمدردی خلق خدا، سیر چشمی، داد و دہش اور امداد باہمی وغیرہ کے وہ عادی ہو جائیں اور یہ باتیں اُن کی طبیعت ثانیہ بن جائیں) اور اُن کو دعا دو۔ بیشک آپ کی دُعا اُن کے دلوں کے لئے راحت و سکون ہے۔"

حُبِّ مال سے صحابۂ کرام کے مبارک قلوب کس درجہ پاک ہوئے، حضرات مہاجرین اور حضرات انصار کی قربانیاں اس کی مثال پیش کرتی ہیں۔ حضرات مہاجرین کے پاس جو کچھ تھا وہ انھوں نے مکّہ میں خرچ کیا اور اس حالت میں مدینہ پہنچے کہ قرآن حکیم نے اُن کے لئے لفظ فقراء[1] استعمال کیا۔

حضرات انصار کی قربانیاں آپ اسی کتاب میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ تمام جائدادیں نصف نصف تقسیم کر چکے۔ پھر بھی اُن کی آرزو رہتی تھی کہ راہِ خدا میں زیادہ سے زیادہ خرچ کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین کی جائیدادوں سے اُن کے نقصانات کی کچھ تلافی کرنی

---

[1] سورہ حشر لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ

چاہی تو اُس کو لینے سے معذرت کر دی کہ پہلے مہاجرین کو آپ عنایت فرمائیں تب یہ جائیدادیں لیں گے ورنہ ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

حُبِّ جان سے تزکیہ کا اندازہ کرنے کے لئے اُس بے پناہ شوقِ شہادت پر نظر ڈالئے جو ان حضرات کے مبارک دلوں اور سینوں میں بھر دیا گیا تھا۔

فزت ورب الکعبہ۔ ("میں کامیاب ہوگیا ہوں خدا کی قسم") کسی مجاہد نے دشمن کے قتل کرنے پر نہیں کہا تھا۔ حرام بن ملحان کے جب دھوکہ سے نیزہ مارا گیا اور خون کا فوارہ اُبل پڑا تو اس خونِ شہادت سے وضو کرتے ہوئے آپ نے نعرہ لگایا تھا:[1]

فزت ورب الکعبہ۔ "رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا"

(میں اپنی مراد کو پہونچ گیا) یہ پَرتو تھا اُس آرزو شہادت کا جس کے لئے سیدالانبیاءؐ کا قلب مبارک بیتاب رہا کرتا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے میری تمنا ہے کہ راہِ خدا میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔[2]

حضرت عبداللہ بن حبشی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: سب سے افضل جہاد کون سا ہے؟ ارشاد ہوا: من عقر جوادہ واھرق دمہ۔[3] "جس کا گھوڑا بھی مارا گیا اور خود اس کا خون بھی بہا دیا گیا۔"

تزکیہ کا عجیب وغریب طریقہ	مرض کے علاج کی یہ صورت بھی ہوسکتی ہے کہ کسی مقوی خمیرہ سے بدن کی اصل طاقت کو بڑھایا جائے تو قوّتِ عزیزیہ مرض کو دور کر دیگی۔

شراب جو عرب کی گھٹی میں پڑی تھی اس کے انسداد کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔

وحی الٰہی ناطق ہوئی:

---

[1] قال بالدم ھٰکذا فنضحہ علی وجھہ ورأسہ ثم قال فزت ورب الکعبہ بخاری شریف ص۵۸۶ اشارہ کر کے بتایا کہ خون کو اس طرح چلّو میں لیا اور اس کو چہرے پر ڈالا سر پر چھڑکا اور کہا فزت ورب الکعبہ

[2] بخاری شریف ص۳۹۲ [3] (ابوداؤد شریف باب بعد باب فی فضل التطوع فی البیت ص۲۱۱ وص۲۱۲ مجتبائی)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (سورہ ۴ نساء، آیت ۴۳)

"مسلمانو! (ایسا نہ کرو کہ تم نشہ کی حالت میں ہو اور نماز پڑھنی شروع کر دو) نشہ کی حالت میں تو نماز کے پاس بھی نہ جاؤ (نماز کے لئے ضروری ہے کہ) تم ایسی حالت میں ہو کہ جو کچھ زبان سے کہو ٹھیک طور پر اسے سمجھتے ہو۔"

یہ ارشاد ربانی خمیرہ مقوی تھا۔ نماز اور اپنے خالق کی بارگاہ میں سر نیاز خم کرنے کی عادت ہو چکی تھی۔ شوقِ نماز نے شوق نشہ کو کافور کر دیا۔ شراب سے وحشت ہونے لگی۔ محفل میں دَور اب بھی چلتا تھا۔ مگر دلوں کا سرور ختم ہو چکا تھا۔ اچانک حُرمت شراب کا اعلان ہو گیا تو نہ شراب باقی رہی نہ محفل شراب۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح، حضرت ابی بن کعب، حضرت ابو طلحہ (رضی اللہ عنہم) جیسے اکابر کی مجلس تھی۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ ساقی میں خود تھا۔ میں عمر میں بھی سب سے کم تھا۔ منادی کی آواز کانوں میں پڑی مجھ سے کہا گیا، باہر نکل کر دیکھو، آواز کیسی ہے۔ میں نے آواز سنی اور آکر کہا۔ اعلان ہو رہا ہے: الا انّ الخمر قد حرمت "(آگاہ ہو جاؤ، شراب حرام کر دی گئی ہے")۔

میزبانِ محفل صاحب خانہ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے فوراً فرمایا "جاؤ مٹکے اُنڈھا دو۔" میں نے تعمیل کی۔ اب پورے مدینہ کی حالت یہ تھی کہ شراب گلیوں میں بہہ رہی تھی۔ جیسے ہی اعلان کانوں میں پڑا مٹکے اوندھے کر دیئے گئے کسی نے اس تحقیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھی کہ اعلان کون کر رہا ہے، کس بنا پر کر رہا ہے [1]

تزکیہ کا عجیب و غریب نمونہ جینا و بال جان

ایک مومن [2] کامل سے زنا سرزد ہو گیا۔ دوسرے موقع پر یہی حرکت ایک مومنہ سے بھی سرزد ہو گئی۔ تلافی کا ایک راستہ

---

[1] بخاری شریف ص ۹۹۲ ج ۲ [2] مسلم شریف ص ۶۸ ج ۲

یہ بھی تھا کہ پورے اخلاص کے ساتھ توبہ کرلیتے۔ نا اُمیدی کی کوئی وجہ نہیں تھی جب کہ ارشادِ ربانی کا سہارا موجود تھا:

"اے میرے بندو، جنھوں نے زیادتی کی اپنے اوپر (گناہ کئے)، نا اُمید مت ہو اللہ کی رحمت سے۔ اللہ تعالیٰ سب گناہ بخش دیتا ہے۔"	يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا (سورہ ۳۹ الزمر آیت ۵۳)

مگر آئینہ کو مانجھنے سے بہتر یہی ہے کہ آئینہ ہی کو توڑ دیا جائے۔ وہ آئینہ ہی کیا جس پر دھبّہ پڑ گیا۔ غور فرمائیے اس سے زیادہ تزکیہ کیا ہوسکتا ہے کہ خود اپنی جان وبال ہونے لگے۔ یہ صاحب اُن کا نام ماعز تھا۔ ابن مالک۔ خدمتِ مبارک میں حاضر ہوئے۔ فریاد کر رہے تھے:

یا رسول اللہ طھرنی	"یا رسول اللہ مجھے پاک کر دیجئے۔"
ارشاد ہوا: ویحك ارجع فاستغفر اللہ وتب الیہ۔	بندہ خدا! جاؤ، استغفار کرو، توبہ کرلو۔"

یہ ارشاد سُن کر کچھ چلے۔ مگر دلِ مضطر کا اضطراب ختم نہیں ہوا، پھر لوٹ کر آئے فریاد کرتے ہوئے آئے:

یا رسول اللہ طھرنی۔	"یا رسول اللہ مجھے پاک کر دیجئے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر واپس کر دیا۔ تین مرتبہ اسی طرح ان کو واپس کیا۔ مگر اُن کے اضطراب نے ہر مرتبہ انھیں لوٹنے پر مجبور کیا تب چوتھی مرتبہ فرمایا۔ کس ناپاکی سے پاک کردوں۔ عرض کیا یا رسول اللہ میں نے زنا کیا ہے[1]۔ پھر آپ نے باقاعدہ چار مرتبہ اقرار کیا

---

[1] آپ نے یہ بھی فرمایا: تمہیں جنون تو نہیں ہوگیا ہے۔ تمہیں شراب کا نشہ تو نہیں ہے۔ حضرت ماعز نے انکار کیا اور اپنے اعتراف پر قائم اور پاک کرنے کے لئے اصرار کرتے رہے۔ حضرت ماعز پھر بھی مرد تھے۔ اُن سے زیادہ حیرت انگیز اور سبق آموز واقعہ قبیلہ غامد کی ایک خاتون کا ہے۔ اس نے آکر اسی طرح (باقی صفحہ آئندہ پر)

اس کے بعد رجم کا حکم صادر کیا گیا۔ چنانچہ ان کو سنگسار کر دیا گیا۔ مگر یہ جو پاک ہونے کے لئے مضطرب تھے اب ان کی پاکی ملاحظہ فرمایئے۔ انھیں ماعز کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی کہ ایسی توبہ کی ہے کہ اگر پوری اُمت پر بانٹ دی جائے تو سب کے لئے کافی ہو جائے۔ [1]

تزکیہ۔ جو بعثت مبارکہ کا اہم مقصد تھا۔ اس کو کس طرح عمل کے پیرایہ میں جلوہ گر فرمایا۔ اس کی وضاحت کے لئے یہ چند مثالیں کافی ہیں۔ ان سے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ یہ مقصد کس درجہ ہمہ گیر ہے۔

اس کتاب میں یا کسی ایک کتاب میں اس کے تمام شعبے بیان نہیں کئے جا سکتے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اعتراف کیا اور یہی اصرار کیا۔ طہّرنی۔ مجھے پاک کر دیجئے۔ یہ حاملہ تھی۔ آپ نے فرمایا: پہلے ولادت سے فارغ ہو لو۔ جب بچہ ہو گیا تو پھر آئی اور اصرار کیا طہّرنی۔ مجھے پاک کر دیجئے آپ نے فرمایا۔ ابھی بچہ کو دودھ پلاؤ۔ دودھ چھوٹنے کے بعد پھر آئی۔ بچہ گود میں اور اس کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا۔ اور یہی اصرار کہ مجھے پاک کر دیجئے۔ فرمایا بچہ کا ذمہ دار کون ہوگا۔ ایک انصاری نے بچہ کا ذمہ لیا تب اس کو رجم کیا گیا۔ (مسلم شریف ج۲ ص۶۸) حیرت انگیز اور قابل قدر یہ ہے کہ یہ معاملہ خود اس کے اقرار پر تھا، شہادتوں سے اس کا ثبوت نہیں ہوا تھا تو جس مرحلہ پر بھی اعتراف کرنے والا مجرم اپنے جرم کا انکار کر دے اس پر حد نہیں جاری ہوگی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سوال کر کے کہ تمہیں جنون تو نہیں ہو گیا تم نے نشہ تو نہیں پی رکھا۔ بار بار موقع دیا کہ وہ کسی طرح اپنے جرم کا انکار کر دے۔ اس خاتون کو ولادت پر دودھ پلانے تک کی مہلت دیکر انکار کر دینے کا موقع دیا۔ مگر حیرت ہوتی ہے ان کا ایمان اور اپنے ناپاک ہو جانے کا یقین اتنا مضبوط تھا کہ کسی صورت سے بھی اس میں جنبش نہیں ہوئی اور جس طرح پہلے اعتراف کے وقت اپنی زندگی کو وبال جان سمجھ رہے تھے۔ آخر تک وہ ان کو وبال ہی معلوم ہوتی رہی مگر اس ایمان محکم کا یہ نتیجہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کی توبہ کی تعریف کی تھی اس خاتون کے متعلق بھی فرمایا کہ ایسی توبہ کی ہے کہ بڑے سے بڑا ظالم بھی ایسی توبہ کرے تو بخشا جائے

[1] مسلم شریف ج۲ ص۶۸

لہٰذا یہ کوشش لاحاصل ہے۔ البتہ اتنی تفصیل بیان کردینی ضروری ہے جس سے شب و روز کی زندگی میں تزکیہ کا نقشہ اور تزکیہ والے کی ایک تصویر سامنے آجائے۔

رات دن میں جو کام انسان عادۃً کرتا ہے۔ اور سونے جاگنے، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے میں جو حالات سامنے آتے رہتے ہیں۔ اور گذارتے رہتے ہیں، اُن کے آداب کیا ہیں جن کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی۔ اور بندہ اور اُس کے خالق کے تعلق کو کس طرح نمایاں فرمایا۔

آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمایئے اور یہ بھی خیال فرمایئے کہ یہ محض زبانی تعلیمات نہیں ہیں، بلکہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال اور معمولات ہیں جن سے یہ تعلیمات اخذ کی گئی ہے۔

شب و روز کے حالات و معمولات کا تزکیہ (سنوار)

اسلامی تہذیب کے بنیادی اصول، آداب اور دُعائیں، عمل اور تعلیم پاک زندگی کیسی ہوتی ہے۔

بنیادی اصول ارشاد ربانی ہے:

۱۔ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿﴾ (سورہ ۲ بقرہ)

"بس تم یاد رکھو مجھکو۔ میں یاد رکھوں تم کو اور احسان مانو میرا اور ناشکری مت کرو۔"

(شاہ عبدالقادرؒ)

۲۔ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ﴿﴾ (سورہ ۱۴ ابراہیم)

"اگر حق مانوگے۔ تو اور دوں گا۔ اور ناشکری کروگے تو میری مار سخت ہے۔" (شاہ صاحبؒ)

۳۔ اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ﴿﴾ وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿﴾ (احزاب آیت ۴۱ و ۴۲)

"یاد کرو اللہ کو بہت سی یاد۔ اور پاکی بولو اس کی صبح و شام۔" (ایضاً)

۴۔ فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ (نساء آیت ۱۰۳)

"جب نماز ادا کرچکو تو یاد کرو اللہ کو کھڑے بیٹھے۔ اور پڑے۔"

۵۔ وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ ﴿﴾ (سورہ ۷ الاعراف)

"اور یاد کر اپنے رب کو دل میں عاجزی کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے اور زبان سے بھی آہستہ آہستہ بغیر پکارے اور ایسا نہ کرنا کہ غافلوں میں سے ہوجاؤ۔"

۶۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴿﴾ (سورہ ۴۷ محمد)

"اور وہ جو کافر ہیں عیش کرتے ہیں اور اس طرح کھاتے ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں اور جہنّم ان لوگوں کا ٹھکانا ہے۔"

۷۔ وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا۟ فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا ٱلْقَوْلُ فَدَمَّرْنَٰهَا تَدْمِيرًا ۝ (سورہ ۱۷ اسراء)

"اور جب کسی بستی کی تباہی آنی ہوتی ہے تو (اس کی ترتیب یہ ہوتی ہے) اُس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں (نبی کے ذریعہ اُن پر احکامِ شریعت نازل کرتے ہیں) پھر وہ بجائے اس کے کہ تعمیل کریں نافرمانی میں سرگرم ہوجاتے ہیں (فسق و فجور کرنے لگتے ہیں) پس اُن پر عذاب کی بات (بربادی کا قدرتی قانون) ثابت ہوجاتی ہے اور (پاداشِ عمل میں) اُن کو برباد و ہلاک کر ڈالتے ہیں۔"

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: سَبَقَ الْمُفَرِّدُوْنَ[۲] "سبقت لے گئے المفردون۔"

صحابہ کرام ——— یا رسول اللہ المفردون کون؟

ارشاد ہوا اَلذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرَاتِ[۱] "وہ مرد اور عورتیں جو کثرت سے اللہ کا ذکر کرتی ہیں۔"

آیاتِ بالا اور حدیث ان اصول کی تعلیم دے رہی ہے جن پر اسلام کی کامل و مکمل تہذیب[۳] کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل اور تعلیم سے رکھی ہے۔

مثبت ——— ذکر اللہ، شکر، تسبیح، تکبیر، عاجزی، خوفِ خدا۔

---

[۱] مسلم شریف ص ۲۲۴ ج ۲ [۲] لغت کے لحاظ سے معنٰی ہیں۔ الگ ہوجانے والے یکسو ہوجانے والے۔

[۳] یہ جشن، جلوس، باجے اور گانے جو دوسری تہذیبوں کے لوازم ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ان کے مذہب کی تعلیمات بھی ہیں، اسلامی تہذیب کے مزاج کے خلاف اور اسلامی تعلیمات کے لئے ناقابلِ برداشت ہیں۔ اسی لئے ان کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ انتہا یہ کہ حالاتِ جنگ میں جہاں شوکت و حشمت کا اظہار ضروری سمجھا جاتا ہے بطور ریاء کی وہاں بھی اجازت نہیں ہے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر کفارِ قریش بڑی شان (باقی صفحہ آئندہ پر)

منفی ——— جو ناشکری سے پاک ہو۔ اَنعامٌ یعنی مویشی (ڈھوروں اور ڈنگروں) کی مشابہت (جس کو احادیث میں شیطانی عمل کہا گیا ہے) اُس میں نہ ہو اور اُس میں تعیش (عیش پرستانہ اور شاہانہ انداز) نہ ہو۔ یعنی اس میں سادگی ہو، سنجیدگی ہو اور کفایت شعاری ہو۔

ان اصول کو سامنے رکھئے اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور آپ کی تعلیمات ملاحظہ فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق بخشے۔

دلیل صداقت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل سامنے آئے تو یہ بھی غور فرمائیے کہ کیا ایسا شخص (معاذ اللہ) جھوٹا ہو سکتا ہے؟ اور یہ بھی خیال فرمائیے کہ تعلیم سے زیادہ عمل ہے جو تلاوت آیات اللہ کی تشریح کرتا ہے۔

ذکر اللہ

حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ کی اس درخواست کے جواب میں (کہ کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جس کا میں پابند رہوں) ارشاد ہوا:

لَا یزال لسانك رطبا من ذكر الله.

"تمہاری زبان ہر وقت یادِ خدا میں تر رہنی چاہیئے"[1]

علماء نے اس کی تشریح یہ بھی فرمائی ہے کہ جس وقت اور جس حالت کے لئے جو دعاء احادیث میں وارد ہوئی ہے وہ اس موقع پر پڑھی جائے۔ مگر یہ ذکر اللہ کا ہلکا درجہ ہے۔ آیاتِ بالا میں ہدایت ہے کہ ذکر کثرت سے کرو۔ کھڑے، بیٹھے اور لیٹنے کی حالت میں بھی اللہ کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کے ساتھ اپنی طاقت پر گھمنڈ کرتے ہوئے مکہ سے روانہ ہوئے تھے۔ حضرت حق جل مجدہ نے مسلمانوں کو اس سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ولا تكونوا كالذين خرجوا من ديارهم بطرًا ورئاء الناس. (سورۂ الانفال آیت ۴۷) (ترجمہ) "اور ان جیسے نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کی نظر میں نمائش کرتے ہوئے نکلے۔"

[1] مشکوٰۃ شریف۔ مسند امام احمد بن حنبل

ذکر کرتے رہو۔" (آیت نمبر ۴)

"ذکر ہلکی آواز سے ہو اور دل سے بھی ہو[1]۔ غفلت[2] کسی وقت نہ ہو" (آیت نمبر ۵)

ان آیات کا تقاضا صرف اُن دعاؤں کے لئے پڑھ لینے سے پورا نہیں ہوتا، جو مختلف حالات کے متعلق احادیث میں وارد ہوئی ہے جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ کیونکہ آیات کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی یاد زیادہ سے زیادہ ہو اور ہر حالت میں ہو۔

سیدالانبیاء رحمۃ للعالمین صلّی اللہ علیہ وسلم کی شان یہاں بھی نرالی ہے۔ وہ تمام اوراد و وظائف جو حضرات علماء کرام اور مختلف سلسلوں کے مشائخ طریقت کی تعلیمات میں رائج ہیں ان سب کا مصدر و ماخذ وہ سینہ مبارک ہے جو گنجینہ اسرار و معارف تھا۔

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

صرف استغفار کے متعلق حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہم گن لیا کرتے تھے کہ ایک ہی مجلس میں آپ کی زبان مبارک سے سو مرتبہ یہ کلمات صادر ہوجایا کرتے تھے:

رب اغفرلی وتب علی انک انت التواب الرحیم۔

"اے میرے رب میری مغفرت فرما اور مجھ پر نظر عنایت فرما۔
بیشک تو بہت توبہ قبول کرنے والا بہت رحمت والا ہے۔"

یہ زبان مبارک کا ذکر تھا اور قلبِ مبارک کی شان یہ تھی کہ وہ حالت خواب میں بھی بیدار رہتا تھا۔ اور حضرت حق کی طرف اتنا متوجہ کہ آپ کی رُویا (خواب) بھی وحی[3] ہوتی تھی۔ گہرے مراقبہ میں قلب زیادہ سے زیادہ متوجہ رہتا ہے اور اعضاء بے حس و حرکت۔ تقریباً یہی شان ہوتی تھی جب چشم نیم باز محو خواب ہوتی تھی ان عینی تنامان ولا ینام قلبی[4]

---

[1] حضرات مشائخ طریقت رحمہم اللہ ذکر کی مختلف صورتیں بتاتے ہیں۔ ذکر بالجہر، ذکر خفی، ذکر اخفی وغیرہ۔ پاس انفاس، مراقبہ وغیرہ ان کا ماخذ اسی طرح کی آیتیں ہیں۔ [2] قلب میں ذکر اللہ جاری اور مراقبہ قائم ہے۔
[3] بخاری شریف ص۲۵ [4] بخاری شریف ص۱۵۲

شب و روز کے حالات و معمولات اور اُن کے آداب و دُعائیں[ع]

جو حالات و معمولات ذیل میں بیان کئے جارہے ہیں اُن کے متعلق بہت سی دُعائیں روایات میں وارد ہیں۔ حضرات محدثین نے اُن کو ضخیم جلدوں میں جمع کیا ہے۔ ہم یہاں مختصر آداب اور صرف ایک ایک دعا پیش کر رہے ہیں۔ نمونہ اور مثال مقصود ہے۔ استیعاب کا نہ مقام ہے نہ مقصود۔ اللہ تعالیٰ ان نمونوں پر ہی عمل کی توفیق بخشے۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ

معمولات شب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے ایک تہائی رات تک نماز عشاء پڑھ لی جائے اس کے بعد آرام کیا جائے قصہ کہانی اور باتوں کے لئے مجلس جانا درست نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عشاء سے پہلے سوجانے اور نماز عشاء کے بعد باتیں کرنے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔[۱] البتہ سفر یا علمی یا ملّی ضرورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔[۲]

ارشاد ہوا جب آپ سونے کا ارادہ کریں تو وضو کیجئے۔ جیسے نماز کیلئے وضو کی جاتی ہے[۳]۔ جب لیٹنے کا ارادہ کریں تو پہلے بستر کو جھاڑ لیں[۴]۔ لیٹنے لگیں تو یہ[۵] دعا پڑھیں:

باسمك ربي وضعت جنبي، وبك	" تیرے ہی نام پر اے میرے پروردگار میں
ارفعه ان امسكت نفسي	نے اپنی کروٹ (بستر پر) رکھی ہے اور تیرا ہی
فارحمها وان ارسلتها	نام لیکر اس کو اٹھاؤں گا اگر تو میری جان کو
فاحفظها بما تحفظ به	روک لے (اسی حالت میں انتقال ہوجائے)
عبادك الصّالحين۔	تو اس پر رحم فرما اور اگر میری جان کو چھوڑ دے

---

[۱] حدیث ابی ہریرہ ترمذی شریف باب کراہیۃ النوم قبل العشاء والسمر بعدہا۔

[۲] ترمذی شریف باب ما جاء فی الرخصۃ فی السمر بعد العشاء [۳] بخاری شریف ص ۹۳۴ [۴] ایضاً

[۵] ایضاً ع احقر کا رسالہ " دعائیں " ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں تمام دعائیں جمع کردی ہیں۔ ترجمہ بھی ساتھ ہے اور دعاؤں پر زیر زبر بھی لگا دیئے ہیں۔

(زندگی میں بیدار ہو جاؤں) تو اس کی اسی طرح حفاظت فرما جس طرح تو اپنے نیک بندوں کی حفاظت کیا کرتا ہے۔"

پھر آپ دہنی کروٹ پر لیٹیں۔ داہنا ہاتھ رخسار کے نیچے رکھ لیں اور یہ دعا پڑھیں:[1]

اَللّٰھُمَّ اَسْلَمْتُ وَجْھِیْ اِلَیْکَ وَ فَوَّضْتُ اَمْرِیْ اِلَیْکَ وَاَلْجَاتُ ظَھْرِیْ اِلَیْکَ رَھْبَۃً وَّرَغْبَۃً اِلَیْکَ۔

"اے اللہ میں نے اپنی ذات تجھے سونپ دی اپنا معاملہ تیرے سپرد کر دیا۔ اپنی کمر تیری پناہ میں دیدی تیرے جلال سے ڈرتے ہوئے اور تیری رحمت اور تیرے لطف و کرم کی طرف رغبت کرتے ہوئے۔

لَامَلْجَاءَ وَلَا مَنْجَا مِنْکَ اِلَّا اِلَیْکَ۔

نہیں کوئی پناہ اور نہ تجھ سے نجات پانے کی جگہ۔ مگر تیری ہی طرف (تیرا ہی دامن)

اٰمَنْتُ بِکِتَابِکَ الَّذِیْ اَنْزَلْتَ وَ نَبِیِّکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ۔

میں ایمان لایا تیری کتاب پر جو تو نے نازل کی اور ایمان لایا میں تیرے نبی پر جس کو تو نے بھیجا۔"

حضرت[2] فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ بھی بتایا تھا کہ جب سونے کو لیٹو تو سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ، الحمد للہ ۳۳ مرتبہ اللہ اکبر ۳۴ مرتبہ پڑھ لیا کرو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قل ھو اللہ اور معوذتین بھی تین تین مرتبہ پڑھا کرتے تھے، ہر مرتبہ دونوں دست مبارک پر دم کرتے۔ دونوں ہاتھ بدن کے سامنے کے حصے پر پھیر لیتے تھے۔[3]

بیداری کے وقت یہ دعا:

الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور۔

"تمام تعریفیں اس خدا کے لئے جس نے ہمیں زندہ کیا اس کے بعد کہ ہمیں مار دیا تھا (سلا دیا تھا) اور اللہ ہی کی طرف ہے مرنے کے بعد زندہ ہو کر جانا۔"

---

[1] ایضاً بخاری شریف ص۹۳۴ [2] بخاری شریف ص۹۳۵ [3] ایضاً بخاری شریف ص۹۳۵ و ص۷۵۰

نیز یہ دعاء:

اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ وَرَبَّ
الْاَرْضِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ
رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ فَالِقَ
الْحَبِّ وَالنَّوٰى. وَمُنْزِلَ التَّوْرٰىةِ
وَالْاِنْجِيْلِ وَالْفُرْقَانِ اَعُوْذُبِكَ
مِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْءٍ اَنْتَ اٰخِذٌ
بِنَاصِيَتِهٖ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ
فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْاٰخِرُ
فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ. وَاَنْتَ
الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ
الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ
اِقْضِ عَنَّا الدَّيْنَ وَاَغْنِنَا
مِنَ الْفَقْرِ.

"اے اللہ اے آسمانوں کے پروردگار زمین
کے پیدا کرنے والے اور عرش عظیم کے مالک آپ
ہمارے پروردگار اور ہر چیز کے مالک اور پروردگار
دانے کو پھاڑنے والے۔ گٹھلی کو چیرنے والے
(جس سے پودا نمودار ہو) تورات انجیل
اور قرآن کو نازل کرنے والے میں تیری پناہ لیتا
ہوں ہر اس چیز کے شر سے جس کی تو پیشانی کے
بال پکڑے ہوئے ہو جو تیرے قبضہ قدرت میں ہے
اے اللہ تو ہی ہے اوّل۔ پس تجھ سے پہلے
کوئی نہیں اور تو ہی آخر پس کوئی نہیں جو تیرے بعد ہو
اور تو ہی ہے ظاہر بس تیرے اوپر کوئی نہیں اور
تو ہی ہے باطن بس تیرے ورے (تجھ سے زیادہ
نزدیک کوئی نہیں) ادا کردے ہمارے ذمہ سے
قرض اور بے نیاز کردے ہم کو فقر سے۔"

تہجد کے وقت جو دعائیں پڑھا کرتے تھے اُن میں ایک یہ بھی تھی:

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَيِّمُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ
وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ

"اے اللہ تیرے ہی لئے ہے سب تعریف تو ہی
ہے قائم رکھنے والا آسمانوں اور زمین کا اور اُن
چیزوں کا جو اُن میں ہیں اور تیرے ہی لئے ہے
تمام تعریف تو ہی ہے نور (رونق) آسمانوں کی

---

۱ بخاری شریف ص۹۳۴ ۲ مسلم شریف ص۳۴۸

اَلْحَمْدُ اَنْتَ مَلِكُ السَّمٰوَاتِ	زمین کی اور اُن تمام چیزوں کی جو اُن میں ہیں
وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيهِنَّ وَ	اور تیرے ہی لئے ہے حمد۔ تو ہی بادشاہ آسمانوں
لَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ الْحَقُّ وَ	کا زمین کا اور ان سب کا جو ان میں ہیں اور
وَعْدُكَ الْحَقُّ وَ لِقَاءُكَ حَقٌّ	تیرے لئے ہی ہے تعریف تو ہی ہے حق تیرا وعدہ حق تیرے
وَقَوْلُكَ حَقٌّ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ	سامنے حاضر ہونا حق تیرا قول حق جنّت حق دوزخ
وَالنَّارُ حَقٌّ وَالنَّبِيُّوْنَ حَقٌّ	حق، تمام انبیاء حق، محمدؐ حق قیامت حق
وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ حَقٌّ	اے اللہ میں تیرا مطیع ہوں، تجھ پر ایمان
اَللّٰهُمَّ لَكَ اَسْلَمْتُ وَ بِكَ	لایا، تجھ پر ہی بھروسہ رکھتا ہوں، تیری
اٰمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْكَ	ہی طرف رجوع ہوتا ہوں اور تیرے ہی لئے
اَنَبْتُ وَبِكَ خَاصَمْتُ وَ اِلَيْكَ	مخاصمت کرتا ہوں اور تجھ ہی کو اپنا منصف
حَاكَمْتُ فَاغْفِرْلِي مَا قَدَّمْتُ	بناتا ہوں پس بخش دے ان (گناہوں) کو
وَمَا اَخَّرْتُ وَ مَا اَسْرَرْتُ	جو میں نے آگے کئے اور جو پیچھے کئے اور جو
وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ	چھپا کر کئے اور جو علانیہ کئے اور وہ تمام گناہ
بِهٖ مِنِّيْ لَا اِلٰهَ اَنْتَ اَنْتَ	جن کو میں نہیں جانتا تو اُن کو مجھ سے بہت
الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا	زیادہ جانتا ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے
اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ. وَ لَا اِلٰهَ	تو ہی ہے آگے لانے والا اور تو ہی ہے پیچھے
غَيْرُكَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ	رکھنے والا۔ صرف تو ہی معبود ہے تیرے سوا
اِلَّا بِاللّٰهِ.	کوئی معبود نہیں اور نہیں کوئی غور و فکر کی طاقت
	(تدبیر) نہ کوئی عمل کی قوت تیرے بغیر"

نمازِ تہجّد اور دُعاء

ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی خالہ تھیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما

کو اپنے بچپن ہی میں شوق ہوا کہ دیکھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کس طرح پڑھتے ہیں چنانچہ رات کو خالہ میمونہ کے یہاں پہنچ گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:
جب رات کا ایک حصہ گذر گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے۔ قضاء حاجت کے بعد آپ مشکیزہ پر تشریف لے گئے جو لٹکا ہوا تھا۔ بڑے اطمینان سے پوری طرح وضو کیا۔ اچھی طرح مسواک فرمائی اسی اثناء میں آپ نے سورۂ آل عمران کا آخری رکوع پورا پڑھا۔ پھر آپ نے اطمینان سے نماز شروع کی۔ میں نے بھی آپ کے بائیں جانب کھڑے ہو کر نیت باندھلی۔ آپ نے دست مبارک میرے کان پر رکھا اور مجھ کو دائیں جانب کر لیا۔[1]

تہجد کے بعد آپ نے جو دعا مانگی اس میں یہ بھی تھا:[2]

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا	"اے اللہ میرے دل میں نور بھر دے
وَفِیْ بَصَرِیْ نُوْرًا وَفِیْ سَمْعِیْ	میری سماعت میں نور بھر دے
نُوْرًا وَعَنْ یَمِیْنِیْ نُوْرًا وَعَنْ	میرے دائیں نور کر دے میرے بائیں
یَسَارِیْ نُوْرًا وَفَوْقِیْ نُوْرًا وَتَحْتِیْ	نور کر دے میرے اوپر نور کر دے میرے
نُوْرًا وَاَمَامِیْ نُوْرًا وَخَلْفِیْ نُوْرًا	نیچے نور کر دے میرے آگے نور کر دے میرے
وَاجْعَلْ لِّیْ نُوْرًا.	پیچھے نور کر دے اور میرے لئے نور مقرر کر دے۔"

تہجد میں قراءت

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تہجد میں عموماً گیارہ رکعت پڑھا کرتے تھے۔ پہلے چار رکعت، مت پوچھو وہ کس قدر طویل اور کس قدر پُر لطف ہوتی تھیں۔ پھر چار رکعت، مت پوچھو کہ وہ کس قدر طویل اور کس قدر پر کیف ہوتی تھیں۔ پھر تین رکعت پڑھا کرتے تھے۔[3]

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ نے چار رکعتوں میں چار سورتیں ختم کیں، سورہ بقرہ، سورہ آل عمران، سورہ نسا اور سورہ مائدہ یا سورہ الانعام (گویا ایک

---

[1] بخاری شریف ص۲۲ و ص۱۲۵ و ص۳ [2] بخاری شریف ص۹۳۵ [3] بخاری شریف ص۱۵۴

چوتھائی قرآن شریف پڑھ لیا۔[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب بڑھاپے کی وجہ سے ضعف غالب ہوگیا تو آپ قرأت بیٹھ کر کیا کرتے تھے اور جب تیس چالیس آیتیں رہ جاتیں تو کھڑے ہوکر پڑھا کرتے تھے۔[2]

تاریکیٔ شب انہیں انوار سے منور رہتی تھی۔ یہاں تک کہ سپیدۂ صبح طلوع ہوتا اور مؤذن اذان پڑھتا اس وقت آپ فجر کی دو رکعت پڑھتے اور تھوڑی دیر داہنی کروٹ پر لیٹ کر آرام فرمالیتے[3] اور کبھی ایسا ہوتا صبح صادق سے کچھ پہلے نوافل سے فراغت پاکر کچھ دیر آرام فرماتے یہاں تک کہ مؤذن کی اذان پر اُٹھ جاتے اور وضو فرماکر نماز صبح کے لئے تشریف لے جاتے۔[4]

وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۞ (سورہ والذاریات)

"اوقاتِ سحر (آخر شب) میں وہ استغفار کیا کرتے ہیں۔"

وقت صبح لطف کی بات یہ ہے کہ رات بھر کے مجاہدہ اور ریاضت کے بعد بھی احساس یہی ہے کہ حق عبودیت ادا نہیں ہوا لہذا صبح ہو رہی ہے تو یہ استغفار پڑھا جارہا ہے،[5] جس کو اہل علم سید الاستغفار کہتے ہیں:

سید الاستغفار اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّيْ	"اے اللہ تو ہی ہے میرا رب تیرے سوا
لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِيْ وَاَنَا	کوئی معبود نہیں تو نے ہی مجھ کو پیدا کیا میں تیرا
عَبْدُكَ وَاَنَا عَلٰى عَهْدِكَ	بندہ ہوں میں تیرے عہد پر اور تیرے وعدے
وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ. اَبُوْءُ	پر (قائم ہوں) جہاں تک میں طاقت رکھتا ہوں
لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَاَبُوْءُ لَكَ بِذَنْبِيْ	میں اقرار کرتا ہوں تیری نعمت کا جو مجھ پر ہے
فَاغْفِرْ لِيْ اِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ	اور اقرار کرتا ہوں اپنے گناہ کا جو تیرے حق میں
اِلَّا اَنْتَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ	میں نے کیا۔ بس میرے گناہ بخشدے
مَا صَنَعْتُ.	بیشک تیرے سوا کوئی گناہ نہیں بخش سکتا جو گناہ

[1] ابوداؤد باب یقول فی الرکوع [2] بخاری شریف ص۱۵۲ [3] ایضاً ص۱۵۵ [4] ایضاً ص۱۵۲ [5] بخاری شریف ص۹۳۲

میں کر چکا ہوں اُن کے شر سے بچنے کیلئے تیری پناہ لیتا ہوں۔"[1]

صبح شام | دن یا رات کا آغاز ہوتا تو زبان مبارک پر جو دعائیں جاری ہوتیں اُن میں سے ایک یہ ہے:

اَمْسَیْنَا وَ اَمْسَی الْمُلْکُ لِلّٰہِ	"ہماری شام ہوگئی اللہ کے تمام ملک کی
وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ	شام ہوگئی۔ سب تعریف اللہ کے لئے۔ اللہ کے
وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، لَہُ	سوا کوئی معبود نہیں۔ اللہ یکتا اور تنہا اس کا کوئی
الْمُلْکُ وَ لَہُ الْحَمْدُ وَ ھُوَ	شریک نہیں ہے اسی کا ملک ہے، اسی کے لئے حمد
عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ۔	ہے اور وہ ہر بات پر قادر ہے۔
اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ مِنْ	میں تجھ سے التجا کرتا ہوں اس رات کی بھلائی
خَیْرِ ھٰذِہِ اللَّیْلَۃِ وَخَیْرِ	کی جو اس رات میں ہے اور میں تیری پناہ لیتا ہوں
مَا فِیْھَا وَ اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّھَا	اس رات کی خرابی سے اور ان تمام چیزوں کی خرابی
وَ شَرِّ مَا فِیْھَا اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ	اور شرارت سے جو اس رات کے اندر ہیں اور تیری پناہ
اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْکَسَلِ	لیتا ہوں کسل سے بیکار کر دینے والے بڑھاپے اور
وَالْھَرَمِ وَسُوْءِ الْکِبَرِ	بڑھاپے کے بُرے دور سے۔ اور تیری پناہ لیتا
وَفِتْنَۃِ الدُّنْیَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ	ہوں دنیا کے فتنہ سے اور عذاب قبر سے۔"[2]

اوقاتِ شب کی تقسیم

معمولاتِ شب کا سلسلہ ختم ہو رہا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پوری رات کا نظام الاوقات بھی پیش کر دیا جائے۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے والد ماجد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالہ[3] سے بیان

[1] مسلم شریف [2] شمائل ترمذی شریف باب ما جاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فرمایا ہے کہ سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے :

ایک حصہ ۔ خاص اپنی ذات کے لئے

ایک حصہ ۔ اللہ تعالیٰ کے لئے

ایک حصہ ۔ اپنے اہل کے لئے

(یہ تین حصے ہوتے تھے مگر مساوی نہیں ۔

جو حصہ اپنے آرام کے لئے مخصوص فرماتے تھے اُس کو بھی تقسیم کر دیتے تھے اس میں سے ایک حصہ عامۃ الناس کو عطا فرماتے تھے ۔ مگر براہ راست نہیں ، بلکہ خواص کے ذریعہ ۔

اس مجلس میں خاص خاص حضرات حاضر ہوتے تھے اور خصوصیت کا معیار ہوتا تھا عوام کی زیادہ سے زیادہ خیر خواہی اور ہمدردی ۔

پس جو شخص عوام کی ہمدردی ، خیر خواہی اور عوام کا بوجھ برداشت کرنے میں بڑھا ہوا تھا وہ آپ کی بارگاہ کا مقرب خصوصی ہوتا تھا ۔ پھر ان خواص میں مدار ترجیح ہوتا تھا علم و عمل ۔

اس معیار پر درجات مقرر کرنا اور ہر ایک کے درجہ کے مطابق وقت دینا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے پر موقوف ہوتا تھا ۔ یہ حضرات آتے کوئی ایک کام لے کر ، کوئی دو کام ، کوئی اس سے زائد ۔ آپ ان میں مشغول رہتے ۔ ان کی طرف حسب حیثیت و حسب ضرورت توجہ فرماتے تھے اور ان حضرات کو عوام میں مشغول فرما دیتے ۔ یعنی آپ خود اُن کے معاملات میں بھی اُن کو ہدایت دیتے اور اُن کی رہنمائی فرماتے اور اُن کے ذریعہ عوام کے حالات اور اُن کے رجحانات معلوم فرماتے ۔ پھر ان باتوں کی تلقین فرماتے جو اُن کے لئے بھی مفید ہوتیں اور عوام کے لئے بھی ۔ آپ کی خاص ہدایت ہوتی کہ ان باتوں کو ان تک پہونچا دیں جو یہاں نہیں حاضر ہو سکے ۔

اس کے علاوہ ان کو خاص تاکید ہوتی کہ عوام کی ضرورتیں جو خود وہ نہیں پہونچا سکتے یہ حضرات اُن کو دربار رسالت میں پیش کریں ۔

ارشاد ہوتا کہ :

من ابلغ سلطانا حاجة من لا يستطيع ابلاغها ثبت الله قدميه يوم القيامة۔

" جو شخص اس پسماندہ کی ضرورت صاحب اقتدار تک پہونچائے جس کو وہ خود نہیں پہونچا سکتا تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے روز ثابت قدم رکھے گا۔"

یہ حضرات اس بارگاہ میں طالب بن کر حاضر ہوتے تھے اور رہنما بن کر یہاں سے باہر آتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ اوقاتِ شب کی تقسیم اس طرح ہوتی: ثلثِ اوّل کے ختم تک نماز عشاء اور اس سے پہلے نماز مغرب، نوافل، پھر اگر مہمان ہوتے تو ان کا کھانا وغیرہ۔ ثلث سوم جس کو احادیث میں ثلث اللیل الآخر فرمایا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لئے۔

درمیان کا ثلث امّت کے لئے بذریعہ خواص نیز اہل کے لئے اور آرام فرمانے کے لئے۔

اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا (سورہ مزمل)

" بیشک تم کو دن میں بہت کام رہتا ہے۔"

دن کے اوقات، معمولات مشاغل اور دعائیں | دن کے اوقات اور مشاغل کو سوانح حیات کہا جاتا ہے۔ یہ تمام کتاب سوانح حیات کی کرن ہے یہاں ان چند معمولات کے آداب لکھے جاتے ہیں جن پر ہر شخص کو لامحالہ عمل کرنا پڑتا ہے۔

مکان سے نکلتے وقت:

بِسْمِ اللهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ۔ — " اللہ کے نام پر، اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس سے بہتر نہ کوئی طاقت ہے نہ قوت۔"

۲- بِسْمِ اللهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ — " اللہ کے نام پر اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنْ   اے اللہ ہم پناہ لیتے ہیں تیری اس سے کہ ہمارے قدم

اَنْ نَزِلَّ اَوْ نَضِلَّ اَوْ   ڈگمگا جائیں یا ہم گمراہ ہو جائیں یا ہم ظلم کریں یا ہم

نَظْلِمَ اَوْ نُظْلَمَ اَوْ   مظلوم ہوں (ہم پر ظلم کیا جائے) یا ہم جہالت کریں (لڑیں

نَجْهَلَ اَوْ يُجْهَلَ عَلَيْنَا۔   جھگڑیں) یا ہم پر جہالت کی جائے (ہم سے لڑا جھگڑا جائے)۔"

مکان میں داخل ہوتے وقت، پہلے یہ دعا پڑھئے۔ پھر اہل خانہ کو سلام کیجئے[2]:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ خَيْرَ   "اے اللہ میں التجا کرتا ہوں تجھ سے اچھے داخلہ

الْمَوْلِجِ وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ   کی اور اچھے خارجہ کی۔

بِسْمِ اللّٰهِ وَلَجْنَا وَعَلَى اللّٰهِ   اللہ کے نام پر ہم داخل ہو رہے ہیں اور اللہ پر

رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا۔   جو ہمارا رب ہے ہم بھروسہ کرتے ہیں۔"

بازار میں داخل ہوں:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا   "خدا وحدہٗ لاشریک کے علاوہ کوئی معبود نہیں

شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَ   اسی کا ہے ملک اسی کی ہے حمد، وہی زندگی بخشتا

لَهُ الْحَمْدُ يُحْيِیْ وَيُمِيْتُ   ہے، وہی موت دیتا ہے اور وہ خود زندہ ہے اس

وَهُوَ حَیٌّ لَا يَمُوْتُ بِيَدِهِ   کو موت نہیں، اسی کے قبضہ میں ہے خیر اور بھلائی

الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ۔   اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

مجلس سے اٹھتے وقت[4]:

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ   "اے اللہ میں تیری پاکی کا اقرار کرتے ہوئے تیری حمد کرتا

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ   ہوں، میں شہادت دیتا ہوں کہ تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں

اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ۔   میں تیری مغفرت چاہتا ہوں اور تیری طرف رجوع کرتا ہوں (توبہ کرتا ہوں)۔"

---

[1] صحاح بحوالہ مشکوٰۃ [2] ابو داؤد ابن ماجہ از مشکوٰۃ [3] ترمذی شریف۔ ابن ماجہ مشکوٰۃ شریف [4] ترمذی شریف

کوئی پریشانی پیش آئے:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ. لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ.

کسی پریشان حال معذور یا مجبور پر نظر پڑ جائے تو

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ عَافَانِیْ "حمد اس اللہ کی جس نے مجھے عافیت بخشی اس سے

مِمَّا ابْتَلَاكَ وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی جس میں تجھ کو مبتلا کیا اور مجھے اُن میں سے بہت سوں پر

كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيْلًا. فضیلت بخشی جن کو پیدا کیا (بہت سی مخلوق پر فضیلت بخشی)"۔

یہ چند حالات اور اُن کے متعلق دعائیں اور آداب بیان کئے گئے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے حالات ہیں۔ مثلاً کھانا، پینا، انسانی حوائج پوری کرنا، جنسی تعلق کو عمل میں لانا۔ یا مثلاً چھینکنا، جمائی لینا، نیا لباس پہننا، نیا پھل دیکھنا، چاند دیکھنا، بارش برسنا، بادل گرجنا، آندھی، طوفان، چاند گہن، سورج گہن، بیماری، علاج، بیماری کے مختلف حالات۔ یا مثلاً دشمن کا دباؤ، مقدمہ وغیرہ۔ یا مثلاً سفر کرنا، سفر کے لئے روانہ ہونا، کہیں پڑاؤ ڈالنا، کسی کا مہمان بننا، کسی مقام پر قیام کے لئے اُترنا، روانہ ہونا۔ یا مثلاً تقریبات میں شرکت وغیرہ وغیرہ ان سب کے آداب ہیں۔ احادیث مبارکہ میں دعائیں وارد ہوئی ہیں بقول۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ۔ اُمت محمدیہ کو اس کے آقا نامدار (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہر بات بتائی ہے حتیٰ کہ قضاءِ حاجت کا طریقہ بھی بتایا ہے اور یہی معنے ہیں "تزکیہ کامل" کے کہ زندگی کے ہر ایک گوشہ اور ہر ایک جزو کو آپ نے سنوارا ہے۔ "فداہ روحی وابی واُمّی" صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ان سب کو نہیں بیان کیا جا سکتا۔ مشاغل شب کے سلسلہ میں سونے اور جاگنے کے کچھ آداب اور دعائیں بیان کی گئیں اب دن کے کاموں میں ملاقات کے آداب بیان کئے جا رہے ہیں پھر مجلس مبارک کے آداب اور خصوصیات پر اس بیان کو ختم کیا جا رہا ہے۔

لہ ترمذی و ابن ماجہ

آدابِ ملاقات

آپ کسی کے یہاں جائیں:

۱. پہلے اجازت حاصل کیجئے۔ مکان پر پہونچ گئے ہیں تو سلام بھی کیجئے اور یہ کہیئے: السّلام علیکم کیا حاضر ہو سکتا ہوں۔ اگر اجازت مل جائے تو اندر جائیے اور اگر صاحب مکان معذرت کر دے تو واپس ہو جائیے برا نہ مانیئے[1]

۲. اگر اندر سے جواب نہ آئے تو دوسری مرتبہ پھر تیسری مرتبہ اسی طرح سلام کیجئے۔ پھر آپ سمجھ لیجئے کہ اس وقت ملاقات کا موقع نہیں ہے۔ کوئی عذر ہے۔ لہٰذا واپس ہو جائے اور برا ہرگز نہ مانیئے[2]

۳. اجازت لینے کے وقت آپ آڑ میں کھڑے ہوں، ایسی جگہ نہ کھڑے ہوں کہ سامنا ہو[3] البتہ اگر صاحب مکان جن سے اجازت لینی ہے سامنے ہوں تو آپ سلام کریں اور اندر حاضر ہونے کی اجازت لے لیں[4]

۴. اندر جھانکنا معیوب ہے۔ ارشاد ہوا: اذا دخل البصر فلا اذن[5]۔ "جب نظر اندر پہونچ گئی تو اب اجازت لینے کا کیا مطلب؟

۵. خود اپنے مکان میں بھی سلام کر کے اور پکار کر جائیے۔ گھر میں پہنچ کر گھر کے آدمیوں کو سلام کیجئے[6]۔

۶. 'سلام' دعا ہے، گرم جوشی سے دعا کرو اور بڑھا کر کہو۔ یعنی یہ کہو: السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

۷. اگر اندر سے پوچھا جائے کون۔ تو آپ نام بتائیں۔ یہ نہ کہیں "میں" اندر والا

---

[1] آیت ۲۷ سورہ ۲۴ نور [2] ترمذی شریف وابوداؤد شریف [3] ابوداؤد شریف [4] ابوداؤد شریف [5] سورہ ۲۴ نور آیت ۶۱ [6] تحیۃ من عند اللہ مبارکۃ طیبۃ۔ سورہ نور آیت ۶۱

کیا جانے "میں" کون[1]

۸۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی کو ہدایت فرمائی۔ ناغہ کر کے ملنے جایا کرو۔ اس سے محبت بڑھے گی[2]

۹۔ آپ نے رات کو کسی کے یہاں پہونچ جانے سے ممانعت فرمادی یہاں تک کہ بلا اطلاع اپنے گھر میں پہنچنے کی بھی اجازت نہیں دی[3]

۱۰۔ اندر داخل ہو کر سب سے بڑھیا جگہ نہ بیٹھئے[4] جہاں جگہ ملے بیٹھ جائیے۔ یہ صاحبِ مکان کا کام ہے کہ وہ آپ کو کہاں بٹھائے۔

کوئی آپ کے یہاں آئے | حضرت زید بن حارثہؓ حاضر خدمت ہوئے تو سید الانبیاء کرتا اُتارے ہوئے تھے۔ چادر کا ایک کنارہ مونڈھے پر تھا۔ خبر پاتے ہی شوق ملاقات میں کھڑے ہوگئے، اُن کو گلے لگایا، سر کو بوسہ دیا۔

حضرت اُم ہانیؓ خدمت مبارک میں حاضر ہوئیں۔ آپؐ نے فرمایا: "مرحبا ام ہانی، ام ہانی مرحبا" [5]

بنی قریظہ کے معاملہ میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو سرپنچ بنایا گیا تھا وہ فیصلہ سنانے کے لئے مسجد میں آئے تو آپؐ نے حاضرین سے فرمایا:

قوموا الیٰ سیدکم " تمہارے سردار آرہے ہیں کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرو[6]"

غزوہ حنین کے بعد ایک وفد کے ساتھ آپؐ کی رضاعی بہن شیما آئیں تو فرطِ مسرت سے آپ نے مرحبا فرمایا۔ اپنی چادر بچھادی اور اپنے پاس اُن کو چادر پر بٹھایا[7]

مختصر یہ کہ آنے والے کے متعلق تعلیم یہ ہے کہ

ان کی آمد پر خوشی ظاہر کی جائے۔ کھڑے ہو کر استقبال کیا جائے۔ مصافحہ کے لئے

---

[1] ابوداؤد شریف [2] صحاح [3] ترمذی شریف [4] ترمذی شریف وغیرہ [5] ترمذی شریف ص۹۵ج۲ [6] ترمذی شریف ص۹۵ج۲ [7] بخاری شریف ص۹۲۶ [8] الاصابہ۔ ذکر شیما۔

ہاتھ بڑھائے[1]۔ کچھ عرصہ بعد ملاقات ہوئی ہے تو معانقہ بھی کیجئے، پھر تعظیم سے بٹھائیے، بڑے کی بڑائی اپنی جگہ۔ جب وہ آپ کے یہاں آیا ہے تو اخلاق سے پیش آنا آپ کا فرض ہے ارشاد گرامی ہے کہ بدترین شخص وہ ہے کہ لوگ اس سے اس لئے ملنا پسند نہ کریں کہ وہ بدخو اور ترش مزاج ہے[2]۔

واپس ہو | جب کوئی رخصت ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محبت اور مہربانی سے اس کا ہاتھ اپنے دستِ مبارک میں لیتے اور جب تک وہ اپنا ہاتھ نہ ہٹاتا، آپ اُس کا ہاتھ لئے رہتے اور یہ دعا فرماتے:

استودع اللہ دینکم "اللہ کے سپرد کرتا ہوں تمہارا دین، تمہارا
وامانتکم وخواتیم اعمالکم[3] ایمان اور خاتمۂ اعمال"

سلام وجواب سلام | ارشادِ ربانی ہے:

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ۝ (سورہ ۴ نساء)

"جب تم کو دعا دی جائے کوئی دعا (مثلاً سلام کیا جائے)
تو تم بھی دعا دو اس سے بہتر یا وہی کہو الٹ کر بے شک
اللہ ہے ہر چیز کا حساب کرنے والا"

سلام کا بہتر جواب یہ ہے کہ رحمۃ اللہ و برکاتہ و مغفرتہ بڑھا دو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی ہے کہ ان میں سے ہر لفظ پر دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ جیسے جیسے الفاظ بڑھتے رہیں گے ثواب بڑھتا رہے گا[4]

---

[1] بخاری شریف ص ۹۲۶ [2] بخاری شریف ص ۹۰۵ [3] ترمذی شریف ص ۱۸۲ ج ۲
[4] ابوداؤد شریف ص ۳۵۹ ج ۲

دربار نبوی یعنی بزمِ رحمۃ للعالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خصوصیات اور آداب

ماخوذ از شمائل ترمذی شریف

(۱) رحمۃ للعالمین محبوب ربّ العالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مجلس مبارک علم وحیاء، صبر و امانت، سکون واطمینان کی مجلس ہوتی تھی۔

(۲) حاضر وغائب اہل مجلس سے ایسا تعلق خاطر رہتا کہ ہر شخص رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا باپ سمجھتا۔ ہر موقع پر ہر ایک کی خبر گیری ہوتی۔ ساتھیوں میں سے کوئی نظر نہ آتا تو اس کی خیریت معلوم کی جاتی۔ اگر کوئی بیمار ہو جاتا تو اُس کی مزاج پُرسی کے لئے اُس کے یہاں تشریف لے جاتے۔ اگر کوئی سفر میں جاتا تو اُس کے لئے دُعا فرماتے رہتے۔ اگر معلوم ہوتا کوئی رنجیدہ ہے تو اُس کی دلداری فرماتے۔ اگر کسی سے کوئی خطا ہو جاتی تو اس کا عذر قبول فرماتے۔ آپس کے معاملات کی تحقیق ہوتی۔ پھر اُن کی اصلاح فرمائی جاتی۔ حضورؐ کے دربار میں امیر وغریب، کمزور وقوی سب برابر تھے۔ سب ساتھی اس طرح رہتے جیسے ایک باپ کی اولاد۔

(۳) مجلسِ مبارک میں جہاں بھی کوئی ہوتا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے مشفقانہ انداز سے وہ یہی سمجھتا کہ اس دربار میں سب سے زیادہ خصوصیت اسی خوش نصیب کو حاصل ہے۔

(۴) ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملنا، تبسّم اور تازہ روئی آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ایسی پیاری عادت تھی جو اپنی نظیر آپ تھی اور کہیں اس کی نظیر ممکن نہ تھی۔

(۵) جب تک ملنے والا خود نہ اُٹھتا آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نہ اُٹھتے مگر یہ مجبوری جس کی معذرت فرمالیتے۔

(۶) ذاتِ رسالت مآب (علیہ الصلوٰۃ والسّلام) کی طرف سے آنے والوں کی عزّت کیجاتی

سلام میں پہل کی جاتی، بیٹھنے کو جگہ دی جاتی، کبھی خود سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ سے کھسک کر اپنے پاس بٹھا لیتے۔ پوری احتیاط برتی جاتی کہ ایسی کوئی بات نہ ہو جس سے کسی کا دل میلا ہو۔

(۷) قبیلہ یا خاندان کا جو بڑا ہوتا اس کی بڑائی مانی جاتی، اُس سے بڑائی ہی کا برتاؤ کیا جاتا۔ پھر اپنی طرف سے بھی اسی کو اس قبیلہ یا خاندان کا بڑا بنا دیا جاتا۔ یعنی جس طرح دربارِ رسالت میں باریاب ہونے والوں کا دین محفوظ ہوتا، عاقبت درست ہوتی اسی طرح اُن کی دنیا بھی درست اور دنیاوی عزّت بھی محفوظ ہو جاتی۔ (صلّی اللہ علیہ الف الف صلوات دائمات)

(۸) خاتم الانبیار سید الثقلین صلّی اللہ علیہ وسلّم کو پسند نہ تھا کہ آپ تشریف لائیں تو لوگ تعظیماً اُٹھیں، یا آپ تشریف فرما ہوں اور لوگ کھڑے رہیں۔ البتہ بزمِ رسالت کی نمایاں شان یہ ہوتی کہ ہر ایک کی دلداری ہوتی، ہر ایک کو مانوس کیا جاتا، بڑوں کی تعظیم کی جاتی، چھوٹوں پر مہربانی ہوتی۔ مجلسِ مبارک میں افضل وہی مانا جاتا جس کی خیر خواہی عام ہوتی جو تقوے طہارت میں اگر سب سے آگے ہوتا تو دوسری طرف خدمتِ خلق، مخلوقِ خدا کی ہمدردی اور خیر اندیشی، بندگانِ خدا کے لئے تکلیف برداشت کرنے اور مصیبت جھیلنے میں بھی سب سے پیش پیش ہوتا۔ کمزوروں کی امداد، مظلوموں کی فریاد رسی، غم زدوں کی غم خواری، بے کسوں کی دستگیری میں سب سے بڑھا ہوا تھا۔ یعنی جس طرح ہمارے آقا رحمۃ للعالمین تھے ایسے ہی وہ بھی خلقِ خدا کے لئے رحمت ہوتا۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ ساری امّت میں سب سے افضل ہیں اور ان کی خصوصی صفت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے۔ ارحم امّتی۔ یعنی "میری تمام امت میں سب سے زیادہ رحم والا"۔ (اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ.

(۹) طرزِ نشست میں مساوات کا یہ عالم ہوتا کہ اجنبی شخص کو پوچھنا پڑتا کہ شاہِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلم کہاں ہیں۔ اس کسرِ نفسی کے باوجود یہ معجزہ تھا کہ جیسے ہی کوئی شخص حبیب خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پہچانتا، مرعوب ہو جاتا اور اس پر ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ مگر جیسے ہی بات چیت ہوتی

زبانِ مبارک سے اس طرح پھول جھڑتے اور ایسے موتی برستے کہ اُس کی ہیبت محبت سے بدل جاتی اور وہ آپؐ کا شیدائی ہو جاتا تھا۔ ایک عجیب انداز تھا کہ لوگوں سے ملے جُلے بھی رہتے اور ہر ایک سے بلند و بالا بھی۔ گویا ذاتِ مبارک سہلِ ممتنع تھی۔

(۱۰) مجلسِ مبارک میں کبھی پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے، لوگوں کے لیے جگہ چھوڑ دیا کرتے۔ اُٹھنے بیٹھنے میں کوئی امتیاز نہ ہوتا۔ آپ کہیں جاتے جہاں جگہ ملتی وہیں بیٹھ جاتے۔ صدر مقام کی کبھی خواہش نہ کرتے۔ یہی آپ کی ہدایت بھی تھی کہ مجلس میں صدر مقام کی خواہش نہ کرو۔ جہاں جگہ ملے بیٹھ جاؤ۔ خاص موقعوں پر ملاقات کے لئے عمدہ لباس زیبِ تن فرماتے، بال وغیرہ بھی درست فرما لیتے تھے۔

(۱۱) مجلسِ مبارک میں اہلِ ضرورت ہی کا تذکرہ ہوتا۔ اہلِ مجلس کو ہدایت تھی کہ جو لوگ کسی بھی وجہ سے اپنی ضرورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچا سکیں مجلس کے ساتھی وہ باتیں پہنچائیں اور اللہ سے ثوابِ عظیم حاصل کریں۔

(۱۲) مجلسِ مبارک میں وقت کی پوری قدر کی جاتی۔ کام کی باتیں جن میں مخلوق کا فائدہ اور خالق سے ثواب کی توقع ہو، خوشی سے سُنی جاتیں اُنھیں میں دلچسپی لی جاتی۔ آنے والے دین کے طالب بن کر آتے اور رشد و ہدایت کی شمع بن کر جاتے۔ اُن کو ہدایت ہوئی کہ جو کچھ اُنھوں نے حاصل کیا ہے اُس کو عوام تک پہنچائیں۔

(۱۳) بات چیت ہوتی تو کسی کی بات کاٹی نہ جاتی جس نے بات شروع کی پہلے اس کی بات پوری ہو لیتی تب کسی دوسرے کو بولنے کا حق ہوتا۔ جب کوئی بولتا سب خاموشی سے اُس کی پوری بات سنتے۔ اگر خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کچھ ارشاد فرماتے تو گویا حاضرین پر سکتہ چھا جاتا۔ فرطِ شوق اور غایتِ احترام میں ایسے ہو جاتے جیسے قالب بے جان!

(۱۴) لوگوں کے حالات اور عوام کے رجحانات کی پوری معلومات رکھی جاتی۔ کوئی اچھا رجحان پایا جاتا تو اس کو تقویت دی جاتی۔ کسی بُری بات کا پتہ چلتا تو اس کی روک تھام کی جاتی۔ اچھی باتوں کی خوبیاں اور جو بُری باتیں ہوتیں اُن کی خرابیاں سمجھا کر ذہن نشین کرائی جاتیں۔

(۱۵) ہر بات اور ہر عمل میں اعتدال سے کام لیا جاتا، ہر کام کے لئے مناسب انتظام ہوتا۔ جو باتیں چھپانے کی ہوتیں وہ امانت سمجھی جاتیں۔ اہلِ ضرورت اور مسافروں کی پوری خبرگیری کی جاتی۔

(۱۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خوش طبعی بھی فرمالیتے تھے۔ مگر کوئی جھوٹی بات کبھی زبانِ مبارک پر نہ آتی۔ حاضرینِ مجلس آپس میں ہنستے بولتے، پہلے زمانہ کی باتیں کیا کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش بیٹھے سنتے رہتے وہ کسی بات پر ہنستے تو آپ بھی مسکرا دیتے۔

(۱۷) اُٹھنا، بیٹھنا، غرض تمام باتیں اللہ کے ذکر کے ساتھ ہوتیں۔

(۱۸) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تین باتوں سے ہمیشہ محفوظ رہی: جھگڑا، تکبر، بیکار باتیں اور سید الکونینؐ نے تین باتوں سے ہمیشہ ہر ایک کو محفوظ رکھا: مذمت، عیب جوئی، پوشیدہ باتوں کا اظہار۔

یارب صلّ وسلم دائمًا ابدًا　　　علی حبیبك خیر الخلق کلھم

آئینہ قرآن میں تصویر تزکیہ
مقاصد بعثت کامیاب۔ حضرت حق جل مجدہٗ کی تصدیق

(۱) وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (سورہ ۴۸ الفتح آیت)

"اور جما دیا اُن کو تقویٰ کی بات پر اور وہ اس کے زیادہ مستحق ہیں اور اس کے اہل ہیں اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔"

(۲) وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (الحجرات ۲۹)

"لیکن اللہ تعالیٰ نے محبت بھر دی تم میں ایمان کی اور سجا دیا، اس کو تمہارے دلوں میں اور نفرت بھر دی تمہارے اندر کفر سے فسق سے اور عصیان (خدا کی نافرمانی) سے۔ یہی ہیں وہ جو راشد ہیں (راہ راست پر ہیں) اللہ تعالیٰ کے فضل اور انعام سے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔"

سیدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ علیہما الصلوٰۃ والسلام کے دعائیہ کلمات کی تلاوت کیجئے۔ خصوصاً یہ کلمات:

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ

"اور ہماری نسل میں سے ایسی امت پیدا کر دے جو تیرے حکموں کی فرماں بردار ہو۔" (آیت ۱۲۸ سورہ ۲ بقرہ)

پھر مقاصد بعثت پر نظر ڈالئے اور موازنہ کیجئے کہ مذکورہ بالا آیات کس طرح کامیابی مقاصد

کی شہادت دے رہی ہیں۔ رحمۃ للعالمین، خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اُمت کے سامنے کتاب اللہ کی تلاوت کی جس کو کتاب و حکمت کی تعلیم دی جس کا تزکیہ کیا، آیات مندرجہ بالا کی شہادت یہ ہے کہ بلا کسی استثنار کے وہ سب اس تعلیم کے صرف عالم ہی نہیں بلکہ عامل بھی اتنے بڑے ہو گئے کہ

(۱) وہ کلمۃ التقویٰ پر ثابت قدم ہیں۔

(۲) اتفاقیہ نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ اس کے اہل ہیں کیونکہ

(۳) ایمان کی محبت اُن کے دلوں میں بھر دی گئی ہے۔

(۴) اس محبت کا نتیجہ یہ ہے کہ

(الف) اُن کے قلوب زیور ایمان سے آراستہ ہو گئے ہیں۔

(ب) ایمان، اسلام اور تقویٰ کی مخالف خصلتیں کفر، فسق اور عصیان سے اُن کے دل متنفر ہو گئے ہیں اور اب حسب ارشاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شان یہ ہے اصحابی کالنجوم[1] بایھم اقتدیتم اھتدیتم (مشکوٰۃ شریف بروایت رزین) "میرے اصحاب تاروں کی طرح ہیں جس کے راستے پر چلو گے ہدایت پالو گے"۔ اور اسی بنا پر حضرت حق جل مجدہٗ کا اعلان یہ ہے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ۔ (سورہ ۵۸ مجادلہ آیت ۲۲)

"اللہ اُن سے راضی اور وہ خدا سے راضی ہو گئے۔"

---

[1] حدیث اگرچہ سند کے لحاظ سے قوی نہیں مانی جاتی مگر اس کا مضمون وہ ہے کہ قرآن پاک کی آیتیں اس کی تائید اور تصدیق کر رہی ہیں۔ لہٰذا حدیث اپنے مفہوم کے لحاظ سے قوی ہے۔

حج البیت

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا۔ (سورۂ آل عمران آیت ۹۷)

اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر حج کرنا اس بیت کی جو کوئی پاوے اس تک راہ (شاہ صاحب)

رب اکبر کے بیت الحرام کی بنیادیں بلند کرتے ہوئے حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے اُمّتِ مسلمہ اور اس کے لیے رسول کی وہ دعا کی تھی جس کی ضیا پاشی کا تذکرہ پہلے صفحات میں گذرا۔ اسی وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت حق جل مجدہٗ کے اس حکم کی تعمیل بھی کی تھی۔

اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (سورہ الحج آیت ۲۷)

"لوگوں میں حج کا اعلان پکار دے"۔

یہ رسول موعود محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مورثِ اعلیٰ کی ملت "ملّتِ ابراہیم" کا احیاء کرتے ہوئے بحکم خدا خانۂ کعبہ کو قبلہ بنا چکے تھے۔ لیکن اعلان حج کا جو تقاضا تھا:

يَأْتُوكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ (آیت ۲۷ سورہ حج)

"آئیں گے تیرے پاس پا پیادہ اور دُبلے پتلے اونٹوں پر جو دُور دراز راستوں سے آئیں گے"۔

یہ تقاضا پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ اور کیسے پورا ہوتا جب کہ خانہ کعبہ پر قریش کا قبضہ تھا اور انھوں نے اس مرکزِ توحید کو کفر و شرک کا تیرتھ بنا رکھا تھا۔

لیکن ملّتِ ابراہیمی کے فداکاروں میں جو جذبہ تحویلِ قبلہ کے لیے تھا وہی جذبہ اور ممکن ہے اس سے زیادہ جذبہ اور شوق اس کا ہو کہ اعلانِ ابراہیمی کے تقاضے کو پورا کریں۔ اس جذب و اضطراب کو بڑا سکون وارث ابراہیم خلیل اللہ محبوب رب العٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جواب سے ہوا کہ:

"سر منڈاتے ہوئے یا بال کترواتے ہوئے مسجدِ حرام میں داخل ہو رہے ہیں"۔

اسی دور میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا ارادہ فرمایا لیکن جب چودہ سو مومنین

صالحین کے پورے قافلہ اور اُن کے آقا اور قائد کو (صلی اللہ علیہ وسلم) مقام حدیبیہ پر روک دیا گیا۔ پھر صلح ہوئی تو نہایت دَبی ہوئی شرطوں پر جن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اس وقت نہ عمرہ کریں، نہ مکے میں داخل ہوں۔ اس وقت حدیبیہ ہی سے واپس ہو جائیں، آئندہ سال آسکتے ہیں۔ مگر خاص خاص پابندیوں کے ساتھ کہ اسلحہ کم سے کم ہوں اور وہ بھی نیاموں میں بند ہوں، صرف تین دن قیام کریں (وغیرہ وغیرہ) تو ایک مایوسی لازمی تھی لیکن وحی الٰہی نے جس طرح اس دَبی ہوئی صلح کو فتح مبین فرمایا، مایوس دلوں کو یہ بشارت دے کر تازگی بخشی کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب اللہ کے رسولؐ کا خواب پُورا ہوگا۔

"تم مسجد حرام میں انشاء اللہ ضرور جاؤ گے امن وامان کے ساتھ کہ تم میں کوئی سر منڈائے ہوگا، کوئی بال کترا تا ہوا۔ کسی طرح کا اندیشہ نہ ہوگا۔" (سورہ ۴۸ الفتح آیت ۲۷)

وحی الٰہی سراسر صداقت ہوتی ہے۔ ایک سال بعد اُن سب نے عمرہ کیا جن کو بشارت دی گئی تھی۔ پھر جب ۸ھ میں مکہ معظمہ فتح ہو چکا تو ۱۰ھ میں خواب کی تعبیر اس شان سے جلوہ گر ہوئی جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

حج اسلام اور اعلانِ برأت ۹ھ

رمضان شریف ۸ھ میں مکہ فتح ہوا۔ مگر چونکہ فوراً ہی حنین و اَوطاس کے معرکے پیش آگئے پھر طائف کے محاصرہ میں تقریباً ایک مہینہ لگ گیا۔ اس لیے اس سال حج کا انتظام پہلے ہی ہاتھوں میں رہا۔ صرف حج کے ارکان مسلمانوں نے حضرت عتاب بن اُسید (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ ادا کیے جو مکہ معظمہ کے امیر (گورنر) مقرر کیے گئے تھے۔

اب مکہ فتح ہوئے ایک سال ہو چکا ہے، نہ صرف مکہ کے باشندے بلکہ قریب قریب عرب کے تمام ہی قبیلے مسلمان ہو چکے ہیں۔

پہلے عرب[1] کفار و مشرکین کا تھا، اب عرب مسلمانوں کا بن چکا ہے۔ لہٰذا اس سال حج کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا جا رہا ہے۔ مگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفسِ نفیس اس سال بھی تشریف نہیں لے جا سکے[2]۔ لہٰذا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو قائم مقام بنایا گیا اور تین سو صحابہ کے ساتھ حج ادا کرنے کے لیے روانہ فرما دیا گیا۔ بعد میں حسب ارشاد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم، سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی خصوصی[3] اعلان کیلئے پہونچ

---

[1] عرب کے باشندے چونکہ قریش کے زیر اثر تھے اس لیے اسلام لانے میں بھی قریش کے رویہ پر ان کی نظر تھی۔ صلح حدیبیہ نے ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کی۔ مسلمانوں کو تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ لہٰذا اسلام قبائل میں پھیلنے لگا اور جب مکہ فتح ہو چکا اور قریش حلقہ بگوشِ اسلام بن گئے تو اب تمام رکاوٹیں ختم ہوگئیں۔ اب ہر قبیلہ اسلام کی طرف لپکنے لگا اور وہ اسلام جو گذشتہ ۲۱ سال میں چیونٹی کی چال چلا تھا اب وہ ایک سیلاب بن گیا جس کی لہریں عرب کے کناروں کو چھونے لگیں۔

[2] اس لیے کہ خانۂ کعبہ اگرچہ نشاناتِ شرک سے پاک ہو چکا تھا مگر سلسلہ حج اس طرح پاک نہیں ہوا تھا کیونکہ مشرکین بھی آتے تھے اور ان کی مشرکانہ رسوم اور وحشیانہ حرکتیں (مثلاً برہنہ حج کرنا) باقی تھیں، حج میں اس سال ان کی ممانعت کا اعلان کر کے مناسکِ حج کو پاک کرنا تھا اور اس لیے بھی آپ تشریف نہیں لے گئے کہ "نسی" یعنی لوند کی وجہ سے جو مہینوں کی ترتیب بگڑی ہوئی تھی وہ درست نہیں ہوئی تھی۔ یہ ترتیب اگلے سال درست ہوئی جس سال آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج فرمایا اسی موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا تھا ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السمٰوٰت و الارض (بخاری شریف ص۶۲۴) زمانہ کی جو ترتیب اس روز تھی جس روز اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین پیدا کیے تھے اسی ترتیب پر لوٹ آیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

[3] اس موقعہ پر بھی پوری اہمیت کے ساتھ یہ اعلان کرنا تھا کہ جو کفار و مشرکین عہدنامہ کی خلاف ورزی کر چکے ہیں ان کا معاہدہ مسلمانوں کی طرف سے بھی منسوخ کیا جاتا ہے اور آئندہ اس کی ذمہ داری سے برات کی جاتی ہے اس قسم کے اہم اعلان کے لیے عربوں کے قاعدہ کے مطابق ضروری تھا کہ خود صاحبِ معاملہ (باقی بر صفحہ آئندہ)

گئے۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلام کی تعلیم کے مطابق حج کرایا۔حج کے زمانہ میں وہ خداوندی اعلان[1] بار بار سنایا جس کی ہدایت سورۂ براءت کے شروع میں کی گئی ہے کہ:

۱۔ وہ لوگ جو معاہدے کے پابند رہے ہیں ان کے معاہدے اپنی مدت تک باقی رہیں گے۔

۲۔ جن لوگوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کی یا اب تک کوئی معاہدہ ہی نہیں کیا تھا، ان کو چار[2] ماہ کی مہلت اور دی جاتی ہے۔ پھر اُن کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ[3] کا اعلان ہے۔

۳۔ آئندہ کوئی مشرک اللہ کے گھر میں داخل نہ ہو سکے گا۔

۴۔ کوئی شخص ننگے بدن طواف نہیں کرے گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اعلان کرے یا کوئی اس کا صلبی عزیز اعلان کرے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ شرف حاصل تھا کیونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے۔لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا، تاکہ مشرکین کو حیلہ بہانہ کا موقع نہ رہے۔

[1] ۱۰ ذی الحجہ جس کو یوم النحر کہا جاتا ہے۔اس روز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منیٰ کے عام اجتماع میں اعلان کیا کہ آئندہ کوئی مشرک خانہ کعبہ میں نہیں داخل ہو سکے گا، نہ کوئی شخص برہنہ بدن طواف کر سکے گا۔ (بخاری شریف) پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سورۂ براءت کی ابتدائی آیتیں پڑھیں جن میں مذکورہ بالا اُمور کا اعلان ہے۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرات نے اس اعلان کی اس طرح زور زور سے تشہیر کی کہ ان کے گلے پڑ گئے (سیرۃ ابن ہشام)۔ [2] مکہ معظمہ گذشتہ سال ۲۰ رمضان کو فتح ہو چکا ہے جس کو آج ۱۰ ذی الحجہ ۹ھ کو پندرہ مہینے گذر چکے ہیں۔اب تک مشرکوں اور کافروں سے کچھ نہیں کہا گیا اور آج بھی چار ماہ کی مزید مہلت دی جا رہی ہے۔اس سے بڑھ کر اور سیر چشمی کیا ہو سکتی ہے؟ پھر بھی کہا جاتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ [3] اس اعلان کے بموجب کسی فیصلے سے بھی جنگ کی نوبت نہیں آئی کیونکہ اس سے پہلے ہی وہ سب لوگ مسلمان ہو چکے تھے جن پر اس دفعہ کا اطلاق ہو سکتا تھا۔

حج فرض۔حج وداع

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ، لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ ۔ (سورہ ۴۸ الفتح آیت)

"بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھلایا ہے جو مطابق واقع کے ہے کہ تم لوگ مسجد حرام میں انشاء اللہ ضرور[1] جاؤ گے امن وامان کے ساتھ کہ تم میں کوئی سر منڈاتا ہوگا۔کوئی بال کترا تا ہوگا۔کسی طرح کا اندیشہ نہ ہوگا۔"

خدا کے سارے احکام پہونچا دیئے گئے۔ان پر عمل کا عادی بھی بنا دیا گیا لیکن ایک فرض باقی رہ گیا یعنی حج بیت اللہ۔اس پر عمل کرانا باقی ہے۔

سنہ ۱۰ھ ذی قعدہ کا مہینہ آیا۔عرب میں حج کا اعلان کرادیا گیا، اہل ایمان مرد عورتیں اور بچے سب طرف سے آنے لگے۔آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا موکب ہمایونی ۲۶رذی قعدہ سنہ ۱۰ھ کو مدینہ طیبہ سے روانہ ہوا۔شمع رسالت کے گرداگرد ہزاروں پروانوں کا ہجوم ہے۔ راستہ میں بے شمار پروانوں کے جھرمٹ آتے جاتے ہیں اور لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ کہتے ہوئے پروانوں میں ملتے جاتے ہیں۔اس طرح ان کی تعداد سوا لاکھ کے قریب پہونچ گئی ہے۔

۴رذی الحجہ سنہ ۱۰ھ کو یہ نورانی قافلہ جو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر قیادت لشکر رحمت ہے بلد حرام (مکہ معظمہ) میں داخل ہوا۔قواعد حج کے مطابق ۸رذی الحجہ کو

---

[1] یہ داخلہ سنہ ۷ھ میں ہوچکا تھا جب عہدنامہ حدیبیہ کے بموجب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کے ساتھ عمرہ کے لیے تشریف لے گئے اور اطمینان سے عمرہ کیا پھر حلق وقصر کیا اس سے پہلے خیبر فتح ہوچکا تھا چونکہ یہ تمام وعدے حج فرض پر بھی صادق ہوتے ہیں اس مناسبت سے یہ آیت یہاں پیش کردی گئی۔

مکہ معظمہ سے روانہ ہو کر شب کو منیٰ میں قیام کرتے ہوئے ۹ ذی الحجہ کو مقامِ عرفات میں نزول فرما ہوا پھر اسی شام کو عرفات سے روانہ ہو کر عشاء کے قریب مزدلفہ پہونچا۔ شب کو یہاں قیام فرما کر صبح سویرے یہ نورانی میلہ مزدلفہ سے منیٰ منتقل ہوا، جہاں دو روز قیام پذیر رہا۔ ان ایام میں اُن کے امام نے (جو سیاسی نظام کے لحاظ سے بھی امام اعظم ہے اور نہ صرف امام المؤمنین بلکہ امام الانبیاء وسید المرسلین ہے (صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلیہم اجمعین) تقریر فرمائی اس کے متفرق اجزاء جو بخاری شریف، مسند احمد، مسند بزاز اور طبرانی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا مفہوم اپنی زبان اور اپنے الفاظ میں پیش کیا جا رہا ہے مطالعہ فرمایئے اور سبق لیجئے۔

ناقہ کی پشت جو اس وقت تاجدارِ دوجہاں سید الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم کا گویا منبر تھا۔ اسی ذی حیات منبر سے آپؐ نے اُمت کو خطاب فرمایا:

خطبہ حجۃ الوداع

(ترجمہ)

پہلے تین دفعہ تکبیر فرمائی اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ پھر ارشاد ہوا:

"خدا واحد کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اپنے بندے کو کامیاب کیا۔ تن تنہا تمام ٹولیوں کو پسپا کر دیا۔ وہی تعریف کا مستحق ہے۔ ہم اسی کی تعریف کرتے ہیں۔ اسی سے مدد چاہتے ہیں۔ اسی سے مغفرت[1] مانگتے

---

[1] یہ ہے مقامِ نبوت تیئیس ۲۳ سالہ جد وجہد کا نام نہیں، اپنی جفاکشی اور محنت کا کوئی تذکرہ نہیں، اپنی ہستی کچھ نہیں۔ جو کچھ ہے اللہ کا فضل وکرم ہے۔ اس کی امداد واعانت ہے۔ اپنی کوتاہیاں سامنے ہیں جن کی مغفرت طلب کی جا رہی ہے۔ اپنے کسی کمال کا تصور اور خیال بھی نہیں۔ پورا خطبہ پڑھ لو کہیں اپنی معمولی سی تعریف بلکہ تعریف کا کوئی شائبہ بھی نہیں ملے گا۔ جبکہ سیاسی رہنما ایسے موقع پر اپنی خدمات بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور اپنی ہوشمندی اور سلیقہ مندی کے قصیدے خود اپنی زبان سے پڑھتے ہیں۔

ہیں اور گواہی دیتے ہیں کہ اس اکیلے معبود کے سوا کوئی معبود نہیں۔ محمد اس کا بندہ اور پیغمبر ہے۔ (بخاری شریف وغیرہ)۔

لوگو! میں تمھیں خوفِ خدا کی وصیت کرتا ہوں۔ دیکھو چار چیزیں ہیں:

خدا کے سوا کسی کو شریک نہ بناؤ، کسی کی ناحق جان نہ لو، زِنا نہ کرو، چوری نہ کرو۔

اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تمہارے بعد کوئی اُمّت نہیں۔

دیکھو، سنو!

اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔ پنج وقتہ نمازیں ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو، زکوٰۃ ادا کرو، جن کو تم اپنے معاملات کا ذمہ دار بناؤ، ان کی بات مانو۔ اپنے رب کی جنت میں خوشی خوشی داخل ہو جاؤ۔

دیکھو، جو کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو۔ یاد رکھو، ممکن ہے آئندہ مجھے نہ دیکھ سکو!

لوگو! بتاؤ۔ یہ کونسا دن ہے، کونسا مہینہ ہے، کس مقام پر تم اس وقت ہو۔

(پھر ارشاد ہوا) یہ وہی دن ہے جس کی تم ہمیشہ سے تعظیم کرتے چلے آئے ہو، جس میں ایک دوسرے کے خون کو حرام سمجھتے آئے ہو، یہ وہی ذی الحجہ ہے جس میں آپس کا قتل و خون سب سے بڑا جرم سمجھتے رہے ہو، یہ وہی شہر ہے جس کی حرمت و عظمت کا سکّہ تمہارے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے، جس میں ہر ایک کی جان محفوظ مانی جاتی ہے۔

دیکھو، ایک دوسرے کی جان، مال، آبرو۔ ایسی ہی حرام ہے جیسے یہ مبارک دن۔ اس مبارک مہینہ میں۔ اس مقدس شہر میں۔

اے لوگو! میری بات سنو اور زندگی پاؤ۔

خبردار ظلم نہ کرنا، خبردار ظلم نہ کرنا، خبردار ظلم نہ کرنا کسی بھی شخص کا مال اس کی رضامندی کے بغیر لینا روا نہیں جس کے پاس کسی کی امانت ہے وہ احتیاط سے اس کو ادا کر دے۔ (مسند احمد)

پھر ارشاد ہوا:

مسلمانو! خبردار، خبردار، میرے بعد گمراہ اور کافر مت ہو جانا کہ آپس میں ایک دوسرے کی گردن مارتے پھرو۔ میری سنو۔ اور خوب سمجھ لو۔ یاد رکھو۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ اور سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ دیکھو ظلم مت کرو۔ کسی کی آبرو مت گراؤ۔

عورتوں کے حقوق

اے لوگو! اپنی عورتوں پر تمہارا حق ہے اور ان کا تم پر تمہارا حق عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہاری ناموس اور آبرو کی حفاظت کریں۔ کوئی بدکاری عمل میں نہ لائیں۔ عورتوں کا حق تم پر یہ ہے کہ تم خوش دلی سے اُن کو کھانا کپڑا دو۔ عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر کچھ خرچ نہ کرے۔

دیکھو۔ عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ وہ اللہ کی بندیاں ہیں۔ خدا نے تم کو اُن پر بڑائی دی ہے۔ عورتوں کے معاملہ میں خوفِ خدا سے کام لو۔

گذشتہ دَور کے مظالم فراموش

دیکھو! خون (یعنی قتل کرنے اور قصاص لینے کے اور) پانی کے چشموں اور اموال کے جو تنازعات چلے آرہے تھے۔ آج وہ سب میرے قدموں کے نیچے (پامال ہو چکے)۔ ان کو فراموش کر دو اور سب سے پہلے جس خون کا مطالبہ معاف کیا جاتا ہے وہ (میرے چچا زاد بھائی) ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کا خون ہے۔ یہ شیرخوار تھا۔ قبیلۂ بنی حارث میں پرورش پا رہا تھا۔ قبیلہ ہذیل کے لوگوں نے اس کو زمانہ شیرخواری ہی میں قتل کر دیا تھا۔ (اس کا خون میں معاف کرتا ہوں)۔

اور دیکھو۔ زمانۂ جاہلیت کے تمام سود معاف۔ میں سب سے پہلے وہ سود معاف کرتا ہوں جو میرے چچا عباس کے لوگوں کے اوپر تھے۔ اگر چاہو تو اصل قرض لے سکتے ہو۔ نہ تم پر کوئی ظلم، نہ تمہارا کسی پر ظلم (مسند احمد)۔

وقت ختم | اور دیکھو زمانہ اُسی ہیئت پر لوٹ آیا ہے جو اس کی ہیئت ابتدا، آفرینش میں تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کیے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ، ذٰلِكَ الدِّيْنُ (تا ختم آیت سورۃ توبہ)۔

مسلمانو! خبردار، خبردار، میرے بعد کفر کی باتوں پر نہ آجانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارتے پھرو (بخاری شریف)۔

دیکھو، شیطان مایوس ہو چکا ہے کہ نماز پڑھنے والے اس کی پوجا نہیں کر سکتے۔ ہاں وہ تمہارے اندر جھگڑے کھڑے کرنے میں (لگ گیا ہے) وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر تمھیں بھڑکاتا رہے گا۔ دیکھو احتیاط سے کام لیتے رہنا۔ (مسند احمد)۔

مساواتِ انسانی | (ارشاد ہوا:)

اے لوگو! تمہارا رب ایک، تمہارا باپ ایک۔ نہ عرب کو عجم پر فضیلت نہ عجم کو عرب پر فضیلت۔ نہ کالے کو گورے پر عظمت، نہ گورے کو کالے پر بڑائی۔ سب کے سب ایک باپ آدمؑ کی اولاد ہیں۔ اور آدم کی آفرینش مٹی سے ہوئی تھی۔ کسی کو جو فضیلت میسر آسکتی ہے وہ تقویٰ (خدا ترسی اور پرہیزگاری) کی بناء پر۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ (الآیۃ سورہ حجرات ع ۲، ترمذی و مسند احمد وغیرہ)

اے جماعت قریش ایسا نہ ہو کہ قیامت کو تم لدے ہوئے آؤ کہ دنیا تمہاری گردنوں پر سوار ہو اور دوسرے لوگ آخرت لے کر آئیں۔

دیکھو۔ میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔

مسلم اور مؤمن کون ہے

دیکھو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں مسلم اور مؤمن کون ہے؟ مسلمان وہ ہے کہ سب مسلمان اُس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے محفوظ رہیں۔ اور مؤمن وہ ہے کہ کسی بھی انسان کو اس کی طرف سے نہ اپنی جان کا خطرہ ہو نہ مال کا۔

اور میں بتاؤں۔ مہاجر و مجاہد کون ہے۔ مہاجر وہ ہے جو تمام برائیوں کو چھوڑ دے اور مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت کرنے میں اپنے نفس سے جہاد کرے۔

اور دیکھو۔ ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان پر ہر چیز حرام ہے۔ اس کی جان حرام، اس کا مال حرام، اس کی آبرو حرام۔

دیکھو۔ غیبت کر کے مردہ بھائی کا گوشت مت کھاؤ۔ (طبرانی و بزار)۔

اے لوگو۔ سنو۔ جہاد فی سبیل اللہ میں ایک شام ایک صبح چلنا بھی دُنیا اور دنیا کی تمام دولتوں سے بڑھ کر ہے۔

دیکھو۔ مَیں تم میں ایک چیز چھوڑے جاتا ہوں جس کے ہوتے ہوئے تم کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ بشرطیکہ اس کو مضبوطی سے سنبھالے رہو، وہ کیا ہے؟ 'اللہ کی کتاب'!

اے لوگو۔ بتاؤ۔ میں نے خدا کے احکام پہونچا دیئے۔ جب تم سے میری بابت سوال ہوگا تو کیا کہوگے ؟

سب نے جواب دیا: "ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے اللہ کا پیغام پوری طرح پہونچا دیا۔ امانت ادا کردی۔ نصیحت میں کوئی کوتاہی نہیں کی"

اس پر آپ نے فرمایا۔ خدایا گواہ رہ، خدایا گواہ رہ، خدایا گواہ رہ۔ پھر صحابہ کو مخاطب کرکے فرمایا:

"جو یہاں ہیں وہ سب باتیں دوسروں تک پہونچا دیں جو یہاں نہیں ہیں"

تکمیلِ دین کی بشارت

فرائضِ نبوت ادا کردیئے گئے، مقاصد بعثت کامیاب ہوگئے۔ اللہ کے دین کی عمارت جس کی تعمیر حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام نے شروع کی تھی، اُس کا آخری رَدّہ رکھا جاچکا۔ عمارت ہر لحاظ سے مکمل ہوگئی، تو عرشِ رحمٰن سے اس کی سند صادر ہوئی:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۔ (سورۂ ۵ آیت ۳)

(ترجمہ) "آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کردیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کردی۔ اور تمہارے لیے پسند کرلیا دینِ اسلام"

مکۂ معظمہ سے واپسی فرائض و واجبات حج سے فراغت ہوگئی تو ۱۴ ذی الحجہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پاکباز رفقاء مکہ سے واپس ہوئے۔ صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

اعلام رخصت

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝

"جب آ پہنچے خدا کی مدد اور فتح، اور آپ لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق جوق داخل ہوتا ہوا دیکھ لیں تو اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیجئے اور اس سے مغفرت کی درخواست کیجئے وہ بڑا توبہ قبول کرنیوالا ہے۔"

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس سورت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کا اعلامیہ قرار دیا، کیونکہ مقاصد بعثت پوری طرح مکمل ہو چکے۔

(الف) تطہیر کعبہ، آخری مقصد تھا۔ مکہ معظمہ فتح ہوا تو سب سے پہلے اس فرض کو انجام دیا گیا کہ خدا رواحد کے بیت کو جو سیکڑوں معبودانِ باطل کا بیت بنا دیا گیا تھا، پھر سے بیت اللہ بنا دیا گیا۔ کھلی آنکھوں جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ [1] کا مشاہدہ کرا دیا گیا۔

(ب) سلسلہ دعوت جس کا دامن صلح حدیبیہ کے بعد سے وسیع ہونا شروع ہوا تھا یہاں تک فتح کے بعد سارا عرب اس کا میدان بن گیا اور اقتدار قریش جو آخری رکاوٹ تھا اس کی دھجیاں

---

[1] حق آیا باطل جاتا رہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں ایک چھڑی تھی خانہ کعبہ کے گرداگرد جو بڑے بڑے بت تھے یہ آیت پڑھتے ہوئے آپ چھڑی کی نوک بت پر لگاتے تھے اور وہ بت زمین پر ڈھیر ہو جاتا تھا۔

بکھری ہوئی خود قبائل نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو وفود قبائل کی فوجیں بارگاہِ رسالت میں حاضر ہونے لگیں۔ دین کا پودا جو تئیس برس پہلے لگایا تھا تن آور درخت بن گیا۔

(ج) یہ مقاصد پورے ہو گئے تو وہ رُوحِ قدسی جو انہیں مقاصد کے لئے خاکدانِ ارضی میں نزول فرما تھی اور بے چین تھی کہ رفیقِ اعلیٰ کی رفاقت میسّر آئے۔ اب وقت آگیا کہ یہ بے چینی ختم ہو اور رفاقت دائمی میسّر ہو۔

(د) تسبیح و تحمید۔ اس رفاقت کا رابطہ ہے، حکم ہوا کہ اسی رابطہ میں مشغول ہو جاؤ۔

یہی ہے مفہوم سورت۔ (واللہ اعلم)

علالت، دورانِ علالت میں حدیث قرطاس، وصیتیں، خطابات و نیابت امامت، غسل، تجہیز، تکفین، تدفین، نمازِ جنازہ، مسئلہ جانشینی، خبرِ رحلت سے صحابہؓ کے تاثرات، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تسکین، وراثت انبیاء علیہم السلام۔ اس کے علاوہ سفرِ حج کی تفصیل، غدیرِ خم کی تقریر، نیز وفود کی آمد، آمدِ وفود پر خطابات و مکالمے، قصۂ فدک، افسانۂ افک، مسئلہ متعہ، ازواجِ مطہراتؓ اور ان کا تعارف، واقعہ ایلاء، حلیلہ متبنّٰی سے نکاح، غلامی اور آزادی جیسے مسائل جلد ثانی میں ملاحظہ فرمائیں جس میں غزوات و سرایا کی تفصیل کے بعد ان مسائل پر بھی بحث ہوگی۔ (انشاء اللہ)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ط

شب چہار شنبہ ۲۱ رشوال ۱۳۸۹ھ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۹ء

محمد میاں عفی عنہ وغفرلہٗ والوالدیہ

افسوس ہے کہ یہ کام آگے نہ بڑھ سکا اور شوال ۱۳۹۵ھ میں مصنف کی وفات ہوگئی۔ البتہ اس مضمون کا تسلسل مصنف کی دوسری کتاب "صحابہ کرامؓ کا عہدِ زرّیں اور مثالی حکومتیں" میں آگیا ہے۔ اس کے بعد اس کا مطالعہ کیا جائے۔